عبداللہ حسین

باگھ

باگھ

ناول

عبداللہ حسین کے دیگر مجموعے

★ ★ ★ ★

★ اُداس نسلیں (ناول)

★ نشیب (ناولٹ اور افسانے)

★ قید (ناولٹ اور افسانے)

عبداللہ حسین

باگھ

ایک محبت کی کہانی

(ناول)

قوسین

خان چیمبرز ○ مولچند سٹریٹ ○ انارکلی، لاہور

جملہ حقوق محفوظ

بار اوّل : ۱۹۸۲ء
ناشر : سلیم و ریاض
طابع :

فرحت

کے لیے

(١)

"There appears to be some basic constitutional defect which renders these people liable to develop this disease. The patient is emotional and overconscientious . . . ."

Diseases of Respiratory System : I. W. B. Grant

(۱)

"رات گرا سدی" یاسمین نے کہا تھا۔ صبح کی روشنی میں اُس کا چہرہ دمک رہا تھا۔

بھورے رنگ کے ریتیلے پتھر کا بنا ہُوا یہ مکان گاؤں سے ذرا ہٹ کر واقع تھا۔ مکان کے عقب میں پہاڑ آسمان کی طرف اُٹھتا ہُوا چلا گیا تھا۔ چوٹی پر چیڑ کا جنگل تھا۔

ایک کھُلا سا کچا صحن، جس کے گرداگرد کمر کمر تک پتھروں سے بنی ہوئی چار دیواری تھی، دراصل اِس مکان کا ہی حصّہ تھا، گو مکان سے مُلحق نہ تھا۔ یہاں سے مکان کو جاتے ہوئے ایک مختصر سی سفیدہ زمین پڑتی تھی۔

اس صحن میں چار درخت تھے: تین چنار، جن کی شاخیں آپس میں ملتی تھیں، اور ایک لمبا نوجوان سفیدے کا درخت جس کے پتّے ہلکے سبز رنگ کے تھے۔ اس سفیدے کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے اسد کو یاسمین کا دمکتا ہوا چہرہ یاد آیا، اور وہ رات کے انتظار میں یکلخت بیتاب ہو گیا۔ وسط مارچ کے اُس چمکتے ہوئے دن کو، اُس بیتابی کے عالم میں اُسے بہت سی باتیں یکے بعد دیگرے یاد آنے لگیں۔ وہ پنجاب کے میدانوں کا باسی، اپنی سانس کے ہاتھوں مجبور ہو کر پردیس میں آ بیٹھا تھا۔ اُس کا حمام دستہ اُس کی ٹانگوں کے بیچ پڑا تھا، اور بیچ بیچ میں وہ ہاتھ روک

کر دوپہر کی دھوپ میں دُور نیچے تک وادی میں دیکھ لیتا جہاں کچھ دنوں سے ایک شیر نے تباہی مچا رکھی تھی۔

اسد کی سانس کی مشکل، اُس کی روزمرہ کی مشقت، یاسمین کا متبسم چہرہ —— ان سب چیزوں کے عقب میں، دُور دُور تک ایک شیر کا علاقہ تھا، اور عرصہ دراز سے رہا تھا۔ اُس (جانور) کی خواہش اسد کے دل میں جیسے نصب تھی، اور اُس وقت سے تھی جس وقت کی یاد بھی اب محو ہو چکی تھی۔ کئی بار اُس نے سوچنے کی کوشش کی تھی کہ کیسے اور کہاں یہ پھانس اس مضبوطی سے اُس کے دل میں آ کے گڑ گئی تھی؟ وہ تو کبھی شکاری بھی نہ رہا تھا، نہ غلیل نہ تیر کمان نہ ائیرگن —— ماسوا، اُن چند برسوں کے جب بہت چھوٹی عمر میں وہ اپنے باپ کے ہمراہ پرندوں کے شکار کو جاتا رہا تھا۔ اُس کے والد بارہ بور کے شکاری تھے اور مُرغابی اُن کا مرغوب شکار تھا۔ اسد کے باپ کی خواہش تھی کہ اُن کا بیٹا اُنہی کی طرح کُھلی فضاؤں کا شکاری بنے۔ مگر وہ تیرہ برس کا تھا کہ اُس کے والد وفات پا گئے۔

یہ بات بھی نہ تھی کہ وہ اس شیر کو پکڑنا اور اسے پنجرے میں قید کر کے رکھنا چاہتا تھا۔ اُس کی خواہش تھی تو شیر مارنے کی، اور وہ بھی محض ہلاک کرنے کی نہیں بلکہ اُس کے تعاقب میں جانے کی۔ اُسے اُس کی اپنی سرزمین پہ جا لینے کی اور اُس کا شکار کرنے کی تھی۔ اسد کو جان لینے اور شکار کرنے کے فرق کا کسی نہ کسی طور علم تھا۔ تعجب کی بات تھی کہ اُس کے دل میں کبھی یہ خیال نہ آیا تھا کہ شیر جب مردہ پڑا ہو گا تو وہ اسے اُٹھا کر کہیں لے جائے گا یا تصویریں بنوائے گا یا اُس کی کھال میں بُھس بھروا کر کھڑا کرے گا، وغیرہ وغیرہ۔ وہ بس چاہتا تھا کہ اُس کا شکار کرے، اور پھر اُسے وہیں چھوڑ کر واپس چلا آئے۔

وہ کس شے کے سامنے شیر کا شکار کرے گا، اس بارے میں بھی ماضی میں کئی مرتبہ اُس نے سوچنے کی کوشش کی تھی، مگر ناکام رہا تھا۔ وہ اس فیصلے پہ بہر حال پہنچا تھا کہ ہتھیاروں کا انتخاب ایک ایسا مسئلہ تھا جس کا حل موقع پڑنے پر ہی ہو سکتا تھا، جب کہ شیر، اور اس کا شکار، باوجود اپنی ازلیت کے، ایک بعید، ادھ بنے خیال کے مانند ہی رہا تھا، جیسے کہ ایک خواب ہو۔ مگر یہ ایک بڑا اصلی خواب تھا، جیسے تمام لوگوں کے خواب ہوتے ہیں، جن کے سہارے لوگ زندگیاں بسر کرتے ہیں۔ اسد کو اپنے خواب پہ یقین تھا۔

اسد اپنے چچا کے گھر منتقل ہو گیا۔ اُس کے چچا کو شہد وقوں سے رغبت نہ تھی، یہ اسد نے سُن رکھا تھا۔ اُس کے چچا شہر سے متصل ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ گاؤں میں اُن کی پچیس تیس ایکڑ کے لگ بھگ زرعی زمین تھی اور ایک کُھلا سادہ بہانی گھر تھا جس میں وہ اکیلے رہتے تھے۔ گھر میں انہوں نے ولایتی نسل کی دو گائیں اور سات بھیڑیں پال رکھی تھیں۔ اس کے علاوہ مرغیوں کا ایک ڈربہ، تین بلیاں اور دو کتے تھے۔ اُس کے چچا کا اپنا کوئی کُنبہ نہ تھا، گو اپنے باپ اور پھوپھی کی آپس کی باتوں سے اسد کو کچھ ایسا اندازہ تھا کہ اپنی نوجوانی کے دنوں میں اُس کے چچا کسی دُور دراز

ملک کو چلے گئے تھے جہاں انہوں نے شادی کر لی تھی اور شاید بچے بھی ہوئے تھے۔ پھوپھی ارما اُس کے باپ کی چھوٹی بہن تھیں جو شادی ہونے تک اُنہی کے پاس رہی تھیں۔ دونوں بہن بھائی اپنے دوسرے بھائی کا ذکر کرنے سے اکثر کتراتے تھے۔ کبھی اگر اتفاقاً اُس کا نام کہیں آجاتا تو کمال عجلت کے ساتھ ایک آدھ بات میں موضوع کو تمام کر دیا جاتا اور پھر دونوں پہ ایک مختصر سی خاموشی چھا جاتی، جیسے کسی خفیف سی حرکت پہ کوئی نادم ہو رہا ہو۔ اس قسم کے تاثر نے اسد کے دل میں چچا کی ایک مدھم سی، نیم مانوس شخصیت کی شکل پیدا کر دی تھی، جیسے کوئی مشہور شہر ہو جو دیدہ نہ ہو مگر سڑکوں اور عمارتوں کی بجائے قتل و غارت کی وجہ سے شنیدہ ہو۔ اسد کے ذہن میں چچا کی یہ شکل اُس وقت بھی قائم رہی جب اُس کے لڑکپن میں ہی چچا ریٹائر ہو کے آکر گاؤں میں رہنے لگے تھے اور مہینے دو مہینے میں پندرہ یا بیس یا پچیس منٹ کے لیے اپنے بھائی سے ملنے آجایا کرتے تھے اور اسد نے انہیں چھُپ چھُپا کر بھی دیکھ لیا تھا۔ بہر حال چچا جب دور دراز سے آئے تو اکیلے آئے اور اسد کو اس بات کا ہمیشہ شک رہا کہ وہ اُس کے بابا سے عمر میں درحقیقت بہت زیادہ بوڑھے ہیں۔

چنانچہ اب جب کہ اسد کے والد مر چکے تھے، وہ تیرہ سالہ بچہ اپنے چچا کے ساتھ اُن کے گھر آکر رہنے لگا۔ اُس کے چچا خاموش طبیعت آدمی تھے اور اپنی زمین پر ایک کسان کنبے سے کاشت کراتے تھے۔ اُسی کنبے کی عورتیں گھر کے جانوروں کی دیکھ بھال کا کام بھی کرتی تھیں۔ اسد کا نیا گھر بہت بڑے صحن اور تین بڑے بڑے کمروں والا تھا، اور چھت پر صرف ایک کمرہ تھا جس میں راتوں کو بچے کے سو جانے کے بعد، اُس کے چچا لیمپ کی روشنی میں ایک موٹی سی کالی جلد والی کاپی کھول کر بیٹھ جاتے اور وقفے وقفے پر، دیر تک اُس میں کچھ لکھتے رہتے۔ اس بات کا علم اسد کو اُس رات ہوا تھا جس رات اُسے نیند نہیں آرہی تھی۔ بعض راتوں کو اُسے دیر تک نیند نہ آتی تھی۔ اُس رات بہت گرمی تھی اور وہ صحن میں اپنے بستر پر آنکھیں میچے بے حرکت پڑا گئی چیزوں کو یاد کرتا رہا۔ اپنے گھر کو، بالائی منزل کی کھڑکیوں کو جن میں سے دُور تک شہر کے چوباروں کا نظارہ ہوتا تھا، اور دل ہی دل میں کچھ دیر تک وہ روتا بھی رہا۔ پھر اُس نے بستر کی چادر سے اپنا مُنہ خشک کیا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر آسمان کو دیکھنے لگا۔ اتنے میں بالائی کمرے سے اُس کو آہستہ آہستہ باتیں کرنے کی آوازیں سُنائی دینے لگیں۔ چچا کے پاس اس وقت کون آیا تھا؟ چچا سے ملنے تو کوئی بھی نہ آتا تھا، نہ دن کو نہ رات کو۔ چنانچہ وہ ہولے سے چارپائی سے اُترا اور دبے پاؤں سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اُوپر پہنچ کر کواڑ کی درز کے ساتھ آنکھ لگا کر دیکھا تو چچا کرسی پہ بیٹھے، اُس موٹی سی سیاہ جلد والی کاپی سے ہلکی آواز میں کچھ پڑھ رہے تھے۔ بیچ بیچ میں وہ ایک پنسل سے کاپی میں کچھ نشان بھی لگاتے جا رہے تھے۔ اسد کچھ دیر تک دروازے کی مختلف درزوں میں سے، جگہ بدل بدل کر اپنے چچا کو دیکھتا رہا، پھر واپس آکر بستر پہ لیٹ گیا۔ اس کے بعد کئی بار اُس نے اسی طرح چچا کو اُس کمرے میں راتوں رات لکھتے، دھیمی یا تیز آواز میں پڑھتے،

کرکے، پیچھے ہاتھ باندھ کر اِدھر اُدھر چکر لگاتے اور بڑبڑاتے ہوئے دیکھا اور پھونک پھونک کر اندھیرے میں قدم رکھتا ہوا نیچے اُتر آیا۔ ایک یا دو بار چچا کی غیر موجودگی میں اُس کمرے میں جاکر اُس نے وہ کاپی حاصل کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اُس کا مقصد یہ نہیں تھا کہ اُس میں سے پڑھ کر معلوم کرے کہ کیا لکھا ہے، بلکہ وہ صرف اُس کتاب نما کاپی کو ہاتھ میں لے کر دیکھنا چاہتا تھا۔ اُس نے کئی بار ایسا خیال بھی کیا تھا کہ وہ اُسی کرسی پر بیٹھا ہے اور کاپی کو دونوں ہاتھوں میں لے کر گود میں رکھے ہوئے ہے، اور نجانے کیا بُڑبڑاتا بھی جا رہا ہے۔ مگر چچا کی ڈیسک تمام تر مقفل رہتی تھی۔ ایک بار کالی کاپی کو حاصل کرنے میں ناکام رہ کر وہ پیٹھ کے پیچھے ہاتھ باندھ کر کمرے میں چکر لگاتا اور کچھ نہ کچھ بڑبڑاتا بھی رہا تھا۔ اُسے یاد نہیں رہا تھا کہ بڑبڑاتے ہوئے اُس نے کیا کہا تھا، مگر اتنا اُسے یاد تھا کہ یہ شاید اُس کا اپنے آپ کے ساتھ باتیں کرنے کا اولیں موقع تھا۔

اسد کے چچا نے اپنے بھائی کے مکان سے ایک شے بھی نہ اٹھائی جو کچھ تھا وہ پیٹیوں، صندوقوں، بکسوں اور کھوکھوں میں اچھی طرح بند کرنے کے بعد ترتیب سے ایک دوسرے کے اوپر رکھ دیا۔ اسد نے اپنی چند چیزیں —— کپڑے، کتابیں، بنٹے، گھاس کے طوطے والی شیشی وغیرہ —— ایک بکس اور دو تھیلوں میں ڈالیں اور سامان مزارعے کے لڑکے کو، جو چچا کے ہمراہ آیا تھا، پکڑا دیا۔ پھر وہ باہر گلی میں آکر کھڑا ہو گیا۔ شام کا وقت تھا اور گھر کے اندر ایک ایک کرکے کواڑوں کے بند ہونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ تیرہ سالہ اسد نے ایک نظر اٹھا کر آسمان پہ ڈالی، اور اُسی لمحے، جیسے کسی اشارے پر، ایک کنڈی چڑھنے کی آواز کے ساتھ ایک ستارہ آسمان پہ نمودار ہوا۔ بچے کے دل میں ایک عجیب سی خاموشی تھی۔ جیسے شام کا وقت ہو، اور بچپن کی اُس حالت میں اسد نے سوچا کہ وہ تین ہی میل پرے ہی تو جا رہا ہے، جب چاہے واپس آسکتا ہے، رہنے کے لیے نہ سہی کھیلنے کے لیے ہی، اور چاہے تو ہر روز آسکتا ہے۔ مگر اُس وقت اُسے اِن باتوں کا اندازہ نہ تھا۔ چنانچہ ایسا نہ ہوا، اور ایک عرصے تک نہ ہوا۔ آخر تنگ آکر اُس نے گھر کا خیال ہی دل سے نکال دیا۔ شام کا وقت اگرچہ اب بھی اسد کے لیے ایک پُرخطر وقت تھا۔ اب بھی کبھی کبھار کسی گلی یا محلّے سے گزرتے ہوئے، کسی مکان کے اندر سے کواڑ کے بند ہونے کی ایک مخصوص آواز آتی تو وہ چونک اُٹھتا اور اُس کی نگاہ بے اختیار آسمان پہ ایک ستارے کی طرف جاتی۔ لوگ غلط ہی کہتے ہیں، اُس نے بارہا سوچا تھا، کہ جب چاہیں گھر کو لوٹ کر جا سکتے ہیں۔ گاؤں والے گھر کے کوٹھے کی دیواریں بھی نہ تھیں اور نہ کھڑکیاں جن کے بیچ سے شہر کے چوباروں کی ایک تصویر نظر آتی تھی۔ یہاں ننگی چھت تھی اور کاپی والے کمرے کے صرف روشندان تھے۔ چھت پہ اسد گھوم پھر کر سارے آسمان اور ساری زمین کو دیکھ سکتا تھا۔ کوٹھے پر سے کھیتوں اور فصلوں اور پیڑوں کا یکساں منظر اسد کو پہلے پہل بہت خوشنما لگا۔ فصلوں کی بیائی اور کٹائی کے موقعوں پر اُوپر بہت ننھی ننھی سیاہ اور تیز رفتار چڑیوں کے ڈاریوں پھیلتے اور سکڑتے ہوئے گزرتے جیسے آسمان پہ کوئی جال کھینچ رہا ہو۔ اُس کے چچا کے گھر میں کوئی بندوق نہ تھی، اور ایک بار باتوں باتوں میں انہوں نے ذکر بھی کیا تھا کہ وہ ہتھیاروں کو

ناپسند کرتے ہیں ۔ گو جس طور پر انہوں نے اسد کے والد کی دو بندوقیں مال خانے میں جمع کرانے سے پہلے توڑیں ، اُن میں تیل ڈالا ، کندھے اور گال سے لگا کر اُن کی نالیوں کا معائنہ کیا ، اُس سے اسد کو یہ پتا چلا کہ ایک زمانے میں اُس کے چچا نے بندوقوں سے کھلونوں کی طرح کھیلنا سیکھا ہوگا ۔ لیکن اب اُن کے پاس کوئی بندوق نہ تھی ، اور یہ گویا اسد کے مختصر شکاری دَور کا خاتمہ تھا ۔ اس کے بعد وہ کبھی شکار کو نہ گیا ۔

مگر شیر ——— کُنڈی والے ستارے کی مانند ——— اُس بچے کے اندر جُوں کا تُوں محفوظ رہا ۔ پہلے پہل اُسے اُس شیر کو شکار کرنے کا خیال کبھی نہ آیا ۔ وہ بس اُس کی شکل کو اپنے اندر پا کر ہی خوش خوش پھرتا رہا ۔ یہ شکل دھاری دار بلی کے قدبت سے شروع ہوئی اور وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی ۔ پھر ایک وقت آیا کہ یہ شبیہہ ایک سے دو اور دو سے چار ہو گئی ۔ اب اُس کے اندر جدھر نظر اُٹھاؤ ایک شیر کھڑا تھا ، مگر ہمیشہ ایک ہی صورت میں ——— لمبے اور سڈول جسم والا ، ریشمی جلد اور گچھے دار پونچھ والا ، اور بجلی کی سی سُرعت والا ، گو ہمیشہ ساکت کھڑا ہوا ملتا ، مگر بجلی کی سی سُرعت والا ——— یُوں کہ جیسے اُس کے اندر چاروں طرف شیشے لگے ہوں اور ایک شیر کی شکل کئی شیروں میں بدل گئی ہو ۔ کئی بار اسد اس خیال سے پریشان ہو جاتا کہ کسی نہ کسی روز یہ شیر اپنے گدے دار پاؤں پر آہستگی سے چلتا ہُوا باہر اُس کے سامنے آ کھڑا ہوگا ، یا ایک بے آواز چھلانگ لگا کر کسی طرف کو چلا جائے گا اور اُس کا سینہ ویران ہو جائے گا ۔

پھر کب اور کیسے اُس کے دل میں اُس شیر کو شکار کرنے کی خواہش پیدا ہُوئی ؟ اس وقت موسمِ بہار کی اس دوپہر کو ، پہاڑ کی پشت پہ واقع مسافری کے اس مقام پر بیٹھے اپنی روز مرہ کی مشقت میں مصروف لمبی لمبی باتوں کو یاد کرتے ہوئے ، اسد کے ذہن میں بڑی دُور کا ایک واقعہ آیا ۔ وہ اُس وقت دس برس کا تھا ، اور سردیوں کے دن تھے ۔

دس سالہ بچہ مٹی کے ایک چھوٹے سے ٹیلے پر کھڑا تھا ۔ نیچے اُس کا باپ ٹیلے کی دیوار کے سہارے زمین پہ نیم دراز ، ہاتھ سر کے پیچھے باندھے ، ڈوبتے ہُوئے سُورج کو دیکھ رہا تھا ۔ پاس ہی اُس کا شکار والا تھیلا پڑا تھا ۔ دائیں جانب سیم تھی ، جہاں ہر دن ڈھلے مرغابیاں آ کر اُترتی تھیں ۔ بائیں ہاتھ کو کماد کی فصل کھڑی تھی ۔ سیم کے ساتھ ملتی ہُوئی ڈھیلی زمین میں گھٹنوں گھٹنوں تک ادھ مری سی فصل تھی ۔ دُور کی زمین میں گنے سر سے بھی ایک ایک ہاتھ اُوپر کو نکلتے تھے ۔ اس وقت ٹیلے کے اُوپر چڑھ کر کھڑے ہُوئے اس بچے پر مُرغابی کی موت کے اثرات ختم ہوتے جا رہے تھے اور وہ کم و بیش دلجمعی کے ساتھ اُس کے بارے میں سوچ سکتا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

سُورج ڈھل رہا تھا جس وقت وہ اپنے ابّا کے پہلو میں سیم کے کنارے پر گھاس کی آڑ لیے کھڑا تھا ۔ وہ مرغابیوں کا انتظار کر رہے تھے ۔ دو نیل مرغابیاں کہیں سے اُڑتی ہوئی آئیں اور عین اُن کے سر پہ پہنچ کر نمودار ہوئیں ۔ ان دونوں کو اُس وقت تک مُرغابیوں کا پتہ نہ چلا جب تک کہ نیل کی پرواز کی مخصوص سرسراہٹ نشان دہی کر کے اُن کے سروں پر

سے گزر نہ گئی۔ بابا نے بندوق کندھے تک اٹھائی، مگر اتنے میں پرندے مار سے باہر جا چکے تھے۔ دونوں مرغابیوں نے ہوا میں معمولی سا غوطہ لگایا، چند سیکنڈ کے لیے پر پھیلائے اور پاؤں ڈھلکا دیے، پھر رخ اوپر کی طرف کر لیا۔ اب اس جوڑے نے آسمان پہ دھوپ کی روشنی میں ایک لمبی سی کمان کی شکل میں اڑان کی اور سورج کی چمک میں غائب ہو گئیں۔ بابا کی داڑھیں گھاس کے ایک تنکے کو چبانے اور نظریں سورج میں غائب ہونے والے پرندوں کا تعاقب کرنے میں لگی رہیں۔

"پھر آئیں گی۔" انہوں نے کہا۔

اب کی بار گو مرغابیاں اسی تیزی سے اُن کے عقب میں ظاہر ہوئیں مگر باپ بیٹا بے دھیان نہ تھے۔ اسد کے باپ کی بے پناہ پھرتیلی، خودکار حرکت، جس سے ایک ہی لمحے میں دستہ کندھے سے، گال نالی سے اور نالی کی مکھی آنکھ اور پرندے کی سیدھ میں آجاتی تھی، عمل میں آئی اور یکے بعد دیگرے دو فائر سن سن کرتے ہوئے جیسے اسد کے کانوں کے پاس سے گزر گئے۔ تقریباً اسی لحظے میں اسد نے نظر آسمان پہ ڈالی اور اس نے ایک عجیب منظر دیکھا۔ اس نے دونوں پرندوں کو اس ایک لحظے میں آسمان پر جیسے اٹکے ہوئے دیکھا جب کہ دھوپ سیدھی اُن کے سینوں پر پڑ رہی تھی اور اسد کی آنکھ میں اس وقت بینائی کی ایک تیز شعاع پیدا ہوئی جس میں اس نے اُن کے سینوں کے ننھے ننھے تیز رنگ پروں کو صاف صاف اور الگ الگ، ایک کے ساتھ ایک کر ملے ہوئے دیکھا، یوں جیسے وہ بہت قریب سے بیٹھ کر انہیں اطمینان سے دیکھ رہا ہو حالانکہ یہ جھلک ایک لحظے سے بھی کم مدت کی تھی۔

فائروں کی آواز سے مرغابیوں کی اڑان میں ایک خفیف سی پھرپھراہٹ پیدا ہوئی، مگر وہ اسی رفتار سے سیدھی آسمان پہ نکلتی گئیں۔ اسد نے کچھ دیر حیرت زدہ نظروں سے اُن کا تعاقب کیا، پھر بے یقینی سے اپنے باپ کو دیکھا۔ اب اس جوان شخص کے حلیے میں ایک ایسی تبدیلی آچکی تھی جس سے اس کا بیٹا بخوبی واقف تھا۔ اس کے ہاتھ اس سختی سے بندوق کے گرد لپٹے ہوئے تھے کہ انگلیوں کے جوڑ سفید ہو چکے تھے۔ اس کا سارا بدن تشنج کی حالت میں تھا اور چہرہ کنپٹیوں سے لے کر نکیلے جبڑے اور گردن تک جھریوں بھری ابھری ہوئی پچھلیوں اور تنی ہوئی رگوں کی صورت منجمند تھا۔ اور پھر اس کی آنکھیں تھیں — جن میں ایک عجیب سے غصے اور مسرت اور حرص کی کوند تھی اور جن میں پوشیدہ بجلی کی سرعت پرندوں کا پیچھا کر رہی تھی۔ ایسے وقت میں اسد کو یوں لگتا تھا کہ جیسے یہ نیم اجنبی آدمی جو اس کا باپ تھا ابھی دیکھتے ہی دیکھتے، بھاگے دوڑے بغیر اپنے پاؤں پہ کھڑا کھڑا ایک مہیب جست بھرے گا اور ہوا میں پرندوں کو دبوچ لے گا۔ اس کے باپ کے منہ سے ایک گالی نکلی۔ "پھٹّر ہے۔" وہ بولا۔

اسی وقت اسد نے دیکھا کہ ہوا میں ایک وسیع محراب کاٹتے ہوئے اچانک بائیں ہاتھ والی مرغابی کی اڑان

میں ایک بے معلوم سی لڑکھڑاہٹ پیدا ہوئی اور وہ پیچھے رہنے لگی۔ اس کے پروں کی رفتار بڑھ گئی مگر اُن میں ہوا نہ رہی، دیکھتے ہی دیکھتے پرواز کی کمان ٹوٹ گئی۔ مُرغابی تیزی سے نیچے گرنے لگی۔

اسد کو کسی اشارے کی ضرورت نہ تھی۔ وہ اپنی جگہ سے اُچھلا اور بھاگ کھڑا ہوا۔ ابھی وہ چند قدم ہی گیا ہوگا کہ پیچھے سے اُس کے باپ کی غصیلی آواز اُس کے کان میں پڑی "دوڑو۔" اور اسد کو یاد آیا کہ بابا اُس کے باپ نے اُسے تنبیہ کی تھی کہ وہ ٹھوڑی اُٹھا کر دوڑا کرے، کہ یہی اصل طریقہ دوڑنے کا تھا۔ پتا نہیں اس میں کہاں تک سچائی تھی؟ مگر اپنے باپ کی آواز کے ساتھ ہی اس نے سر چھاتی سے اُٹھایا اور بھاگنے لگا۔ آدھے رستے جا کر جب مُرغابی پہ اس کی نظر پڑی تو اس کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ مُرغابی سیم کے پانی سے چند قدم اِدھر گری تھی اور پانی تک پہنچنے کے لیے بُری طرح پھڑپھڑا رہی تھی۔ اسد نے کئی مرغابیاں اسی طرح ہاتھ سے کھوئی تھیں۔ سیم کا پانی مرغابی کا قلعہ ہوتا ہے، اُس کے پر توڑ کر سیم کے پانی میں چھوڑ دو اور وہ کہیں سے کہیں نکل جائے گی، یا پھر کسی سرکنڈے کی جڑوں میں ڈوبی پتا سی چونچ سانس کے لیے پانی سے نکالے گھنٹوں دم سادھے بیٹھی رہے گی اور معدوم ہو جائے گی۔ آپ کمر کمر پانی میں اُتر جائیں، پھونک پھونک کر قدم کیچڑ میں رکھیں تا کہ شور نہ ہو، لہریں نہ بنیں، اور غڑاپ سے پانی پر گر کر اُس چونچ پر جھپٹیں اور اُس کو مضبوطی سے مٹھی میں داب لیں۔ مگر جب کیچڑی کیچڑی ہوئی حالت میں اپنے قدموں پہ سنبھلیں تو پتا چلے کہ مٹھی میں تو سرکنڈے کا لمبا سا پتا ہی آیا ہے جسے چونچ سمجھ بیٹھے تھے۔ مُرغابی کو کھو دینے کے خوف سے اسد نے اپنی ٹھوڑی پھر چھاتی سے لگائی اور باقی ماندہ قوت کو بھی اپنی ایڑیوں، گھٹنوں، کولھوں اور کندھوں میں سے نکال کر بے دریغ بھاگنا شروع کر دیا۔ اُس کے باپ کی مستقل غراہٹ ("دوڑو۔ دوڑو۔") اس کی پیٹھ پر جیسے کوڑے لگا رہی تھی اور وہ چھوٹے چھوٹے کنّوں اور کھیتوں کی بنّیوں کو ٹاپتا، گڑھوں کو پھلانگتا اور چیونٹیوں کے گھروں کو روندتا ہوا بے اختیار و قدرت بھاگا جا رہا تھا، جیسے کہ وہ شکاری نہیں بلکہ خود کوئی شکار ہو۔ سیم کے کنارے پہ پہنچ کر اُس نے ایک آخری چھلانگ لگائی اور پیٹ کے بل مُرغابی کے اُوپر جا گرا اور ٹخنوں ٹخنوں پانی میں لڑھکتا چلا گیا۔ جب وہ اُٹھا تو اُس کا تین چوتھائی جسم سیم کے سیاہ کیچڑ میں لتھڑا ہوا تھا، مگر مُرغابی اُس کے سینے کے ساتھ محفوظ تھی۔

"دیکھو، بابا۔ یہ دیکھو۔" کچھ دیر بعد وہ اپنے باپ کے پاس کھڑا اُس کو مُرغابی کا معمولی سا زخمی پر دکھا رہا تھا۔

"یہ دیکھو، بس ایک چھرا لگا ہے۔ ہڈی بھی نہیں ٹوٹی بابا۔"

"بیٹے، یہ زخمی ہے۔ اِدھر لے کے آؤ۔"

"کچھ بھی تو نہیں ہوا، بابا۔ اِس کو دھو کر اُوپر گندھک کی مرہم لگا دیں گے، بالکل ٹھیک ہو جائے گی۔"

"بیٹے، میں نے کہا نا کہ زخمی پرندہ ہے۔ مر جائے گا۔"

"پر زخم تو کوئی بھی نہیں، بابا، ایک دو دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔"

"یہ گھر پہ نہیں رہ سکے گی۔" اُس کے باپ نے سمجھایا۔

"کیوں نہیں رہے گی؟" وہ بولا، "زخم تو بھر جائے گا۔"

"یہ کھائے گی کچھ نہیں۔" اُس کے باپ نے صبر سے کہا، "تمہارے ہاتھ سے ایک دانہ بھی نہیں کھائے گی۔ آخر جان دے دے گی۔ کیا فائدہ؟"

"کیوں نہیں کھائے گی؟"

"بس اس کی خصلت۔ آزاد پرندہ ہے، قید میں زندہ نہیں بچتا۔ بطخوں کی خصلت اور ہوتی ہے، اس کی اور۔"

"مگر، بابا ——" بچے نے منت کی، "یہ تو ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"خواہ مخواہ ضد مت کرو۔" اس کے باپ نے سختی سے کہا، "کیا ظلم کر کے اسے مارو گے؟ شکار کے کچھ اصول ہوتے ہیں۔ ادھر لاؤ۔"

اُس نے ایک نظر پرندے کے گول گداز سینے کے پروں پر ڈالی، اور اُس کی گول چمکتی ہوئی آنکھوں پر جن سے وہ کسی اور طرف کو دیکھ رہا تھا، جیسے کہ لاتعلق ہو اور ٹھیک ٹھاک ہو۔ پھر اسد نے، بجائے اس کے کہ پروں کو سمیٹ کر اپنے باپ کے پیر کے نیچے دیتا جیسا کہ ذبح کرنے کا طریقہ تھا، ہاتھ بڑھا کر اُسے اپنے باپ کے حوالے کیا اور مُنہ موڑ کر چلا آیا۔

کچھ دیر کے بعد ایک کنوئیں پر پہنچ کر اُس کے باپ نے پانی نکالا اور اسد نے بیٹھ کر اپنے بُوٹ، جرابیں، نیکر، قمیض، پھر ٹانگیں اور بازو دھوئے۔ کنوئیں سے واپسی پر اُس کے باپ نے اس چھوٹے سے ٹیلے پر پڑتی ہوئی دھوپ کو دیکھا اور سستانے کے لیے وہاں بیٹھ گیا۔ اسد نے اپنی قمیض اور جرابیں سوکھنے کے لیے ایک جھاڑی پر پھیلا دیں اور اپنے باپ کی ٹانگوں کے سہارے زمین پر آ بیٹھا۔ کافی دیر تک وہ وہیں بیٹھا انگلی سے زمین پر پاکستان کا نقشہ بناتا رہا۔ اُس کے دل میں کوئی بات ہی نہ آ رہی تھی۔ سُورج کی شعاع مسلسل اُس کی آنکھوں کے سامنے گول گداز سینے اور چاقو کے پھل پر چمک رہی تھی۔ اُس نے کئی مرغابیوں کو بندوق سے گرتے اور ذبح ہوتے ہوئے دیکھا تھا، مگر وہ زخمی اور لہولہان ہوتی تھیں۔ اُن میں ایک بھی ایسی نہ تھی جو دلچسپی سے کسی اور ہی طرف کو دیکھ رہی ہو اور بالکل ٹھیک ٹھاک ہو۔ بچے کا دل تھوڑی دیر کے لیے سُن ہو گیا تھا۔

"بابا،" پھر وہ بولا، "آپ نے کتنی مُرغابیاں ماری ہیں؟"

" بہت ۔" اُس کے باپ نے جواب دیا ۔

" بہت کتنی ؟"

" ان گنت ، بیٹے ۔"

" اور مگھ ؟"

" مگھ بھی بہت ۔"

" اور تیتر ، بٹیر ، کبوتر ؟"

" کبھی گنے ہی نہیں ۔"

" اور ہرن بھی ، بابا ؟"

" ہاں ۔ چیتل سے لے کر بڑے کالے ہرن تک سب ۔ اور نیل گائے ، اور جنگلی سُور ۔ شکار کی میرے دل میں اب کوئی حسرت نہیں ۔" اُس کے باپ نے کہا ، " سوائے ایک کے ۔"

" سوائے کس کے ، بابا ؟"

" سوائے بڑے شکار کے ۔"

" شیر کا شکار ؟"

" ہاں ، شیر ، چیتا ۔"

" اسد باپ کی ٹانگوں پر سے اُٹھ کر اپنے پیروں کے بل بیٹھ گیا ۔ کچھ دیر تک وہ پھر زمین پر لکیریں ڈالتا اور مٹاتا رہا ۔

" شیر کا شکار بہت مشکل ہوتا ہے ، بابا ؟" پھر اُس نے پوچھا ۔

" مشکل تو نہیں ، خطرناک ضرور ہوتا ہے ۔"

" مشکل نہیں تو پھر آپ نے کیوں نہیں کیا ، بابا ؟"

" کبھی اتفاق ہی نہیں ہوا ۔"

کچھ دیر کے لیے بچہ پھر مخمصے میں پڑ گیا ۔

" بابا ،" پھر اُس نے سر اُٹھا کر پوچھا ، " اتفاق کیا ہوتا ہے ؟"

" اتفاق ؟" اس کے باپ نے ایک لمبی سی ، مدھم سی " ہوں " کی آواز نکالی ، جیسے جواب سوچ رہا ہو ۔ " ایک ایسی چیز ہے جو ہمارے اختیار میں نہیں ہوتی ۔"

" اتفاق مشکل ہوتا ہے، بابا؟"

اُس کے باپ نے اگلے دو دانتوں پہ انگلیوں کے ناخن بجانا شروع کیے۔ "مشکل بھی ہوتا ہے۔" اُس نے سوچ کر جواب دیا، "ایک طرح سے آسان بھی ہوتا ہے۔"

" مشکل اور آسان دونوں کیسے ہوتا ہے؟"

" بعض باتیں ایسی ہیں، بیٹا، جو میں تمہیں سکھا پڑھا نہیں سکتا۔" اُس کے باپ نے بے صبری سے جواب دیا، "تم خود ہی سیکھ جاؤ گے۔"

"کب؟"

" وقت کے ساتھ۔"

پھر اُس کے باپ نے ہاتھ سر کے پیچھے باندھ لیے اور ڈوبتے ہوئے سورج کے مقابل اپنی آنکھیں موند لیں، جیسے کہہ رہا ہو کہ بات ختم ہو گئی، اب آرام کرنے دو۔ اسد کچھ دیر اُسی طرح بیٹھا اِدھر اُدھر دیکھتا رہا جیسے کسی بات کا انتظار کر رہا ہو، حتیٰ کہ اُس کے ٹخنوں میں ہولے ہولے درد ہونے لگا اور وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُسے سردی لگ رہی تھی۔ اُس نے اپنے ننگے بدن پر باپ کی سویٹر کو اچھی طرح سے لپیٹ لیا۔ اُس وقت اس کے باپ کے چہرے پہ ایک عجیب بے رنگی تھی، اور وہیں کھڑا کھڑا وہ اپنے باپ کی بھاری اور مدھم آواز کو، جو یکدم پھیکی پڑ گئی تھی، اپنے ذہن میں گونجتے ہوئے سُنتا رہا۔ وقت کے ساتھ، اُس نے دل میں دُہرایا، پھر حیران ہوا۔ وقت کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟ یہ شاید پہلی بار تھی کہ بابا اُس کو کسی بات کا جواب دینے سے قاصر رہے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اُن کے پاس بیٹھ کر، اُن کے سر کو اپنے بازوؤں میں لے کر اپنے ساتھ لگا لے۔ مگر ابھی اُس کا دل خاموش تھا۔

" مَیں اس پہ چڑھوں، بابا؟" اُس نے پوچھا۔

" احتیاط سے، بیٹا۔" اُس کے باپ نے آنکھیں کھولے بغیر جواب دیا، "مٹی نرم ہے۔"

آہستہ آہستہ، احتیاط کے ساتھ ایک ایک قدم رکھتا، ہاتھوں سے مٹی کو پکڑتا ہوا وہ ٹیلے پر چڑھنے لگا۔ چوٹی پر پہنچ کر وہ کتنی ہی دیر تک اِدھر اُدھر دیکھتا رہا —— ارد گرد کے کھیتوں کو، نیچے اپنے باپ کو۔ پھر بندوق کے پاس پڑے ہوئے تھیلے کو ایک اچنبھے کے ساتھ دیکھ کر اُس نے سوچا کہ تھیلے میں شکار کی ہوئی مرغابی ہی تو ہے۔ زیاں کا احساس اب اُس کے سر سے اُتر چکا تھا اور اس کا دِل اب کھُلنے لگا تھا۔ اس نے فخر سے سینہ پھُلا پھُلا کر سانس لینے شروع کیے، حتیٰ کہ سورج غروب ہو گیا اور مشرق کی جانب سے دسمبر کی یخ ہوا چلنے لگی۔ نیچے اُس کا باپ جانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔

"چلو اب چلیں۔" اُس کے باپ نے کہا، اور نیچے اُترنے سے پہلے، اُس شام کو، بچے نے ٹیلے کے اُوپر کھڑے کھڑے اپنے دل میں کہا کہ ایک نہ ایک دن، وہ کسی جنگل میں جا کر کسی شیر کا شکار کرے گا۔

آج اتنے سالوں میں پہلی بار یہ واقعہ اسد کو یاد آیا، اور اُس نے سوچا کہ اُس کی دیرینہ خواہش کو، حالیہ سفر کو، اور اِس وادی میں کہیں سے آنکلے ہوئے ایک شیر کو ملانے میں اس واقعے کا عجیب اتفاق ہے، اور ایسا آسان، جیسے راستے میں دھرا ہو۔

(۲)

طویل اور روشن یاد کے عود کر آنے کا وہ دن تھا۔ اپنا دستے والا ہاتھ روک کر اسد نے وادی میں نگاہ دوڑائی۔ سامنے والے پہاڑ کی کمر میں سانپ کی طرح بل کھاتا ہوا تنگ راستہ تھا جس پر دُور سے اُس کو بھورے رنگ کی ایک متحرک زنجیر نظر آئی۔ یہ چند فوجی تھے جو سنگل فائل میں چلے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی وقت اُن میں سے کسی ایک کا کوئی ہتھیار سُورج کے سامنے آجاتا تو دھوپ کی آہنی شعاع دُور، دُور تک اُچھل جاتی۔ اسد مُنہ جوڑ کر چنار کی گہری ٹہنیوں میں دیکھنے لگا۔ شاخوں میں ہوا ایسی حلاوت سے اُٹھ رہی تھی جیسے پانی زمین سے اُبل کر نکلتا ہے۔ اُس اندھیرے میں اسد کو اپنے باپ کا چہرہ نظر آیا۔ اُس کے ساتھ ہی ایک مانوس مگر ناواقف چہرہ اور تھا، جو شاید اُس کی ماں کا تھا۔ وہ اپنی ماں کی صُورت سے آشنا نہ رہا تھا، چنانچہ جگہ بہ جگہ ناواقف چہرے اُس کی نظر کا پیچھا کرتے رہتے تھے۔ چناروں کی چھاؤں میں چار دیہاتی بیٹھے مختلف دوائیاں رگڑ رہے تھے۔ چند ماہ پیشتر، اسد نے سوچا، مَیں کہاں تھا؟ آج یہ میرے ہمراہی ہیں۔ اُس کا دل بے معلوم طور پہ نرم پڑ گیا تھا، اور اُس کی سوچ، حسبِ عادت، ایک انجانی طرف کو چل نکلی تھی۔ جذبے اور اتفاق کا باہم رشتہ بھی کیسا انوکھا ہے، اُس نے سوچا۔ جذبے کا وقت مشکل بھی آتا ہے اور آسان بھی، اور ایسے بھی

لوگ ہیں جن پہ یہ آتا ہی نہیں ، جیسے یہ کسان ، جو اپنی محنت کے ساپنچے کو ہی توڑ نہیں پاتے ۔ اسد اگر پیچھے اپنے بچپن کی طرف سوچنا شروع کرتا تو جذبات کی عمر وہ مختصر سا عرصہ قرار پاتی جو اُس ٹھیک ٹھاک مرغابی کے شکار کی شام ، اور گھر کے اندر کواڑوں کے بند ہونے کی آوازوں والی شام کے درمیان پڑتا تھا ۔ اگر وہ خیال کرے ، اسد اکثر سوچتا ، تو اُس کے جذبے کی عمر کا بیشتر حصہ تو اُسی شام کو منتقل ہو گیا تھا جب کہ وہ گداز اور روشن سینہ آسمان سے اُس کی گود میں آکر ذبح ہوا تھا ۔ مگر آج اپنی عمر کی اس گنجلک منزل پہ پہنچ کر بھی اُس نے سوچا ، گئے گزرے ہوئے لوگوں کے چہرے مٹ نہیں پائے ، اور کبھی پہاڑ کے پتھروں میں اور کبھی درختوں میں نمودار ہوتے رہتے ہیں ۔ یہ کیسا اتفاق ہے ؟

ولی ، جو گاؤں کا چوکیدار تھا ، اپنی جگہ سے اُٹھ کر اسد کے پاس آ بیٹھا ۔

" تم نے واقعی اُسے دیکھا ہے ؟ " اسد نے تیسری بار ولی سے پوچھا ، " اپنی آنکھوں سے ؟ "

" ہاں تو کیا تمہاری آنکھوں سے ؟ " ولی نے آنکھیں نکال کر جواب دیا ۔

" جھوٹ بول رہے ہو ۔ "

" جھوٹ ! ان دو آنکھوں نے —— " ولی دونوں ہاتھوں سے اپنی آنکھوں کو بار بار چھونے لگا ،

" ان آنکھوں نے دیکھا ہے ۔ یہ جیسے تم یہاں بیٹھے ہو ، یہاں ، " اُس نے بازو ہوا میں لمبا کیا ، " یہاں تین ہاتھ کے فاصلے پر ، بیس کی گنتی تک کھڑا وہ مجھے دیکھتا رہا ۔ "

" شروع سے بتاؤ ۔ "

" جب میں آواز لگاتا ہوا عالم کے باڑے تک پہنچا " ولی نے اپنی کہانی دہرانی شروع کی ، " تو اندر میں نے جانوروں کی بھگدڑ کی آواز سُنی ۔ میں نے سوچا ضرور کوئی بات ہے ۔ جیسے ہی باڑے کی دیوار کے ساتھ ساتھ مُڑ کر اُدھر نکلا تو دیکھتا ہوں کہ رحمت کی مکئی کے برابر وہ کھڑا ہے ، اور کھڑا باڑے کی دیوار کو تاک رہا ہے ، جیسے وہیں سے چھلانگ لگا کر اسے پار کر جائے گا ۔ پھر اُسی طرح اُس نے سر میری طرف موڑا اور مجھے دیکھنے لگا ، جیسے اُسے کوئی ڈر خوف نہ ہو ۔ "

" ڈر خوف تم سے ؟ ہاہا ۔ " چنار کے نیچے بیٹھے ہوئے میر حسن نے قہقہہ لگایا ۔

" اُس کی شکل کیسی تھی ؟ "

" پونچھ سمیت کوئی دس بیس ہاتھ لمبا ہو گا ۔ مجھے ٹھیک اندازہ نہیں ، میری سیدھ میں کھڑا تھا ۔ مجھے تو اُس کا سر یاد ہے ، بڑے بڑے انگاروں جیسی آنکھیں ۔ اُس کا ماتھا کوئی تین چار گٹھ کا ہو گا ۔ شیر کا ماتھا دیکھنے کی چیز ہے ، میدان کا میدان اور آگ سے بھری ہوئی آنکھیں ۔ "

" باقی جسم اُس کا کیسا تھا ؟ "

"کمخواب کی طرح چمکتی ہوئی کھال اور لمبی لمبی دھاریاں ۔۔"

"جھوٹ ۔" اسد بولا ۔ "باگھ کے تو چیتا نشے ہوتے ہیں ۔"

"باگھ کی بات کون کر رہا ہے ۔ باگھ جیسے میں نے دیکھا نہیں ہے، ان ہاتھوں سے۔" ولی نے دونوں ہاتھ اکٹھا کر اسد کو دکھائے، پھر ایک ہاتھ سینے پر مار کر بولا، "خالی ان ہاتھوں سے ولی نے باگھ مارا ہے۔ چیل والی پہاڑی سے جب میں لوٹ رہا تھا۔"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے ۔" اسد نے بے صبری سے ٹوکا ۔

"تو جناب یہ باگھ کی بات نہیں ہو رہی ۔ باگھ تو اس کے سامنے بچہ ہے ۔ بزدل جانور ہے ۔ ایک بار میں نے باگھ کو للکارا تو بلی کی طرح بھاگ گیا ۔ یہ شیر ہے شیر۔ جب میں نے شور مچایا تو آرام سے کھڑا مجھے گھورتا رہا ۔ پھر آرام سے مڑ کر چلا گیا، جیسے اس کو میری کوئی پروا نہ ہو ۔"

ولی نے دریا دلی سے اسد کے ہاتھ سے اس کا حمام دستہ لیا اور اسے اپنی ٹانگوں کے بیچ رکھ کر پیسنے لگا ۔ ولی دستے کو حمام کے اندر مخصوص چکروں میں چلاتا تھا، سات بار دائیں اور نو بار بائیں ۔ اسد نے کئی بار گنا تھا، مگر ان چکروں کی تعداد نہ کبھی کم ہوئی تھی نہ زیادہ، ہمیشہ ایک سی رہی تھی، گو اسے یقین تھا کہ ولی نے خود اپنے ہاتھ کے یہ چکر کبھی گنے نہ تھے ۔ بس اس کی عادت پکی ہو چکی تھی ۔

"اپنا کام ختم کر لیا ؟" اسد نے پوچھا ۔

"کیا فرق پڑتا ہے ؟" ولی نے مطب پر ایک نفرت بھری نگاہ ڈال کر کہا ۔ "میرا ہو یا تمہارا، کبھی ختم ہوا ہے ؟"

"تعجب ہے ۔" کچھ دیر کے بعد اسد دور جنگل میں دیکھتے ہوئے بولا ۔ "یہ آیا کہاں سے ؟"

"اوپر سے ۔"

"اونہوں ۔" اسد نے نفی میں سر ہلایا، "کوئی ایک آدھ باگھ کبھی سردیوں میں نیچے اتر آئے تو ٹھیک ہے، ماننے والی بات ہے ۔ مگر یہ جانور تو یہاں پایا ہی نہیں جاتا ۔"

"کہاں پایا جاتا ہے ؟"

"جنوب میں کہیں ۔" اسد نے جواب دیا، "گرالیار ۔ بنگال ۔"

"کسی ایک جگہ سے اس کا تعلق تھوڑا ہے ۔ یہ تو بادشاہ ہے ۔"

"بادشاہت کی بھی حدیں ہوتی ہیں ۔"

" یہ ایک ہی پہاڑ ہے ، یہاں سے سمندر تک اور یہ تو ایک شکاری ہے ، دُور دُور تک گھومنے والا ہے۔ اسے کون روک سکتا ہے ؟"

" ان علاقوں میں یہ کبھی دیکھا ہی نہیں گیا ولی "، اسد نے کہا ، " فرض کرو اگر مان بھی لیا جائے ، تو یہاں گاؤں میں کیا کرنے آئے گا ؟"

" پیٹ بھرنے کے لیے تم نے اُس کی دہاڑ نہیں سُنی ؟"

" سُنی ہے ۔"

" ایسا سنائی دیتا ہے جیسے دروازے کے باہر کھڑا گرج رہا ہے ، حالانکہ دُور کہیں کستی میں ہوتا ہے۔ جب بھوکا ہوتا ہے تو زمین سے مُنہ لگا کر دہاڑتا ہے ، جس سے اُس کی گرج میلوں تک چلی جاتی ہے۔ جب پیٹ بھرا ہو تو اُوپر مُنہ اُٹھا کر غراتا ہے ۔"

" پھر تجھے اُس نے کھا کیوں نہیں لیا ؟" میر حسن نے آواز دے کر پوچھا ۔

" چرچر مت کر ۔ تیری تو ڈر سے ٹٹی نکل جاتی ۔ میں نے ایسے زور سے شور مچایا کہ وہ مُڑ کر غائب ہو گیا ۔"

ولی نے ہاتھ روکا اور بنیان اُٹھا کر کمر کے ساتھ بندھی ہوئی پوٹلی کو ٹٹولنے لگا ۔ تھوڑی دیر بے خیالی سے ٹٹولنے کے بعد اُس نے چکنے پھولدار کپڑے کی پوٹلی کو دانتوں کی مدد سے کھول کر اپنی گود میں رکھ لیا اور روٹی توڑ توڑ کر اچار کی پتلی سی پھانک کے ساتھ کھانے لگا ۔ وہ ہمیشہ روٹی کو نہایت انہماک کے ساتھ چبا چبا کر کھایا کرتا تھا ، جس سے اُس کی ایک آنکھ تقریباً بند ہو جاتی تھی ۔ اُس کی سیاہ بھینسے کی سی گردن سے طاقتور کندھوں کی ڈھلان شروع ہوتی تھی جو کھانا کھانے کے دوران پتھر کی طرح ساکت رہتی ۔ وہ ذیابیطس کا مریض تھا ۔

ولی نے کھانا ختم کیا تو روٹی کا ایک ٹکڑا اُس کے ہاتھ میں پڑا رہ گیا ۔ اُس نے وہ ٹکڑا ریزہ ریزہ کر کے چڑیوں کو ڈال دیا ۔ پھر وہ خاموشی سے دستے پر ہاتھ جما کر اُسے حمام کے اندر مخصوص چکروں میں پھیرنے لگا ۔ کچھ دیر کے بعد اس نے ہاتھ روک کر حمام کے اندر سے چٹکی بھر سفوف نکالا اور اُسے آنکھوں کے قریب لا کر دیکھا ، پھر انگلی اور انگوٹھے میں مَل کر اسد کی طرف بڑھایا ۔

" ایک گھنٹہ اور ۔" اسد نے دیکھ کر کہا ۔

ولی نے بُرا سا منہ بنایا اور دوبارہ دستے کو مضبوطی سے تھام کر دوائی پیسنا شروع کر دی ۔ اسد نے سفیدے کے تنے کے ساتھ کمر ٹیکی اور دونوں ہاتھ سر کے پیچھے باندھ کر دُور تک دھوپ میں ڈوبی ہوئی وادی میں نظر دوڑائی ۔ اس بات میں کوئی شک نہیں کہ شیر اُس کستی میں موجود تھا ۔ پچھلے دو ہفتوں میں برابر ، کبھی شام کے وقت اور کبھی رات

گئے ۔ اسد نے اُس کے دہاڑنے کی آواز سنی تھی۔ پچھلی شام تو وہ ایسے بول رہا تھا جیسے یہیں گاؤں کے کنارے پہ کھڑا ہو، حالانکہ نیچے کستی میں کسی جگہ پر تھا، یا اُوپر پہاڑ پر۔ گاؤں ایک مہیب پہاڑ پہ واقع تھا۔ پہاڑ کی دیوار کے تقریباً وسط میں، ایک تنگ سی ہموار جگہ سے اُٹھتا ہوا دو سو گز اُوپر تک چلا گیا تھا۔ گاؤں کے نچلے کنارے پر کھڑے ہوں تو پاؤں کے نیچے ہزار ڈیڑھ ہزار فٹ کی عمودی گہرائی تھی جو کستی میں جا کر ختم ہوتی تھی۔ پلٹ کے دیکھیں تو گاؤں کے عقب میں پہاڑ کی زمین آدھ پون میل تک اُوپر آسمان کی طرف اُٹھتی چلی جاتی تھی۔ مقابل کے پہاڑ سے، ایک سطح پہ دیکھیں تو پتھروں کے بنے ہوئے چوکور مکان چھوٹے چھوٹے ڈبوں کی مانند ایک دُوسرے کے اُوپر رکھے ہوئے نظر آتے تھے۔ ذرا نیچے اُتریں تو گاؤں نظروں سے اوجھل ہو جاتا تھا، صرف درختوں کے اُوپر اُوپر چیڑ اور گوبر کا دھوآں ہوا میں چلتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ یہ گاؤں تقریباً چاروں طرف سے جنگل میں گھرا تھا — اور وُہ اس جنگل میں کسی جگہ بھی ہو سکتا تھا، اُوپر کی طرف یا نیچے، یا آگے یا پیچھے، گو جس وقت وہ بولتا تھا تو ایسا لگتا تھا جیسے احاطے کے دروازے پر کھڑا ہے۔ اُس کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ اُس کا چہرہ بلند اور سینہ بڑا ہی عمیق اور زور آور رہو گا، اور اُس کی پُشت پر لمبی کالی دھاریاں بھی ہوں گی۔ ولی کی کہانی سے قطع نظر، اسد کو دل میں بہر طور اس بات کا یقین تھا کہ یہ کوئی عام خام باگھ نہیں بلکہ اصل شیر تھا، جو کسی نامعلوم مقام سے، کسی نہ کسی ذریعے سے یہاں تک آنکلا تھا، اور دل میں جانتا تھا کہ یہ اُس کی قبیل کا علاقہ نہیں اور نہ کبھی رہا ہے۔ شاید اسی لیے وہ اس طور سے دہاڑتا تھا۔

ولی کی اور سب باتیں تو ٹھیک ہیں، اسد سوچ رہا تھا، سوائے اس ایک بات کے، کہ وہ رات کو یہاں گاؤں تک آیا ہے۔ اسد کا دل اِس بات کو نہ مانتا تھا کہ وہ جس کا مہیب اور جلتی ہوئی آنکھوں والا چہرہ اور بجلی کی تاروں جیسے پٹھوں والا بدن تھا، جو ایک ہوا کی سی جست بھر کر جنگل کے ہر جانور کو پیچھے چھوڑ سکتا تھا اور ایک دہاڑ سے ان کی رفتار کو اپنے قابو میں کر سکتا تھا، وہ رسّے سے بندھے ہوئے چند پالتو جانوروں کی بُو پر رات کو گاؤں کی طرف آئے گا۔

وہ بھوک کے ہاتھوں لاچار نہیں تھا، نہ کبھی ہو سکتا تھا۔ وہ جو ایسے بولتا تھا تو اس لیے کہ اکیلا بھٹک کر اس اجنبی سرزمین پہ آنکلا تھا اور اب زمین پہ مُنہ رکھ کر گرجتا تھا کہ دُور و نزدیک اُس کی نسل کا شاید کوئی اور اُس کی آواز کو سُن لے اور اس کا جواب دے۔ یہ کہنا کہ وہ چوروں کی طرح رات کے اندھیرے میں چند ایسل مویشیوں کو چرانے یا انہیں ڈرانے کے لیے آئے گا، سراسر جھوٹ تھا۔ ولی ایک سُست الوجود شخص ہی نہیں، جھوٹا بھی تھا۔ سارا گاؤں جانتا تھا کہ جیسے ہی رات بھیگتی وہ آوازے لگانا چھوڑ کر جھٹ سے بیوہ کی کوٹھری میں جا گھستا تھا۔ یہ بیوہ کوئی عام بیوہ نہ تھی۔ گاؤں میں اور بھی بیوہ عورتیں موجود تھیں، مگر اُن کے اپنے اپنے نام تھے، یا وہ اپنے مرحوم خاوندوں کے ناموں سے پہچانی جاتی تھیں۔ اس بیوہ کا کوئی نام نہ تھا۔ وُہ صرف بیوہ کے نام سے مشہور تھی۔ یہ پچاس سالہ عورت

جو اسی گاؤں میں پیدا ہوئی اور کبھی یہاں سے باہر نہ نکلی تھی، اپنی عمر میں تین خاوندوں کی جان لے چکی تھی۔ ایک گاؤں کا موچی رہا تھا، دُوسرا کمہار، اور تیسرا ایک بدنصیب نوجوان جو کسی دُوسرے گاؤں سے کھیت مزدُوری کرنے آیا تھا اور بیوہ کے ساتھ شادی کے چند سال بعد ایک چٹان سے پھسل کر مر گیا تھا۔ پہلے دو مردوں سے بیوہ کے دو بیٹے ہوئے تھے جو اسی گاؤں میں کھیت مزدُوری کرتے تھے مگر اپنی اپنی بیویوں کو لے کر الگ ہو چکے تھے، اُس کی مُستقل بیوگی اور تیز طرار زبان کے ڈر سے گاؤں کے بڑے بوڑھے اُس کے مقابل آنے سے کتراتے تھے۔ علاوہ ازیں یہ بات بھی تھی کہ گاؤں کے اکثر مردوں کے کسی نہ کسی وقت میں، کچھ نہ کچھ عرصے کے لیے بیوہ کے ساتھ تعلقات رہ چکے تھے، چنانچہ اُن کی آنکھوں میں بیوہ کی شرمساری تھی۔ ولی اور بیوہ کا جوڑ کچھ تو فطری تقاضوں، اور کچھ آسائش باہمی کے اصُولوں پر قائم تھا۔ ولی کو سرد راتوں میں ایک عورت کا گرم بستر اور دن بھر کی روٹیاں میسّر آجاتی تھیں، اور بیوہ کے لیے گھر باہر کا کام کروانے اور موقع بے موقع گالیاں دینے کو ایک مرد کی ذات موجود تھی۔ جن لوگوں نے بیوہ کو جوانی کی عمر میں دیکھا تھا وہ اُس کے جلال کی قسم کھاتے تھے ـــ کہ آزاد عورتوں کا جمال نہیں بلکہ جلال مردوں کی رُوح کو گرفتار کرتا ہے۔ اس ڈھلتی ہوئی عمر میں بھی اُس کے سینے کا زور اور آنکھ کی چمک قائم تھی۔ چنانچہ گلہ ہے لگا ہے یہ ایک واقعہ رونما ہوتا رہتا:

آدھی رات کے وقت زور دار چیخوں اور کوسنوں کی آوازوں سے اچانک آدھا گاؤں جاگ اُٹھتا۔ دو چار بڑے بُوڑھے داڑھیوں میں اُنگلیاں پھیرتے اور خوابیدہ ہاتھوں سے سروں پر پگڑیاں جماتے اپنی کھاٹوں سے اُٹھتے اور زیرِ لب، "بدبخت فاحشہ، بدبخت رنڈی"، بڑبڑاتے ہُوئے بیوہ کے مکان پر پہنچتے جو دو کوٹھڑیوں پر مشتمل تھا اور بیوہ کے دوسرے خاوند کمہار نے اُسے بنا کر دیا تھا۔ وہاں پر بیوہ، دروازے کے اندر کھڑی ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر ولی کو، جو دروازے کے باہر دبکا کھڑا ہوتا، گالیاں دے رہی ہوتی۔ بوڑھوں کے وہاں پہنچنے پر وہ ولی پر الزام لگاتی کہ اُس نے چوکیداری کے بہانے، نیّتِ بد سے اُس کے گھر میں داخل ہو کر اُس کی عزّت خراب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی وہ گاؤں کے رکھوالوں کو کوستی کہ وہ مزے سے اپنی عورتوں کی رانوں میں سر دیے سوئے رہتے ہیں اور ایک بیکس بیوہ کی مدد کو پہنچنے کے لیے کسی کی ٹانگوں میں ہمّت نہیں رہی۔ بوڑھے خفت کی حالت میں کھڑے، داڑھیوں میں اُنگلیاں پھیرتے، اُس کے رُکنے کا انتظار کرتے۔ جونہی بیوہ سانس لینے کو رُکتی تو بوڑھے، پُوچھ گچھ کیے بغیر، اونچی آواز میں ولی کو سرزنش کرتے اور اسے دیانتداری سے اپنا کام کرنے کی تنبیہہ کر کے، زیرِ لب، "فاحشہ، رنڈی"، بڑبڑاتے ہوئے اپنے گھروں کو لوٹتے۔ گاؤں کی دیواروں پر سے حسد اور انہماک سے دیکھتے ہوئے کالے سروں کی قطاریں ایک ایک کر کے غائب ہونا شروع ہو جاتیں۔ یہ سر بیشتر ادھیڑ عمر لوگوں کے ہوتے، جب کہ بوڑھے بدن اپنی رانوں کی آگ کو فراموش کیے کھاٹوں سے اُٹھنے کی تکلیف ہی

نہ کرتے، اور نوجوان ان باتوں سے بے نیاز، سارے جہان کو بازوؤں میں سمیٹے، محوِخواب رہتے۔

اس واقعے کے اگلے ہی روز، باقاعدگی کے ساتھ، بیوہ کے دونوں بیٹے رات کے پہلے پہر ولی کو گاؤں کی کسی گلی میں جا لیتے اور نہایت خاموشی سے، لاتوں اور گھونسوں سے اُس کی مرمت کر کے واپس چلے آتے۔ اگلے دن ولی اپنے چہرے اور بازوؤں اور پسلیوں پر متعدد چوٹوں کو سہلاتا ہوا مطب میں آتا۔ حکیم اُس کو دیکھ کر تاسف سے سر ہلاتے ہوئے کہتا:

"ولی، کتنی بار کہہ چکا ہوں، ذیابیطس کے مرض میں پرہیز کی ضرورت ہے۔ ایک زخم بھی چل نکلا تو جان لے لے گا۔" جس پر ولی، باقاعدگی کے ساتھ، کسی چور کے تعاقب، یا اندھیرے میں ٹھوکر کھا کر گرنے کی کوئی کہانی بیان کرتا۔ چنانچہ ولی، اسد نے سوچا، پرلے درجے کا جھوٹا تھا۔ شیر کے گاؤں میں آنے کی کہانی صاف جھوٹ تھی جو اُس نے اپنی کارگزاری ثابت کرنے کی غرض سے گھڑی تھی۔

اُس وقت اسد نے سینے میں اپنی سانس کو محسوس کیا۔ اس نے ٹانگیں اپنے آگے زمین پر سیدھی کیں اور ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر، آگے جھک کر بیٹھ گیا۔ حکیم نے ہمیشہ اُس کو تاکید کی تھی کہ سانس کے دورے کے دوران بہترین طریقہ بازو ڈھیلے چھوڑ کر اور کمر سیدھی کر کے بیٹھنے کا تھا۔ مگر اپنے تجربے کی بنا پر سب سے آرام دہ طریقہ جو اس نے پایا تھا وہ کمر ڈھیلی کر کے، آگے جھک کر بیٹھنے کا تھا۔ پہلے پہل وہ بوکھلا جایا کرتا، اور بوکھلاہٹ میں اُس کے بدن پر خفیف سے تناؤ کی کیفیت طاری ہو جاتی، جس سے سانس میں مزید رکاوٹ پیدا ہوتی۔ پھر ایک بار غصے اور تکلیف کی حالت میں اُس کو خیال آیا کہ ڈرنے سے کیا حاصل؟ اس حیران کن خیال کے ساتھ ہی اُسے یوں محسوس ہوا جیسے اپنے ذہن پر کسی نہ کسی حد تک اُسے اختیار مل گیا ہو۔ اِس کے بعد وہ آہستہ آہستہ اپنے بدن پر قابو پانے لگا۔ اب جب کہ اُس کا خوف بڑی حد تک دُور ہو گیا تھا، وہ ہر نئے دورے کے لیے تقریباً تیار رہتا۔ پہلے پہل یہ دورے اس کو آناً فاناً میں آ لیتے، جیسے بجلی گرتی ہو۔ اب نہیں۔ اب جیسے وہ اُن کو دُور سے آتے ہوئے دیکھ لیتا تھا۔ اصل دورے کے پہنچنے سے منٹ آدھ منٹ پیشتر چھاتی اور گلے میں ایک تنگی کا احساس ہوتا، جیسے لمبی چڑھائی چڑھنے سے ہوتا ہے۔ پھر یہ سوجن اُوپر ہی اُوپر اُٹھتی آتی اور سانس کا رستہ تنگ سے تنگ ہوتا چلا جاتا، حتیٰ کہ سانس کہیں کھو کر رہ جاتی۔ اب جب کہ خوف کی حالت میں مدافعت کرنے کی بجائے، اسد نے نیم یاس کی کیفیت میں اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دینے کا ڈھنگ سیکھ لیا تھا، جسم کی تکلیف کو اُس نے بڑی حد تک اپنی قوتِ برداشت میں شامل کر لیا تھا۔ تاہم، پوری طرح سے وہ اس پہ قابو نہ پا سکا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس جگہ کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔

اسد جھک کر بیٹھا، سر کو موڑ کر پیچھے وادی کے جنگل پر دھوپ کو دیکھتا رہا۔ سانس اپنی شدت کے مرحلے پر رُک رُک کر، چھوٹے چھوٹے جھٹکوں میں آ رہی تھی، جیسے کسی خراب نلکے سے کھانستی ہوئی

ہوا اور پانی خارج ہوتا ہے۔ اور اس کی ایک گھنی سی شکل اور حجم اور وزن ہی نہیں، بلکہ ایک رنگ اور روپ بھی تھا، نیلا سا، ہلکا نیلا اور بھورا سا جس میں پیلاہٹ کے چھینٹے تھے۔ اسد نے ہمیشہ اس کو اسی رنگ میں پایا تھا، چاہے کوئی موسم ہو اور دن یا رات کا کوئی بھی وقت ہو، یہ اسی رنگ روپ اور (شہد کی مکھیوں کے چھتے ایسے) گھنے سے حجم میں آتا اور آ کر چھاتی پر بیٹھ جاتا تھا۔ گویا جسمانی اذیت کا یہ رنگ تھا۔

کوئی ایک گھنٹے میں یہ دورہ گزر گیا۔ اسد نے کہنیاں رانوں پر سے اٹھائیں اور کمر سیدھی کر کے درخت سے لگا لی۔ اس کا چہرہ، جو وقتی طور پر سرخ ہو گیا تھا، تیزی سے رنگ بدلنے لگا، گو اس کی آنکھوں کی چمک قائم رہی۔ ولی کا ہاتھ خودکار مشین کی طرح دستے کو مضبوطی سے پکڑے مخصوص ڈُو اور سات کے چکروں میں گھوم رہا تھا اور وہ خاموشی سے آنکھیں پھاڑے اسد کو دیکھے جا رہا تھا۔ اب اسد کے پیٹ اور چھاتی کی نالیوں میں نقاہت کا درد شروع ہوا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں اور سر سفیدے کے تنے پر ٹیک دیا۔ پھر آنکھیں بند کیے کیے وہ ذرا سا مسکرایا۔ اگلی جمعرات سے پہلے اس نے اس کی توقع نہ تھی۔ اس موسم میں عموماً بیس پچیس دن کے وقفے پہ آتا تھا۔ بہار کا موسم اس لحاظ سے سخت موسم تھا، جاڑوں سے بھی سخت۔ چلو اچھا ہوا، اس نے سوچا، کم سے کم اگلے پندرہ بیس روز بے خطر گزریں گے۔

اسی دوران حکیم مطب سے نکل کر اپنا آخری چکر لگا چکا تھا۔ اس نے ایک ایک کے پاس رک کر اس کے کام کا جائزہ لیا۔ انگلی اور انگوٹھے میں مل کر سفوفوں کی پسائی اور چوبی چمچہ اٹھا کر لعاب کی تار کو دیکھا۔ اب وہ واپس مطب میں جا چکا تھا۔ اسد ولی کے ہاتھوں سے اپنا ہمام دستہ لے کر اٹھا اور گھر کی جانب چل پڑا۔ احاطے کے دروازے کی طرف جاتے ہوئے اس نے اپنے ساتھیوں پر نگاہ ڈالی۔ چار آدمی چناروں کے نیچے، دیوار کے ساتھ ساتھ بیٹھے اپنے اپنے کام کو انجام دینے میں مصروف تھے۔

ولی اب واپس اپنی جگہ پہ پہنچ چکا تھا۔ وہ ایک ململ کے کپڑے میں سے، جس کا ایک سرا اس نے دانتوں میں اور دوسرا پاؤں کی انگلیوں میں داب رکھا تھا، ایک سفید پھکی کو چھان رہا تھا۔ نظام لکڑی کے پیالے میں ایک سیاہ رنگ کے لعاب کو چوڑے سے چوبی چمچے کے ساتھ پھینٹے جا رہا تھا۔ میر حسن دستے پر ہاتھ جمائے بے خیالی سے اسے ہمام میں گھمائے جا رہا تھا جس میں بھورے رنگ کا سفوف تھا۔ احمد علی سمیت وہ چاروں کوئی نہ کوئی اسی طرح کا ہاتھ ہلانے والا مسلسل اور بے خیال کام کیے جا رہے تھے جس سے وقت کٹتا بھی جا رہا تھا اور مکمل بھی ہو چکا تھا۔ کسان سیاہ فام

دیندار۔ لوہار کا بیٹا۔ چوکیدار ...... اسد کو اُن کی بیماریوں کا بھی علم تھا۔ خونی بواسیر۔ گنٹھیا۔ سِل و دق۔ ذیابیطس۔ ان سب میں ایک وہی مریض ہونے کے علاوہ حکیم کا ہمہ وقت شاگرد بھی تھا۔ باقی سب اپنی اپنی شکایتوں کے جال میں پھنسے مشقت کرتے تھے۔ صرف اسد گھر کے اندر یاسمین تک پہنچ سکتا تھا، دوسرے سب دروازے تک آکر اپنے اپنے برتن رکھتے اور لوٹ آتے۔ اسد اپنا حمام دستہ باورچی خانے کے سٹول پر رکھ کر پورے ایک منٹ تک یاسمین کی پشت پر نظریں جمائے کھڑا رہا۔ یاسمین اُس کی موجودگی سے باخبر، مُنہ موڑے کسی کام میں لگی رہی۔ جب اُس نے مُڑ کر اسد کو دیکھا تو اُس کے ہونٹوں کے گرد پسینے کے قطرے تھے۔

"ختم ؟" اُس نے ہاتھ ذرا سا ہوا میں اُٹھا کر، سر ٹیڑھا کر کے دِلرُبائی سے پُوچھا۔

"تمہارے باپ کا کام کبھی ختم ہوا ہے ؟"

"تم تو یہیں ہی نہیں رہے تھے۔"

"اور کون یہیں رہا تھا ؟"

"دلی وہ بھی یہیں تھوڑا رہا تھا، آنکھیں پھاڑے تمہیں دیکھ زیادہ رہا تھا۔"

اسد نے خاموشی سے کندھے اُچکائے۔

"نیچے کیتی میں کیا دیکھتے ہو، اسد ؟" یاسمین نے پُوچھا۔

"کچھ نہیں۔"

"ہر وقت دیکھتے رہتے ہو، جیسے تمہاری کوئی چیز وہاں کھوگئی ہو۔"

"تمہارا وہم ہے۔" اسد نے کہا۔

"اسد !" یاسمین چونک کر بولی، "دھوپ میں بیٹھے تھے ؟"

"نہیں۔"

"یہاں آؤ۔ آکر دیکھو۔"

" اسد دیوار پر ٹنگے ہوئے چھوٹے سے شیشے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اُس کا چہرہ خون کی یلغار سے سُرخ ہو گیا تھا اور آنکھیں چمک رہی تھیں۔

"ابھی دورہ پڑا ہے۔" اسد نے آہستہ سے کہا۔

"ہائے !" یاسمین اُس کے بہت قریب آکر کھڑی ہوگئی۔ "اسد ی۔" اُس نے ہاتھ اٹھا کر اسد کے ماتھے کو چھُوا، "اتنی جلدی ؟"

"ہاں ۔" اسد واپس جانے کے لیے مُڑا ، "اپنی بات یاد ہے ؟"

"ہاں ۔" یاسمین نے کہا ، "رات کو ، اسدی ۔"

وہ دروازے تک اُس کے پیچھے آئی اور مطب کے احاطے کی طرف واپس جاتے ہوئے اسد کی پُشت کو دیکھتی رہی ۔ اُس کا دل بھر آیا ۔

★ ★ ★ ★ ★

پہاڑوں پہ بہار دیر سے آتی ہے ۔ میدانوں میں ہوا کا رنگ بدل گیا تھا اور فصل پکنے کو تیار تھی ۔ یہاں پر کھیت ابھی نوعمر تھے اور سرما کے اِکا دُکا پھول سر اُٹھائے کھڑے تھے ۔ اسد جس وقت گاؤں کی دیواروں کو پیچھے چھوڑ کر اُس کھلے رقبے تک پہنچا جو گاؤں کو جنگل سے جُدا کرتا تھا تو فضا میں پہاڑوں کی خنک ہوا کی خوشبو رچی ہوئی تھی ۔ جن گلیوں سے اسد گزر کر آیا تھا اُن میں بے کواڑ دروازے تاریک صحنوں میں کھلتے تھے جہاں سے اِکا دُکا کسانوں کے باتیں کرنے کی بھاری اور مختصر آوازیں آ رہی تھیں ۔ تیل جلانے کو نقدی درکار ہوتی تھی ، اور نقدی یہاں پہ نایاب شے تھی ۔ یہ لوگ کلی طور پہ اپنے اپنے مختصر قطعۂ اراضی ، اپنی مزدوری اور مویشیوں پہ گزر اوقات کرتے تھے ۔ چنانچہ روشنی صرف شادیوں ، پیدائشوں یا موتوں پہ کی جاتی ۔ دن ڈھلے یہ لوگ دن بھر کا کام ختم کر کے گھروں کو لوٹ آتے ، اور اندھیرا ہونے سے پہلے رات کی روٹی سے فارغ ہو جاتے ۔ پھر اگر موسم کھلا ہوتا تو وہ صحنوں میں کھاٹوں پہ بیٹھ کر باتیں کرتے ۔ کہیں کہیں کسی بچے کے رونے یا عورت کے ہنسنے کی آواز بھی آ جاتی ۔ جلد ہی وہ اپنی اپنی اکلوتی کوٹھڑیوں میں گھس کر ، اندر سے کنڈی لگا کر زمین پہ سو جاتے ۔ کھاٹیں صحن میں پڑی رہتیں ۔ رات یہاں پہ ، شروع سے آخر تک سونے کا اور سکوت کا وقت تھا ۔ صرف کتوں کی یا کبھی کسی گیدڑ کی لمبی بھونک اس سکوت کو توڑتی ۔ رات کے پہلے پہر ان آوازوں میں ٹڈی کی تیز اور عجیب طرح سے کٹی پھٹی آواز کی کوک بھی شامل ہو جاتی ۔

رات ستاروں سے بھری تھی ۔ اسد آہستہ آہستہ قدم رکھتا ہوا جنگل کی طرف بڑھ رہا تھا ۔ جب وہ کھلی زمین کے وسط تک پہنچا تو اُسے یاسمین کا ہیولا نظر آیا ۔ وہ درختوں کی حد سے ذرا اِدھر ، زمین میں گڑھی ہوئی ایک مہیب

چٹان کے پہلو میں کھڑی تھی۔ اُس نے آنکھیں اُٹھا کر سکوت کے عالم میں اسد کو دیکھا، اور اسد نے اس لمبے سے نوخیز چہرے میں (گو وہ عمر میں اُس سے چند سال بڑی تھی) اور پتلے پتلے مضبوط ہونٹوں میں اور دُور دُور جھلملاتی ہوئی آنکھوں میں (عین بیچ سے مانگ نکلے ہوئے ماتھے اور سیدھے سیاہ کَس کر باندھے ہوئے بالوں میں) بدن کی قربت کے اس اوّلین بے زبان لمحے کو بجلی کی کاٹ کی مانند سر سے پاؤں تک محسوس کیا۔ وہ کپکپا اُٹھا۔ اُس کو اس بات کا پتا تھا کہ لمحے لمحے یا اُس سے اگلے، یا اُس سے اگلے، یہ احساس بدل جائے گا، یا ہاتھ سے نکل جائے گا۔ اِس لمحے کی نایابی اسی میں تھی کہ اِس کی یہ خالص سنسناہٹ، جو زندگی کے عمیق محوروں کو مسلسل مقناطیس کے مانند اپنی گرفت میں رکھتی ہے، جو دل کو ایک مُستقل شدت کی سطح پر زندہ رکھتی ہے، جو بار بار آنے اور جانے پر بھی نہ گھٹتی ہے نہ بدلتی ہے، وہ صرف اِس لمحے کے اوّلین پن تک محدود ہے۔ اس بات کا اُس کو علم تھا۔ اس نے اس لمحے کو بیتابی سے مگر بے اُمیدی سے تھام کر رکھنا چاہا، مگر یہ ہوا کی طرح گزر گیا۔ وہ دونوں جنگل کے بالائی حصے میں داخل ہوئے۔ یہاں پر جنگل زیریں حصے کی طرح گہرا نہ تھا، یہاں دیودار کے درخت کھُلے کھُلے اُگے ہوئے تھے۔ یہاں کوئی جانور نہ رہتا تھا کہ گاؤں کے بہت قریب تھا، صرف گاؤں کے بچے یہاں بھیڑ بکریاں اور گائیں چرانے کے لیے آتے اور پیڑوں کے ساتھ بیٹھ کر گپیں لگاتے اور سو یا کرتے تھے۔ جنگل کی یہ جگہ محفوظ تھی۔

اسد اُس سے ایک قدم آگے چل رہا تھا۔ کچھ دور پر وہ تنگ سا راستہ چھوڑ کر درختوں کے بیچوں بیچ چلنے لگے۔ یہاں پر تاریکی بہت تھی مگر اسد اس جگہ کے قدم قدم سے واقف تھا۔ وہ اندھیرے میں ایسے چل رہا تھا جیسے دن کی روشنی ہو۔ جیسے ہی کسی درخت کے پاس سے گزرتا اُس کے تنے کا رنگ، اُس کی گولائی، اُس کی چھال کی ساخت اُس کی آنکھوں میں پھر جاتی۔ یاسمین آسانی سے چلتی ہوئی اُس کے پیچھے پیچھے آ رہی تھی۔ وہ ایک ایک درخت کو انگلیوں کے پوروں سے چھوتی، اور کسی کسی نوجوان تنے پہ بازو ڈال کر اُس کے بغیر، اُسے گلے لگاتی ہوئی چل رہی تھی۔ یاسمین اس جگہ پہ پل کر جوان ہوئی تھی۔ اسد کا مدھم سا ہیولا برابر اُس کی آنکھوں میں تھا ——— لمبا اور پتلا، کندھوں کے خفیف سے جھکاؤ والا بدن، مگر تیز، بہت تیز اور ہلکا پھلکا جیسے بلّے کے پاؤں والا، گو اُس کو بہت چھو کر اُس نے نہیں دیکھا تھا مگر اُس کی تیزی اور حدت سے وہ واقف تھی۔ دفعتاً اُس کا جی چاہا کہ وہ بھاگ کر اسد کے برابر پہنچ جائے۔ اُس نے اپنے قدم تیز کر دیے۔ ایسے وقت میں ایسی جگہ پر، یاسمین نے سہم کر دل میں سوچا، میں کسی کی خاطر بھی نہ آؤں۔ اُسے دل میں ہلکے سے جُرم کا احساس ہوا اور وہ ہنستی ہوئی بھاگ کر اسد کے پاس سے نکلی اور ایک پیڑ کی اُبھری ہوئی جڑ پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ اسد اُس کے پاس جا بیٹھا۔ یاسمین نے آہستہ سے اُسے سینے پر چھُوا۔ "تم نے سویٹر نہیں پہنی۔"

"نہیں ۔" اسد نے کہا۔ "تمہاری سانس پھول گئی ہے۔"

یاسمین ہولے سے ہنسی۔

"ایسے وقت میں یہاں دوڑنا نہیں چاہیے۔" اسد نے کہا۔

"کیوں؟"

"یہاں بھیڑیے ہوتے ہیں۔"

"ارے جاؤ۔"

اسد اُچھل کر اپنے پنجوں پر بیٹھ گیا۔ پھر اُس نے ایک طرف کو مُنہ موڑ کر بھیڑیے کی آواز میں ایک لمبی ہُوک لگائی۔ یاسمین اُس کے بازو سے چمٹ گئی۔ دونوں خوشی سے اور بیتابی سے ہنستے رہے۔ اسد پھر اپنی جگہ پر جا کر بیٹھ گیا۔ اندھیرے میں ہاتھ پھیلا کر اسد نے ایک لمبی ڈنڈی والا پہاڑی پھول توڑا اور یاسمین کے ہاتھ میں دے دیا۔ تاریکی میں اب وُہ بخوبی دیکھ رہے تھے۔

"رات کو میں نے تمہیں دیکھا تھا۔" یاسمین نے کہا۔

"کب؟"

"آدھی رات کے بعد کا وقت تھا۔ تم میز پہ بیٹھے لکھ رہے تھے۔"

"کہاں سے دیکھا تھا؟"

"باورچی خانے سے۔"

"میں نے تمہیں نہیں دیکھا۔"

"تم نے اُدھر دیکھا ہی نہیں۔"

"دیکھا تھا۔ باورچی خانے میں اندھیرا تھا۔ تم اندھیرے میں کیا کر رہی تھیں؟"

"پانی پینے گئی تھی۔"

"کل رات تو سردی تھی۔"

"ہاں۔"

"تمہیں سردی میں پیاس لگی تھی؟"

"ہاں۔"

"اور وہاں تم نے کیا کیا؟"

"کچھ نہیں۔"

"کتنی دیر کھڑی رہیں؟"

"پتا نہیں۔" یاسمین نے کہا، "کافی دیر۔"

"مَیں نے اُدھر دیکھا تھا؟"

"ہاں۔"

"کئی بار؟"

"ہاں۔" یاسمین نے کہا، "کیا لکھ رہے تھے؟"

"خط۔"

"چچا کو؟"

"ہاں۔"

"تمہارے چچا یہاں کبھی نہیں آتے۔" یاسمین نے کہا، "تمہارے چچا یہاں کیوں نہیں آتے؟"

"چچا بہت بوڑھے ہو گئے ہیں۔"

"اس بار تم گئے تو اُن سے ملے تھے؟"

"نہیں۔"

"کیوں؟"

اسد خاموش رہا۔

"تم نے مجھے بتایا تھا کہ دُنیا میں تمہارے ایک چچا ہیں، اور ایک پھوپھی، اور کوئی نہیں۔"

"ہاں۔"

"اسد جی،" یاسمین نے کہا، "بعض دفعہ مَیں سوچتی ہُوں تم بہت ہی عجیب آدمی ہو۔"

"کیسے؟"

"تم نے اپنے بارے میں مجھے کچھ بھی تو نہیں بتایا۔"

"جو کچھ مجھے پتا ہے مَیں نے بتا دیا ہے۔"

وہ اُٹھا اور کمر تننے کے ساتھ لگ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اُس نے سر کو دائیں اور بائیں آہستہ آہستہ جھٹکے دیے، جیسے کسی خیالی بوجھ کو اُتار کر پھینک رہا ہو۔ جہاں وہ بیٹھی ہے، اُس نے بے خیالی سے سوچا، مَیں آسانی

کے ساتھ ہاتھ بڑھا کر اسے چھو سکتا ہوں۔ وہ پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔

"پتا ہے تمہارا نام کیسے رکھا گیا تھا، یاس ؟"

"کیسے ؟"

"تمہارے باپ نے مجھے بتایا تھا۔"

"بتاؤ ؟"

"جب وہ تمہیں یہاں لے کر آیا تو تم بہت چھوٹی سی تھیں۔ اُس وقت شاید تمہارا کوئی اور نام تھا۔"

"فاطمہ۔"

"فاطمہ اچھا نام ہے۔"

"ہاں۔"

"اُس نے آس پاس کے پہاڑوں پہ بہت ڈھونڈا مگر جس پھول کا وہ عمر بھر سے دلدادہ تھا وہ یہاں کہیں پہ نہ ملا۔ پھر اُس نے میدانوں سے یاسمین کے بیج اور پودے تک منگوائے، مگر اس زمین نے انہیں قبول نہ کیا۔ آخر اس نے تمہارا نام یاسمین رکھ دیا۔"

"فاطمہ یاسمین۔"

"یہی کہانی ہے نا ؟"

"ہاں۔"

"میرا خیال ہے یہ کہانی تمہارے باپ نے گھڑی ہے۔"

"ابا کو کیا ضرورت ہے گھڑنے کی ؟"

"تمہیں خوش کرنے کے لیے۔"

"ابا نے کوئی بات نہیں گھڑی۔ یہ سچی بات ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا ہے ؟ تم تو چھوٹی سی تھیں۔"

"مجھے پتا ہے۔" یاسمین تلخی لہجے میں بولی۔ "مجھے سچی لگتی ہے۔"

اسد بلا وجہ دھیمے غصے کی حالت میں تھا۔

"جب میں چھوٹی سی تھی،" یاسمین نے بات کی، "تو ہر وقت یہاں گھوما کرتی تھی۔ اکیلی۔ مجھے کسی شے سے خوف نہ آتا تھا۔ دوسری لڑکیاں غول در غول آتی تھیں، میں اکیلی کھیلا کرتی تھی۔ میں ہر ایک پرندے،

ہر ایک جانور، ہر ایک پتھر سے واقف تھی - پھر میں مظفر آباد سکول میں چلی گئی - ان جگہوں کے ساتھ میری واقفیت ختم ہو گئی - اب مَیں صرف رات کے اندھیرے میں تمہارے ساتھ یہاں آتی ہوں ۔"

اسد نے اُس کی آواز میں رنجیدگی کی لغزش محسوس کی ۔" پر اس جگہ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ۔"

"کبھی پہاڑ بھی بدلے ہیں ؟" اسد نے کہا ۔

"شاید بدلتے ہوں ۔" کچھ دیر تک وہ خاموش رہی ۔" اسد ؟"

"ہُنہہ ۔"

" تم نے میرے نام کی بات کیوں چھیڑی تھی ؟"

" ایسے ہی ۔" اسد نے جواب دیا ۔" مَیں نے ایک نظم شروع کی ہے ۔"

"کیسی نظم ؟"

" ایک نظم ۔ کئی بار شروع کی ہے ۔"

" کیا لکھنا چاہتے ہو ؟"

" پتا نہیں ۔ مگر تمہیں علم ہے کہ آدمی کی زندگی پر اُس کے نام کا بُرا اثر ہوتا ہے ؟"

"کیسے ؟"

" ہر ایک نام کی ایک آواز ہوتی ہے ۔ یہ تو تمہیں پتا ہی ہے ۔"

"ہاں ۔"

" اس کے علاوہ اُس کی ایک شکل و شباہت اور اپنی ایک جان ہوتی ہے ۔ ہر بار جو یہ نام پکارا جاتا ہے تو بولنے والی آواز کے جذبہ کے مطابق ، یعنی جوش یا غصّے یا محبّت کے مطابق جا کر اپنے ستارے سے ٹکراتا ہے ۔"

" گویا اگر میرا نام یاسمین ہے تو پھر ؟"

" یہ مجھے پتا نہیں ،" اسد نے کہا ،" بس اتنا پتا ہے کہ نام کا تمہارے اُوپر اثر ہوتا ہے ۔"

" کوشش کرو تو شاید لکھتے لکھتے پتا چل جائے ؟"

" شاید ۔"

" تم نے مجھے بتایا تھا کہ نظم لکھنے کے دوران تمہیں ایسی ایسی باتوں کا پتا چلتا ہے جن کا پہلے خیال بھی نہیں ہوتا ۔

"ہاں ۔"

" کوشش کرکے لکھو گے نا ؟"

"کوشش کی بات نہیں۔" اسد نے کہا، "قسمت کی بات ہے۔"

قسمت کی بات محض اس لیے نہیں کہ کبھی کبھار وہ کوئی نظم لکھ لیتا تھا، بلکہ اس لیے کہ وہ یاسمین کے بارے میں اور اُس کی خاطر کوئی بات کہنا چاہتا تھا، کوئی ایسی بات جو جھوٹ نہ ہو، جو من گھڑت یا خیالی نہ ہو بلکہ اصلی اور سچی ہو۔ وہ اُس کی زندگی کا پہلا سچا مرد بننا چاہتا تھا۔ اُسے احساس تھا کہ کوئی مرد کسی عورت کے لیے شاید اتنا کچھ ہی کر سکتا ہے۔ وہ اپنی خواہش کے مبہم، بلکہ مہمل ہونے تک سے خائف تھا۔ اُسے دراصل یہ بھی ٹھیک سے پتا نہ تھا کہ کسی عورت کے ساتھ سچائی کا دعویدار ہونا کیا ہوتا ہے۔ یہ کس طرح کی چیز ہے، کیا اس کا کوئی مفہوم بھی ہے؛ اس سے آرام ملتا ہے یا کوئی رنج ہوتا ہے، یا اس کا آخر کوئی فائدہ بھی ہے؟ تاہم اپنے اندر جہاں پر وہ چیزوں کے مفہوم اور اُن کی نوعیت کی کسی نہ کسی طور، کچھ نہ کچھ خبر رکھتا تھا اُس مقام کے اندر اُس کو اس بات کا فہم تھا کہ زیادہ سے زیادہ جو وہ یاسمین کی خاطر کر سکتا تھا تو اُس کے ساتھ سچائی کا دعویٰ کر سکتا تھا، اور بس ...... یاسمین اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اسد کا ہاتھ اندھیرے میں بے اختیار اُس کی جانب لپکا، اُنگلیوں کے پوروں نے اُس کی قمیض کے دامن کو چھوا، پھر ہاتھ ہوا میں معلق رہا۔ نیچے اس کے —— اُس نے سوچا —— سفیدے کے نوجوان تنے کی مانند لمبی اور گول، نرم اور مضبوط اور صاف ستھری اور پارے کی لہر کی طرح تھرکتی ہوئی، بدن کی ایک پوشیدہ ٹہنی ہے جس کی مجھے خبر نہیں۔ دونوں باتیں کرتے ہوئے ایک درخت سے دُوسرے اور دُوسرے سے تیسرے تک گھومتے رہے۔

"جانتے ہو،" یاسمین بولی، "ایک مدت تک مجھے تمہارا پتا ہی نہ چلا تھا۔ اُس زمانے میں تم گھر کی طرف آتے ہی نہ تھے۔"

"آتا بھی تو تمہیں دیکھ تو نہ سکتا تھا۔"

"مگر میں تمہیں دیکھ لیتی۔"

"ہاں۔ اور میں شاید تمہاری آواز ہی سُن لیتا۔"

"پتا ہے میں نے تمہیں پہلے پہل کب دیکھا تھا؟"

"کب؟"

"تمہارے جانے سے دو دن پہلے۔ شام کا وقت تھا اور تم مطب کی دیوار کے ساتھ کھڑے نیچے دیکھ رہے تھے۔ میں کسی کے گھر جانے کے لیے باہر نکلی تو میری نظر تم پر پڑی۔ میں سمجھی تم کوئی مریض ہو۔"

"درست۔"

"جب مَیں باہر سے لوٹی تو رات پڑ چکی تھی اور تُم ابھی تک وہیں کھڑے تھے، گھر کی جانب پُشت کیے، پتھر کے بُت کی طرح۔ آسمان پہ اُس رات کو چھوٹا سا چاند تھا۔ یکدم میرا جی چاہا کر تمہیں دیکھوں۔ اندر جانے کی بجائے مَیں دروازے سے ذرا آگے نکل آئی، تاکہ تمہارا سر آسمان کے سامنے آجائے۔ وہاں ایک لحظے کے لیے رُک کر مَیں نے تمہیں دیکھا اور پھر واپس چلی گئی ...... مجھے یہ بھی پتا چل گیا کہ تُم ہمارے علاقے سے نہیں ہو۔"

"کیسے۔"

"تمہارے کھڑے ہونے کے انداز سے۔ تمہاری کہنیاں دیوار پر اور مُٹھیاں ٹھوڑی کے نیچے تھیں۔ تم ایک ٹانگ کے بل کھڑے تھے، دُوسری ٹانگ ڈھیلی ڈھالی پاؤں کی نوک پہ ٹکی تھی۔ اِس علاقے کا کوئی آدمی ایسے کھڑا نہیں ہوتا۔ تم شہر سے آئے تھے۔ دو روز کے بعد تم گاؤں چھوڑ کر چلے گئے۔ مَیں سمجھی تندرست ہو کر واپس چلے گئے ہو۔"

"تندرست ہو کر!" اسد طنز سے بولا، "یہاں سے؟"

"تمہارا خیال میرے دل پہ رہا۔ کبھی کبھی مَیں اپنے آپ پہ ہنستی۔ مَیں نے تمہارے ہیولے کو رات کے اندھیرے میں کئی گز کے فاصلے سے صرف ایک لحظے کے لیے دیکھا تھا۔ مگر اُس ایک لمحے کے بعد مَیں لاکھ کوشش کرتی، تمہارا خیال دل سے نہ جاتا۔ کیسی عجیب بات ہے۔"

خون کے اُبال سے اسد کے رونگٹے اکڑ گئے اور ایک بے نام سی کپکپی اُس کے بدن میں دوڑ گئی، جیسے ننھی ننھی، نہایت ہی باریک پھوار پڑتی ہو۔ اُس وقت پہلی بار شیر کے بولنے کی آواز آئی۔ اسد تیزی سے پلٹا۔ اُس نے لپک کر یاسمین کا بازو پکڑا اور اُسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ یہ آواز باقاعدہ گرج کی بجائے ایک چنگھاڑ کی آواز تھی، کٹی پھٹی، بے ربط، اور خونخوار۔ اسد کو یہ اندازہ نہ ہوا کہ آواز کس جانب سے آئی ہے، مگر کہیں قریب سے آئی تھی۔ اُس کی کپکپی رُک گئی۔ اُس کے جسم کو دفعتہً جیسے آرام مل گیا۔ اب وہ ہلکا پھلکا، چاق و چوبند کھڑا تیز تیز آنکھوں سے اندھیرے میں چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔ کچھ دیر تک دونوں ساتھ لگ کر کھڑے چنگھاڑ کے بعد کی گہری خاموشی کو سُننے کی کوشش کرتے رہے۔ اُوپر کسی درخت سے ایک پرندہ نہایت آہستگی سے اُڑا تو وہ یوں چونک اُٹھے جیسے اُن کے سروں کے اُوپر دھماکا ہُوا ہو۔ پھر اسد نے قریب ہی ایک رائفل کے سیفٹی کیچ کی آہنی کلک کی آواز سُنی۔

"شاہ رُخ!" وہ چلا اُٹھا۔

"چیخو مت۔" اندھیرے میں آواز آئی۔ "بیوقوف۔"

شاہ رُخ اِس علاقے کا فارسٹر تھا۔ اِس کے علاوہ وہ یہاں کی واحد رائفل کا مالک تھا۔ وہ سرحد کے علاقے کا رہنے والا صاف سُتھرا نوجوان تھا اور اسد سے اُس کی دوستی تھی۔ اپنے طور پر شاہ رُخ بھی شیر کی تاک میں تھا اور رات رات بھر اپنے ڈاک بنگلے کے برآمدے میں سیفٹی کیچ اتار کر بیٹھا انتظار کرتا رہتا تھا۔ اسد کئی بار دل ہی دل میں سے یہ سوچ کر ہنسا تھا کہ پاگل آدمی سمجھتا ہے کہ شیر شاید اُس کو ڈھونڈتا ہوا ڈاک بنگلے آئے گا۔ اِس وقت اُس کو یہاں پا کر ایک لمحے کو اسد کو خیال ہُوا کہ شاید شاہ رُخ بالآخر شیر کے تعاقب میں باہر نکل آیا ہے۔ مگر اگلے ہی لمحے اُس نے ایک لڑکی کی سرگوشی، اور جواب میں شاہ رُخ کی آواز سُنی تو اُس کا دل ٹھہر گیا۔ یہ عالم پٹواری کی بیٹی حُسنہ تھی جس سے ملنے شاہ رُخ یہاں آیا کرتا تھا۔ حُسنہ اور یاسمین کے رازوں میں اُن کا اشتراک تھا۔

"میں سمجھا تم گولی چلانے والے ہو۔" اسد ہنستے ہوئے بولا۔

"تمہاری آوازیں تو ہم ایک گھنٹے سے سُن رہے ہیں۔ سارے جنگل میں شور مچا رکھا ہے تم دونوں نے۔" شاہ رُخ نے جواب دیا، "سیفٹی عادتاً اتار لی تھی۔ آواز تو اس ظالم کی ایسے آتی ہے جیسے بغل میں کھڑا ہو۔ ہوتا دراصل کہیں اور ہے۔"

"دن کے وقت کہاں جاتا ہے؟" اسد نے پُوچھا۔

"کہیں بھی نہیں جاتا۔ پڑا سوتا ہے۔"

"پھر اسے ڈھونڈنے کا بہترین وقت دن میں ہی ہے۔"

"سہ پہر میں۔ اُس وقت یہ جانور گہری نیند سوتے ہیں۔" شاہ رُخ نے کہا، "مگر ہو سکتا ہے یہ جو ہے سوتا ہی نہ ہو۔"

"کیوں؟"

"اکیلا جو ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا کہ اکیلا ہے؟"

"آواز۔" شاہ رُخ نے کہا، "ہمیشہ ایک ہی آواز میں دہاڑتا ہے۔ اِضطراب کی کیفیت میں۔"

"تمہیں ان کی آوازوں کا فرق معلوم ہے؟"

"نہیں۔" شاہ رُخ نے کہا، "مگر مجھے ایسا احساس ہے کہ یہ اکیلا ہے۔ جیسے یہ چنگھاڑتا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی جوڑی ساتھ نہیں۔"

اسد کا اِس بات پر شاہ رُخ سے بہر طور اتفاق تھا۔ ان کی حسّیات اس بارے میں مُشترک تھیں۔ فرق یہ

تھا کہ اسد اس بات کو دل میں رکھتے ہوئے تھا۔ اُسے اس بات کا دھڑکا رہتا تھا کہ جیسے یہ کوئی راز ہے جو اُس کے ہاتھ سے نکل جائے گا ــــــ امید و بیم کی ایسی کیفیت کے مانند جو دل و دماغ پر چھا جاتی ہے اور جُوں جُوں بڑھتی اور بتدریج حقیقت میں تبدیل ہوتی جاتی ہے زیادہ سے زیادہ بے ہیئت اور بے یقین ہوتی چلی جاتی ہے، ہوا بنتی جاتی ہے۔ آدمی کے خیال اور اُس کی خواہش کے قلب میں جو تضاد بیٹھا ہوتا ہے، اُس کا دھڑکا اُسے لگا رہتا تھا۔ وہ دونوں کھڑے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے، مستقبل کے کسی وقت پر اس جانور کے مقابل آنے اور اُسے اپنے قابو میں کرنے کے ان دونوں کے اپنے اپنے منصوبے تھے۔ دونوں لڑکیاں اگلے درخت کے ساتھ لگ کر کھڑی تیز تیز سرگوشیاں کر رہی تھیں اور ہونٹ دبا دبا کر پیٹ میں ہنستی جا رہی تھیں۔ وقفے وقفے پر حسنہ اُونچی آواز میں کہتی: "ہائے یاس۔ مجھے خوف آتا ہے۔" اور شاہ رُخ اُس کی بات کو ہنسی میں اُڑانے یا اُن دونوں کو مزید خوف زدہ کرنے کے لیے کوئی بات کرتا۔ تھوڑی دیر میں شاہ رُخ جانے کے لیے تیار ہو گیا۔

"تمہارے کٹروں کا کیا حال ہے؟" اسد نے پُوچھا۔

"کام چل رہا ہے مگر میں ان کی دُم پر پاؤں رکھنے کے لیے موجود نہ ہوں تو شاید گھر پر ہی بیٹھے رہیں۔" شاہ رُخ نے کہا، "ایک فائدہ ہوا ہے، چوری چکاری ساری رینج میں رُک گئی ہے۔ شام کے بعد کسی کی ہمّت ہی نہیں ہوتی۔"

"کسی نے اسے دن میں دیکھا ہے؟"

"اونہوں" شاہ رُخ نے سر ہلایا۔ "تمہاری طبیعت اب کیسی ہے؟"

"اب ٹھیک ہُوں۔"

اُن کو لمبے راستے سے درختوں کے اندر اندر گاؤں کے گرد گھوم کر کہیں عقب میں جا کر نکلنا تھا جہاں حسنہ کا گھر تھا۔ چنانچہ وہ اسد سے ہاتھ ملا کر، حسنہ کو ساتھ لے کر جنگل کی تاریکی میں غائب ہو گیا۔ کچھ دُور تک اُن کے قدموں کی آواز آتی رہی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

اسد اور یاسمین تقریباً جنگل کے کنارے پر پہنچ چکے تھے جب وہ دُوسری بار بولا۔ اِس دفعہ یہ پُورے گلے کی، گونجدار گرج کی آواز تھی جس سے یاسمین اُچھل پڑی۔ دونوں ہاتھوں سے اسد کا کندھا پکڑ کر وہ اُس سے لپٹ گئی، پھر ایک دم علیحدہ ہو کر کھڑی ہو گئی۔

"ڈر گئیں؟"

"اِتنا اچانک دہاڑا ہے۔ بس۔" وہ بولی، "ڈرنے کی کیا بات ہے۔"

"بات تو ہے۔"

" کیوں ؟"

" لوگ ڈرتے تو ہیں اِس سے ۔"

" میں نہیں ڈرتی ۔" یاسمین نے کہا ، " لوگ ڈرتے ہیں تو ڈرتے رہیں ۔"

" آج یہاں آتے ہوئے تمہیں خوف نہیں آیا ؟"

" نہیں ۔"

" تمہیں پتا ہے کہ یہ یہاں تک آتا ہوا دیکھا گیا ہے ؟"

" ولی کی بات کا کیا اعتبار ۔ وہ تو ہر وقت سویا رہتا ہے ۔"

" تم نے اس کی دہاڑ نہیں سُنی ؟"

" سُنی ہے ، اسد ۔ تم نے تو شاید پہلی بار سُنی ہوگی ۔ یہاں پہ ایسے ایسے باگھ ہر دُوسرے سال آیا کرتے ہیں ۔"

" یہ باگھ کی آواز ہے ؟"

" یہ کوئی ذرا بڑا باگھ ہوگا ، بس ۔ اور کچھ بھی نہیں ۔"

" کیسے کچھ نہیں ۔" اسد نے ضدی لہجے میں کہا ۔

" کچھ بھی نہیں ۔" یاسمین اب آہستہ آہستہ غصّے میں آ رہی تھی ۔ " کچھ نہیں ۔" اُس نے دہرایا ۔

اُس وقت تیسری بار گرج کی آواز آئی ۔ اب کے یاسمین اپنی جگہ سے ہلی تک نہیں ، آنکھ جھپکے بغیر متوازن نظروں سے اسد کو دیکھتی رہی ۔ اسد اُس سے ایک بازو کے فاصلے پہ کھڑا کبھی اُسے اور کبھی مڑ کر گرج کی سمت میں دیکھتا رہا ۔ اُس کا جی چاہا کہ وہ ہاتھ بڑھا کر یاسمین کو چھوئے ، رات کے اندر اُس کے جُثے کو ، اُس کے جسم کو محسوس کرے اور اس طرح اُس اندھیرے کی آواز کو معدوم کر دے ۔ مگر اُس کا بدن جیسے ماتھے سے لے کر نیچے پاؤں کے بیچ کی زمین تک دو حصّوں میں بٹ چکا تھا ، اُس کی بوٹی بوٹی مخالف سمتوں میں لپک رہی تھی اور بیچ کی اِس کاٹتی ہوئی لکیر نے اُسے مفلوج کر کے رکھ دیا تھا ۔ اُس کے آگے اور اُس کے پیچھے صرف اُس کی نگاہ اور اُس کی خواہش دَوڑ رہی تھی ، اُس کا فہم ، اُس کے بدن کی طرح سکوت میں تھا ۔ وہ ہاتھ کی ایک انگلی تک کو جنبش نہ دے سکا ۔ چند لمحوں میں اُس پہ سے اس عجیب و غریب کیفیت کا ایک عالم گزر گیا ۔ آخر یاسمین نے سرکشی کی ایک جنبش کے ساتھ اپنی ٹکٹکی کی تار توڑی اور منہ موڑ کر چل کھڑی ہوئی ۔ کھُلے آسمان کے نیچے پہنچ کر یاسمین نے آنکھوں کے کونوں میں سے دیکھا کہ اسد اُس کے ساتھ ساتھ چل رہا ہے ۔

" اسد ؟" وہ بولی ، " ایک بات پوچھوں ؟"

"ہاں۔"

"سچ سچ؟"

"ہاں، یاسمین۔"

"تم واپس کیوں آئے تھے؟"

"کہاں؟"

"یہاں۔"

وہ ہنسا: "تمہارے لیے۔"

"اُس وقت تم مجھے جانتے بھی نہ تھے۔"

"مَیں نے تمہیں خواب میں دیکھا تھا۔" وہ دوبارہ ہنس کر بولا۔

"اُوپر آنے سے پہلے تم ایک رات ڈاک بنگلے میں رہے تھے۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟"

"حُسنہ نے۔" وہ بولی، "تم واپس کیوں آئے تھے، اسد؟"

"بتایا جو ہے، یاسمین۔" اسد نے کہا، "تمہارے لیے۔"

★ ★ ★ ★ ★

درحقیقت وہ یاسمین کی خاطر آیا تھا نہ شیر کی خاطر، وہ دوبارہ اس لیے یہاں واپس آیا تھا کہ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ جھوٹ بولنے میں وہ ایک طرح سے حاذق تھا۔ سالہا سال تک چچا کے گھر رہتے اور تنِ تنہا پل کر جوان ہوتے ہوئے اسد نے چند چیزوں میں مہارت حاصل کی تھی۔ اُن میں ایک چیز کہانیاں بھی تھیں۔

پہلے پہل وہ بڑے دُکھ میں رہا تھا، مگر اُس وقت وہ اِتنا چھوٹا تھا کہ اُسے پتا بھی نہ چلا کہ اُس کے اِس درد کی وجہ کیا تھی۔ بعد میں جب وہ سمجھنے کے قابل ہُوا تو اُسے پتا چلا کہ وہ اِس وجہ سے دُکھی رہا تھا کہ تنِ تنہا تھا۔ سکول میں اُس کے ساتھی تھے اور دو دوست بھی تھے۔ پہلے اُس کے دوست اُن کے گھر کھیلنے کے لیے آیا کرتے۔ اُن کا

گھر بچوں کے کھیل کی جگہ تھی۔ دُوسرے گھروں میں مائیں تھیں جو بچوں کو ڈانٹتی رہتی تھیں، یہ نہ کرو، وہ نہ کرو، اور باپ تھے جن کے آنے پر بچوں کی شوخی پر اوس پڑ جاتی۔ اسد کے گھر میں صرف ایک بڑھی خادمہ تھی، اور پھوپھی اُڑ ما تھیں جو چلی گئیں۔ بچے پہلے گلی میں کھیلتے، گلی سے تھک جاتے تو گھر کے اندر چلے آتے اور اندر ابا ہوتے۔ وہ بچوں کو کسی بات پر بھی منع نہ کرتے۔ سارے محلے میں ایک اُن کا گھر ایسا تھا جہاں چھپو چھپک پجرلیاں کھیلنے کی آزادی تھی۔ گھر بھر کی ویرانیں، دروازے، تاریک پوشیدہ گوشے کوٹھے اور چاک اور پیلی گاچنی کی چھوٹی چھوٹی لکیروں سے اٹے پڑے تھے۔ ابا کبھی کبھی خود اُن کے کھیلوں میں شریک ہو جاتے۔ جب "چھپو چھپک پجرلیاں، دو ڈیریاں دو میریاں" کا نعرہ لگنے پر تلاشی شروع ہوتی تو لکیروں کی گنتی اور کٹائی میں وہ ان کا ساتھ دیتے۔ بعد میں اگر بھوک لگی ہوتی تو دُودھ کے پتیلے میں سے ایک ایک گلاس دُودھ، اور دو دو چار چار پیسے ہر ایک کو خرچنے کے لیے بھی ملتے۔ اسد اور اُس کے ابا کا گھر متوسط آمدنی والا گھر تھا مگر وہاں پہ چیزوں کی اور جگہوں کی چھوٹ تھی۔ چچا امیر تھے اور اُن کا گھر بھی بڑا تھا، مگر وہ چُپ چاپ اور الگ تھلگ رہا کرتے جیسے مقبرہ ہوتا ہے۔ اُن کے گھر کوئی بھی کھیلنے کو نہ آتا۔ اُس گاؤں سے صرف چند بچے ہی شہر کے سکول میں پڑھنے جاتے تھے، اور وُہ بھی پیدل۔ چنانچہ بائیسکل پہ ساڑھے تین میل ایک طرف اور اتنا ہی دوسری طرف کا کچی سڑک کا راستہ ہر روز طے کرنا پڑتا۔ سات میل کا یہ سفر کڑی تنہائی کا سفر تھا۔ بارش کے موسم میں کچے راستے کیچڑ میں بدل جاتے اور کیچڑ پہیوں کے ساتھ گھومتا ہوا آ کر مڈگارڈوں میں پھنس جاتا۔ وہ بھاری ہوتے ہوئے پیڈلوں پر زور لگائے جاتا، لگائے جاتا، حتیٰ کہ پہیے جام ہو جاتے۔ پھر کھڑے ہوئے سائیکل پہ توازن برقرار رکھنے کی کوشش میں ایک لحظہ پھڑپھڑاتا ہوا اگلا پہیہ —— اور وہ دھپ سے ایک پاؤں پہ کیچڑ میں گر پڑتا، پھر ٹانگ گھما کر سائیکل سے اُتر جاتا اور اُس کو کھینچتا ہوا راستے کے کنارے تک لے جا کر سٹینڈ پہ کھڑا کر دیتا۔ پھر وہ پاؤں کے بل بیٹھ جاتا اور ایک ہاتھ سے سائیکل کے ڈنڈے کو پکڑ کر دُوسرے ہاتھ کی انگلیاں مڈگارڈ کے کیچڑ میں گاڑ دیتا۔

"اُلّو کے پٹھے، حرامزادے"، وہ مڈگارڈوں کو دل میں اپنی بڑی بڑی گالیاں دیتا۔ ہر دو چار سَو گز کے فاصلے پر اُسے غیر متحرک، ہکلاتے ہُوئے سائیکل سے واسطہ پڑتا اور اُترنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔ ایسے موسم میں ہر دو سو چار سو گز پہ وہ پاؤں کے بل، ایک ہاتھ سے سائیکل کو تھامے دُوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے مڈگارڈ اور پہیے کے درمیان پھنسے ہوئے سمنٹ گاچی کے کیچڑ کو اُکھاڑ اُکھاڑ کر نکال رہا ہوتا جب کہ بارش کے چھینٹے اُس کے مُنہ پہ طمانچے مارتے۔ آنسوؤں سے مِل کر گردن پر اور سینے سے ہو کر پیٹ سے نیچے تک بہتے چلے جاتے۔ پھر تانگے اور گدّے چلتے اور کیچڑ میں گہری گہری کھائیں بنا ڈالتے جو بارشوں کا موسم نکلنے پر دھوپ میں سُوکھ کر سخت ہو جاتیں۔ اُس موسم میں گاؤں کا راستہ ایسی ایسی تنگ کھائیوں سے اَٹا پڑا ہوتا، جیسے سٹیشنوں کے ساتھ شنٹنگ کے علاقے میں لائنوں کا جال بچھا ہوتا

ہے، فرق صرف اتنا ہوتا کہ وہ زمین کے اُوپر ہوتی ہیں اور یہ زمین کے اندر۔ اِس راستے پر سائیکل چلانا جان جوکھم کا کام ہوتا۔ قدم قدم پہ یہ خدشہ کہ پہیہ کہیں کھال میں نہ پھنس جائے، اگر پھنس جاتا تو یُوں لگتا جیسے کسی تیز رفتار چلنی کے اُوپر جو آٹا پیسنے والی چکّیوں کے ساتھ لگی ہوتی ہے چل رہے ہوں پھر اُترے بنا چارہ نہ ہوتا۔ مادر چود۔ ایک دو برس میں اُس کی گالیاں بھی بڑی ہو گئیں اور وہ اُونچی آواز میں اور کبھی دل میں سوال کرتا، یہ سڑکیں ہیں مادر چود؟ تیز سفید دھوپ کی چادر آنکھوں کو لگتی اور ایک نہایت مہین سی گرد ہوا میں اُڑتی جس کی تہہ کی تہہ چہرے پہ بیٹھ جاتی اور جس پر آنسو کبھی کبھی نہروں یا نالیوں کی شکل بنا کر خشک ہو جاتے۔ گھر پہنچنے پر وہ سائیکل صحن میں کھڑی کر کے نلکے کی بجائے سیدھا اندر کی جانب جاتا۔ وہاں وہ دیوار پہ ٹنگے ہوئے شیشے میں ان نشانوں کو نہایت غور سے، آنکھیں کھول کھول کر اور گالوں کو انگلیوں سے کھینچ کھینچ کر دیکھتا اور اُن کے روز بروز بدلتے ہوئے نقشے پر حیران ہوتا۔ پھر چچا کا سامنا کرنے سے پہلے نلکے پر اُنہیں رگڑ رگڑ کر مٹا دیتا۔ چچا اُس حال احوال پُوچھنے کے عادی نہ تھے، بس کوئی ایک آدھ بات کبھی کبھار کر لیتے۔ اکثر وہ خود ہی خوش طبعی سے سکول کی، راستے کی اور گھر کی چھوٹی چھوٹی خوشگوار من گھڑت باتیں کرتا رہتا۔ ایک عرصے تک وہ یُوں ہی ایک بے نام سے احساس کے لیے رہتا گیا جس کے سر پیر کی بھی اُسے خبر نہ ہوتی (جس کو بعد میں (بہت بعد میں) اُس نے تنہائی کا نام دیا۔ حتّٰی کہ ایک روز وُہ بے وجہ طور پر غصّے سے تقریباً بلبلا اُٹھا۔ اُس نے اپنی چارپائی کے پایوں کو ٹھڈے مارے، باہر آ کر بلّی کو ایک زور دار ٹھڈا رسید کیا، پھر وہ گھر سے نکل کر کنوئیں کی جانب چل پڑا۔ رستے میں وہ چھوٹے بڑے ڈھیلوں اور رُوکھی سُوکھی جھاڑیوں کو ٹھڈے مارتا اور اکھاڑتا گیا۔ کنوئیں پہ وہ ایک شیشم کے درخت کے نیچے جا بیٹھا اور سوچنے لگا کیا ہی اچھا ہو اگر وہ واپس اپنے گھر جا کر رہنے لگے۔ اِس خیال کے آتے ہی اُسے گمان ہُوا کہ وہ واپس اپنے گھر میں پہنچ گیا ہے اور پہلے کی طرح وہاں رہ رہا ہے۔ بابا گھر میں چل پھر رہے ہیں، اور جہاں جہاں جاتے ہیں وہیں وہیں سے کبھی اپنے آپ سے کبھی اُس کے ساتھ باتیں کر رہے ہیں۔ اِس احساس سے اُس کے جسم کو بڑا آرام پہنچا۔ وہ آنکھیں موند کر درخت کے سائے میں لیٹ گیا اور لیٹتے ہی چند منٹ کے لیے گہری نیند سو گیا۔ جب اُس کی نیند کھُلی تو اُس کی آنکھیں ابھی بند تھیں اور وہ اُسی حالت میں پڑا تھا۔ باہر کی (جسم سے باہر کی) آوازوں سے اور پپوٹوں کے اندر سے آتی ہوئی روشنی سے پتا چلتا تھا کہ اُسے سوتے ہُوئے کوئی وقت نہ گزرا تھا، مگر اُس کا بدن اپنے دل کے گرد ایسے آرام اور سکوت کی حالت میں پڑا چل رہا تھا کہ خیال ہوتا تھا کئی گھنٹے کی نیند سے جاگا ہے۔ اُس کا ذہن شیشے کی مانند صاف اور شفاف تھا، اور اُس وقت اس کوری سطح پر دفعتہً ایک انکشاف اُبھرا ——— کہ ایک نایاب گُر اُس کے ہاتھ آ گیا ہے، کہ اب وہ جب بھی اور جہاں پہ بھی چاہے "آناً فاناً" میں پہنچ سکتا ہے اور جو چاہے کر سکتا ہے اور کوئی اُس کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا، کہ اِس پہ کوئی لاگت

نہیں آتی اور کوئی شے درکار نہیں ہوتی۔ بس آنکھیں بند کرنے کی دیر ہے، کہ جو کچھ وہ کسی وقت میں کر رہا ہوتا ہے وہی کچھ کرتے رہنے کی یا وہیں پر رہنے جانے کی اُس کو کوئی مجبوری نہیں ہے۔ اپنے گردوپیش سے اچانک آزادی حاصل کر لینے کی اس دریافت پر اُس کے اندر بجلی سی کوندگئی اور اُسے محسوس ہُوا جیسے اُس کے کندھوں پر ان دیکھے پر اُگ آئے ہوں۔ یہ پراُس بچے کے زمانے کی ایک نئی سمت تھی جو لامکان تھی، پر اس کے باوجود اُس کے لیے ایک پناہ گاہ کی صورت تھی۔ یہ اس سمت کا کمال تھا۔ پہلے پہل آنکھیں بھینچ کر ہی یہ سمت نظر آتی، پھر جب اعتماد پختہ ہوگیا اور اُسے اس بات کا یقین حاصل ہوگیا کہ اب یہ اُس کے ہاتھ سے نکل کر کہیں نہیں جاتی تو وہ آنکھیں کھول کر اس سمت کو دیکھنے اور اپنی مرضی کے مطابق اسے استعمال کرنے لگا۔ موہوم سا تخیل جیتے جاگتے خوابوں میں بدل گیا۔ یہاں سے کہانیوں کی دریافت کا سلسلہ شروع ہوا۔

کہانیاں پہلے اُس نے اپنے استعمال کے لیے ایجاد کیں، پھر دوسروں کی خاطر۔ پہلے کہانیوں میں صرف وہی ایک ہوتا جو مختلف جگہوں اور وقتوں اور مختلف صورتوں میں پیدا ہوتا اور منزلیں سر کرتا۔ پھر ان کہانیوں میں دُوسرے لوگ بھی شامل ہونے لگے، چھوٹے اور بڑے، اُس کے سکول کے ساتھی اور دوست اور اُستاد، اور کہانیاں لمبی ہوتی گئیں حتیٰ کہ ایک وقت آیا کہ وہ واقعے کو واقعے سے اور قصّے کو قصّے سے جوڑتا چلا جاتا اور کہانی ختم ہونے میں نہ آتی اور جیسے جیسے کہانی بڑھتی جاتی وہ فخر اور آزادی کے احساس سے پھولا نہ سماتا۔ اُس کی اس بات نے اُسے اپنے ساتھیوں میں بہت مقبول بنا دیا۔ ساتھیوں میں اُس کے ہم جماعت لڑکے تھے اور کسان مزارعوں کی لڑکی جو کنوئیں پہ رہا کرتی۔ لڑکی اسکی ہم عمر تھی اور وہ تقریباً ہر روز سہ پہر کے وقت کنوئیں کے عقب میں کیکر کے درخت کے نیچے بیٹھ کر اُس دہقان لڑکی کو لمبی لمبی بے معنی، مسحور کن کہانیاں سُناتا۔ مگر چند کہانیاں ایسی بھی تھیں جو اس نے صرف اپنی خاطر بچا کر رکھی تھیں۔ ان کہانیوں میں انسانی کردار صرف اُس کا اپنا ہوتا اور باقی سب چرند پرند اور درندے، کھیت اور جنگل، دریا، پہاڑ اور طوفان ہوتے۔ ان کہانیوں میں وہ ہمیشہ حیرتناک شجاعت کے کارنامے انجام دیتا اور یہ ایسی کہانیاں تھیں جنہیں وہ اپنے مشکل ترین وقت پہ استعمال کرتا۔ جب کبھی موسم شدید ہوتا یا راستہ سخت تو وہ اپنے آپ سے یا بائیسکل سے یا ویسے ہی ہوا میں منہ اُٹھا کر ان کو اونچی آواز میں دُہراتا۔ اس سے راستے کا سفر ذرا آسان ہو جاتا۔ چنانچہ گاؤں میں چچا کے گھر رہتے ہوئے اُس نے جن باتوں میں مہارت حاصل کی تھی کہانیاں اُن میں سے ایک تھیں۔

دُوسری بات اُس کی پڑھائی تھی۔ آٹھویں جماعت میں وظیفہ حاصل کر کے وہ ہائی سکول میں پہنچا۔ اُن کے گاؤں سے دو فرلانگ پر نہر بہتی تھی جہاں اس نے تیرہ سال کی عمر میں تیرنا سیکھا تھا۔ موسم ذرا کھلتا تو گاؤں کے دوسرے لڑکوں کے ساتھ وہ دن دن بھر نہر میں نہاتا رہتا حتیٰ کہ دھوپ اُس کی جلد کو جلا کر سیاہ کر دیتی۔ یہیں پہ وہ اُلٹا اور سیدھا، ایک ہاتھ سے اور ہاتھ پاؤں باندھ کر، بہاؤ کے ساتھ اور اُس کے مخالف تیرتے ہوئے پیراکی میں مشّاق ہوا تھا۔ ساون

اور بھادوں کی بارشیں شروع ہوتیں تو دیکھتے ہی دیکھتے نہر کا پانی پل کے ساتھ لگ کر بہنے لگتا، اور کبھی کبھی کوئی کنارا کہیں سے ٹوٹ جاتا تو اُن کا گاؤں تک پانی کی لپیٹ میں آجاتا۔ اُن دنوں میں اُس کا جی چاہتا کہ نہر کے اس بھنور کھاتے ہوئے تیز رفتار سمندر میں کود جائے اور دُور تک تیرتا ہوا چلا جائے۔ پانی کے معاملے میں خوف نام کی کوئی شے اُس کے پاس بھی نہ پھٹکتی تھی۔ مگر چچا اُن دنوں میں اُس کا تیرنا بند کر دیتے کہ سیلابی پانی میں سانپ پائے جاتے ہیں۔ وہ نویں میں تھا کہ اُن کے سکول سے تین لڑکوں کو بین السکول کھیلوں کے مقابلے میں حصہ لینے کے لیے پیراکی کی ٹیم کے طور چُنا گیا۔ اُن تین میں ایک اسد تھا اور ٹیم کا کپتان تھا۔ پیراکی کے مقابلے کمپنی باغ کے "تالاب میں منعقد ہوتے۔ پانی کا وہ کیڑا تھا، چار لمبائیوں کی دوڑ جیت گیا۔ اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف سکولز نے اُس کے ساتھ ہاتھ ملا کر ایک چھوٹا سا نکل پالش والا چمکدار کپ اُس کو پکڑا یا اور دوبارہ ہاتھ ملایا۔ چچا بھی وہاں تھے۔ انہوں نے مُسکرا کر آہستہ سے کہا "ویری گڈ"، اور اُسے ساتھ لے کر گھر لوٹ آئے۔ گھر پہنچ کر وہ سیدھا کنوئیں کی طرف نکل گیا۔ دہقان لڑکی جو پہلے کسی پالتو جانور کی طرح اُس کے پیچھے پیچھے چلی آتی، اب نہ آیا کرتی تھی، کہ آخر لڑکی تھی، کہانیوں کی عُمر سے جلد ہی نکل گئی، اسد کی طرح عمر بھر کے لیے اُن کے جھنجھٹ میں نہ پھنس گئی تھی۔ وہ کیکر کے نیچے جا کر بیٹھ گیا اور بیتابی سے اُس عجیب و غریب واقعے کو یاد کرنے لگا جو ابھی تھوڑی دیر پہلے پیش آیا تھا۔ اُس نے اپنے نام کی آواز کو فضا میں گونجتے ہوئے سُنا اور اس پر سینکڑوں لوگوں کو تالیاں بجاتے ہوئے دیکھا۔ پھر اُس نے دیکھا کہ وہ عظیم شخصیت اُس کو انعامی کپ پیش کر رہی ہے اور بیسیوں مہربان چہروں والے، خوبصورت چشمے لگائے ہوئے خوش لباس لوگ شفقت سے اُسے دیکھ رہے ہیں —— یہاں سے اُسے ایک نئی ڈگر مل گئی اور وہ سوچے سمجھے بغیر اُس پہ نکل پڑا۔ اُس نے دیکھا کہ وہ ایک جہاز کے عرشے پہ کھڑا ہے اور اُس نے نیلے رنگ کے ریشم کا جانگیہ پہن رکھا ہے جب کہ سمندر پہ دھوپ چمک رہی ہے۔ اچانک اُس کو دور ایک جزیرہ دکھائی دیا اور وہ کسی کو بتائے بغیر ہوا میں ہاتھ سیدھے کر کے سمندر میں کود گیا۔ ایک طاقتور مچھلی کی طرح کبھی سطح سمندر کے نیچے کبھی اوپر تیرتا ہوا وہ جزیرے کی طرف بڑھنے لگا، مگر جزیرہ جو پہلے وہاں سے قریب ہی معلوم ہوتا تھا اب پیچھے ہی پیچھے ہٹنے لگا۔ مگر پریشانی یا گھبراہٹ کے نام سے وہ واقف نہ تھا۔ تن تنہا وہ جوش کھاتے ہوئے سمندر سے لڑتا، غوطہ لگا کر لہروں کی دیواروں کے نیچے سے نکلتا، ایک دن اور ایک رات تک مسلسل اور بے تکان تیرتا رہا حتیٰ کہ اگلے روز صبح صادق کے وقت جزیرے کے ساحل پر جا کھڑا ہوا۔ ساحل پہ اُس کے استقبال کی خاطر جزیرے کے سب لوگ جمع تھے۔ اُس مجمعے کی سربراہی جو لوگ کر رہے تھے ان کی لمبی لمبی سفید داڑھیاں تھیں اور انہوں نے قیمتی چوغے پہن رکھے تھے۔ سر پہ اُن کے سُرخ پگڑیاں تھیں اور آنکھوں پہ نازک فریموں والے چشمے۔ انہوں نے اسد کے ساتھ ہاتھ ملایا اور شفقت سے اُسے دیکھتے رہے۔ پھر انہوں نے اُس کو ایک بہت بڑا سونے کا

کپ، جو اُس کی کمر تک آتا تھا، پیش کیا جس پر یہ الفاظ کھدے تھے: "اسد کریم۔ جس نے کسی کو بتائے بغیر، تن تنہا، بیس گھنٹے تک تیر کر جہاز سے جزیرے تک کا راستہ طے کیا۔"

وہ زیادہ دیر وہاں رُکا نہیں، اُسے اپنا جہاز پکڑنا تھا۔ چنانچہ اس نے اُن شفیق چہروں والے بزرگوں کا شکریہ ادا کیا اور کپ کو بغل میں دبا کر واپس سمندر میں کُود پڑا۔ اب جہاز، کچھ فاصلے اور کچھ دھند کی وجہ سے، آنکھوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ مگر اُسے قریب قریب اُس سمت کا پتا تھا جس طرف کو جہاز نکل گیا تھا۔ چنانچہ کچھ اپنے علم اور کچھ چھٹی حس پر اعتماد کرتا ہوا وہ ایک بازو کی مدد سے "تیرتا" جہاز کی سمت میں بڑھنے لگا۔ سارا دن اسی دھند آلود سمندر میں نکل گیا، حتیٰ کہ رات پڑ گئی اور پورے بارہ گھنٹے کی سخت پیراکی کے بعد پہلی بار اُسے دھند میں سے جہاز کی روشنیاں نظر آئیں۔ وہ ایک بازو کی پوری قوت سے تیرنے لگا، مگر جہاز آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔ ساری رات جہاز کے تعاقب میں بسر ہوئی۔ صُبح جب ہوئی تو سمندر رُک گیا تھا اور جہاز سے اُس کا فاصلہ چند سو گز کا رہ چکا تھا۔ وہاں سے اُس نے دیکھا کہ جہاز کے سارے مسافر اور عملہ عرشے پر جمع ہیں اور سب کی نظریں اُس پر لگی ہوئی ہیں۔ کئی لوگ دُور بینوں کی مدد سے اُس کی حیرتناک مہم جوئی کا نظارہ کر رہے ہیں اور کئی کیمروں سے تصویریں اُتار رہے ہیں۔ مگر خاموشی کا ایک عالم تھا کہ پُرسکون پانی کی سطح پہ ہوا کی آواز بھی سُنائی دیتی تھی۔ اُس نے "تازہ تازہ" دھوپ میں چمکنے کا کپ ایک ہاتھ سے اُٹھا کر سر کے اُوپر لہرایا، اور اُس مجمعے میں سے دفعتہً ایک مہیب نعرہ بلند ہوا۔ رسّی کی سیڑھی پھینکی گئی، جس کو ایک ہاتھ سے پکڑ پکڑ کر وہ چشم زدن میں عرشے پر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر اُس نے سونے کا کپ ان لوگوں کے درمیان جا رکھا اور ایک طرف کو کھڑا ہو گیا۔ اب سب لوگ، مرد، عورتیں اور بچے، اُس کے گرد جمع ہو گئے اور حیرت سے کبھی اُسے اور کبھی کپ کو دیکھنے، تالیاں بجانے اور اُس کی پیٹھ تھپکنے لگے۔ اس ہجوم میں کہیں بابا بھی تھے جو اُس کے برابر آ کھڑے ہوئے اور اُس کے شانوں کے گرد بازو ڈال کر تصویر اُتروانے لگے۔ اور پرے کہیں چچا کا چہرہ بھی تھا جو قہقہے لگا رہا تھا اور خوشی کے مارے ناچ رہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ یہ کہانی اُس کے اپنے لیے تھی۔ اُس نے دل میں فیصلہ کیا۔ بعد میں اس میں ردّوبدل ہو گی، بڑی بڑی مچھلیاں اور دوسرے سمندری درندے جن کے ساتھ اُس کی جنگ ہو گی مگر جو صورت بھی بنی اس کہانی کو وہ خاص اپنے لیے رکھے گا۔ رات کو اُس نے چچا کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا اور خاموشی سے سونے کے لیے چارپائی پر چلا گیا۔

(تکیے پر سر رکھ کر اُس نے آنکھیں بند کیں تو کمرے کی دیوار کے ساتھ، حسبِ معمول بندوق کھڑی تھی جس کی نلی اُس کی پہنچ میں تھی۔)

میٹرک کے امتحان میں اُسے دو سال کا وظیفہ ملا جس پر وہ اپنی یونیورسٹی کے کسی بھی کالج میں داخلہ لے سکتا تھا۔

وہ لاہور جانا چاہتا تھا، مگر چچا نے اِس بات پر منع کر دیا کہ بہت دور ہے۔ اس کی بجائے وہ اپنے نزدیکی بڑے شہر کے کالج میں داخل ہو گیا جو گاؤں سے بیس میل کے فاصلے پر تھا۔ اُس نے ہوسٹل میں رہنا چاہا مگر چچا نے اجازت نہ دی، چنانچہ وہ بائیسکل پر اپنے شہر کے سٹیشن تک جاتا، سائیکل کو چچا کے ایک دوست کی دکان پر کھڑا کرتا اور ریل گاڑی پکڑ کر اگلے شہر پہنچتا۔ کبھی کبھی جب موسم اچھا ہوتا اور اُس کی طبیعت خوشگوار ہوتی تو وہ سائیکل پر ہی بیس میل کا فاصلہ طے کرتا۔ اُس کے شہر سے اگلے شہر تک پکی سڑک تھی اور کالج سڑک کے کنارے پر تھا۔ سکول اور کالج کی فضا کا فرق ایک اَن سُنے دھماکے کی طرح اُس کو لگا۔ کالج میں نئے ساتھی ملے، اور ایک دوست ریاض، جو ہوسٹل میں رہتا تھا اور ایک بڑے زمیندار کا بیٹا تھا۔ وہ اپنے خالی پیریڈ ریاض کے ہمراہ کالج میں گھومتے ہوئے یا ہوسٹل کے کمرے میں گزارتا۔ تاریخ، معاشیات اور اُردو اُس کے مضمون تھے۔ اُن دنوں میں اُردو شاعری کو اُس نے پہلی بار پڑھا۔ ایک کالج کی دُنیا تھی، ایک شاعری کی —— ایک آزادی جسم کی اور ایک ذہن کی —— اور اِن دونوں کے ملاپ کی فضا ایک پیراکی کی تھی۔ شہر کے کسی دولت مند نے دو سال پہلے کالج کو ایک سوئمنگ پول بنوا کر دیا تھا جس میں سفید کنکریٹ کی سیڑھیاں شیشے کی مانند پانی میں اُترتی تھیں اور سفید فرش ایک سرے سے دوسرے سرے تک ڈھلوان جاتا تھا۔ تالاب کے گرد جنگلا بنا تھا جس پر ہاتھ رکھ کر نوجوان آنکھوں والے لڑکے پہروں تک پانی میں جھلملاتے ہوئے فرش کو دیکھتے رہا کرتے تھے۔ اور گہرے پانی والے سرے کے اُوپر بارہ فٹ کی بلندی پر، بیدی کی طرح تھرتھراتا ہوا تختہ نصب تھا۔ یہ کیا تھا؟ اِس سے پہلے اُس نے کبھی اُونچائی سے پانی میں سر کے بل غوطہ نہ لگایا تھا، نہ نہر کے پُل سے دیکھیں سے، صرف کسانوں کی طرح نہر کے کنارے سے ٹانگیں پھیلا کر پانی میں چھلانگیں لگائی تھیں مگر پانی کے گُر اس کے بدن میں موجود تھے، تختے سے غوطہ لگانا اُس کو کسی سے سیکھنا نہ پڑا۔ صرف ایک بار اُس نے ایک لڑکے کو ہوا میں ہاتھ اٹھا کر تختے سے اُچھلتے اور غوطہ لگاتے ہوئے دیکھا اور بس۔ وہ جانگیہ پہن کر اس لرزاں تختے پر جا کھڑا ہوا اور وہاں اُس نے ہاتھ اٹھائے، جیسے ناچ شروع کرنے کے لیے بازو آسمان کی جانب بلند کرتے ہیں، اور ہوا میں کُود کر، نیم قلابازی کی شکل میں بدن کا رُخ پانی کی سیدھ میں کیا جیسے شکاری پرندے کبھی زمین کا نشانہ باندھ کر ہوا میں ایک لمبا اور تیز غوطہ لگاتے ہیں، اور تیر کی طرح سطح کو چیرتا ہوا اُس کی مخملیں تہوں میں دُور تک اُتر گیا۔ اندر اُس نے آنکھیں کھولیں اور بڑی سی بادامی رنگ کی مچھلی کی طرح، مچھلی کی سی آزادی اور سہولت کے ساتھ پانی کے اندر گھومتا پھرتا، وقفے وقفے پر ہوا کے بُلبلے چھوڑتا، فرش کو قریب سے دیکھتا چاروں دیواروں پر گھوم گیا۔ پھر سیڑھیوں کے پاس پہنچ کر اُس نے سر پانی سے نکالا اور جنگلے پر جھکے ہوئے چند لڑکے دم بخود رہ گئے۔ ایک اصل نسل پیراک آبی سہولت جس کے بدن کا جزو تھی، اُن کے درمیان وارد ہوا تھا، جس کو پانی کے اندر اپنے دم پر اتنا اختیار

تھا کہ باہر کھڑے ہونے والوں کو گھبراہٹ ہونے لگی تھی۔ ایک بار غوطہ لگانے کے بعد ایک بار پھر، اور پھر، اور پھر اپنے آپ کو روکنا جیسے اُس کے لیے دشوار ہو گیا۔ وہ قوت اور وہ آزادی —— پانی کی ملائم اور گھنی تہوں کو نشتر کی سی تیزی اور صفائی کے ساتھ چیرتے ہوئے، جُدا کرتے ہوئے دور تک داخل ہوتے جانے کا عمل، وہ تہیں جو جُدا ہونے پر ڈھے نہ جاتیں بلکہ اپنے دبیز گدوں پہ اسے سہارتیں اور چشم زدن میں اُس کے بدن کو ہلکا پھلکا اور حرکت سے بے نیاز بنا دیتیں کہ وہ اپنے پیٹ پہ، اور کبھی پلٹ کر اپنی پشت پر بے وزن پڑا چھوٹی چھوٹی لہروں پہ بہتا اور ہچکولے کھاتا رہتا، اور پھر ان سب سے اوّل، شروع میں، ہوا میں لپکتی، ہوا کو پھاندتی ہوئی، ہوا میں قوس بناتی ہوئی، انگلیوں کے پوروں سے پاؤں کی ایڑیوں تک محیط، مدار سے محور کو لے کر جاتی ہوئی طویل چھلانگ ! —— وہ قوت اور وہ آزادی اُس کے دل میں اُتر گئی، یہاں تک کہ اب بدن کی قوس کے منتہا تک پہنچنے سے پہلے ہی نیچے جل تھل پانی کی سطح میں، سوئی کے ناکے ایسے مہین ایک نقطے پہ اُس کی نظر بندھی ہوتی، اور یہ وُہی نقطہ ہوتا عین جس کے اُوپر وہ سطح آب میں داخل ہوتا۔ ایک لحظے کو وہ آنکھیں موندتا، پھر کھول دیتا۔ آج تک نہر کے گدلے پانی میں ڈبکی لگانے کی دُنیا اُس کے واسطے اندھیری رات کی دُنیا رہی تھی جہاں آنکھ کھولنے کی ہمت نہ ہوتی۔ اب وہ اس طرح آنکھیں کھول کر پانی میں سفر کرتا جیسے شیشے میں دیکھ رہا ہو۔ ہر روز کلاسیں ختم ہونے کے بعد وہ وہاں پر موجود ہوتا جب تک کہ جاڑوں کا موسم شروع ہونے پر کالج والے تالاب کو خالی نہ کر دیتے۔ ہر روز سہ پہر کی دُھوپ میں اُس کا پتلا اور لمبا، سیدھا بدن اپنے آپ میں مگن، صرف اپنے اور پانی کے ایک نقطے کے درمیان والے فاصلے سے باخبر، ہوا میں مُعلق تختے پر کھڑا نظر آتا۔ پھر بڑی آہستگی سے بازو ہوا میں اُٹھتے اور ایک لحظے سے بھی کم مدت میں، جیسے بجلی کوند جائے، اُس کا پچھا پنجا جی اٹھتا اور وہ بانا بُرا آہستگی ایک حیرتناک سرعت کے جبر میں بدل جاتی۔ اس طرح وہ گویا کسی اَن سُنے سازینے کی دُھنوں پر حرکت کرتا ہوا غوطے پہ غوطہ لگاتا چلا جاتا۔ اب وہ یاد کرتا تو وہ وقت شاید اُس کی زندگی کا خوشگوار ترین وقت تھا۔

یہیں پہ پہلی بار اُس کی سانس ٹوٹی تھی۔ اسی طرح وہ ایک غوطہ لگا کر اُبھرا تھا اور پانی کے اُوپر اپنی پشت پر لیٹا ہولے ہولے ہاتھوں اور پاؤں کے چپّو چلا رہا تھا کہ سانس اُکھڑنی شروع ہوئی، جیسے اُس کا کچھ حصہ اندر ہی اندر گم ہوتا جا رہا ہو۔ پہلے کم کم مبہم معلوم سی، پھر کچھ اور، پھر اور زیادہ۔ کچھ ایسا احساس کہ کوئی کا خشک تنکا چھاتی میں پھنس گیا ہے اور سانس کو جذب کرتا جا رہا ہے۔ اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ اُس نے گہرا سانس لینے کی کوشش کی مگر لیا نہ گیا۔ وہ تالاب سے نکل کر کنارے پہ بیٹھ گیا، اُس نے گھٹنے اُٹھا کر بازو اُن کے گرد باندھے اور پیشانی گھٹنوں پہ رکھ کر سانس جاری کرنے کی کوشش کی۔ جو سانس بھی وہ کھینچتا وہ آدھی اندر رُک جاتی، پھر آدھی

سے زیادہ رُکنے لگی۔ یُوں معلوم ہوتا کہ پسلیوں کی درازوں میں ٹھونس ٹھونس کر سانس کو بھرا جا رہا ہے، جیسے کسی تھیلے میں رُوئی کو بھرا جاتا ہے، پھر تھیلے کا مُنہ مروڑ کر اُس کا گلا بنایا جاتا ہے اور گلے پر کس کر رسّی کی گانٹھ دی جاتی ہے۔ اُس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیا کرے، کہاں جائے۔ خوف کے مارے اُس کی سوچ معطّل ہو گئی تھی۔ اسے خیال آیا کہ وُہ مر رہا ہے۔ اگر وہ چلے پھرے، کہیں چلا جائے، کچھ نہ کچھ کرنے لگے تو شاید یہ وقت ٹل جائے، مگر جب اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو ہل بھی نہ سکا۔ کچھ دیر کے بعد اس میں بیٹھنے کی ہمّت بھی نہ رہی۔ تالاب کے کنارے، کنکریٹ کے فرش پہ لیٹے لیٹے اُس نے دھوپ میں دمکتے ہُوئے نیلے اور انتہائی بلند آسمان کو حیرت سے دیکھا، جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو، بہت اُونچی اُڑتی ہوئی تین چیلوں کو دیکھا، اور دہشت کے آنسو اُس کی کنپٹیوں پر بہتے ہُوئے کانوں میں ٹپکتے رہے۔

پھر اچانک یہ ریلا گزر گیا۔ چھاتی کی سُوجن آہستہ آہستہ کم ہونے لگی اور سانس واپس آنے لگی۔ بہت آہستہ آہستہ، احتیاط کے ساتھ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور غور سے اپنے بدن کو دیکھنے لگا۔ اُس کا بدن پہلے کی طرح تندرست تھا۔ وہ اُٹھ کر کھڑا ہوا۔ اُس کی کمر اور ٹانگوں کی قوّت برقرار تھی۔ اُس کی سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا کہ کیا گزری ہے۔ اُس کے بدن پر اس واردات نے کسی قسم کے اثرات نہ چھوڑے تھے۔ اُس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ اُس وقت، جب وہ لیٹا آسمان کو دیکھ رہا تھا اُس کے علاوہ تالاب پر اور کوئی نہ تھا۔ چند گھنٹوں میں وہ اس واقعے کو بھول گیا۔ تین ہفتے گزر جانے کے بعد یہ واقعہ دوسری بار پیش آیا، بالکل پہلی والی شکل میں، ایک غوطے کے عین بعد۔ اب کی بار سانس کا ریلا کچھ زیادہ دیر تک رہا، لیکن اب وُہ پہلے کی طرح خوفزدہ نہ ہوا۔ اب کے اُسے شک ضرور گزرا کہ یہ کوئی اتفاقیہ بات نہ تھی، بلکہ کسی قسم کی بیماری تھی جس کا اُسے علم نہ تھا۔ پھر بھی اُس نے کسی سے اِس کا ذکر نہ کیا۔ اُسے دل میں کچھ ایسا خیال تھا کہ اگر کسی کو اس کا علم نہ ہو پایا تو یہ شاید اُسے چھوڑ جائے گی۔ اب بہرحال اُس نے تختے سے غوطے لگانے چھوڑ دیے، بس ہولے ہولے تیرا کرتا۔ جب اس پر تیسری بار حملہ ہوا تو اُسے کالج کے ڈاکٹر کے پاس جانا پڑا۔ پانچویں حملے کے بعد ڈاکٹر نے اُسے سپیشلسٹ کے پاس بھیج دیا۔ دَورے نہ رُکے۔ یہ بھلا کیسی علّت تھی؟ یہ سانس کی بیماری کی ایک شکل تھی مگر کیسی شکل تھی۔ سپیشلسٹ نے اچنبھے اور مایوسی سے سر ہلا کر اپنی کم علمی کا اظہار کیا، اِس شکل سے وہ آشنا تھا۔ دَوروں کی رفتار، اُن کا اختصار، اس کے دُوسرے اطوار اُس کے تجربے میں نہ آئے تھے۔ بہرحال، اُس نے کہا، مکمل طور پر تو یہ علّت قریب قریب لاعلاج تھی، مگر پرہیز سے، یا قسمت کے زور سے، کافی حد تک قابو میں رکھی جا سکتی تھی۔

اُسے کہا گیا کہ وہ تیرنا، تیزی سے سائیکل چلانا یا اونچائی کی طرف بھاگنا ترک کر دے۔ ہدایت ہوئی کہ معتدل رفتار پر لمبی سیر کی جائے۔ اُس نے معتدل رفتار پر لمبی سیر کرنا شروع کر دی۔ اونچائی سے غوطہ لگانے کی اُس کے دل میں کبھی

کبھی حسرت پیدا ہوتی، مگر اس سے بھی زیادہ حسرت اُس کو اپنی پرانی دنیا کی ہوتی جس پر اُس کی گرفت اب ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ پہلے وہ جہاں پر بھی ہوتا، جو کچھ بھی کر رہا ہوتا، کرتا رہتا، اور ساتھ ہی ساتھ اُس کو چھوڑ چھاڑ کر کہیں اور بھی چلا جاتا اور کچھ اور کرنا شروع کر دیتا۔ اب وہ ضبط ناپید تھا۔ سانس کا ریلا جب آتا تو وہ جتنی بھی جدّ و جہد کرتا اس کے حصار سے نکل نہ سکتا۔ اُسے معلوم ہوا جیسے وقت کی رفتار تھم گئی ہے۔ نہ کوئی واقعہ، نہ قصہ نہ کہانی۔ وقت نہ آگے چلتا تھا نہ پیچھے، بس جسم کی اذیت میں بدلتا جاتا تھا۔ بالآخر اُسے معلوم ہوا کہ دل کی اُڑان والی وہ عجوبہ سمت جو اپنی حکمتِ عملی سے اُس نے دریافت کی تھی، جس کے ساتھ وہ وقت کے جبر کا مقابلہ کیا کرتا تھا اور کبھی کبھی اُسے تسخیر کر لیتا تھا جسم کی بدامنی کے بہانے ڈھے گئی تھی۔ عجیب بات تھی کہ کچھ عرصے کے بعد خود اُس کے دل میں واپس وہاں جانے کی خواہش ماند پڑنے لگی جیسے کہ اُس کی کشش محض ظاہری کشش تھی جو ابتلا کے ایک اصل مقام پر ریزہ ریزہ ہو گئی تھی۔

قریب قریب اُسی وقت سے کتابوں کی دریافت کا سلسلہ شروع ہوا۔ اُن جادو کی پٹاریوں میں ایک ایک جہان دفن تھا جس کی بازیافت کو نہ کلید درکار تھی نہ کانٹا، جن تک پہنچنے، چلنے پھرنے اور بھیس بدلنے کا عمل تنہائی میں بلا شرکتِ غیرے، از خود مکمل تھا۔ اِس پڑھائی نے اُس کی طالب علمی کو فائدہ پہنچایا۔ پہلے سال کا امتحان اُس نے آسانی سے پاس کر لیا۔ اگلے سال، گرمیوں کی چھٹیوں کے فوراً بعد، اُس نے ریاض کی حمایت میں، جو یونین کا جوائنٹ سیکرٹری کھڑا ہوا تھا، کالج کے الیکشنوں میں زور شور سے حصّہ لیا۔ یہ اُس کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ عمر میں پہلی بار اُس نے اپنے ذاتی عمل سے نکل کر کسی اجتماعی جدّ و جہد میں حصّہ لیا تھا۔ ایک واضح اور ٹھوس منزل کی جانب اجتماعیت کے اِس سفر نے ایک انوکھی کیفیت سے اُسے روشناس کرایا۔ ایک گروہ کا حصّہ ہونے پر جو سہولتیں اور آزادیاں اُس کو حاصل ہوئیں اُن سے وہ اب تک نابلد رہا تھا۔ پہلی بار اُس کو پتا چلا کہ اُس کے دل میں عمر بھر سے شاید، ایک نامعلوم سا غصّہ دبک کر بیٹھا ہوا تھا جس کو باہر نکلنے کا کبھی موقع نہ ملا تھا۔ اِس کا علم اُس کو ایک ایک لڑکے کے پاس جا کر کنویسنگ کرتے ہوئے مخالف گروہوں کے ساتھ مقابلوں، مناظروں اور تُو تُو مَیں مَیں کے دوران ہوا۔ اکثر وہ چھوٹی سے چھوٹی بات پر بھڑک اُٹھتا۔ (جب وہ مقابلہ ہار گئے تو کالج کے باہر اُن کے اور دو مخالف گروہوں کے درمیان بڑے زور کی، ہاکیوں اور بیٹل کے مکّوں سے، تین طرفہ لڑائی ہوئی جس میں اُس کا سر پھٹ گیا۔ کالج کے پرنسپل نے کمشن کر پولیس کی مداخلت کو روک دیا، اور اسد سمیت چار لڑکوں کو، جن کے سر لڑائی شروع کرنے کی ذمّہ داری آئی، ایک ایک سو روپیہ جرمانہ کیا، جو اُس زمانے میں کبھی سنا بھی نہ گیا تھا۔) ایک سرکشی تھی جو عجب تسکین بخش طور پر اُبھرتی اور اُسے بڑی جماعت کے لڑکوں اور اُستادوں تک سے سوال جواب کرنے کی ہمّت دیتی، اُس کے سینے میں تنہائی کی پھانس کو نرم کرتی۔ اُس کی سرکشی کی بھی ایک پُرکار کہانی تھی جس کا تعلق بغاوت سے کم اور عقلِ سلیم سے زیادہ تھا۔ اُس زمانے میں اُس کی سمجھ میں نہ آتا کہ ایک بات —— کوئی بھی بات

___ جو اُس کے سامنے صاف سیدھی اور عام فہم ہوتی، لوگوں کی عقل میں کیوں نہ آتی تھی۔ صرف یہی نہیں کہ لوگ اس سے انکار کرتے، بلکہ ایک بات جو صریحاً غلط ہوتی اُسے مانتے چلے جاتے، اُس کے جواز ایجاد کرتے۔ اس بات کا بھی اُس کو کبھی بعد میں پتا چلا کہ فہم کی عجیب عجیب شکلیں ہیں جو اپنی اپنی حاجتوں پہ قائم ہوتی ہیں، جن کا اپنا ایک اسرار ہوتا ہے جو فریب در فریب کام کرتا ہے۔ اور یہ بات اُس کو زندگی کی اور ساری باتوں میں سب سے زیادہ افسوسناک معلوم ہوئی کہ آدمی کا فہم نہر کے گدلے پانی کی طرح ہے، جس کے اندر جاؤ تو اندھیری رات ہوتی ہے، اور اندھا دھند چلتے، ہاتھ پاؤں سے ٹٹول کر اندازہ کرتے جاؤ کہ محض دم باندھنے کی مہم ہے، نہ کوئی حیرت نہ سراغ، نہ دریافت نہ کوئی جستجو۔ اس زمانے میں بہرحال، لوگوں کے دو بدو ہو کر، اُن سے الجھ اُلجھ کر، اُن کے انفعال اور تحکم کا راز، اور اس راز کا کھوکھلا پن اُس پہ عیاں ہوتا گیا۔

اس انوکھی اُٹھان کا یہ دور بھی ایک جھلک دکھا کر، اپنے سبق سکھا کر گزر گیا۔ اُسی سال کے جاڑوں میں دورے اس رفتار اور اتنی شدت سے آنے لگے کہ اسے کالج چھوڑنا پڑا۔ چچا نے بے دریغ پیسے خرچ کیے، لاہور تک ڈاکٹروں کے پاس اُسے لے کر گئے، جواب ایک ہی: کہ اس بیماری کے اطوار انوکھے ہیں، یقینی طور پر صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ سانس کی بیماری کی ایک قسم ہے۔ اس کا جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ناممکن ہے۔ کبھی کوئی قسمت والا، عمر کے ساتھ، قدرتی طور پہ اس سے چھٹکارا پا جائے تو پا جائے، مگر کبھی کبھار۔ پھیپھڑے کی دیواروں پر بننے والی رطوبت کی تھیلیوں کو خشک کرنے کے لیے ٹیکے ہیں، دوا کی گولیاں ہیں، سانس کے ساتھ اندر کھینچنے والے عرق کے کیپسول ہیں، جن کے استعمال سے مسلسل افاقے کی صورت نکالی جا سکتی ہے۔ جسمانی تکلیف بہرحال سہارنی پڑے گی، آگے اپنی اپنی قسمت۔ مایوسی کی کوئی بات نہیں، نوجوانی میں اس کے کوئی ضرر رساں یا دیرپا اثرات نہیں ہوتے، صرف ذہنی حالت درست رکھنے کی ضرورت ہے، وغیرہ وغیرہ۔

کچھ لوگ ہوں گے جو تکلیف کے عادی ہو جاتے ہیں۔ وہ نہ ہو سکا۔ دورہ جب ہوتا تو پانچ منٹ کیا اور کیا پانچ گھنٹے، جان حلق میں اٹک جاتی، دماغ ماؤف ہونے لگتا۔ جب گزر جاتا تو گردن سے لے کر کمر تک کی ہڈیاں درد سے چور ہو جاتیں، جیسے بیلوں کی جگہ رہٹ کر دن بھر کنوئیں کے چکر لگاتا رہا ہو، نیند کی بے روک خواہش سارے بدن پہ چھا جاتی۔ حتیٰ کہ عقیدہ ٹوٹ گیا، گو امید نہ ٹوٹی۔ ڈاکٹروں کے بعد حکیموں کی، پھر ٹونے ٹوٹکے اور تعویذ گنڈے والوں کی باری آئی۔ گرما کا ایک موسم بیت گیا۔ وہ کتابیں پڑھتا، کبھی کبھار کوئی معمولی سی نظم لکھنے کی کوشش کرتا، اور کھیتوں میں پھرتا رہتا۔ آخر ایک روز گمشدہ حکیم کی خبر اُن کے کانوں تک پہنچی۔

خبر لانے والے نے کہا کہ حکیم کوئی ایسی مشہورِ زمانہ شخصیت نہ تھی، مگر آس پاس کے دس بیس گاؤں میں اُس کا بڑا

پھر چاتھا۔ کہا جاتا تھا کہ اُس کے پاس کچھ لاعلاج بیماریوں کے، جن میں سانس کی بیماری بھی تھی، چند نُسخے بھتے جو آزمودہ تھے۔ کیوں نہ اس کا علاج بھی کر کے دیکھ لیا جائے ؟ کہتے ہیں غرض مند اندھا ہوتا ہے۔ چنانچہ اگلی گرمیوں کے موسم میں اسد نے رختِ سفر باندھا اور گھر سے چل پڑا۔

گاڑی سے وہ راولپنڈی پہنچا۔ وہاں سے بس لے کر آزاد کشمیر کو روانہ ہوا۔ کئی گھنٹے کے سفر کے بعد ایک جگہ پر بس کو چھوڑ کر خچر کے ذریعے دریا کے ساتھ ساتھ پہاڑی راستے پر چل دیا۔ یہ کم و بیش دس میل کا راستہ اوپر ہی اوپر کو چلا جاتا تھا۔ جُوں جُوں وہ اونچائی پہ چڑھتا گیا ہوا میں ٹھنڈک آتی گئی۔ کچھ چڑھائی کا سفر، کچھ ہوا کی لطافت، سینے پہ کام بھاری آپڑا۔ ہر میل دو میل پہ رُک کر وہ ایک کیپسول کو سپن ہیلر میں بھرتا، پھر سپن ہیلر کو مُنہ کے اندر ڈال کر کیپسول کو توڑتا، اور دوا سے تر حلق کے راستے سانس اندر کی طرف کھینچتا۔ اس طرح دم بھرتا ہوا وہ آگے بڑھتا رہا۔ اس بلندی پر پہنچ کر خنکی اتنی بڑھ گئی تھی کہ اُسے سویٹر نکال کر پہننی پڑی۔ یہاں پر چیڑ کے جنگل گھنے ہونے شروع ہو گئے تھے۔ سامنے والے پہاڑ پر سے دیودار کے کاٹے چھانٹے ہوئے تنے سینکڑوں کی تعداد میں لڑھکائے جا رہے تھے۔ ہزاروں فٹ کی بلندی سے لڑھکتے ہوئے اگر یہ مہیب تنے، تنکوں کی مانند نیچے دریا میں گرتے اور پانی کے بہاؤ پر ڈوبتے، اُبھرتے ہوئے اپنی منزل کی طرف روانہ ہوتے۔ اسد کچھ دیر تک رُک کر اس منظر کو دیکھتا رہا۔ کبھی کبھار کوئی فوجی جیپ اُس راستے پر سے گزر جاتی۔ چند میل پر اسے جیپ کا راستہ بھی چھوڑنا پڑا۔ اب وہ ایک تنگ سے پتھریلے راستے پر جا رہا تھا جو پہاڑ کے پہلو میں چکر کھاتا ہوا اُوپر چڑھتا تھا۔ وہ ایک آدھ کوس ہی گیا ہو گا کہ شام پڑ گئی۔ اسد اور اُس کا خچر مزدور محکمۂ جنگلات کے ڈاک بنگلے میں پہنچے جہاں سے گاؤں بنام گشتہ ابھی مزید سات آٹھ سو فٹ کی بلندی پر تھا۔ یہاں پر شاہ رُخ نے اسد کو رات بسر کرنے کی دعوت دی جو اُس نے بخوشی قبول کر لی۔ وہیں سے اُس نے اپنے رہبر کو مزدوری دے کر رخصت کیا جو اپنے خچر کو لے کر واپس شہر کو ہو لیا۔ یہ شاہ رُخ سے اُس کی پہلی مُلاقات تھی۔ وہ رات گئے تک بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ شاہ رُخ اُس کو جنگلات کی زندگی کے پُرلطف واقعے، اور اُس گاؤں کے انوکھے نام کی تاریخی وجوہات کے قصّے سناتا رہا۔ حکیم کے بارے میں شاہ رُخ نے صرف اتنا کہا: "جتنے مُنہ اُتنی باتیں۔ مگر یہ اپنی اپنی حاجتوں کا معاملہ ہے، کیا معلوم کہاں سے پُوری ہو جائیں۔ تم خود ہی آزما کر معلوم کر لینا۔"

حکیم چھریری سفید داڑھی والا دُبلا پتلا آدمی تھا۔ اُسے چچا کا خط مل چکا تھا، نہایت خندہ پیشانی سے پیش آیا۔ مطب کے عقب میں، مریضوں کے ٹھہرنے کے واسطے مخصوص تین کمروں میں سے ایک اسد کو دے دیا گیا۔ وہاں پر اپنا سُوٹ کیس اور بستر رکھ کر وہ مطب میں آن بیٹھا۔ اُس کے کھانے کا انتظام، حکیم نے بتایا، حکیم کے ایک مزارعے کے گھر سے ہو گا۔ اسد نے جھجکتے ہوئے معاوضے کے بارے میں پُوچھا۔ معاوضہ نام کی یہاں کوئی چیز وصول نہیں کی جاتی، حکیم نے عجیب نرمی اور

سختی کے ملے جُلے انداز میں جواب دیا ۔ یہ تکلیف رفع کرنے کا مقام ہے ، یہاں سب کچھ اللہ اور انسانیت کے نام پر کیا جاتا ہے ۔

اگلی صبح ، فجر کے وقت ، نہار مُنہ حکیم نے اپنے دونوں ہاتھوں سے ، باری باری آنکھیں میچ کر اُس کی دونوں کلائیوں کی نبضیں دیکھیں ، آنکھوں کی پتلیوں کا غور سے معائنہ کیا ، سینے کے ساتھ کان لگا کر سانس کی آواز کو سُنا ۔ اس میں کوئی دس منٹ لگ گئے ۔ پھر حکیم نے اپنی الماری کھول کر بیچ والے خانے سے ایک کھُلے منہ والی مٹھگنی سی بوتل نکالی اور اُس میں سے ، احتیاط کے ساتھ ، اٹھارہ گولیاں گنیں ، اُن کی چھ علیحدہ علیحدہ پڑیاں ــــــ چھ دن کے واسطے ــــــ بنائیں اور اُس کے ہاتھ پر رکھ دیں ۔ ایک گولی صبح ، ایک دوپہر ، ایک شام ، پانی کے گلاس کے ساتھ ، حکیم نے کہا ۔ ساتویں دن اسی وقت پھر نبض دیکھی جائے گی اور اگلے علاج کا تعین ہوگا ۔

ان گولیوں نے جادو کا اثر دکھایا ۔ پہلے روز سے ہی اُسے محسوس ہونے لگا کہ اُس کی سانس ہلکی اور ہموار ہوتی جا رہی ہے ۔ سینے کی سرنگ جیسے جگمگا اُٹھی ۔ یہ وقت سال کے سخت موسموں میں سے تھا ۔ ان دنوں ہفتہ وار دورہ اُٹھتا تھا ۔ ان گولیوں کے اثر سے ہفتہ بھر سانس بھاری نہ ہوئی ، اور نہ پھر اگلے ہفتے اور نہ اس سے اگلے ۔ ساتویں دن نہار مُنہ پھر حکیم نے نبض دیکھی اور اطمینان سے سر ہلا کر اُسے رخصت کیا ۔ وہ کم سے کم دوا دینے کا قائل تھا ، اُس نے کہا ، اگر کم دوا سے کام نکلتا ہے تو کم دوا لو ، باقی پرہیز اور احتیاط ۔ یہ اُس کا اصُول تھا ۔ اہم بات تو یہ ہے کہ مریض اپنے ذہن کو پریشانی سے دُور رکھے ۔ اسد نے حکیم کی ہر بات پہ لبیک کہنا شروع کیا ۔ اُس کا دل خوش و خرم تھا ۔ نہ جانے کتنے ہی سینکڑوں دن اور رات کن کن عجیب و غریب بدمزہ دواؤں سے ، ٹیکوں سے ۔ اُس نے اپنے نوجوان جسم کو بد امن کیا تھا ، کیسے کیسے دواخانوں کی ڈیوڑھیوں میں انتظار کاٹا ، لاتعلق آنکھوں والے چہروں سے مشورے کیے اور کاغذ کی پرچیاں ــــــ اپنی بے اطمینانی کے پُرزے ــــــ اُٹھائے دل میں کرشموں کی اُمید لیے باہر آیا تھا ۔ اور اب ــــــ بھُورے رنگ کی ننھی ننھی کل اٹھارہ عدد گولیوں نے اُسے اُس دُنیا سے اُٹھا کر یہاں پہ لا کھڑا کیا تھا جہاں زمین کا اور آسمان کا رنگ بدل چکا تھا ۔ نا اُمید ہوتے ہوتے ہوئے شخص کی سی پُر اُمیدی سے اُس نے سوچنا شروع کر دیا کہ اب بیماری دُور ہو چکی ۔ اپنے اندر اُس نے ایک ایسی سرمستی کی لہر محسوس کی جو صرف اُن لوگوں کا حصہ ہوتی ہے جنہوں نے کسی لاعلاج بیماری کی شکل دیکھی ہو ۔ پیڑ ، پرندے ، پتھر اور پہاڑ ، ہوا اور آوازیں ، چیزوں کی ترتیب اور ترکیب ، گاڑیاں اور فوجی ، دھوپ چھاؤں ، ہر شے صاف اور شفاف ، آنکھوں کے بہت قریب اور ساتھ ہی بہت دُور مگر نمایاں ، دھلی ہوئی جیسے کہ وہ کسی دوربین میں سیدھی اور اُلٹی طرف سے ایک ساتھ دیکھ رہا ہو اور نظر میں کوئی آڑ نہ ہو ۔ آویزش در آویزش اور انفراد در انفراد ۔ ایک سہ پہر کے عرصے میں اُس نے ایک نظم لکھی ، ایک خط لکھا ۔ صبح اور شام کے وقت وہ جنگل میں لمبی

سیر کو جاتا، اور اپنے بدن کو ابھی تک ، ہمیشہ کی طرح توی اور چُست پا کر حیران ہوتا۔ مطب میں دوسروں کو وہ چلتے پھرتے، دوائیاں پیتے، حکیم کے گھر باہر کا کام کرتے، اُس کی گائے کو گھاس ڈالتے ہوئے دیکھتا تو اس کے دل میں اُن کے لیے محبت کے جذبات پیدا ہوتے۔ کیا سیدھے سادے، مخلص لوگ تھے جو یہاں سے علاج حاصل کر رہے تھے اور اپنے اپنے طور اس کی قیمت چکا رہے تھے۔ آہستہ آہستہ ولی نے اُس سے کھل کے بات کرنا شروع کی، پھر میر حسن نے۔ ولی نے سب سے پہلے اُسے اُن بڑے بڑے شہروں کے نام بتائے جو وہ اپنی فوجی ملازمت کے دوران دیکھ چکا تھا۔ یہ بتا چکنے کے بعد وہ اسد سے بے تکلفی سے باتیں کرنے لگا۔ میر حسن، گاؤں کے لوہار کا سترہ سالہ بیٹا، ٹپ دق کا مریض، ہلکے ہلکے بخار سے مستقل چمکتی ہوئی آنکھوں اور باریک ناک نقشے والا، چڑیا کے بچے کی مانند پھرتیلا اور ذہین تھا۔

"تم جو ڈھونڈ رہے ہو یہاں نہیں ہے۔" ایک روز اچانک میر حسن نے اپنے جھٹکے دار لہجے میں اُس سے کہا۔ اس روز پہلی بار اُس نے براہِ راست اسد سے بات کی تھی۔ میر حسن کا مخصوص، سر اور کندھوں اور ہاتھوں کو جھٹک جھٹک کر باتیں کرنے کا انداز تھا، جیسے مسلسل اَن دیکھے دھماکوں سے چونک چونک پڑ رہا ہو۔ اُس کا یہ انداز نو وارد کو اکثر مضحکہ خیز معلوم ہوتا تھا۔ اسد اُس کی بات پر حیران رہ گیا۔ "کیا نہیں ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"علاج۔" میر حسن نے کہا۔

"اور کہاں ہے؟"

"کیا معلوم۔" میر حسن بولا، "مگر یہاں نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں ہے؟" اُس نے سوال کیا۔

"ہماری طرف نہیں دیکھتے؟ سالوں سال سے یہاں کام کر رہے ہیں۔ یہاں کوئی تندرست نہیں ہوتا۔"

"کیوں؟"

"بس۔" میر حسن نے سرکشی اور مایوسی کے ملے جلے لہجے میں سر کو جھٹکا دیا۔ "ایک کنواں ہے۔ پانی پینے کے لیے اس میں اُترو تو اندر ہی رہو۔"

اسد آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھتا رہا۔ ولی نے میر حسن کو کہنی مار کر اُس کا منہ بند کرنے کو کہا۔ وہ چُپ ہو گیا۔ احمد کا سانپ کا سا بے لب دہانہ ایک خوفناک سی مسکراہٹ میں چہرے کی ہڈیوں پر پھیل گیا۔ ایک بے وجہ سا غصّہ اسد کے دل میں پیدا ہونا شروع ہوا۔ وہ مطب کی دیوار کے پاس جا کھڑا ہوا اور نیچے دیکھنے لگا۔ ایسا شفاف دن تھا کہ نظر دُور تک جاتی تھی۔ میلوں دُور تین پہاڑوں کے درمیان پکی سڑک کا چند گز کا ٹکڑا ایک دھاگے کی مانند نظر آ رہا تھا۔ اُس پر تین فوجی گاڑیاں یکے بعد دیگرے گزر گئیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھے بغیر اُن سب کے چہرے ایک ایک کر کے اُس کی آنکھوں کے سامنے سے

گزر گئے۔ یا خدایا، اس نے اپنے آپ سے کہا، یہ ماجرا کیا ہے۔ کوئی بھی تو بات نہیں کرتا۔

چار ہفتوں کے گزرنے پر سانس کا ہوکا لوٹ کر آیا۔ وہ اپنے کمرے میں لیٹا، چھت کی طرف دیکھتا ہوا کسی بات کو یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ اچانک اس نے اسے آتے ہوئے دیکھا اور خوف گدلے سے گھنے دھوئیں کی مانند اس کے دل کو چڑھنے لگا۔ چند لمحوں کے لیے اس کے پٹھے کھنچ گئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دھواں سانس میں بدل گیا اور اس کے سینے پر جا بیٹھا۔ آہستہ آہستہ کوشش کر کے اس نے اپنے بدن کو ڈھیلا چھوڑا اور چارپائی پر سر نہوڑا کر بیٹھ گیا —— ان چار ہفتوں میں اس نے بمشکل، بڑی محنت اور محبت کے ساتھ، اپنے آپ کو ایک ایسی بات پر اعتبار کر لینے پر راضی کیا تھا جو وہ اپنے شعور سے پرے کہیں جانتا تھا کہ ناقابلِ یقین ہے —— وہی رنگ، وہی روپ۔ ہلکا نیلا اور بھورا، جس میں پیلاہٹ کے چھینٹے تھے۔ یہ ریلا پچھلے چار ہفتوں کی مجموعی شدت کے ساتھ آیا اور گزر گیا۔ جیسے ہی سانس برابر ہوئی وہ حکیم کے پاس پہنچا۔

"میں تو سمجھا تھا،" وہ جھجکتے ہوئے بولا، "اب اس سے چھٹکارا ہوا۔"

"چھٹکارا ہوگا، ضرور ہوگا۔" حکیم نے مہربانی سے مسکرا کر جواب دیا، "مگر چٹکی بجانے میں نہیں۔ دوا نے اثر دکھایا ہے، دورہ زیادہ دیر نہیں رہا۔"

"مگر بہت شدید تھا۔" اسد نے کہا۔

"اس وقت یہی کافی ہے کہ دوا نے اثر تو دکھایا۔ اب ہم علاج کو آگے بڑھا سکتے ہیں۔ اور دورہ سخت بھی نہیں تھا۔ چونکہ کافی وقفے کے بعد آیا ہے اس لیے تمہیں شدید لگا۔"

"بہت شدید تھا۔" اسد نے دہرا کر کہا۔

حکیم نے بے خیالی سے سر ہلایا۔ "جسم کو ڈھیلا چھوڑ دو، کمر سیدھی کر کے بیٹھو، نکل جائے گا۔ یہ لو۔" حکیم نے پہلے کی سی تین تین گولیوں والی چھ پڑیاں اس کے ہاتھ میں پکڑائیں۔ اب کے اس نے پڑیاں پہلے سے بنا کر الماری میں رکھی ہوئی تھیں۔ "موذی مرض ہے، بیٹا، وقت لے گا، مگر رفع ہو جائے گا۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔"

وہ اپنے کمرے میں آکر چارپائی پر لیٹ گیا، اور گزشتہ چار ہفتوں کے دمکتے ہوئے وقت کو یاد کرنے لگا۔

ان گولیوں نے پھر ویسا اثر نہ دکھایا۔ وہ رنگ میں، حجم اور بناوٹ میں، ذائقے تک میں بالکل ویسی ہی تھیں جیسی کہ پہلی، اور وہ ان کو اسی طرح دن میں تین بار پانی کے گلاس کے ساتھ کھاتا رہا، مگر دورہ تین ہی ہفتے کے بعد وارد ہو گیا۔ اس بار وہ نیم متوقع حالت میں تھا، چنانچہ خوفزدہ نہ ہوا۔ اس نے دیوار کے ساتھ سیدھا اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی، مگر بیٹھ نہ سکا۔ اس بار اس میں اتنی شدت نہ تھی، گو پہلے سے کچھ زیادہ دیر تک رہا۔ پھر وہی اٹھارہ گولیاں اس کو

کھانے کو ملیں جو اُس نے بے یقینی سے، چھ روز میں نگلیں۔ جب تین ہی ہفتے کے بعد تیسرا دورہ ہُوا تو وہ حکیم کے پاس جا کر پھٹ پڑا :

"اب ان گولیوں میں اثر کیوں نہیں رہا؟"

"اثر تو ہے۔" حکیم نے سرد آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھ کر جواب دیا۔

"کہاں ہے؟ ایک ہفتے سے زیادہ کی گولیاں میں کیوں نہیں کھا سکتا؟"

"دوا کی بڑی سے بڑی خوراک ایک وقت میں یہی ہے۔"

"پہلی بار کیسے فائدہ ہوا تھا؟"

"یہ دوا اِسی طرح اثر کرتی ہے، بچے۔ آہستہ آہستہ۔"

"کہاں اثر کرتی ہے؟ پہلی بار کے بعد کوئی فائدہ نہیں ہوا۔"

"میرے خیال میں تمہیں کافی آرام آگیا ہے۔"

"ہُنہہ! آرام۔ کیسا آرام؟"

"دوروں سے، نوجوان، اپنے دوروں سے آرام۔ یاد ہے جب تم آئے تھے تو کس حالت میں تھے؟ چھ، سات دن میں دورہ ہو رہا تھا، اور تیز اتنا کہ بات نہیں نکلتی تھی، اور بارہ بارہ گھنٹے تک ہو سکتے تھے۔ یاد ہے؟ اور اب؟ کتنے کتنے وقفے پر آتے ہیں اور کتنی دیر رہتے ہیں؟ یہ آرام نہیں تو اور کیا ہے، بتاؤ، یہ آرام نہیں تو اور کیا ہے؟ تھ تھ تھ۔" حکیم نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "لوگوں کی مصیبت تو یہی ہے، بھول جاتے ہیں، اپنی تکلیف کو بھی بھول جاتے ہیں، حیرت کی بات ہے۔ کبھی کبھی مجھے خیال آتا ہے کہ اپنی تکلیف کو بھول جانا دُنیا کی سب سے آسان بات ہے، چاہے تکلیف کیسی ہی سخت کیوں نہ ہو۔ میں پچیس سال سے علاج کر رہا ہوں، مجھ سے زیادہ اس بات کو کون جانتا ہے۔ آرام کی خاطر یہاں آتے ہیں، سب چیزوں کو چھوڑ کر صرف آرام حاصل کرنے کی خاطر، اور آرام حاصل کرتے ہیں۔ مگر پھر؟ کیا وہ ایک منٹ کے لیے بھی بیٹھ کر خدا کا شکر ادا کرتے ہیں؟ نہیں نہیں جناب، سب بھول جاتے ہیں۔ اب وہ کہتے ہیں کہ ہماری بیماری رفع کرو، ہمیں جلد از جلد فارغ کرو۔ اب وہ اپنا حق مانگتے ہیں۔ یہ میں نہیں کر سکتا۔ میں کوئی جادوگر ہُوں؟ یہ بات اُن کی سمجھ میں نہیں آتی۔ تھ تھ تھ۔" اُس نے دوبارہ سر ہلایا۔ "آدمی کتنا حریص ہے۔ بیماری کی حالت میں بھی آدمی اتنا حریص ہے۔"

"مگر پہلی بار،" اسد نے زور دے کر پُوچھا، "چار ہفتے تک کیوں نہیں ہُوا؟"

"بیماری رفع نہیں ہُوئی، قابو میں آگئی ہے۔ سُنو،" حکیم نے ہاتھ اُٹھا کر اچانک دھیمے دھیمے میٹھے لہجے

میں بولنا شروع کیا، "تم چونکہ سمجھدار ہو، میں تمہیں تفصیل سے بتاتا ہوں۔ میری بات کو غور سے سنو، علم کی بات ہے، کام آئے گی۔ اس مرض کو ضیق النفس کہتے ہیں، قصبۃ الریہ اور تنفس کے عضلات میں شدید کھچاؤ کے باعث عارض ہوتا ہے، جس سے سانس کے تواتر میں فرق آجاتا ہے۔ اس کے تین بین وجوہ ہیں۔ مگر یہاں ایک مشکل آن پڑی ہے۔ تمہارا عارضہ عام فہم ضیق النفس کے عوامل پر پورا نہیں اُترتا۔ اس کی صحیح تشخیص میں ازحد احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ اسباب کو علامات پر مقدم رکھنا ہوگا اور شافی تدابیر شروع کرنے سے پہلے متعدد کوائف پر گہری نظر رکھنی پڑے گی، مثلاً مریض کا مزاج، خاندانی وراثتیں، وغیرہ وغیرہ۔ محض سانس کی تیزی کا نام عارضہ ضیق النفس نہیں۔ بعض دفعہ اس کے اسباب بہت ہی مختلف النوع ہوتے ہیں، مثلاً التہابِ شعبی جس میں سانس کی نالیوں میں شدید سوزش ہوتی ہے اور اس کے ساتھ ہی سانس کی نالیاں پھیل جاتی ہیں اور پھیپھڑے کے جوف میں بلغم بھر جاتا ہے اور حرارتِ غریبہ کی وجہ سے اس میں عفونت پیدا ہو جاتی ہے۔ گردوں کی کارکردگی کا بھی اس کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ گردوں کی چھلنی میں کسی غیر طبعی کیفیت کے باعث پیشاب میں خارج ہونے والے رسوب اور سمی مادّے اس میں جمع ہو کر خون میں شامل ہو جاتے ہیں جس سے غشائے ریہ یعنی پھیپھڑوں کے غلاف یا حجاب حاجز میں ورم پایا جاتا ہے جس سے دل کی ملحقہ گزرگاہوں میں دورانِ خون کے ساتھ پیشاب کے سمی اجزاء اثر انداز ہوتے ہیں۔ اسی طرح کے متعدد اور اسباب ہو سکتے ہیں، چنانچہ اس کی تدابیر میں عجلت سے کام نہیں لیا جا سکتا بلکہ اس کا نادر، اصولی علاج ہونا چاہیے۔ دورے کی صورت میں صرف علامات کا فوری طور پر علاج ہوتا ہے، جب دورہ ختم ہو جائے تو پھر مستقل اصولی علاج کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ اگر تم مجھ سے دو لفظوں میں اس کا علاج پوچھتے ہو تو وہ یہ ہے، تحمل اور بردباری۔ ادویات کے اثرات کا اندازہ اور نتیجے کا انتظار لاحاصل ہے۔ مسلسل علاج کرتے چلے جاؤ۔ تم تکلیف میں تھے، تمہیں آرام کی ضرورت تھی، آرام تمہیں بڑی حد تک مل گیا ہے۔ میرے واسطے یہی نصف سے زیادہ علاج کے برابر ہے۔ اب آگے اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ یہ لو۔"

اسد چھوٹی سی آواز میں کھنکارا اور اٹھارہ گولیاں لے کر واپس چلا آیا۔ اگلے دورے کے بعد اس نے ایک بار اور قسمت آزمائی کی:

"مجھے اگر،" اُس نے احتیاط سے بات شروع کی، "دو ہفتے کی گولیاں ایک ساتھ مل جائیں تو شاید ——"

"ایسا میں نہیں کر سکتا۔"

"کیوں؟"

"میں اپنی دوا کو جانتا ہوں نہ کہ تم۔ اگر تمہارا خیال ہے کہ تمہیں فائدہ نہیں پہنچ رہا تو تمہیں حق ہے جب

چاہے علاج ختم کر دو۔"

اس کے بعد وہ حکیم کے پاس نہ گیا۔ اب باقاعدگی سے ڈھائی تا تین ہفتے کے بعد کبھی ہلکا کبھی تیز دورہ ہوتا، اور ہر دورے کے بعد چھ روز کی گولیاں کھانے کو ملتیں۔ بیشتر وہ اپنے کمرے میں پڑا رہتا۔ جنگل میں کچھ دور تک گھوم گھام کر واپس آجاتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ، کچھ کچھ بات اس کی سمجھ میں کبھی آتی، کبھی نکل جاتی۔ یہ ایک جگہ تھی جہاں پہ اس نے مکمل شفا کی دھندلی سی شکل ابھرتی ہوئی دیکھی تھی۔ آخر یہ جگہ بھی اسے محض افاقہ مہیا کر کے رہ گئی تھی۔ نصف سے زیادہ علاج، حکیم نے کہا تھا۔ کہیں مسلسل افاقے کی صورت ہی علاج کا نام تو نہیں؟ وہ سوچتا۔ اب تک تو وہ صرف انسانی چیزوں کی ماہیت جاننے پہ ہی اکتفا کرتا رہا تھا۔ اب اس زمانے میں پہلی بار اس نے ان کے بنیادی عمل دخل کے بارے میں سوال کرنا شروع کیے۔ لوگوں کی بے سمجھی تو سیدھی سادی (تسکین بخش) بات تھی۔ مگر جب ان چیزوں کے برتنے، اور ان کے اوپر زندگی بسر کرنے کا عمل شبے کی زد میں آنے لگا تو بات وہاں پہنچتی تھی جہاں پہ اپنی ہی سمجھ کی بنیادوں کو ٹھوکر لگتی تھی، چنانچہ اس سطح پر سوچنے کی اس کو کبھی ہمت ہی نہ ہوئی تھی۔ شہر بشہر وہ اپنی سانس کے علاج کے واسطے گھوما تھا، مگر اب اس عجیب و غریب گاؤں میں پہنچ کر اس سوال کے بالمقابل آن کھڑا ہوا تھا، جیسے پہاڑ کی ایک وسیع و عریض عمودی دیوار ہو جسے پار کرنے کا کوئی راستہ دکھائی نہ دے۔ چند دن پہلے میر حسن اس کے پیچھے پیچھے جنگل کی طرف آنکلا تھا، جہاں تازہ گری ہوئی پتلی پتلی برف پہ بھیڑ بکریوں کے کھروں کے نشانات کے اوپر اوپر وہ گھومتے رہے تھے۔

"مجھے یہ سمجھ نہیں آتی۔" اسد نے کچھ اپنے آپ سے، کچھ میر حسن سے سوال کیا، "کہ یہ سارا کھیڑا اس نے کیوں پال رکھا ہے۔ فرض کرو کہ دوسرے حکیموں کی طرح یہ ہم سے دوائی کی قیمت وصول کرتا ہے۔ تو اس کے پاس تو پیسے ہی اتنے ہو جائیں گے کہ کام کاج کے لیے کئی نوکر رکھ سکتا ہے۔"

"کام کاج!" میر حسن ہنسا، "اسے تو غلام چاہئیں، جن کے گلے میں رسّا ڈال کر مطب میں باندھ رکھے۔ نوکر تو آزاد لوگ ہوتے ہیں۔"

"اس کی زمینیں اور مکان وغیرہ کہاں سے آئے؟"

"پیسے والا ہے۔ گنبد میں آتے ہی اس نے زمین خریدی تھی، پھر مکان بنوایا۔ پہلے کھیتی باڑی کرتا رہا، پھر دوا دینی شروع کر دی۔ ایک دفعہ ایک مسافر ادھر سے گزرا تھا، اس نے یہاں بات کی کہ وہ اس کو جانتا ہے۔ جب یہ نیچے میدانوں میں ہوا کرتا تھا۔ اس کی عورت کسی کے ساتھ بھاگ گئی تو یہ اوپر چلا آیا۔ مگر پکا پتا کسی کو نہیں چلا کہ یہ کہاں سے آیا ہے۔ میرے تائے نے یہ بات بتائی تھی۔"

"تمہارا خیال ہے اس واسطے یہ ایسا کرتا ہے ؟"

"کیا معلوم ۔" میر حسن نے کہا، "آدمی کا کیا پتا چلتا ہے ۔"

اسد نے چہرہ ہوا میں اٹھا کر لمبی سانس لی : "برف میں چیڑ کی خوشبو کیسے بدل جاتی ہے !"

"ہاں ۔" میر حسن بولا، "میں نے تم سے کہا تھا، ابھی وقت ہے یہاں سے نکل جاؤ ۔"

"میں اس کا آخیر معلوم کر کے جاؤں گا ۔ اس کا کوئی نہ کوئی مقصد تو ہو گا ۔"

"تمہیں کیا فائدہ ہو گا ؟"

"میری گولیاں ہی لو ۔ بالکل وہی ہیں ۔"

"لگتی وہی ہیں، مگر ہیں کہاں ؟ اصل چیز تو صرف پہلی بار ہوتی ہے ۔ اس کے بعد شکل وہی رہتی ہے، اصل بدل جاتا ہے ۔ اصل وہ صرف پہلی بار ہی دیتا ہے، یا بیچ میں گھٹا بڑھا کر دیتا رہتا ہے ۔ اس طرح یہ لوگوں کو باندھ کر رکھتا ہے ۔ تم نے دیکھا ہے کسی کو اپنی دوائی پینے کو نہیں دیتا ۔ کوئی اپنی دوائی نہیں پیتا ۔"

"پھر کون پیتا ہے ؟"

"بس ایک دوسرے کی دوائیاں بناتے ہیں ۔ پتا نہیں ہوتا کہ کون کس کی بنا رہا ہے ۔ ملاوٹ گھر کے اندر جا کر کرتا ہے ۔"

"افاقہ تو ہوتا ہی ہے ۔" اسد نے کہا ۔

"ہنہہ !" میر حسن حقارت سے بولا، "پہلے پہل افاقہ ہی معلوم ہوتا ہے ۔"

شام کی پھڑپھڑاتی ہوئی برفانی ہوا میں، کمبلوں کو سر اور شانوں کے گرد کس کر لپیٹے ہوئے وہ دونوں واپس لوٹ آئے ۔

"ہو سکتا ہے ۔" واپسی پر اسد نے بے خیالی سے کہا، "اس کے پاس افاقے کا گر ہی ہو، اور کچھ بھی نہ ہو ۔"

میر حسن جواب دینے کی بجائے خالی خالی نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا، جیسے اس کو اس بات کی سمجھ نہ ہو کہ افاقے کا گر بھی کوئی گر ہوتا ہے ۔ اسد کو احساس ہوا کہ گو لڑکے کو اس بات کا فہم نہیں، مگر اس کا قدیم روگ والا گوشت و پوست کسی نہ کسی طور حکیم کے اطوار کا بہتر علم رکھتا ہے ۔ یہ علم خود اس کے بدن کو آہستہ آہستہ اب ہونا شروع ہوا تھا ۔ جیسے ہی دوروں کا وقفہ بڑھا، انتظار کی کوفت ناقابلِ برداشت ہوتی گئی ۔ ایک کے گزرنے کے بعد وہ دوسرے کی آمد کا منتظر رہتا ۔ دن گنتے گنتے آخر صورتِ حال یہ ہوئی کہ کئی بار اس نے عمداً اس وقفے کو کم کرنے کی کوشش بھی کی ۔ ایک بار اس نے ہفتہ بھر کی گولیاں نہ کھائیں، پھر اگلی بار سات دن کی مزید گولیاں لے کر دو ہفتے تک متواتر کھاتا رہا ۔—

صورت وہی رہی) اس اُمید میں کہ ایک بار اور گزر جائے، ایک بار اور چھٹکارا ہو، اس پاگل اُمید میں کہ آخر ایک روز آم آکر ختم جائے گا یا اس کا زور ٹوٹ جائے گا یا کچھ نہ کچھ اور ہوگا، کوئی تبدیلی، کوئی زیر کوئی زبر، کوئی آخرت۔

آخر جنوری کے پہلے ہفتے میں اس نے اپنا بستر باندھا اور کسی سے کچھ کہے بغیر گاؤں چھوڑ کر چل دیا۔ اپنے گاؤں جانے کی بجائے اُس نے کالج کا رُخ کیا اور ریاض کے پاس ہوسٹل میں جاکر ٹھہرا۔ اس سال ریاض کالج یونین کا سیکرٹری منتخب ہوچکا تھا۔ دن دن بھر وہ کالج میں پھرتے اور گزرے ہُوئے الیکشن کے ہنگاموں کی باتیں یاد کرتے اور دوستوں سے گپیں لگاتے۔ صبح کے وقت وہ عموماً لائبریری میں چلا جاتا۔

"تمہاری صحت تو اچھی ہوگئی ہے۔" ایک روز ریاض نے کہا۔

"ہاں۔" اسد نے جواب دیا، "کافی افاقہ ہے۔ وہاں کی آب و ہوا بھی موافق آگئی ہے۔"

"اب آ کیوں نہیں جاتے۔"

"آ تو گیا ہوں۔" اسد ہنسا۔

"داخلہ لے رہے ہو؟"

"ابھی کچھ روز دیکھتا ہوں۔"

"اچھے خاصے ہٹے کٹے ہو۔" ریاض نے کہا۔

"یہی اس کی ایک خوبی ہے۔ تندرستی کم دبیش بحال رہتی ہے۔ یہ بھی نہ ہو تو خدا جانے کیا ہے۔"

اسی دوران میں، پچھلی مدت ختم ہونے پر، ایک دورہ وقتِ مقررہ پر ہوچکا تھا۔ اُس سے اگلے ہی ہفتے ایک اور ریلا آیا، اس قدر شدت سے کہ وہ رات بھر دل کو پکڑ کر ہونکتا رہا۔ جب گزر گیا تو دس گھنٹے تک سوتا رہا۔ اگلی صبح کو اُس نے ریاض سے کچھ پیسے اُدھار لیے اور گاڑی پکڑ کر واپس گنبد کو روانہ ہوا۔

اِن بیس دنوں میں گنبد وہ گنبد نہ رہا تھا۔ سب سے پہلے شیر کی موجودگی کی خبر اُسے شاہ رُخ سے ملی۔ دفعتہً اُس کے دماغ کے ہزاروں چھوٹے چھوٹے نیم تاریک گوشے روشن ہونے لگے — جیسے لیمپ کی بتی کو بہت آہستہ آہستہ کوئی اُونچا کرے ــــ جہاں اُس کی شبیہہ گویا ہمیشہ سے نیم تیار، نیم منتظر حالت میں کھڑی تھی۔ اب وہ اپنا لمبا اور سڈول، دھاری دار جسم اور جلتی ہُوئی آنکھیں لیے ہر طرف جگمگانے لگی۔ اُسی لمحے اُس نے ایک عجیب (بعید از قیاس) فیصلہ کیا، کہ یہ جانور اُس کا ہے، کہ اِس پہ ہاتھ ڈالنے کا اختیار کسی اور کو نہیں۔ اُسی شام ایک اور واقعہ ہُوا: جس وقت تک اُس نے اِس جانور کے بولنے کی آواز نہ سُنی تھی، اُس کے تئیں یہ جانور ہی رہا تھا۔ مگر ایک بار، رات میں اُس کی چونکا دینے والی گرج سُن لینے کے بعد اُس عکس میں جس میں شکل اور شباہت تو تھی، چال ڈھال کے گمان بھی تھے، مگر سانس اور سانس کی آواز نہ چلتی

تھی ، اُس میں جان پڑ گئی - اس کے بعد اسد کے لیے ہمیشہ کے واسطے محض ایک جانور کی صورت میں اُس شکل کا خیال کرنا ممکن نہ رہا۔

حکیم نے اسد کی بیس روزہ غیر حاضری اور پھر اُس کی واپسی کو ایسے لیا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اُس نے شفقت بھرے لہجے میں اُس کا حال پوچھا، اور اٹھارہ گولیوں کی چھ پڑیاں فوری استعمال کے لیے دیں۔ دو دن میں ہی اُس کی سانس کی آمد و رفت میں افاقہ محسوس ہونے لگا۔ ایک، دو، تین ہفتے گزر گئے۔ پھر تیئسویں دن اس کو ایک جھٹکا آیا جو دو گھنٹے میں گزر گیا۔ حملہ اتنا کمزور تھا کہ بعد میں اُسے آرام کرنے کی ضرورت بھی محسوس نہ ہوئی۔ حکیم نے اب اُسے تھوڑا بہت کام دینا شروع کر دیا تھا جو وہ ایک آدھ گھنٹے میں ختم کر لیتا۔ ایک روز حکیم نے اُس سے کہا: "تم نے بہت اچھا کیا جو آ گئے۔ اس علاج میں صبر اور تحمل کی ضرورت ہے۔ کچھ ابتدائی سوجھ بوجھ حاصل کر لو تو اور کام بھی سیکھ سکتے ہو۔ تم ان دہقانوں میں سے نہیں، ان سے زیادہ میل جول رکھنا بھی مناسب نہیں۔ تعلیم یافتہ ہو، میرے پاس جو کچھ ہے اگر چاہو تو مجھ سے حاصل کر سکتے ہو۔ ایک بیٹی ہے، اُسے دسویں درجے تک شہر میں تعلیم دلوائی ہے، کچھ گھر میں میری مدد کرتی ہے۔ مگر بیٹی آخر بیٹی ہوتی ہے۔" پھر حکیم نے سرسری لہجے میں کہا کہ وہ اسد کو بالکل گھر کا ایک فرد تصور کرتا ہے، اسے دوا کے برتنوں کو گھر کے اندر لے جانے کی کوئی ممانعت نہیں۔

اب اسے مطب میں اور گھر کے اندر آنے جانے کی آزادی تھی۔ گھر کا کام یاسمین ایک دہقان عورت کی مدد سے چلاتی تھی۔ اسد نے اپنا کھانا بھی حکیم کے گھر سے لینا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ ایک مریض کی حیثیت سے نہیں بلکہ کسی حد تک مالکانہ احساس کے ساتھ مطب کے اندر باہر گھومتا۔ مطب کے کئی چھوٹے موٹے کاموں میں حکیم نے اُس پر انحصار کرنا شروع کر دیا تھا۔ دن میں کسی وقت وہ سفیدے کے درخت تلے اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ کر اپنا دن بھر کا کام دو چار گھنٹے میں ختم کر لیتا۔ زیادہ تر جڑی بوٹیوں کے پیسنے پسانے، اور مختلف پسائیوں کے لیے مختلف قسموں کے کھرل اور حمام دستے وغیرہ مہیا کرنے کا کام تھا۔ صرف پسائی کا درجہ متعین کرنے کا کام حکیم نے اپنے پاس رکھا تھا۔ اس بات کا علم صرف اُسی کو تھا کہ کون سی دوا کس حد تک (اور کیوں) کھرل ہوگی، چنانچہ اس سلسلے میں وہ کسی پر بھروسہ نہ کر سکتا تھا۔ اُس روز جب میر حسن نے اسد سے کہا تھا: "ہماری طرف نہیں دیکھتے؟" اسد نے پہلی بار ٹھیک سے اُن کی طرف دیکھا تھا، اور اُن کی نظروں کی ٹکٹکی اور کھرلوں حمام دستوں وغیرہ کے اندر اُن کے ہاتھوں کو اندھے انجان چکروں میں گھومتے ہوئے دیکھ کر اُس نے خوف اور کراہت سے نظریں پھیر لی تھیں۔ خدایا، اُس نے سوچا تھا، لڑکا سچ کہتا ہے۔ یہ لوگ تو بے جان ہیں۔

اب وہ سفیدے کے درخت تلے بیٹھا، دل سے یا میر حسن سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے، مطب کے اُوپر اُوپر کے انتظامات کرتے ہوئے، کبھی کبھی اپنے دل میں حیران ہوتا کہ اس روز اس نے کیا دیکھ کر ان بیچارے لوگوں

کے بارے میں اس طرح خیال کیا تھا۔ آخر یہ عزیب لوگ، دُنیا کے سب لوگوں کی طرح کام کر رہے ہیں اور اِس کا معاوضہ اپنی مرضی کے مطابق وصُول کرتے ہیں۔ کام میں کیا قباحت ہے۔ جب تک آدمی کام کرنے کے قابل ہے، کام کرتا ہے۔ کام کرنے میں تو کوئی بُکی نہیں۔

★ ★ ★ ★ ★

چنانچہ وہ یاسمین کی خاطر آیا تھا نہ شیر کی خاطر، وہ دوبارہ اس لیے یہاں واپس آیا تھا کہ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ یہ الگ بات تھی کہ یہاں آ کر اب وہ بالآخر خوش تھا۔

"سچ بول رہے ہو؟" یاسمین نے دروازے میں رُک کر پُوچھا۔

"ہاں" اسد نے کہا۔

یاسمین ایک طویل لحظے تک اُسے دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے ہاتھ بڑھا کر آہستہ سے اسد کو کندھے پر چھوا، اور دروازہ کھول کر گھر کے اندر داخل ہو گئی۔ اسد اپنے کمرے کو لوٹ آیا۔ اُس نے بستر سیدھا کیا، اور اُس پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ دروازے کے پاس ایک بندوق ہمیشہ سے دیوار کے ساتھ کھڑی تھی جس کی لبلبی، یہاں سے لیٹے لیٹے ہاتھ بڑھا کر، دبائی جا سکتی تھی۔ ایک دن، اطمینان سے اسد نے سوچا، مَیں اُٹھوں گا اور دُنیا بٹ چکی ہو گی۔

(۳)

مسئلہ شیر کے شکار کا تھا۔ بیشک ایک رائفل شاہ رُخ کے پاس تھی، مگر شاہ رُخ اس علاقے کا افسر تھا، گاؤں کی ایک تہائی آبادی اس کی ماتحتی میں کام کرتی تھی، اور اگر وہ کہتا کہ میں تمہاری مہم میں شریک نہیں ہوتا تو کوئی اُسے مجبور نہ کر سکتا تھا۔ وہ بس ڈاک بنگلے کے برآمدے میں رات رات بھر، رائفل کا سیفٹی کیچ اُتارے، بیٹھا رہنے پر کتفی تھا، اِس اُمید پر کہ کسی نہ کسی رات شیر ڈاک بنگلے تک آئے گا، اندھیرے میں مشعلوں کی سی آنکھیں چمکائے گا، اور پھر شاہ رُخ اپنی محفوظ نشست پر سے اُن آنکھوں کے بیچ نشانہ باندھ کر گولی چلائے گا اور اسے ڈھیر کر دے گا۔ شاہ رُخ خوش اُمید آدمی تھا۔ اسد کبھی سوچتا کہ اصل خوش نظری شاید یہی ہوتی ہے، جو آدمی کو خود پرست اور خود فریب اور با اصول بناتی ہے اور اُسے بہادرانہ کارنامے انجام دینے کی ہمت عطا کرتی ہے، یا جو لاکھوں کروڑوں آدمیوں کو طویل چھوٹیں بہم پہنچا کر اُن کی زندگیوں کو سہارا دیے رہتی ہے۔ وہ خود بھی، اسد اکثر سوچتا، آخر انہیں میں سے ایک تھا، گو ابھی تک وہ معمولی چھوٹیں بھی تلاش کرنے میں ناکام رہا تھا۔ مگر عین ممکن تھا کہ کبھی نہ کبھی مل جائیں۔ اُس وقت جب کہ مطب کے احاطے میں بیٹھا وہ لوہے کے حمام میں سلیٹی سے رنگ کے پیچش کے سفوف کو دستے کی مدد سے کبھی دائیں، کبھی بائیں پیس رہا

تھا، اسد نے سوچا کہ عین ممکن ہے کبھی مل ہی جائیں ——— چار پانچ سو بھورے رنگ کی گولیوں کی صورت میں، متواتر کئی مہینوں کی خوراک، چار پانچ سو پانی کے گلاسوں کے ساتھ نگلنے کے لیے، تاکہ اِس سانس کا خاتمہ بالخیر ہو اور یہ کبھی لَوٹ کر نہ آئے ——— اس لیے کہ زندگی گزارنا، اُس نے سوچا، تو کوئی ایسی بات نہیں۔ شاہ رُخ کے بارے میں سوچتے ہُوئے اُس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو گاؤں کے پانچ بوڑھے احاطے کو پار کر کے مطب میں داخل ہو رہے تھے، اور اسد کو یاد آیا کہ مسئلہ بندوق کا تھا۔

کیوں کہ گاؤں بھر میں صرف ایک بندوق تھی جو حکیم کے پاس تھی (چند سال پہلے، گڑبڑ کے دنوں میں کئی اور بندوقیں بھی گاؤں میں آئی تھیں، مگر کچھ عرصے کے بعد پولیس نے آکر وہ اپنے قبضے میں کر لی تھیں)، حکیم اس بات سے صاف انکاری تھا۔ گاؤں کے یہ بڑے بوڑھے بڑی لمبی عمروں والے آدمی تھے۔ اُن کو وہ دن بھی اچھی طرح یاد تھا جس دن یہ شخص، جو ابھی جوان آدمی تھا، مگر عمر سے ڈھلا ہوا دکھائی دیتا تھا ——— جس کے واسطے سے مستقبل میں گنبد کا نام اس گاؤں کی حدود سے نکل کر دُور دُور تک پہنچنا تھا، اور جس نے اپنی باقی عمر ان لوگوں کے درمیان ایک ناقابلِ فہم شخصیت کے طور (خدا کی رحمت، یا زحمت؟) پر گزارنا تھی—ایک مسافر کی شکل میں اپنے شیرخوار بچے کو لیے، ایک سُوٹ کیس اور گول بندھے ہُوئے بستر کے ہمراہ گنبد میں وارد ہُوا تھا، اور یہیں پر رہنے لگا تھا۔ کسی کو پتا نہیں تھا کہ اُس نے مستقل پڑاؤ ڈالنے کے لیے اس گاؤں کا انتخاب کیوں اور کیسے کیا تھا۔ ایک بار اُس نے کسی سے صرف اتنا کہا تھا: "مجھے یہ جگہ پسند آئی ہے۔"

چنانچہ اس بارے میں کئی کہانیاں سُننے میں آنے لگی تھیں جو حکایتیں کچھ ہنگامہ خیز تھیں اپنی طبعی عمر گزار کر مر گئیں۔ جن میں ذرا تخیّل کی گنجائش تھی دُہرائی جاتی رہیں، اور بالآخر سکّہ بند قصّے بن کر لوگوں کی توجّہ سے ہٹ گئیں۔ خود وہ آدمی، ان قصّوں کے ساتھ ساتھ اور ان سے ذرا ہٹ کر، گاؤں کے سِرے پر، انہی قصّوں کی مانند، گاؤں والوں کی قدیم اور گہری زندگیوں سے بچے پرے رہتا چلا گیا۔ پہلے پہل کے اُن دنوں میں ان بڑے بوڑھوں نے، جو اُس زمانے میں بھی چالیس چالیس، پچاس پچاس کے پیٹے میں ہوں گے، اپنے کھیتوں میں کام کرتے یا آرام سے بیٹھ کر حقّہ پیتے، کھانا کھاتے ہُوئے کئی بار اُسے گاؤں کی دیواروں کے ساتھ ساتھ گزرتے، خاکی کینوس کے خول میں بندوق کو کندھے سے لٹکائے، سیدھا سامنے دیکھ کر چلتے ہُوئے گاؤں سے نکل کر نیچے وادی میں اُترتے یا چوٹی والے جنگل میں چڑھتے ہُوئے دیکھا تھا۔ پھر کہیں سے ایک تیز دھماکے کی آواز آتی، اور تھوڑی دیر میں وہ ایک مُردہ پرندے کو—کسی بھٹ تیتر یا جنگلی کبوتر کو ہاتھ میں لٹکائے واپس آتا دکھائی دیتا۔ اِدھر اُدھر نظر دوڑائے بغیر وہ اپنے گھر کو چلا جاتا۔ پھر گھر کے صحن میں وہ کوئلوں کی آگ پر اُس پرندے کو بھون کر کھاتا، اور کبھی کبھی ہوا کے رُخ پر بھُنتے ہُوئے گوشت کی اشتہا آور مہک دُور دُور تک پہنچتی اور ان لوگوں کو اُس شخص کی خودکفالتی کا عجیب، نامانوس سا احساس دلاتی۔ گاؤں والوں کی ہوش میں وہ پہلے فائر تھے جو اُن کے اپنے

گاؤں کے کسی باشندے کی بندوق سے ہوئے تھے۔ یہ جان کر جہاں گاؤں والوں کو فخر کا احساس ہوتا، وہاں اُس شخص کا انجان ماضی، اُس کی بے زن اور بے طلب، بے محنت زندگی، اُس کا رویہ، اُن کو اُس سے دُور دُور رکھتا۔ دہقانی زندگی جس مانوسیت کے دائرے کے اندر بسر ہوتی ہے، اُس زمانے میں وہ شخص، محمد عمر، اُس دائرے کی حدوں پر عجیب پُرخطر طور پہ وقت کاٹتا رہا۔

پھر اچانک بندوق نظروں سے غائب ہو گئی، گو جنگلوں میں اُس شخص کا جانا برقرار رہا۔ اب وہ اکیلا، پہر پہر بھر دُور دُور کے جنگلوں میں گھومنے کے لیے جاتا، جہاں پہ کبھی کسی چرواہے یا گاؤں کو لوٹتے ہوئے کسی مسافر کی نظر اُس پر پڑ جاتی۔ اکثر وہ زمین پہ نظریں جمائے، پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہُوا چل رہا ہوتا، جیسے کسی شے کو ڈھونڈ رہا ہو۔ کبھی کسی درخت یا پودے پر نظریں لگائے دیر دیر تک کھڑا گھورتا رہتا، یا جھک کر جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی زمین سے کوئی پتا اُٹھاتا، شام کے اندھیرے میں اُسے آنکھوں کے قریب لا کر دیکھتا، اور پھر احتیاط سے تہہ کر کے جیب میں رکھ لیتا۔ ایک روز آخر اُس نے اپنی تین سالہ بچی کو کندھے پہ بٹھایا اور گھر کو دہقان عورت کے سپرد کر کے گاؤں سے رخصت ہُوا، یہ کہہ کر کہ وہ تین مہینے تک واپس آ جائے گا۔

وہ دن بھی ان بڑے بوڑھوں کو یاد تھا جب ٹھیک تین ماہ کے بعد اُنھوں نے اُسے کرائے کے ایک خچر پہ نیا المونیم کا ٹرنک لادے، اُس پہ بچی کو بٹھائے گُنگدو واپس آتے ہُوئے دیکھا تھا۔ گاؤں میں آناً فاناً مزید دولت کی افواہیں پھیل گئیں۔ مگر جب ٹرنک کھُلا تو اُس میں سے صرف شیشے کی چھوٹی بڑی، ڈھکنے دار بوتلیں، ٹین کے ڈبے، کچھ بھرے ہوئے کچھ خالی، اور خشک جڑی بوٹیوں کی پوٹلیاں نکلیں۔ اُس روز سے اس شخص نے ایک نئی زندگی کی ابتدا کی تھی، جس نے اُسے محمد عمر سے اُٹھا کر مشہور "گُنگدو والا حکیم" بنا دیا اور اُس کی جڑیں اُس خشک زمین میں گاڑنی شروع کر دیں۔

بندوق بہرحال پھر نظر نہ آئی، گو یہ بات کہ اُس گاؤں میں ایک بندوق تھی، جسے گاؤں بھر نے فی الحقیقت چلتے ہُوئے سُنا اور مار کرتے ہوئے دیکھا تھا، سب کے علم میں رہی۔ اور اب جب کہ گاؤں کے مویشیوں کو ہی نہیں بلکہ عورتوں اور بچوں کو، چرواہوں اور لکڑہاروں کو ایک خونخوار درندے سے جان کا خطرہ پیدا ہو چکا تھا، سب کی نظریں اِس بندوق پہ لگی تھیں۔ مگر حکیم نے، ایک آدھ ابتدائی اطلاع کے مطابق، بندوق کا مالک ہونے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اب اس شخص سے، جو کہ ہر روز تازہ دُھلا ہُوا سفید کُرتا پہنتا، سر پہ اُسی کپڑے کی سفید، ہلکی سی چوکور ٹوپی رکھتا، اور نہایت مہربانی اور شفقت سے ہر ایک کے ساتھ پیش آتا تھا، اِس بارے میں آخری بات کون کرے۔

اسد سفیدے کے نیچے سے اُٹھ کر چنار کے نیچے جا بیٹھا جہاں سے مطب کے اندر کا منظر دکھائی دے رہا تھا۔ اندر حکیم نے آنے والوں کی خاطر اپنا گدّے دار، ٹھگنی ٹانگوں والا تختہ جسے وہ دیوان کے طور استعمال کرتا تھا خالی کر دیا تھا، اور اب اپنی پُرانی آرام کرسی پر بیٹھا تھا۔ پانچوں بوڑھے بے آرامی سے تختے کے ایک ہی طرف کو جمع ہو کر ساتھ ساتھ لگے بیٹھے تھے۔ انہوں نے اپنی پگڑیاں اور ٹوپیاں اُتار کر گھٹنوں پر ٹکا دی تھیں، اور اب بے اعتماد ہاتھوں سے داڑھیاں اور سر کھجا رہے تھے۔ یُوں لگتا تھا جیسے ماحول کی غیر مانوسیت نے انہیں گنگ کر دیا ہے۔ وہ شاید ایسے نرم گدّے دار تختے پر کبھی نہ بیٹھے تھے۔ اُن میں سے ہر ایک کی یہ کوشش تھی کہ وہ گاؤ تکیے سے دُور از دُور بیٹھے۔ تختے کے سامنے ایک نیچی سی چوکور میز، جو دوائیاں رکھنے یا کبھی کبھار لکھنے کے کام آتی تھی، پڑی تھی۔ اس میز کے مصرف سے بھی اُن کی براہِ راست واقفیت نہ تھی۔ آدھے فرش پر نیلے رنگ کی دری بچھی تھی۔ ایک بُوڑھے نے بلا وجہ جھک کر اپنے پیر کے پاس دری کے ایک کونے سے اُلٹے ہاتھ کے ساتھ کچھ گرد صاف کرنا شروع کر دی۔ کونے میں ایک تنگ سی میز پر، شیشے کی اونچی چمنی والا جستی لیمپ پڑا تھا۔ دائیں دیوار کے ساتھ وہ چوڑی سی مقفّل الماری تھی جس میں حکیم کی اس ساری کرشمہ سازی کا سامان بند تھا۔ کمرے کی ساری چیزیں ایک نہ ایک وقت میں شہر سے لائی گئی تھیں۔ حکیم بید کی بنی ہوئی آرام کرسی پر ٹیک لگائے، ہونٹوں پر بے عنوان سی مسکراہٹ لیے، خاموش بیٹھا خلا میں دیکھ رہا تھا، جیسے یہ سارا ساز و سامان اس نے فقط اسی دن کے لیے اکٹھا کیا تھا، اور اب اطمینان سے بیٹھا ان لوگوں کی پریشانی کا لطف اُٹھا رہا تھا جو پچیس برس تک اُس کو مشتبہ جانتے رہے تھے اور اب اپنی عمر میں پہلی بار مجموعی طور پر مدد کی درخواست لے کر اس کے پاس آئے تھے۔ اسد کے حمام دستے میں خشک ڈنڈیاں اور پتّے ٹوٹ پھوٹ چکے تھے، اور دیر یہی تھی کہ پیستے پیستے وہ ایک خاص باریکی کے نقطے تک پہنچیں تو تیار ہوں۔ جہاں پہ وہ بیٹھا تھا وہاں سے بخوبی اندر کی گفتگو کو سُن سکتا تھا، مگر گفتگو مفقود تھی۔ چنانچہ وہ چنار کے سائے میں بیٹھا لوہے کے دستے کو مضبوطی سے تھامے، کبھی دائیں کبھی بائیں اُسے حمام میں پھراتا ہوا بدرنگ سی پھکّی کو پیسے جا رہا تھا جو پہلے ہی کافی حد تک باریک ہو چکی تھی۔ جہاں تک اُس کا علم تھا، اس پھکّی میں مزید کسی تبدیلی کے آنے کی گنجائش نہ تھی، مگر یہ علم کہ ابھی یہ باریکی کے مطلوبہ درجے تک پہنچی ہے کہ نہیں، اُس کے ہاتھ میں نہ تھا۔ پہلے پہل وہ حیرت سے سوچا کرتا کہ ایک بار جب بھاری دستے کے نیچے کچّی پکّی ڈنڈیاں اور خشک پتّے اور چھوٹے بڑے بیج ٹکڑے ٹکڑے ہو کر مل جُل جائیں، اور کچھ اور پسنے پر یکجان ہو جائیں، تو پھر اسے بلا وجہ پیستے رہنے سے دوا کی تاثیر میں کیا فرق پڑ سکتا ہے۔ مگر پھر حکیم نے اُس کو بتایا کہ یہ اُس کے جاننے کی بات نہ تھی، کہ یہ جاننے کی بات تھی ہی نہیں، بلکہ تجربے کی تھی۔ اور تجربے کا بدل وقت کے سوا کوئی نہ تھا۔ وقت کے ساتھ ساتھ بیسیوں، بلکہ سینکڑوں مریضوں پہ اسے پساہٹ کے مختلف درجوں پر آزما کر دیکھا جاتا

ہے اور پھر اُس سے کوئی نتیجہ اخذ کیا جاتا ہے۔ پھر بھی یہ نتیجہ کبھی کارآمد ہوتا ہے کبھی نہیں ہوتا، جس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی کے عارضوں کی ہزاروں شکلیں ہیں، اور ہر شکل دُوسری شکل سے مختلف ہے۔ اس کا اندازہ کرنا تجربہ کہلاتا ہے اور یہی اصل علم ہوتا ہے —— یہ بھی اُن ہزار ہا ایک طرفہ باتوں کی سی ایک بات تھی جو قریب قریب ہر روز اُسے بتائی جاتی تھیں جن کا کوئی ثبوت نہیں تھا، اور وہ ان باتوں کو کیے جاتا تھا اس لیے کہ ضروری ہوتی تھیں اور اس ضرورت کا کوئی بدل نہیں تھا۔ یہ پہلے پہل کی بات تھی۔ وہ اُن دُوسروں کو دیکھتا جو اپنا اپنا کام کر رہے ہوتے اور ساتھ ہی ساتھ دل میں دُعا کیے جاتے کہ ابھی حکیم اپنے چکر پہ نکلے گا، اُن کے برتنوں میں ہاتھ ڈال کر انگلیوں کے بیچ پسائی کو دیکھے گا اور کہے گا، "ہوگیا"۔ ہر دم دل میں یہی اُمید لیے کہ اب اُن کی خلاصی ہوئی کہ اب ہوئی، گھنٹوں گھنٹوں تک کیے جا رہے ہیں، کچھ عادت کے زور پر کچھ علم کی کمی کے احساس سے۔ اُنہیں کہا جاتا تھا کہ کرو، اور فقط یہ کہنا ہی علم کی قوت بن کر اُن کی آنکھوں پہ پردے کی مانند گر پڑتی تھی اور اُن کے ہاتھوں کو اپنی چاکری میں مصروف کر دیتی تھی کہ علم بہر حال ایک برتر قوت ہے جو اپنے قوانین رائج کرتی ہے۔ مگر اُس کی حیرت کی انتہا نہ رہتی جب وہ اپنے ساتھیوں کو اپنے اپنے کاموں پر دھیان دیے یا بدن کی کوئی قوت صرف کیے بغیر، پہروں پہر خوشی بہ خوشی ہاتھ چلائے جاتے ہوئے دیکھتا۔ وہ کون سی طاقت ہے، وہ سوچتا، جس کے سہارے پر یہ لوگ کچھ جانے بُوجھے بنا چلے جاتے ہیں؟ پھر کچھ عرصے کے بعد، اُن کے ہاتھوں کی حرکت کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد، ایک دن اُسے خیال آیا کہ شاید یہ ایک مشینی آہنگ ہے جو ان لوگوں نے پا لیا ہے، جس کے زور پہ یہ اپنے اپنے کام کو اتنی آسانی کے ساتھ نپٹائے جا رہے ہیں۔ ہاتھوں کی حرکات کا اور پسائی کی دھیمی دھیمی آواز کا فی الواقع ایک آہنگ تھا جو ان کے اِس بے حساب کام کو آسان بنا دیتا تھا۔ اور وقت کے ساتھ، اتنی صفائی سے اُنہوں نے اِس ڈھنگ کو اپنا لیا تھا کہ اُن کی علالت کے اِس مقام پہ جہاں نہ علم تھا نہ کوئی اُمید، فقط یہ کام، یہ حرکت ہی اُن کو آرام پہنچانے کا ایک ذریعہ بن گئی تھی، اِس لیے کہ یہ آہنگ جو انہوں نے اپنی انتھک محنت سے حاصل کیا تھا بالآخر اتنا سیدھا سادا اور آسان اور آرام دِہ تھا کہ اِس کے مقابلے میں دُوسری سب باتیں، علم یا اُمید یا کچھ اور، گنجلک سی باتیں لگتی تھیں۔ زندگی کے راستے، اُس نے ایک بار سوچا تھا، کیسی دانائی کے راستے ہیں، اور یہ لوگ ان راستوں کو کسی نہ کسی طور ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ یہ لوگ شاید دنیا میں حقیقی خالق ہیں۔ اُس نے اس آہنگ کو دریافت کرنے کی سر توڑ کوشش کی تھی، اور اُسے اعتماد تھا کہ جلد یا بدیر وہ بھی اسے پا لے گا۔

چنانچہ اُس وقت وہ چنار کے نیچے بیٹھا ایسے بے معلوم طریقے پر اپنے بھُورے رنگ کے سفوف کو پیسے جا رہا تھا کہ ہاتھ روکے بغیر اندر کی باتوں کو سن سکتا تھا، مگر بہت دیر تک اندر کوئی بات ہی نہ ہوئی، ایسے جیسے دونوں فریق اپنے اپنے مُوقف پہ اڑے بیٹھے تھے، اور کمرہ آہستہ آہستہ بھاری خاموشی کے طلسم میں جکڑتا جا رہا تھا۔ یہ سکوت اب گھنا ہو

کر ایک اَن دیکھی دُھند کی شکل میں دروازے سے باہر ٹپکنا شروع ہو گیا تھا اور احاطے کے اُس حصّے کو اپنی لپیٹ میں لیتا جا رہا تھا جہاں اسد بیٹھا تھا۔ اسد کو خیال ہوا جیسے اِس سکوت کا اپنا ایک زور تھا جو اندر بیٹھے ہوئے لوگوں کے دلوں پر اپنا خوف طاری کیے جا رہا تھا اور وہ اسے توڑتے ہوئے ڈر رہے تھے، اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے ہوئے بے چینی سے کسمسا رہے تھے، اور بات کرنے کے ارادے سے مُنہ کھول کر بنا بات کیے اسے بند کر دیتے تھے، کُرتوں کے کُھلے کُھلے بازو چڑھا رہے تھے اور بلا ضرورت کہنیاں کھُجا رہے تھے۔ اسد نے مُنہ پھیر کر دُور دُور تک جنگل میں نظر دوڑائی، اور دفعتہً اُسے درختوں کے ایک جُھنڈ کے بیچ، رات کے اندر یاسمین کا مُتبسم چہرہ گزرتا ہُوا نظر آیا اور اُس کی آنکھوں میں درد کی ایک ٹیس اُٹھی، جیسے بہت دیر تک گھُپ اندھیرے میں رہنے کے بعد نظر یکبارگی دھُوپ کے سامنے آ جائے۔ اُس نے ایک لحظے کو اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ جب اُس نے دوبارہ کمرے کی طرف دیکھا تو اندر بات شروع ہو چکی تھی۔ ایک بوڑھے نے مُنہ کھولا۔ دو تین بار اُس کے ہونٹوں نے بے آواز لفظوں کی شکلیں بنائیں، اور ابھی اسی کوشش میں تھا کہ دُوسرے نے جلدی سے شلے کر بات شروع کر دی۔ بابر اسد کے ہاتھ کی تو بیں ٹوٹ گئیں۔ اُس کی اُنگلیاں دستے کے اُوپر کس گئیں، یہاں تک کہ اُن کے جوڑ سفید ہو گئے، دستہ اچانک جیسے ایک من کا ہو گیا، اور کوشش کے باوجود وہ اپنے بدن کے آہنگ کو، جو ایسا بے معلوم تھا کہ اُس کی ذات میں معدوم ہو چکا تھا، برقرار نہ رکھ سکا۔ اُس کے کان سنسنا رہے تھے، اور وہ سوچ رہا تھا، یہ مجھے ہوا کیا ہے۔ میں سُن کیوں نہیں سکتا؟ باتوں کے ٹوٹے ہُوئے، چھوٹے بڑے ٹکڑے اُس دُھند میں جیسے سُست رفتاری سے اُڑتے ہُوئے اُس کے کانوں تک پہنچ رہے تھے۔ اتنا اُس نے سُنا کہ وہ بوڑھا دہقان، کسی تمہید کے بغیر، فوراً بر سرِ مطلب آ گیا، اور بولا کہ انہیں بندوق مانگنے کی ضرورت آ پڑی تھی۔ دُوسرے دو بوڑھوں نے بیک وقت بے معنی سی ہوں ہاں کرکے اُس کی ہاں میں ہاں ملائی، اور پھر حکیم نے پہلی بار مُنہ کھولا اور کہا کہ اُس کے پاس تو اب کوئی بندوق نہ تھی۔ حکیم کی اس بات کے ساتھ ہی جیسے جادو کی چھڑی سے کمرے کے اندر اجنبیت کا وہ طلسم ٹوٹا اور بابر اسد کے جسم کی بے ترتیبی ختم ہو گئی۔ اُس کے کانوں کی سنسناہٹ ایک دم بند ہو گئی اور آنکھوں کی دُھند چھٹ گئی، اور اُس کے ہاتھوں کے دائرے واپس اپنی نہج پہ آ کر اس کے آہنگ کا حصّہ بن گئے، جیسے کوئی گاڑی ریل کی پٹڑی سے ایک لحظے کے لیے اُتر جائے اور چند زور شور کے دھچکے کھا کر واپس اپنی پٹڑی کو پکڑ لے۔ مطلب کے اندر پانچوں بوڑھے اب بڑے اعتماد کے ساتھ غضبناک ہو رہے تھے۔

"یہ میرے لیے ——" ایک بوڑھے نے اپنی دسوں اُنگلیاں پھیلا کر اپنے سینے پر رکھیں،

"یا اس کے لیے،" اُس نے دُوسرے کے سینے پر اُنگلی لگائی، پھر حکیم کی طرف دیکھتے ہُوئے اُس نے تیسرے کی جانب اُنگلی لہرائی جو غیر ارادی طور پر تیسرے بڈھے کی داڑھی میں جا گھُسی اور وہ اُس کے وار سے بچنے کے لیے تیزی

سے پیچھے ہٹنا؟ "یا اس کے لیے نہیں۔ یہ گنبد کے لیے، عورتوں اور جانوروں کی حفاظت کے لیے ہم تمہارے پاس آئے ہیں۔ خطرے کی گھڑی میں تمہیں اپنا جان کر تمہارا ہتھیار مانگنے آئے ہیں۔ آخر گنبد تمہارا اپنا گھر ہے . . . . !"

پھر حکیم کی میٹھی، کسی حد تک خوفناک آواز: "بیشک۔ بیشک گنبد میرا اپنا گھر ہے۔ اس کی حفاظت کی خاطر جو کچھ مجھ سے ہو سکتا ہے میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ بندوق میرے پاس نہیں۔ بیس پچیس سال ہوئے۔ یہ بات میں نے کسی کو نہیں بتائی، پہاڑ پر یا کستی میں مجھے اب ٹھیک یاد بھی نہیں کہ کہاں، ایک روز میں نے ایک پرندہ مارا۔ ایسا خوبصورت پرندہ میں نے اپنی زندگی میں نہیں دیکھا تھا۔ مگر یہ پرندہ حرام تھا۔ اُسے پھینک دینے کے سوا میرے پاس اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اُس وقت میں نے سوچا، یہ میں کس کام میں پڑا ہوں! آدمی تو جان کی حفاظت کی خاطر پیدا ہوا ہے، میں جان لے رہا ہوں۔ اس خیال کے ساتھ میں ایسا پشیمان ہوا کہ اُسی وقت میں نے بندوق کو گھما کر دُور پھینک دیا۔ ہاں، اب یاد آیا، میں اس وقت پہاڑ کے اوپر کھڑا تھا، مجھے یاد ہے کہ بندوق اتنی دُور نیچے کستی میں جا کر گری تھی کہ مجھے اس کی آواز بھی نہیں آئی تھی۔" حکیم نے افسوس سے سر ہلایا، "کیا پتا تھا کہ ایک روز اس کی ضرورت پڑ جائے گی۔"

تڑے مڑے کاغذ کے سے شکن دار چہروں میں کہنہ آنکھیں بے اعتباری سے بھڑک اٹھیں۔ پانچوں کے پانچوں بڈھے ایک ایک کر کے اُٹھنے لگے۔

"اچھا صلہ دیا۔" ایک بڑبڑایا، پھر اچانک مڑ کر ایک لمبی الزاویہ انگلی حکیم کی آنکھوں کے سامنے ہلا کر اونچی آواز میں بولا: "ہم تمہارے اُوپر اعتبار کر کے آئے تھے، حکیم۔ کم سے کم ایک بار زندگی میں یہ ثابت کر دیتے کہ تمہیں ہمارا درد ہے —" حکیم نے ہاتھ اُٹھا کر کچھ جواب دینے کی کوشش کی، مگر اُس کی بات سُنے بغیر پانچوں بڈھے ایک دوسرے کے پیچھے باہر نکل گئے۔ اُس وقت اسد کی آنکھوں کے آگے اور آنکھوں کے پیچھے دنیا کا منظر بڑا واضح اور شفاف نظر آ رہا تھا اور اُس کے دل میں مکمل سکوت کا عالم تھا۔ وہ اپنا حمام دستہ وہیں پہ رکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ بڑے آرام سے، ہلکے پھلکے بدن پر چل کر وہ سفیدے کے نیچے پہنچا۔ یہاں پہ رُک کر اُس نے دھیمی سی نظر احاطے پہ ڈالی۔ دھوپ کی ایک تیز چادر احاطے کے صحن پر تنی تھی اور گویا نہایت محنت اور صبر کے ساتھ درختوں کے ایک ایک پتے پر منڈھی گئی تھی۔ ان گنوار لوگوں کو، اُس نے سوچا، ان ڈرپوک اور گنوار لوگوں کو کیا حق ہے کہ ہتھیاروں سے مسلح ہو کر ایک شیر کو جان سے ہلاک کر دیں۔ یہ اوہام پرست لوگ اس کے اہل نہیں۔ مطب کے دروازے پہ پانچوں بزرگ لوگ ایک تنگ سے گروہ کی شکل میں رُکے ہوئے تھے اور ایک اُن میں سے باٹ دار آواز میں چھینکیں مار رہا تھا۔ وہ ایک بار چھینکتا، پھر ناک کے سوراخوں کو اوپر سورج کی سیدھ

میں کر کے نتھنے پھُلاتا، اور وہاں سے پھر دوسری زوردار چھینک کا آغاز کرتا۔ چھینکوں کے درمیان وہ زور شور سے ناک سُنکے جا رہا تھا، جیسے غصّے کے اظہار کا اس سے بہتر طریقہ نہ جانتا ہو۔ پھر وہ پانچوں، اُسی طرح ایک دُوسرے میں گھُس کر چلتے ہُوئے احاطے کے دروازے کی جانب بڑھے جس کے باہر گاؤں کے لوگوں کا ایک گروہ اُن کے انتظار میں کھڑا تھا۔ چند لمحوں کے لیے احاطے میں کام کرتے ہُوئے لوگوں کے ہاتھ رُک گئے، اور اُن کی آنکھیں احاطے کو پار کرتے ہُوئے پانچ شکست خوردہ بزرگوں کا تعاقب کرنے لگیں۔ جب وہ دروازے تک پہنچے تو نظریں اپنی جگہ پر پلٹ آئیں اور ہاتھ پھر سے جاری ہو گئے۔ مگر صرف ایک لمحے کے لیے۔ اُس کے بعد ایک ایسا واقعہ ہوا جو شاید اس احاطے کی عمر میں پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ میر حسن کا تنومند جسم ایک سپرنگ کی سی لچک اور قوت سے اُچھل کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ دو تین تیز تیز جھٹکوں کے ساتھ اُس لڑکے نے مطبخ کو، سامنے دیوار کو، اور پھر دروازے کو دیکھا، پھر ہوا کے پیروں پر اُڑتا ہُوا باہر نکل گیا۔ جاتے جاتے اُس کا برتن پاؤں کی ٹھوکر سے اُلٹ گیا، لکڑی کا چمچہ دُور جا گرا، اور برتن سے گھنی سی سیاہ معجون (جو ملاوٹ کے بجائے کس مرحلے پر تھی!) آہستہ آہستہ بہنے لگی۔ مگر میر حسن نے پلٹ کر بھی نہ دیکھا، جیسے اب وہ یہاں کبھی نہیں آئے گا۔

احاطے کے دروازے کی سیدھ میں ایک چوڑی سی گلی جاتی تھی، جو تقریباً تیس گز تک چڑھائی کے رُخ پر چڑھتی تھی، اُس سے آگے ڈھل جاتی تھی۔ سفیدے کے نیچے سے، جہاں اسد کھڑا تھا، اس مقام پر گلی سامنے آسمان میں ختم ہوتی ہُوئی معلوم دیتی تھی۔ اُس گلی میں اب میر حسن سمیت دس بارہ مردوں کا ایک گروہ، جس کی رہبری پانچ بوڑھے کر رہے تھے، اونچائی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ گلی کے دونوں طرف دروازوں میں مرد، عورتیں اور بچے کھڑے گنگ نظروں سے اُنہیں گزرتے ہُوئے دیکھ رہے تھے۔ کبھی کوئی عورت یا کوئی مرد اُن کے گزر جانے پر افسوس سے سر ہلاتا۔ کچھ بڑے بچے اور دو مرد گھروں سے نکل کر اُن کے پیچھے ہو لیے۔ اسد کے مُنہ میں ایک بے نام سی بدمزگی پھیلنے لگی۔ وہ اپنے کمرے کو جانے کے لیے دروازے کی طرف چل پڑا۔ اُس مختصر سے گروہ کے لوگ اب گلی کی چوٹی پر پہنچ چکے تھے اور ایک ایک کر کے نظروں سے اوجھل ہوتے جا رہے تھے۔ یکلخت ایک بوڑھا، جو گروہ کے آخر میں تھا، پلٹا اور ڈھلان پہ اُتر کر غائب ہونے سے پہلے اُس نے مٹھی ہوا میں بلند کی —— جو چمکتے ہُوئے آسمان کے مقابل کسی جلے ہُوئے درخت کی ٹہنی کی مانند اسد کی آنکھوں کے سامنے دیر تک چمچاتی رہی —— اور غصّے سے پھٹی ہُوئی آواز میں چیخا:

"پناہ گیر!"

اس ایک لفظ میں جہنّم کے اور اُن کے درمیان پچیس برس کے بُعد کی دہشت اور ویرانی پھیلی تھی۔ اسد اپنے

کمرے میں داخل ہو کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اُس نے اپنی کہنیاں گھٹنوں پہ ٹکائیں اور سر کو ہاتھوں میں لے کر جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ خوش قسمتی سے یہ مختصر سا ریلا کوئی آدھ گھنٹے میں گزر گیا۔ بعد میں وہ دیر تک سر کے پیچھے ہاتھ باندھے، آنکھیں بند کیے چارپائی پر لیٹا رہا۔ بیچ بیچ میں وہ آنکھیں کھول کر سامنے دیوار کو دیکھتا جہاں دھوپ کی کھڑکی بنی تھی اور اُس کے وسط میں مٹی ابھر کر دراڑ کی شکل میں پھٹ گئی ہوئی تھی۔ دھوپ کے اس چوکھٹے میں ایک چھپکلی اپنی بے جھپک آنکھیں وا کیے سُن بیٹھی دیوار کے سکوت میں اضافہ کر رہی تھی۔ سکوت ایسا تھا کہ دھوپ کے راستے میں ایک ذرہ تک نہیں اُڑ رہا تھا۔ یہ پہاڑوں کی ہوا ہے، اسد نے خیال کیا۔ اُسے یہ احساس تھا کہ کمان کی طرح تنے ہوئے اس سکوت کے اندر گاؤں کی زندگی میں دل شکنی اور خوف کی ایک کھلبلی تھی —— اور اس کمان کے کناروں پر کہیں یہ شخص ابھی مارا مارا پھرتا تھا، آرام بانٹتا ہوا، متین اور باضبط اور خوش اخلاق، جس نے خود اپنی سعی بالجبر سے اپنے آپ کو آج اس مقام پہ لا کھڑا کیا تھا جہاں پر گولی کی طرح چھوٹے ہوئے ایک لفظ نے بالآخر اُس کی ہڈیوں تک کو برہنہ کر کے رکھ دیا تھا۔ مدت ہوئی کہیں سے یہ آدمی اکھڑے ہوئے درخت کی مانند بہتا ہوا اِدھر آ نکلا تھا، اور اس زمین میں کسی طور جم کر کھڑا ہو گیا تھا۔ سالہا سال تک وہ ان کے درمیان رہتا چلا گیا تھا۔ اُس کی گردن میں خم نہ اُس وقت آیا تھا نہ اب ہے، اور اگر تھا تو عجیب سا جو نظر نہ آیا تھا۔ وہ ایک علم کا راز سینے میں لیے یہاں وارد ہوا تھا، اور اس جگہ کا انتخاب کر کے یہاں رہنے لگا تھا، مگر ان لوگوں کی طرح نہیں جو سادگی کے ساتھ زمین سے اور آسمان سے اور جنگلوں پہاڑوں سے اپنا حق مانگتے تھے اور وصول کرتے تھے، وصول کیے جاتے تھے۔ یہ شخص دینے والا تھا، اور اسی بنا پر اُن سے الگ تھلگ ہو گیا تھا۔ مگر بالآخر وہ اپنے علم کا ثبوت فراہم نہ کر سکا تھا۔ یہ کہ وہ آرام تقسیم کرتا تھا ایک غیر اہم سی بات ہو کر رہ گئی تھی کیسی عجیب بات ہے، اسد سوچتا رہا۔ اگر یہی شخص جادو کا داعی ہو کر، یا آزادی کا نعرہ لے کر، یا کسی ان دیکھی بے مقام دُنیا کا پیغام لے کر گشتہ میں آتا تو یہ دہقان جوق در جوق، سوال جواب کیے بغیر اُس کی ولایت میں داخل ہونے کو چلے آتے۔ دلوں کا سکون بانٹنا، جسم کا آرام بانٹنے کی نسبت کتنا آسان ہے، اسد نے سوچا —— وہ اپنے خیال کی پیچیدگی سے گھبرا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ دروازے میں سے اُس نے دیکھا کہ احاطہ خالی پڑا ہے، سوائے ولی کے جو اسد کا رتن لیے بیٹھا اُس کے اندر کا سفوف آہستہ آہستہ، سات اور نو کے چکروں میں پیس رہا تھا۔ ولی کے سوا سب کو چھٹی مل چکی تھی اور اُن کے رتن گھر کے دروازے پر رکھے تھے۔

صرف میر حسن کا رتن اُسی طور گرا پڑا تھا جس طرح میر حسن اسے چھوڑ کر گیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد حکیم مطب سے برآمد ہوا اور اپنی مستعد چال کے ساتھ احاطے سے نکل کر گھر کے اندر چلا گیا۔ اسد اپنے کمرے سے نکل کر ولی کے پاس جا بیٹھا۔

”تمہیں اس پہ یقین ہے؟“ کچھ دیر بعد ولی نے اپنی لمبی اور چوڑی ٹھوڑی سے مطب کی طرف اشارہ کر کے

پوچھا۔

"پتا نہیں۔" اسد نے بات ٹالتے ہوئے کہا، "تمہیں ہے؟"

"اونہوں۔" ولی نے نفی میں سر ہلایا۔ پھر وہ سوچ میں پڑ گیا، جیسے کسی مخمصے میں ہو۔ "مگر ایک بات ہے۔"

"کیا؟"

"اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔"

"پھر بھی تمہیں اس پہ یقین نہیں؟"

"اونہوں۔"

"کیوں؟"

"یہاں پر۔" ولی نے سینے پر ہاتھ مارا، "مجھے پتا ہے۔ بندوق اس کے پاس ہے۔"

اسد نے حمام میں سے چٹکی بھر سفوف نکالا اور انگلیوں میں اسے مل کر دیکھا۔ "ہو گیا۔" اس نے کہا اور حمام دستہ ولی کے ہاتھ سے لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک چنار کے نیچے اس نے جھک کر میر حسن کا گرایا ہوا برتن اور لکڑی کا چمچہ اٹھایا، اور دونوں برتنوں کو لیے گھر کی جانب چل پڑا۔ گھر کے دروازے پر پڑے ہوئے دو اور برتن اس نے اٹھائے اور دونوں ہاتھوں میں چار برتن لیے گھر میں داخل ہوا۔ گھر میں خاموشی تھی۔ کچھ دیر تک وہ باورچی خانے میں کھڑا باہر شمال کی طرف سے اٹھتی ہوئی ہوا کی آواز کو سنتا رہا۔ پھر وہ باورچی خانے سے نکلا اور گھر کے چھوٹے سے صحن کو عبور کر کے حکیم کے کمرے کے دروازے پر جا کھڑا ہوا۔ اندر حکیم گردن اور کندھوں کے گرد تولیہ لپیٹے چارپائی پر بیٹھا تھا اور یاسمین اس کے سر میں بادام روغن لگا رہی تھی۔ دونوں کی پشت دروازے کی جانب تھی۔ کچھ دیر تک اسد دروازے پہ کھڑا باپ بیٹی کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ کمرے میں داخل ہوا اور ہلکے ہلکے قدم رکھتا ان کے پاس جا کھڑا ہوا۔ حکیم آنکھیں بند کیے بیٹھا، دھیمی آواز میں کہہ رہا تھا:

"دیکھو، ضد مت کرو۔ بندوق میرے پاس نہیں۔"

"میں نہیں مانتی۔" یاسمین نے کہا۔

"تم تو تعلیم یافتہ ہو، بیٹی۔ عقل کی بات کرو۔ اگر میرے پاس ہو بھی تو یہ بندوق چھوٹے موٹے پرندوں کے شکار کے واسطے ہے۔ اس سے بھلا شیر کا شکار ہوتا ہے؟"

"جو کچھ بھی ہے، ان لوگوں کے حوالے کر دینے میں آپ کو کیا اعتراض ہے؟"

"تو گویا تم چاہتی ہو کہ میں بھی ان لوگوں سے مل کر بیوقوفی کی حرکتیں کروں؟"

"بیوقوفی کی کیا بات ہے۔ یہ لوگ ایک سچ مچ کے خطرے سے دوچار ہیں۔ آپ ان کی مدد نہیں کر سکتے ؟"

"بیشک ۔" حکیم نے یاسمین کے تیز تیز چلتے ہوئے ہاتھوں کے نیچے سر ہلایا، "جب میں دیکھوں گا کہ سچ مچ کا خطرہ لاحق ہو گیا ہے تو جو کچھ میرے اختیار میں ہوا کروں گا۔"

حکیم تولیہ گردن سے اتار کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ یاسمین تیل کی بوتل پر ڈھکنا رکھ کر ہاتھوں کو ایک دسترخوان سے رگڑ کر خشک کرنے لگی۔

حکیم اسد کو دیکھ کر چونکا: "تم یہاں کیا کر رہے ہو ؟"

"کچھ نہیں۔" اسد نے جواب دیا۔ پھر وہ بولا: "یہ کیوں بندوق اُن کے حوالے کرنے پر ضد کر رہی ہے ؟"

حکیم ایک لحظے تک ٹھٹک کر اسد کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے جلدی سے اپنے آپ کو سنبھالا۔ "پاگل بیٹی ہے۔" وہ یاسمین کی طرف دیکھ کر پیار سے بولا، اور کمرے سے نکل کر غسل خانے کو چلا گیا۔ یاسمین کے ہاتھ دسترخوان پر رُک گئے۔ اُس کا رنگ ہلکا سا زرد پڑ گیا اور وہ اپنی جگہ پر بے حرکت کھڑی کپڑے کا گیند بنا کر آہستہ آہستہ اُسے دبانے لگی۔ اسد سوالیہ نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔

"ظاہر ہے ۔" وہ بولی، "ایک خطرناک درندے کو ہلاک کرنے کے لیے۔"

"جنگل درندوں سے بھرا پڑا ہے۔ تم بندوقیں لیے اُن کے پیچھے تو نہیں دوڑتے پھرتے صرف اس لیے کہ وہ درندے ہیں ؟"

"اس قسم کے درندے نہیں۔ یہ خطرناک درندہ ہے جو صرف دہاڑ دہاڑ کر لوگوں کو خوفزدہ کرتا رہتا ہے، اور جنگل سے نکل کر کسی وقت بھی حملہ کر سکتا ہے۔"

"تم نے سُنا اُس بڈھے نے ابھی کیا کہا ہے ؟"

"میں نے کچھ نہیں سُنا ۔"

"سارے گاؤں نے سُنا ہے ۔" اسد نے غصے سے کہا، "ان کی نظروں میں تمہاری یہ عزت ہے . . . "

"عزت وزت کا سوال نہیں۔ یہ سارے گاؤں کا معاملہ ہے، ہمارا یا اُن کا الگ الگ نہیں۔"

"شاید تم بھی ان لوگوں کی طرح ایک خیالی خوف سے مری جا رہی ہو ؟"

یاسمین کا ہاتھ جیسے غیر ارادی طور پر اپنے حلق کی طرف اُٹھا اور اُس نے انگلیوں کے پوروں سے ہولے ہولے گلے کو ملنا شروع کیا، جیسے بات کی شدت سے اُس کا حلق بند ہوا جاتا ہو۔ اُس کی نظریں لپک کر اسد کی آنکھوں

سے ملیں۔

"مجھے کوئی خوف نہیں تم جانتے ہو میں اِس سے نہیں ڈرتی۔" ایک لمحے کو رُک کر وہ پھر بولی "تمہیں ثبوت چاہیے؟ میں آج رات کو اکیلی جنگل میں جا کر دکھا دوں گی۔"

اسد کے اندر غصّے کی لہر یک دم سرد پڑ گئی۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر یاسمین کو دیکھنے لگا۔

"پاگل ہوئی ہو؟"

"تم نہیں آنا چاہتے تو مت آنا۔" یاسمین ایک بے وجہ سرکشی سے بولی۔

اسد آخر اپنے آپ کو سنبھال کر مسکرایا: "مجھے کیسے پتا چلے گا کہ تم گئی ہو؟"

حکیم غسل سے فارغ ہو کر کمرے میں لوٹ آیا۔ وہ آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور لکڑی کے کنگھے سے اپنے چھوٹے چھوٹے سفید بالوں میں پیچھے سے آگے کی طرف کنگھی کرنے لگا۔ اسد گھر سے نکل گیا۔

(۴)

اسد کمرے کی بتی کو پھونک سے بجھا کر باہر نکل آیا۔ دروازہ بھیڑتے ہوئے اس نے آسمان پر نگاہ ڈالی۔ شام ہوتے ہوتے آسمان پر بادلوں کی ایک تہہ چڑھ آئی تھی۔ اس وقت چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ اسد نے یاسمین کے کمرے کی کھڑکی کو دیکھا، دل میں موہوم سی اُمید لے کر کہ شاید وہ باہر نہ گئی ہو، شاید اس کھڑکی میں روشنی کی دراڑیں نظر آئیں اور وہ جا کر اپنی انگلی ہولے ہولے تین بار اس پر بجائے، پھر ایک لمحے کا وقفہ دے کر دوبارہ تین بار، پھر لیمپ کی بتی نیچی ہو اور یاسمین کا جسم آگے آ کر روشنی کی دراڑوں کو بند کر دے، ہولے سے کنڈی کے اترنے کی آواز آئے، پٹ ایک اِنچ کھلے، پھر تیزی سے کھل جائے اور اس کا گرم گرم دانتوں والا خاموشی سے ہنستا، تمتماتا ہوا چہرہ نمودار ہو۔ وہ اپنی کہنیاں کھڑکی میں رکھ کر اپنا بوجھ ان پہ ڈالے اور آگے کو جھک آئے اور خواہ گھپ اندھیرا ہو اس کے شانوں کے، بازوؤں کے، چھاتی کے اور ہرن کی سی لہراتی ہوئی لمبی پشت کے تنے ہوئے چست پھیلاؤ چاندنی کے خطوط کی مانند واضح ہو جائیں۔ اسد نے دیکھا کہ کھڑکی بند اور بیجان پڑی تھی، جیسے کبھی کھولی نہ گئی ہو۔ وہ خیال کر کے دل میں حیران ہوا کہ کیسی عجیب بات ہے کہ جب کوئی شے بیجان ہو جائے، تو اس بات کے امکان بھی کہ کبھی یہ جاندار

اور محترک رہ چکی ہے یاد میں لانے محال ہو جاتے ہیں۔ اپنے احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہُوا وہ اُونچی نیچی تنگ گلیوں میں داخل ہُوا جن سے نکل کر اُسے گاؤں کے بائیں ہاتھ کو پہنچنا تھا۔ گلیوں اور گھروں میں اندھا اندھیرا تھا، اور دروازے اس طرح جامد تھے جیسے کوئی سانس لیتا ہوا ذی رُوح اُن کے پیچھے موجود نہ ہو، صرف مدتوں سے ہوا اندر رُکی ہُوئی ہو۔ چند منٹ کے اندر وہ دیواروں کو پیچھے چھوڑ کر اُس میدان کے کنارے پہ کھڑا تھا جس کی چٹیل سفید سطح اندھیری رات میں چاندی کے تھال کی طرح جھلملاتی تھی۔ آج اس رات کے اندھیرے میں یہ میدان بھی غائب ہو چکا تھا۔ آنکھیں پوری کھول کر دیکھنے کی کوشش کرتے ہُوئے اسد نے میدان کے پرے درختوں میں نظر دوڑائی۔ تاریکی میں ایک جگہ پر اُسے دو چمکتی ہُوئی آنکھیں نظر آئیں۔ اُس نے نظر ہلا کر دیکھا تو آنکھیں نظر کے ساتھ ہل گئیں۔ یہ اُس کی اپنی آنکھوں کے تارے تھے۔ مئی کا مہینہ تھا اور موسم میں خنکی زائل ہو چلی تھی۔ ایک پتے کے ہلنے کی آواز نہ آ رہی تھی۔ وہ احتیاط سے قدم اٹھا اٹھا کر رکھتا ہُوا میدان پار کرنے لگا۔ اُس کے سر کے چاروں طرف آنکھیں لگی تھیں اور اُس کا ایک ایک انگ چھوٹی سے چھوٹی آواز کی حرکت پہ بدکنے کے لیے تیار تھا۔

ایسی اندھیری رات میں، اسد نے سر کو مستقل دائیں بائیں پھراتے ہوئے سوچا، یہاں آنے کی کیا ضرورت تھی۔ اُس کو یاسمین پہ غصّہ آ رہا تھا۔ ایک انجانے سے خوف کے مارے اُس نے قدم تیز کر دیے۔ وہ تین چوتھائی میدان طے کر چکا تھا کہ ایک زوردار ضرب سے پلٹ کر گرا، جیسے زناٹے کا تھپڑ کسی نے اُس کی کنپٹی پر رسید کیا ہو۔ اُس کے کان سُن ہو گئے اور آنکھوں میں تارے ناچنے لگے۔ وہ اپنے پاؤں پہ بیٹھا، ہاتھوں پہ جسم کے بوجھ کو سہارے ہوئے اُلّوؤں کی طرح آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تاریکی میں دیکھنے لگا، پھر اگلے ہی لمحے چاروں ہاتھوں پاؤں کے زور پہ گیند کی طرح اُچھل کر دُور جا گرا۔ گرتے ہی اُس کا ہاتھ ایک گول سے پتھر پر پڑا جو اس نے اُٹھتے اُٹھتے پکڑ لیا۔ اب اُس کی صورت کچھ اس طرح تھی کہ ایک پاؤں اور ایک گھٹنے کے بل ادھ کھڑا، اُس بھاری پتھر کو ہاتھ میں تانے، ذرا سے اشارے پہ مارنے کے لیے تیار، اندھیرے میں منجمد ہو گیا تھا جب کہ اُس کی آنکھیں اپنی حدوں سے باہر تک پھیلی ہُوئی تھیں اور سر برابر دائیں اور بائیں چل رہا تھا۔ ایک سکوت کا عالم تھا جو ٹڈے سے نہیں ٹوٹتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس تاریکی سے ایک مدھم سا سیاہ، دراز قد ہیولا اس کی نظروں کے سامنے اُبھرا۔ اُس کا دل ایک بار بہت زور سے دھڑکا اور بیٹھ گیا۔ تیزی سے کئی بار آنکھوں کو جھپک کر اُس نے پھر اُنہیں آخری حد تک پھیلایا۔ اُس ہیولے میں کوئی حرکت نہ ہُوئی مگر اُس کی لمبائی اندھیرے میں بڑھنے لگی۔ یکبارگی اسد کے منہ سے ایک گالی نکلی۔ وہ پتھر کو ہاتھ سے پھینک کر اُٹھ کھڑا ہُوا اور جُھک کر گھٹنے کو سہلانے لگا۔ میں اِدھر کیسے آ نکلا، اُس نے اپنے آپ سے کہا۔ تاریکی میں وہ میدان کے بیچ بیچ جانے کی بجائے کوئی پندرہ قدم دہنے ہاتھ کو بھٹک گیا تھا، اور بے خبری میں پوری

رفتار کے ساتھ اُس کا ماتھا اُس جلے ہُوئے پیڑ کے تنے سے جا ٹکرایا تھا جو اُس میدان کا اکلوتا درخت تھا۔ جہاں پہ وہ کھڑا تھا وہاں سے اندازہ کرکے اُس نے اپنی چٹان کا رُخ کیا۔ یہ چٹان درختوں کی اُس آبادی کے کنارے پر زمین میں گڑی تھی اور جنگل والے رُخ پہ اندر سے کچھ دُور تک کھوکھلی ہو چکی تھی۔ اُس کھوہ میں جہاں دو آدمیوں کے بخوبی کھڑے ہونے کی جگہ تھی، دن کے وقت چرواہے بچے کھیلا کرتے تھے۔ اسد چٹان سے کچھ فاصلے پر تھا کہ دبی دبی ہنسی کی آواز اُس کے کان میں پڑی۔ آخری چند قدم تقریباً دوڑتا ہوا وہ کھوہ میں یاسمین کے برابر جا کھڑا ہوا۔

"کیوں ہنس رہی ہو؟"

"بس۔" وہ دِلربائی سے ٹھوڑی ہوا میں اُٹھا کر بولی۔ اندھیرے میں اُس کی آنکھوں کی چمک بہت مدھم مگر بہت شدید تھی۔

"کوئی وجہ؟" اسد نے کہا۔

"تم درخت سے ٹکریں کیوں مار رہے تھے؟" وہ ہنستے ہوئے بولی۔

"تم دیکھ رہی تھیں؟"

"ہاں۔"

"کہاں سے؟"

"وہاں سے۔" یاسمین نے ٹھوڑی سے درختوں کی جانب اشارہ کیا۔

"تم وہاں تھیں؟"

"ہاں۔"

"کب؟"

"ابھی۔"

"میرے گھٹنے میں چوٹ آئی ہے۔" وہ بولا۔

"ارے۔" یاسمین نے جلدی سے بیٹھ کر اُس کے گھٹنے پر ہاتھ رکھا۔

"یہ نہیں — دُوسرا —"

"پکا پتا ہے؟"

"ہاں۔" وہ سختی سے بولا۔ "ایسی رات میں یہاں آنے کی بھلا کیا تُک ہے۔"

"چلی جاؤں؟" یاسمین کی آواز میں ہنسی کی کھنک تھی۔

"اب آگئی ہو تو رُک ہی جاؤ۔" اسد نے کہا۔

یاسمین نے ایک لمبی سی "اچھا ؟" میں جواب دیا۔ دونوں ہنسنے لگے۔

یاسمین اُٹھی اور کھوہ سے باہر نکل کر چل دی۔

"کہاں جا رہی ہو ؟"

"وہاں۔"

"وہاں کہاں ؟"

"یہاں۔" وہ ایک درخت کے ساتھ پُشت لگا کر سیدھی کھڑی ہو گئی۔

اسد نے تیزی سے ایک نظر چاروں طرف دوڑائی۔ "احمق !" وہ بولا۔

"یہی دیکھنے آئی ہوں۔" یاسمین نے دونوں ہاتھ پیچھے لے جا کر تنے پر رکھ دیے، جیسے اُسے ڈر ہو کہ کوئی اُسے درخت سے یا درخت کو اُس سے چھین کر نہ لے جائے۔

"کیا ؟"

"احمق میں ہوں یا تُم ؟"

"کیسے ؟"

"تم کہتے تھے کہ وہ یہاں تک نہیں آتا، نیچے اپنے جنگل میں رہتا ہے۔"

"ہاں۔"

"پھر ڈر کیوں رہے ہو ؟"

"کہاں ڈر رہا ہوں ؟"

"ایک لمحے کو تمہاری نظر نہیں رُکتی۔ ہر طرف گھوم رہی ہے۔"

"تم دیکھ سکتی ہو مجھے ؟"

"اور کیا۔"

"کہاں ہوں میں بھلا ؟" وہ جلدی سے پاؤں کے بل بیٹھ گیا۔ یاسمین نے بات کیے بغیر ہاتھ بڑھا کر اُس کے بالوں کو چھُوا۔ سر اُٹھا کر اسد نے یاسمین کو، اور اُوپر درخت کے اندھیرے کو دیکھا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔

"اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ ڈر رہا ہوں۔"

"تم کہتے نہیں کہ وہ یہاں پر نہیں آتا ؟"

"کہتا ہوں ۔"

"مگر تمہیں اپنی بات پر یقین نہیں ۔"

"کیا اوٹ پٹانگ باتیں کر رہی ہو ؟"

"تم جو کہتے ہو تمہارا اپنا اُس پر یقین نہیں ۔" یاسمین نے دہرایا ۔

"مَیں کہتا ہُوں وہ نہ یہاں آتا ہے نہ کسی پر حملہ کرتا ہے ۔"

"تو پھر کیوں اُسے ہر طرف تلاش کرتے پھر رہے ہو ؟" یاسمین کی آواز میں گویا ایک فریاد تھی ۔ اسد نے آہستہ سے اُس کے بازو پر ہاتھ رکھا ۔

"چلو ۔" وہ بولا ۔

"کہاں ؟"

"وہاں ۔" اسد نے چٹان کی طرف اشارہ کیا ۔

وہ ٹکٹکی لگائے اسد کی طرف دیکھتی رہی ، مگر اپنی جگہ سے نہ ہلی ۔ پُشت میں چُبھتے ہُوئے تنے کو اُس نے دونوں ہاتھوں سے تھام رکھا تھا اور دُور دُور جھلملاتی ہوئی اُس کی آنکھیں اسد کی آنکھوں میں چھید کر رہی تھیں ۔ دفعتہً اُن کے پاس ایک تیز سرسراہٹ کی آواز پیدا ہوئی ۔ اسد اُچھل پڑا ۔ اُس کا جسم مدافعت کے انداز میں تن گیا اور وہ پہلو بدل کر اندھیرے کے مقابل کھڑا ہو گیا ۔ یاسمین کی ایک انگلی تک نہ ہلی ۔ وہ اُسی انداز میں کھڑی ایک ٹک اسد کو دیکھتی رہی ۔ اُس کی طرف دیکھے بغیر اسد کو برابر یہ احساس رہا کہ اُس لڑکی میں ذرہ برابر لغزش نہیں آئی ۔ (وہ دل میں اس بات پہ جھلا اُٹھا ۔ ایک خیال اُس وقت تیزی سے اُسے آیا اور گزر گیا کہ اگر وہ اُس وقت دیکھ سکتا تو ایک سرد اور بے جان چہرہ وہاں دیکھتا) سرسراہٹ کی آواز تیزی سے بڑھتی گئی ۔ اسد کو اب احساس ہُوا کہ آواز اُن کے پاس سے نہیں ، اُوپر سے آ رہی تھی ۔ اتنے میں پانی کے بڑے بڑے قطرے شاخوں میں سے چھن کر اُن کے سروں پر ٹپکنے لگے ۔

"چلو ۔" وہ یاسمین کا بازو ہاتھ میں لے کر بولا ۔ ساتھ ساتھ بھاگتے ہُوئے وہ چٹان کی کھوہ میں آ کھڑے ہوئے ۔ یہ جگہ بارش سے محفوظ تھی ۔ مگر اتنی سی دیر میں اُن کے کپڑے آدھے بھیگ چکے تھے ۔ اب گیلی ہوا کے جھونکے آنے شروع ہُوئے اور بہت اُونچائی پر بادلوں میں مدھم مدھم بجلی چمکنے لگی ۔ کھوہ کی زمین صاف ستھری اور ہموار تھی ، اور وہ پتھریلی دیوار کے ساتھ ، کندھے سے کندھا لگائے کھڑے تھے ۔

"بارش کے کوئی آثار نہ تھے ۔" اسد نے کہا ، "جب مَیں باہر نکلا تو دیکھ کر حیران رہ گیا ۔ بادل اتنی خاموشی

سے آئے ہیں۔"

"ہاں۔"

"پیاس ہے؟"

"ہوں۔"

"کیوں یہاں آئی ہو؟"

"بتایا تو ہے۔" وہ خاموشی سے بولی، "دیکھنے۔"

"کیا دیکھنے؟"

"کچھ نہیں۔"

"کچھ نہیں کیا؟"

"کچھ بھی نہیں۔"

"تو پھر؟" اسد نے پوچھا۔ اُس کی آواز میں اب غصّے کی رمق تک نہ تھی، ایک تحمل تھا۔ "اتنا اندھیرا تھا۔"

"ہاں۔"

"تو پھر؟"

یاسمین زمین پر بیٹھ گئی۔ اُس نے کھوہ کی دیوار سے ٹیک لگائی اور گھٹنوں پر ہاتھ اور ہاتھوں پہ ٹھوڑی رکھ کر ایک لحظے کو آنکھیں بھینچ لیں۔

"اسد۔" وہ بولی، "کوئی اور بات کرو۔"

اسد اُس کے ساتھ پاؤں کے بل بیٹھ گیا۔ بجلی اب آہستہ آہستہ قریب آتی جا رہی تھی، اور ساتھ بادلوں کی ہلکی ہلکی گرج سُنائی دینے لگی تھی۔ بارش پہلے زوردار چھینٹے کے بعد تھم گئی تھی، اور ہوا کے جھونکوں کے ساتھ نیم گیلے جنگل اور پہاڑ کی مخصوص خوشبو چاروں طرف سے آ رہی تھی۔ اسد خاموش بیٹھا، ماتھے پر ہلکی سی تیوری ڈالے سامنے زمین کو دیکھے جا رہا تھا جو بجلی کی چمک میں بار بار تیزی سے سفید اور سیاہ ہو رہی تھی۔ یاسمین نے ہاتھ بڑھا کر اُس کے بالوں میں انگلیاں ڈال دیں اور ہلکے ہلکے پوروں سے اُس کے سر کے پچھلے حصّے کو سہلانے لگی۔

"تم نے وہ نظم لکھی؟" اُس نے پوچھا۔

"نہیں۔"

"کیوں؟"

"پتا نہیں۔" اسد نے کہا، "یاس؟"

"ہاں۔"

"میں سوچ رہا تھا ایک آدھ ہفتے کے لیے چلا جاؤں۔"

"کہاں؟" یاسمین نے دہل کر پوچھا۔

"چچا بیمار ہیں۔"

"خط آیا ہے؟"

"ہاں۔"

"کب؟"

"جمعے کو۔"

"تم اپنے چچا کو یہاں کیوں نہیں لے آتے؟"

"کس لیے؟"

"علاج کے لیے۔"

"تمھارے باپ کے پاس؟" اسد نے طنز سے کہا۔ پھر وہ خود ہی اس بات پہ پشیمان سا ہو گیا۔ یہ پہلی بار تھی کہ حکیم کے بارے میں اُس کا ردِ عمل کچھ اُلجھ سا گیا تھا۔

"شاید کچھ آرام آجائے۔" یاسمین نے کہا، "اس عمر میں تھوڑے بہت آرام کی ہی ضرورت ہوتی ہے۔"

"ہاں،" اسد بولا، "سردی ہو رہی ہے۔"

"ہاں۔"

"یاس، ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو۔"

"سچ سچ؟"

"سچ سچ۔"

"بندوق تمھارے باپ کے پاس ہے؟"

"چار پانچ سال پہلے تک تو تھی۔"

"پھر کہاں گئی ؟"

"پھر غائب ہو گئی ۔"

"کہاں تھی ؟"

"گھر میں پڑی تھی ۔" مسلسل چمکتی ہوئی بجلی کے اندر یاسمین اپنی لمبی لمبی نیم بھوری آنکھوں سے برابر اُسے دیکھے جا رہی تھی ۔ "اسد،" وہ بولی، "تم خوش ہو کہ ابا نے بندوق نہیں دی ۔"

اسد خاموش بیٹھا رہا ۔

"مَیں جانتی ہُوں تم خوش ہو ۔"

"تم سب کچھ جانتی ہو ۔" اسد طنز سے بولا ۔ "میرے دل کا حال تم سب جانتی ہو ۔"

"سارے علاقے کو اس درندے نے مصیبت ڈال رکھی ہے ۔ ایک آدمی کو ہلاک کر چکا ہے ، اور تمہارے دماغ پر ایسے یہ چھایا ہوا ہے جیسے کوئی بہت عجوبہ چیز ہو ۔"

"ہاہا ۔ میرے دماغ پہ چھایا ہے ؟ دماغ پہ تو تم لوگوں کے چھایا ہے جیسے کوئی آفت آ گئی ہو ۔ تمہیں پتا ہے مَیں نے وہ پنجر دیکھا ہے ۔ کوئی چھ سال پُرانا ہے ۔ اس کی پسلیوں میں پودے اُگ رہے ہیں ۔ کوئی سانپ کا کاٹا مر گیا ہو گا کسی زمانے میں ۔ اب اس بیچارے کے سر تھوپ رہے ہیں ۔"

"بیچارہ ؟ تم تو ایسے بات کرتے ہو جیسے کوئی تمہارا عزیز ہو ۔"

"اس کا کوئی قصور نہیں ، بے گناہ جانور ہے ۔ صرف اس لیے اس کی جان کے پیچھے پڑ جانا کہ اس طرف آ نکلا ہے اور جنگل میں کھڑا ہو کر گرجتا ہے کہاں کا انصاف ہے ؟"

"اسد، تم عجیب آدمی ہو ۔ مَیں نے کبھی کسی کو ایک درندے کے بارے میں ایسی باتیں کرتے نہیں سُنا ۔"

اسد اکڑوں بیٹھا زمین کو گھورتا رہا ۔

"تم کیوں ہر وقت اس کا خیال کرتے رہتے ہو ؟" یاسمین نے پُوچھا ۔

"پتا نہیں ۔" اسد نے جواب دیا ۔

"پتا نہیں ۔ پتا نہیں ۔ ہر بات میں کہتے ہو پتا نہیں ۔"

بجلی اب بغیر رُکے چمک رہی تھی ۔ اسد وہیں بیٹھا سامنے جنگل کو دیکھتا رہا جو اب مسلسل اُس کی آنکھوں کے سامنے تھا ، اس طرح کہ ایک ایک سیکنڈ پر تیز سفید روشنی میں چمک اُٹھتا ، پھر گھپ اندھیرے میں اُس کا سفید نقشہ آنکھوں کے سامنے گھومتا ، اور اس سے پہلے کہ یہ عکس تحلیل ہو جنگل پھر ایک بار روشن ہو جاتا ۔

"اسدی ۔" یاسمین نے ڈرتے ڈرتے اُسے بُلایا۔

"ہوں ۔"

"کبھی تم مجھے اپنے گاؤں لے جاؤ گے ؟"

"ہاں ۔" پھر اچانک کسی خیال سے اسد کا ماتھا کھل اُٹھا ۔ وہ یاسمین کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا، "چلو بھاگ چلیں ۔"

"اونہوں ۔" وہ خاموشی سے سر ہلا کر بولی۔

"کیوں ؟"

"ایسے نہیں ، اسدی ۔" یاسمین نے آرام سے جواب دیا ۔ پھر بولی : "شہر بھی لے جاؤ گے ؟"

"ہاں ۔"

"کسی بڑے شہر میں چلیں گے ۔" وہ فیصلہ کُن لہجے میں بولی۔

"ہاں ۔" اسد نے کہا، "پنڈی ؟"

"نہیں ۔" وہ بولی ، "لاہور ۔"

"ٹھیک ہے ۔ لاہور ۔"

اب وہ چندھیائی ہوئی آنکھوں سے یاسمین کے مسلسل روشن ہوتے ہُوئے چہرے کو دیکھ رہا تھا ، اور یاسمین کی آنکھیں جنگل پہ لگی تھیں ۔ بادل اب اُن کے سروں پہ اُتر آئے تھے اور اُن کی گھن گرج تیز ہو گئی تھی ۔

"تم لاہور کبھی گئے ہو ؟"

"ہاں ۔"

"ہم وہاں جا کر کیا کریں گے ؟" یاسمین نے پُوچھا ۔

"فلم دیکھنے جائیں گے ۔" اسد نے سوچ کر جواب دیا ۔

"تم وہاں کسی کو جانتے ہو ؟"

"ہاں ۔"

"ہاں ۔" کچھ دیر بعد وہ اسد کی طرف مُنہ موڑ کر خوشی سے بولی ، "فلم دیکھنے جائیں گے ۔"

وہ بجلی کی تیز روشنی میں آنکھیں جھپک جھپک کر دیر تک اسد کے چہرے کو بہت قریب سے دیکھتی رہی ۔ پھر یکبارگی اُس کے ہونٹ ذرا سے کانپے اور اسد کو محسوس ہوا کہ جیسے وہ وہیں پہ بیٹھی بیٹھی اُس کی جانب بہہ نکلی

ہے۔ اسد نے اس کا چہرہ پھول کی طرح ہاتھوں میں لیا اور اُس کے آبرو کو، گال کو، ہونٹوں کے کناروں کو چُومنے لگا ــــ ایک ثانیے کے اندر سرد اور سفید پھڑکتے ہوئے نمدار ہونٹوں نے اسد کے دہن کو ڈھانپ لیا۔ اُس کے بے چین ہاتھ ریڑھ کی ہڈی پہ پھسلتے، کمر کے خم میں اُترتے، پیٹھ کے ابھار میں پیوست ہوتے ہوئے کسی لامتناہی شے کو گرفت میں کرنے کے لیے بھٹکنے لگے اور اندر، سُرخ اور سیاہ نم اندھیروں میں لرزتی، پھڑکتی، تیر کی طرح چھوٹتی ہوئی زبانیں چکر کاٹتی رہیں حتیٰ کہ اُن کے کسمساتے ہوئے، ساتھ ساتھ اٹھتے اور بند ہوتے ہوئے، زور آوری سے دھکیلتے ہوئے درشت جسم یک جان ہونے کی کوشش میں تنی ہوئی تار کی مانند کپکپانے لگے ــــ دفعتہً بادلوں سے روشنی کا ایک تختہ گرا جس نے اُن کی آنکھوں کو جھٹکے سے کھول دیا، اور ایک مہیب گرج نے انہیں ایک دُوسرے کی لپیٹ سے دھکا دے کر نکال دیا۔ یاسمین پہلو کے بل گرتے گرتے بچی۔ اسد کمر کو ذرا سا خم دیے، ہاتھ ہوا میں اٹھائے، جنگل پر مرکوز تھا۔ یہیں ہے، کسی نے اُس کے دل میں کہا، یہیں پر ہے۔ آواز اتنے قریب سے آئی تھی جیسے یہیں جنگل کے کنارے پر ہو۔

”کیا دیکھ رہے ہو؟“ یاسمین نے سانس روک کر پوچھا، ”چلو چلیں۔“

اسد اسی حالت میں کھڑا دائیں سے بائیں نظر گھماتا رہا۔ بار بار روشن ہوتا ہوا جنگل یکسر خالی تھا۔

”اسدی، کیا دیکھ رہے ہو؟“

”چُپ رہو۔“ وہ بولا۔

”اسدی، یہ تو بادل گرجا تھا،“ یاسمین کے حلق میں آنسو آکر اٹک گئے، ”یہ تو بادل کی گرج تھی۔“ اُس نے فریاد کی، ”چلو۔“ اُس نے اسد کے اُٹھے ہوئے بازو پر ہاتھ رکھا، ”اسدی، خُدا کے لیے میری بات سُنو۔ میری بات ......“ اُس کی آواز رُک گئی۔ وہ آنکھوں میں حیرانی اور خوف کے آنسو لیے اُس شخص کو دیکھتی رہی جس کے اندر سے گزر کر وہ ابھی آئی تھی اور اب جو اُس کے لیے اجنبی بن چکا تھا۔ آہستہ آہستہ بادل اور بجلی کا طوفان، کھُل کر برسے بغیر، اُن کے سر سے گزر گیا۔ اسد بازو گرا کر، اُس سے الگ کھوہ کی دیوار کے ساتھ جا کھڑا ہوا۔ رات کی فضا صاف ہو چکی تھی۔

واپس آتے ہوئے وہ میدان کے بیچ میں تھے کہ مشرق کے پہاڑوں کی جانب سے تڑتڑ ٹکراتی ہوئی تیز فائر کی ایک مختصر سی آواز آئی۔ ایک لمحے کو رُک کر اُنہوں نے رات میں کان لگائے، مگر اب ہر طرف خاموشی تھی۔ مشرق کی طرف بجلی کی ہلکی ہلکی چمک ابھی جاری تھی۔ گھر کے دروازے پر یاسمین نے مُڑ کر ایک بار اسد کو دیکھا، پٹ تھامے چند سیکنڈ تک اُسے دیکھتی رہی، پھر اُس نے ہاتھ بڑھا کر اسد کے بالوں کو چھُوا اور اندر چلی گئی۔

★ ★ ★ ★ ★

گھر کے دروازے سے اپنے کمرے کو جانے کے لیے اسد کو کچھ دُور تک مطب کے احاطے کی دیوار کے ساتھ ساتھ جانا پڑتا تھا جہاں سے مطب کا دروازہ نظر آتا تھا۔ دروازے کا ایک پٹ نیم وا تھا اور اندر مدّھم سی روشنی ہو رہی تھی۔ اسد اسے دیکھ کر رُک گیا۔ رات کے اس وقت حکیم کا مطب میں آنا معمول کے خلاف تھا۔ صرف کبھی کبھی جب اِدھر اُدھر کے کسی گاؤں سے کوئی مریض حالتِ غیر میں چارپائی پر ڈال کر لایا جاتا تو اسے رات کو اٹھ کر آنا پڑتا، مگر اس صورت میں احاطے کے اندر مریض کی چارپائی رکھی ہوتی اور گرد اس کے عزیز و اقارب بیٹھے حقّوں کے کش لگا رہے ہوتے۔ دروازہ پیٹ کر حکیم کو جگانے کے عمل سے آس پاس کے گھروں کے چند لوگ بھی جاگ اٹھتے اور عموماً حال احوال پُوچھنے کو نکل آتے۔ ولی بہرصورت موجود ہوتا۔ مگر احاطہ اس وقت سُنسان پڑا تھا۔ اندر روشنی اتنی مدّھم تھی کہ اسد کے دل میں کھٹکا پیدا ہوا۔ اِس وقت حکیم یہاں کیا کرنے آیا تھا اور اُس نے لیمپ اتنا نیچا کیوں کیا ہوا تھا؟ جب حکیم گھر سے نکلا تو اُسے یاسمین کی غیر موجودگی کا علم ہو گیا ہو گا؟ دروازے کی کنڈی تو اندر سے اُتری ہوئی تھی۔ تو کیا اس نے، مطب میں آنے سے پہلے، اسد کے کمرے میں بھی جھانک کر دیکھا ہو گا؟ شاید دیکھا ہو۔ ہر چند کہ حکیم نے خود ہی ایک طرح سے اُن دونوں کو میل ملاپ کی ترغیب دی تھی، مگر اُس کی پیٹھ پیچھے، اُس کی اجازت کے بغیر ملنا؟ اور پھر گھر سے باہر؟ یہ تھے وہ خیالات جو اُس وقت وہاں کھڑے کھڑے، اندھیرے میں اُس مدّھم سے نیم وا پٹ پہ نظریں جمائے، اسد کے دماغ میں تیز تیز آ رہے تھے۔

تو گویا راز جو تھا فاش ہو چکا تھا۔ اُس کو پہلے ہی شک تھا کہ گاؤں میں دو ایک لوگوں کو اُن کے راز کا علم ہے۔ ولی ان میں سے ایک تھا۔ ولی گو احمق تھا، مگر دہقانوں کے مخصوص انداز میں چالاک بھی تھا۔ حکیم نے پھر کیا کیا ہو گا؟ یعنی جب اُس کو اُن کی غیر موجودگی کا علم ہو گیا تو کیا وہ کچھ دیر تک گھر کے اندر اُن کے انتظار میں بیٹھا رہا ہو گا؟ اور جب وہ پھر بھی نہ لوٹے تو باہر نکل کر مطب میں آ گیا ہو گا؟ شاید وہ اسی مصلحت کے پیشِ نظر مطب میں گیا ہو کہ ہم دونوں خاموشی سے لوٹ کر اپنے اپنے کمروں کو چلے جائیں۔ مگر اس کے لیے مطب میں جانے کی کیا ضرورت تھی، وہ خاموشی سے واپس اپنے کمرے میں بھی جا سکتا تھا۔ کیا یاسمین کو پتا چل گیا ہو گا؟ اور نہوں، دا اُس

نے اندھیرے میں سر ہلایا) وہ کُنڈی لگا کر سیدھی اپنے کمرے کو چلی گئی ہو گی۔ اب حکیم واپس کیسے جائے گا؟ دروازہ اندر سے بند ہو گا اور وہ مزے سے سو رہی ہو گی۔ خدایا، اب کیا کروں؟ یاسمین کو مطلع کرنا ضروری ہے۔ اُس کی کھڑکی پر جا کر دو دفعہ تین تین بار انگلی بجاؤں اور اُسے بتاؤں کہ کم از کم جا کر کنڈی ہی اتار دے، یا پہلے جا کر اپنے باپ کے کمرے میں نظر ڈال لے کہ وہ وہاں پر ہے یا نہیں۔ اِس سے شاید صورتِ حال کچھ واضح ہو جائے۔

اسد کے دماغ میں یکدم گڑبڑ شروع ہو گئی۔ چلو، مزید وقت ضائع کیے بغیر چلو، چل کر کھڑکی کھلواؤ، ابھی وہ جاگ رہی ہو گی، چلو چلو، وہ بار بار اپنے دل میں دہراتا رہا اور وہیں پر کھڑا رہا، جیسے اُس کے پاؤں اُس زمین میں جڑ پکڑ گئے ہوں اور ہلائے نہ ہلتے ہوں۔ مطب کے اندر کوئی ایسی بات تھی جو اسے وہاں سے ہلنے نہ دیتی تھی، جیسے کہ اگر اُس نے ایک بار وہاں سے نظریں ہٹا لیں تو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اوجھل ہو جائے گا۔ روشنی اندر بہت ہی مدھم تھی، اگر رات اتنی اندھیری نہ ہوتی تو شاید نظر بھی نہ آتی۔ اُس وقت اُسے خیال ہُوا کہ جیسے ایک سایہ سا دروازے کے آگے سے گزرا ہے۔ اُس نے چونک کر دونوں ہاتھ دیوار پر رکھے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگا۔ سایہ جو ایک آدمی کا تھا دوبارہ دروازے پر نمودار ہُوا۔ اُس نے دروازے کا ایک پٹ کھولا اور دو قدم باہر نکل کر اندھیرے میں آ کھڑا ہُوا، یوں کہ اُس کا اُوپر کا دھڑ روشنی کے مقابل نظر آتا رہا۔ وہاں پر اُس سائے نے ایک دو بار سر کو گھما کر اِدھر اُدھر دیکھا، پھر پلٹ کر واپس مطب کے اندر چلا گیا، جیسے صرف تازہ ہوا میں سانس لینے کو باہر نکلا ہو۔ جاتے جاتے اُس نے دروازے کا پٹ بھیڑ دیا۔ یہ شبیہہ بہت مانوس تھی۔ اس کی چال ڈھال اسد کو جانی پہچانی لگی۔ کون ہو سکتا ہے، حکیم تو نہیں ہے۔ یہ اُس سے ذرا لمبے قد کا، کم عمر آدمی ہے، اسد نے سوچا۔ دروازے میں اب ایک پتلی سی درز رہ گئی تھی۔

اسد وہیں سے دیوار کو پھلانگ کر پنجوں کے بل بھاگتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ دروازہ کھول کر اندر جانے کی بجائے وہ درز سے آنکھ لگا کر دیکھنے لگا۔ کمرے کا جتنا حصّہ نظر آ رہا تھا وہاں صرف آدھا تختہ، اور اُس کے اُوپر سفید دیوار تھی جس پر تھرکتی ہوئی لیمپ کی روشنی سے پتا چلتا تھا کہ بتی ٹمٹما رہی ہے۔ اسد نے دروازے پر ہاتھ رکھا ہی تھا کہ اندر سے دروازہ ایک جھٹکے کے ساتھ کھُلا اور میر حسن کی شبیہہ اُس کے مقابل کھڑی تھی۔ سب سے پہلا خیال جو اُسے دیکھتے پر اسد کو آیا وہ تھا کہ ارے، یہ تو میر حسن ہے! میں پہچان کیوں نہیں سکا؟

"میر—" وہ بات کرتے کرتے رُک گیا۔ میر حسن کی چمک دار آنکھیں خوف کے مارے اُبلی پڑتی تھیں اور اُس کے چہرے کی پہلاہٹ اُس تاریکی میں بھی نمایاں ہو رہی تھی۔ وہ ایک پرندے کی شکل میں بازو پھیلائے دونوں پٹ مضبوطی سے تھامے کھڑا تھا اور اُس کا جسم غیر ارادی طور پر اپنے بازوؤں پر آہستہ آہستہ جھول رہا تھا۔

اسد نے ہاتھ بڑھا کر اس کی کلائی کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔

"یہاں کیا کر رہے ہو؟" اسد نے سختی سے پوچھا۔

لڑکا اپنی آنکھوں میں حیوانی سہم لیے گُنگ کھڑا ٹکٹکی باندھے اُسے دیکھتا رہا۔ اسد نے اُس کی کلائی پر اپنی گرفت نرم کیے بغیر اُسے پیچھے کی طرف دھکیلا۔ اس پر میر حسن میں گویا اچانک جان پڑ گئی۔ اُس نے سر کو ایک جھٹکا دیا۔

"میں نے کچھ نہیں کیا۔" الفاظ اُس کے مُنہ سے اُبل پڑے۔ اُس کا جسم مدافعتی انداز میں اسد کو باہر کی طرف دھکیلنے اور دروازے میں کبھی دائیں کبھی بائیں کو سرکنے لگا، جیسے کمرے کو اسد کی نظروں سے اوجھل رکھنا چاہتا ہو۔ کمرے کے اندر نگاہ ڈالنے سے پہلے ہی میر حسن کے مُنہ سے نکلے ہُوئے اُن پانچ الفاظ نے اسد کے کانوں میں ایک دہلا دینے والی گونج پیدا کی، اور اُس نے میر حسن کی نازک سی کلائی کو اپنے ہاتھ کی گرفت میں بھینچ کر پُوری قوّت سے اُسے اندر کی طرف دھکا دیا۔ پہلی چیز جس پر اسد کی نظر پڑی وہ لیمپ تھا۔ اُس کی مہین سی لَو بُری طرح کپکپا رہی تھی۔ پھر حکیم کی قدِ آدم چوڑی سی سیاہ الماری جو مُقفّل رہتی تھی۔ الماری اب وا پڑی تھی۔ اُس کے متوازی خانے، جن میں سے کئی ایک لکڑی کے عمودی تختوں کی مدد سے مزید چھوٹے بڑے خانوں میں تقسیم کیے گئے تھے، شیشے کی بوتلوں، سفید اور سُرخ مٹی کے مرتبانوں، کاغذ کی مختلف شکل اور حجم والی پُڑیوں، خشک شاخوں کے چھوٹے بڑے گٹھوں، پتھر کے پیالوں اور دوسری حکمت کی اشیاء سے اٹے پڑے تھے۔ نیچے فرش پر دیوار کے پاس حکیم کا بدن اوندھے مُنہ پڑا تھا۔ اُس کی گردن مُڑی ہُوئی تھی اور داہنا گال زمین پر ٹکا تھا۔ ایک بازو پھیلا ہوا کہنی تک تختے کے نیچے گھُس گیا تھا۔ دُوسرا کہنی پر سے عجیب مُڑے تُڑے انداز میں رکھا تھا۔ اُس بازو کا ہاتھ بندوق کی نالی کو اِس مضبوطی سے گرفت کیے ہوئے تھا کہ اُنگلیوں کے جوڑ سفید ہو چکے تھے۔ اسد کو خبر بھی نہ ہوئی کہ کب اُس کا ہاتھ میر حسن کی کلائی پر سے ڈھلک گیا۔ وہ ایک قدم آگے بڑھا اور لاعلم نظروں سے جھک کر دیکھنے لگا۔ اُس کا فہم ایک لمحے کے لیے معطّل ہو گیا۔ اتنا اندھیرا کیوں ہے؟ اُس نے خفگی سے سوچا، کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ پلٹا، اور اُس بے حرکت بدن سے بچتا ہُوا ایک پاؤں تختے پر رکھ کر آہستہ سے اُسے پھلانگ گیا۔ لیمپ کے پاس جا کر اُس نے بتّی اُونچی کی اور اُسی راستے سے واپس آ کر، گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر جھک گیا۔ مُنہ کے کونے سے خُون خارج ہو کر ایک پتلی سی سیاہ لکیر بناتا ہُوا کوئی چھ اِنچ کے فاصلے پر ایک بڑے سے بُلبلے کی شکل میں فرش پر جم گیا تھا۔ پُشت میں بائیں طرف کو قمیص کوئی تین اُنگل کے قریب چری پڑی تھی اور وہاں پر کھدر کے دھاگے خون میں خشک ہو کر سر اُٹھائے کھڑے تھے۔ خشک ہوتے ہوئے خون سے بائیں طرف کی آدھی قمیص اور بازو کے کچھ حصّے کا کپڑا

اکڑ کر اُٹھا ہوا تھا۔ خون ایک ٹیڑھے میڑھے راستے سے گزر کر تھوڑے فاصلے پر فرش میں ایک نیچی سی جگہ میں جمع ہوتا رہا تھا جہاں وہ اب سطح سے جمنا شروع ہو چکا تھا۔ نچلے دھڑ کے کپڑے بے داغ تھے اور دونوں ٹانگیں سیدھی رکھی تھیں جیسے کوئی آرام سے پیٹ کے بل سویا ہو۔ بندوق کا دستہ الگ دیوار کے ساتھ ایک عجیب زاویے پر پڑا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے پورے زور سے پھینکا گیا ہو اور دیوار پر لگ کر نیچے آ گرا ہو۔ دیوار پر اُس کی ضرب کا نشان تھا، اور دستے کے ٹوٹے ہوئے کونے پر دیوار کی مٹی لگی نظر آ رہی تھی۔ بے خیالی میں جُھک کر اسد نے تین اُنگلیوں سے جسم کے چہرے کو چھُوا اور اِس طرح ہاتھ کھینچ لیا جیسے اُسے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ اُس لمس کی وحشت اور کراہت سے سردی کی ایک لہر اس کے جسم میں سرایت کر گئی اور گویا پہلی بار ساری صُورتِ حال پُوری قوت سے اُس پر واضح ہُوئی۔ آنکھیں ادھ کھُلی اور بے نُور تھیں۔ وہ ایک سُرعت کے ساتھ نعش کے اُوپر سیدھا ہوا۔

"یہ —— یہ ——" وہ نعش کی طرف اشارہ کر کے ہکلاتے ہوئے بولا۔ پھر اُس کی زبان بند ہو گئی۔

میر حسن اپنی جگہ پر کھڑا، پھٹی پھٹی چمک دار آنکھوں سے اسد کو دیکھتا ہُوا، کئی لمحوں تک بات کرنے کو مُنہ کھولتا اور بند کرتا رہا۔ آخر آواز اس کے حلق سے نکلی:

"مَیں نے نہیں کیا۔"

"حرامی۔"

"مَیں نے نہیں کیا —— اللہ کی قسم۔"

"کس نے کیا ہے؟"

"مجھے نہیں پتا —— مَیں تو آیا ہی ہُوں۔" —— آواز حلق میں پھٹ گئی۔

"کس نے؟ کس نے؟ اور کس نے کیا ہے؟"

"کسی اور نے کیا ہے۔ مجھے نہیں پتا۔"

"مادر .... تم یہاں کیا کر رہے ہو؟"

"مَیں نے نہیں کیا۔ نہیں کیا۔ ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ مَیں بے قصور ہُوں۔"

"تم نے اسے قتل کر دیا ہے۔ مار ڈالا ہے۔" اسد چیخا۔ "مَیں نے خود دیکھا ہے۔"

"تم نے نہیں دیکھا، کچھ نہیں دیکھا۔ مَیں تو آیا ہی ہُوں۔" میر حسن اپنے پنجوں پر ذرا سا اُٹھا اور ایک سیکنڈ تک وہیں رُکا رہا، جیسے اُڑنے کے لیے پر تول رہا ہو۔ پھر اُس نے بدلی ہُوئی حیرت زدہ آواز میں، جس میں انتہائی سہم کی پُکار بھی، چُپکے سے کہا، "تمہیں یقین نہیں۔" اور ایک چھلانگ لگا کر نعش کو پار کر گیا۔ اسد نے اُسے روکنے کے

لیے ہاتھ بڑھایا، مگر دوسری ہی چھلانگ میں وہ اسد کی بغل سے نکل کر دروازے سے باہر جا چکا تھا۔ اسد توازن قائم نہ رکھ سکا اور اُلٹ کر تختے پر جا گرا۔ پھر وہ تیزی سے اُٹھ کر بھاگا، مگر چند ہی قدم اندھیرے میں گیا ہوگا کہ رُک گیا۔ عجیب نامعلوم طریقے پر اُسے احساس ہُوا کہ تعاقب بے سُود تھا، کہ لڑکا اُس سے کہیں تیز پا تھا، اور اِس گاؤں کے گھر گھر سے واقف تھا۔ ہچکچا کر اُس نے اندھیرے میں مُنہ اُٹھایا اور پُورے زور سے چیخا:

"بدمعاش —— بھاگ کر کہاں جاؤ گے —— میں بتا دوں گا۔"

تاریکی میں سے بھاگتے ہُوئے قدموں کی آواز بھی نہ آئی۔ لڑکا بھوت بن کر غائب ہو چکا تھا۔ کچھ دیر تک اسد وہاں کھڑا اپنے الفاظ کی بے صوت بازگشت کو کانوں میں سنسناتے ہُوئے سُنتا رہا۔ اُس نے اپنے ذہن کی ہلچل کو دبانے کی کوشش کی۔ بہت آہستہ آہستہ، جیسے گہری دُھند میں سے، صورتِ حال کی حقیقت اُس کے اُوپر واضح ہونے لگی —— اُس کی پُشت پر ایک کمرہ ہے، جس میں ایک نعش پڑی ہے۔ اُس کے معدے میں تیزابی بھنور سا پڑنا شروع ہُوا اور سینہ بند ہونے لگا۔ سانس اُوپر چڑھ رہی تھی۔ وہ پلٹ کر دروازے تک گیا اور ایک پٹ کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا۔ اُسے بیٹھ جانا چاہیے تھا، مگر وہ دروازے کو پکڑے کھڑا انتظار کرتا رہا۔ اُس وقت سانس کو چڑھتے ہوئے دیکھ کر اُس توقع اور انتظار میں اُسے بے انتہا سکون محسوس ہوا —— اس انتظار میں کہ سانس آکر اس پر غلبہ پالے، اُس کو مکمل طور پر اپنی لپیٹ میں لے لے، اپنے آپ میں اُلجھا لے، تا کہ وقتی طور پر ہی، مگر اس مصیبت سے چھُوٹ جائے۔ بعد میں دیکھا جائے گا، کچھ نہ کچھ ضرور ہو گا، کوئی واقعہ، کوئی بات —— اُس وقت فی الواقع اُسے قوی اُمید تھی کہ سانس کا ریلا گزر جانے کے بعد حالات میں کوئی تبدیلی آجائے گی، کوئی نہ کوئی آن پہنچے گا، اُس کو چھٹکارا دلانے، اُس کا ہاتھ بٹانے کے لیے کوئی نہ کوئی راستہ نکلے گا۔ ساری نشانیاں موجود تھیں، وہ دروازے کو تھامے سر نیہوڑائے کھڑا انتظار کرتا رہا، اور ایک عجیب بات ہوئی۔ سانس کا ریلا نہ آیا۔ پہلے ایسا کبھی نہ ہوا تھا۔ جب نشانیاں ظاہر ہوتیں، سانس آکر رہتی۔ اس دفعہ، عمر میں پہلی بار دغا دے گئی تھی۔ اُس کا حلق مُستقل اُٹھتا اور بیٹھتا رہا، مگر سانس کم و بیش برابر چلتی رہی۔ اسد کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔ اُس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ یہ کیا ہوا۔ اب کیا ہو؟ سب سے بہتر ترکیب تو یہ ہے کہ لاش کو کھینچ کر تختے کے نیچے کر دو، لیمپ کو پھُونک سے بجھا دو، اور جا کر کمرے میں سو رہو۔ صبح گاؤں والے خود ہی پتا کرتے پھریں گے کہ کیا ہُوا کیا نہ ہُوا۔

وہ کمرے میں داخل ہوا، اور تختے پہ پاؤں رکھ کر الماری کے برابر جا کھڑا ہُوا۔ کسی بوتل یا مرتبان پر لیبل نہ تھا۔ لیبل کیوں نہیں لگے، اُس نے ذہن پر زور دے کر سوچا۔ اتنی دواؤں کی پہچان کیسے رکھتا ہے۔ پھر اُسے یاد آیا کہ وہ کئی بار، پہلے بھی اس بات پہ غور کر چکا ہے۔ فرش پر سے نظریں چُراتے ہُوئے اسد نے الماری کی ایک ایک شے

کو باری باری دیکھا اور ملگجے پتھر کے خوبصورت کاغذی کٹروں میں، جو کبھی استعمال میں نہ آئے تھے، دیکھتے ہوئے اُس کا دل چاہا کہ وہ گلا پھاڑ کر ایک ایسی چیخ لگائے کہ سویا ہوا گاؤں جاگ پڑے۔ "خون!" پھر وہ گاؤں کے کسی بڑے بوڑھے کے گھر جائے اور اُس کا دروازہ پیٹ پیٹ کر سارا ماجرا کہہ سنائے، پھر ڈاک بنگلے جا کر شاہ رُخ کو جگائے۔ تختے سے اُتر کر وہ باہر کی طرف چل پڑا۔ احاطے میں ایک جگہ رُک کر اُس نے اندھیرے میں دیکھا کہ حکیم کی نعش اُس کی آنکھوں کے سامنے کھڑی ہے۔ اب تو یہ نعش یہاں پڑی ہے اور میں یہاں پہ موجود ہوں، اُس نے سوچا۔ بات نکل آئے گی، کسی نہ کسی طرح۔ چھپانے سے کیا فایدہ؟ اب تو مجھے اس سے نبٹنا ہی ہے۔ وہ اندھیرے سے واپس لوٹ آیا۔

احتیاط سے قدم رکھتا ہوا وہ لاش کے سر کی طرف پہنچا اور وہاں بیٹھ کر اُس نے بندوق کی نالی کو کھینچنے کی کوشش کی۔ مُردہ ہاتھ کی گرفت تالے کی طرح اُس کو لگی تھی۔ ایک دو بار کوشش کرنے کے بعد اُس نے پاؤں اُس ہاتھ کے گرد جمائے، اور دونوں ہاتھوں کے زور سے کھینچ کر آخر نالی کو اُس آہنی گرفت سے آزاد کرا لیا۔ اسی میں اُس کی سانس پھول گئی، اور جب وہ کھڑا ہوا تو ایک اندھیرا سا اُس کی آنکھوں کے آگے سے گزر گیا جس میں ستارے چھوٹ رہے تھے۔ اُسے خیال ہوا کہ اُس کا دل بیٹھنے والا ہے۔ اُس نے جھک کر دیا کے ساتھ کھڑا ہوا دستہ اٹھایا، دونوں چیزوں کو تختے پر رکھا، اور تختے پہ کھڑے ہو کر الماری کے اوپر والے خانے سے بندوق کا لمبا سا ڈبا نکالا جو وہاں، شیشیوں اور مرتبانوں کے پیچھے کھلا ہوا پڑا تھا۔ اُس تک پہنچنے کے لیے آگے سے کئی چھوٹی بڑی شیشیاں اُٹھا کر نچلے خانے کی چوڑے منہ والی بوتلوں کے اوپر رکھ دی گئی تھیں۔ خانے کے تختے پر گرد میں ان کے پیندوں کے گول نشان موجود تھے۔ قینچی کہاں ہے؟ ڈبے میں تو نہیں۔ اُس نے اُلٹ پلٹ کر دیکھا، قینچی کہیں غائب تھی۔ اُس نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ پھر گھٹنے زمین پہ ٹیک کر تختے کے نیچے نظر ڈالی تو قینچی دوسرے ہاتھ کے قریب زمین پر پڑی ہوئی دکھائی دی۔ تینوں چیزیں احتیاط کے ساتھ اُس نے ڈبے میں بند کیں، اور ڈبے کو میز پر رکھ دیا۔ پھر وہ تختے پر چڑھا اور ایک ایک شیشی کو اٹھا کر اُس کے اپنے دائرے میں فٹ کر کے رکھنے لگا، اِس احتیاط کے ساتھ کہ اردگرد کی گرد میں کوئی نشان نہ پڑنے۔ جب وہ شیشیوں کو اپنی جگہ پہ رکھ چکا تو بلا وجہ انہیں گننے لگا۔ (بعد میں جب کبھی اُس نے اس وقت کے بارے میں سوچا تو اُسے خیال آیا کہ غالباً یہی لمحات تھے جب اسے اپنے قواء پر کسی حد تک اختیار حاصل ہونا شروع ہوا تھا۔) وہ تعداد میں کُل انیس تھیں۔ یہ کام اطمینان بخش طور پر ختم کر کے اُس نے الماری بند کی اور اسے تالا لگایا، جیب سے رومال نکال کر چابی اور تالے کو پونچھا اور چابی حکیم کے کرتے کی دائیں پہلو والی جیب میں ڈال دی۔ رومال سے ہی اُس نے حکیم کے ہاتھ پر لگی اپنے جوتوں کی مٹی کو اچھی طرح سے صاف

گیا۔ پھر اُس نے بندوق والا ڈبا اُٹھایا اور کمرے سے نکل کر کھڑکی جانب چل پڑا۔

جب اُس نے یاسمین کی کھڑکی پر تین بار اُنگلی بجائی تو اسد کا جسم پُرسکون تھا۔ سانس کی گرانی غائب ہو چکی تھی۔ تیسری بار کھڑکی بجانے پر اندر لیمپ جلا، اور یاسمین نے کنڈی اُتار کر پٹ کو ایک درز کھولا، پھر جلدی سے کھڑکی کھول دی۔

"اسدی!"

اُس اندھیرے میں بھی اسد کو اُس کی آنکھوں کی چمک اور بالوں کی ایک ڈھیلی سی لٹ نظر آئی۔ یاسمین کا بدن بہت مدّھم مدّھم —— تندوری روٹی کی سی تنجیری مہک چھوڑ رہا تھا۔ اسد کے دل میں حسرت پیدا ہوئی کہ کاش وہ کچھ کہے سُنے بغیر، کوئی جواب دیے بغیر اس کھڑکی کے راستے داخل ہو کر اُس گرم بستر میں گھس جائے اور اپنے آپ کو اُس چارخانے کھیس سے ڈھانپ لے اور کبھی وہاں سے نہ نکلے۔

"دروازہ کھولو۔" اُس نے آہستہ سے کہا۔

"کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔ تم دروازہ کھولو۔"

یاسمین کچھ دیر تک اُسے خالی خالی نظروں سے دیکھتی رہی، پھر کھڑکی بند کر کے اندر چلی گئی۔ اسد دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا دروازے تک پہنچا۔ جب یاسمین نے کنڈی اُتاری تو وہ دروازہ کھول کر اندر گھس گیا۔

دروازے کے اندر رُک کر اسد نے لبوں پر اُنگلی رکھ کر چُپ رہنے کا اشارہ کیا اور یاسمین کے کمرے کی جانب چل پڑا۔ یاسمین اُس کے پیچھے پیچھے اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔

"یہ کیا ہے؟" یاسمین نے پُوچھا۔

"کچھ نہیں۔"

"یہ تو بندوق کا ڈبّا ہے۔"

"ہاں۔" اسد نے جُھک کر ڈبے کو یاسمین کی چارپائی کے نیچے دھکیلتے ہُوئے جواب دیا۔

یاسمین حیرانی سے کھڑی اُسے دیکھتی رہی۔ "یہ کہاں سے لائے ہو؟" اُس نے نیچی آواز میں پُوچھا۔

"دیکھو۔" اسد نے کمرے میں اِدھر اُدھر نظر دوڑاتے ہُوئے بات کرنے کی سعی کی۔ "جوتا پہنو۔"

"کیوں؟"

"جوتا پہن کر میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں ؟ کیوں ؟" یاسمین نے چونک کر سوال کرنے شروع کیے، "کہاں چلوں ؟" اور کچھ ذہن میں نہ آنے پر اسد نے دوبارہ اُنگلی ہونٹوں پر رکھ کر اُسے چُپ رہنے کی تاکید کی: "مطب میں۔" اُس نے کہا۔

"کس لیے ؟" وہ بولی۔ پھر یکلخت اُس کی آواز میں ہراس کی سرک پیدا ہوئی، "ابا ——" اُس نے نیچی سی آواز میں پوچھا۔ پھر زور سے بولی، "ابا کہاں ہیں ؟"

"مطب میں ہیں۔"

"وہاں کیا کر رہے ہیں ؟"

"کچھ نہیں،" وہ بولا، "ایک حادثہ ہو گیا ہے۔"

"حادثہ ؟ کیسا حادثہ ؟ کیا ہو گیا ہے ؟ اسدی ؟" جواب کا انتظار کیے بغیر وہ پلٹ کر کمرے سے نکل بھاگی۔ اسد نے اُس کی ایک ڈھیلی سی لٹ دروازے میں اُڑتی ہوئی دیکھی، پھر وہ صحن کو پار کر کے اندھیرے میں غائب ہو گئی۔

"یاس ؟" اسد اُس کے پیچھے لپکا، "میری بات سُنو۔ یاس، میرے ساتھ چلو۔"

وہ اُس کی بات سُنتی نہ سُنتی ہوئی، بازو ہوا میں اُٹھائے، لمبی لمبی نازک ٹانگوں والے پرندے کی مانند چھوٹے بڑے پتھروں کے اُوپر ننگے پاؤں اُڑتی چلی گئی۔

مطب کے دروازے پر یاسمین نے دونوں ہاتھوں سے چوکھٹ پکڑ کر اپنے آپ کو روکا اور جیسے زمین میں گڑ گئی۔ پھٹی ہوئی آنکھوں سے اُس نے اندر کا منظر دیکھا اور لاعلمی سے مُڑ کر اسد پر ایک سرسری سی نظر ڈالی۔ پھر اُس نے کمرے میں ایک قدم رکھا اور، ذرا سا جھک کر، بے سمجھ نظروں سے لاش کو دیکھنے لگی۔

"ابا ——" اُس نے ہولے سے بلایا، "ابا۔"

پھر اُس کے حلق سے ایک عجیب سی آواز نکلی، جو کچھ کچھ جاڑوں کی بھوک کے مارے ہوئے بھیڑیوں کی گُرگ سے مشابہ تھی —— ایک گہری، پیٹ سے اُبھرتی ہوئی غیر انسانی سی آواز جو نہ چیخ تھی نہ پکار بلکہ دہشت ہی دہشت تھی۔ ایک لحظے کو وہ بازو پھیلائے اسد کی طرف مُڑی، جیسے اُس کے جسم میں پناہ لینا چاہتی ہو، پھر پلٹ کر اپنے باپ کے اوندھے بدن پر جھک گئی۔ چوپایوں کی مانند چاروں ہاتھوں پاؤں پر چلتی، مُردہ جسم کو روندتی ہوئی، سر کی طرف جا کر، وہ زمین پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گئی۔ آہستہ سے اپنے باپ کا سر ہاتھوں میں لے کر اُس نے اپنی گود میں رکھا، اور اُس کے چھوٹے چھوٹے سفید بالوں کو مٹھیوں میں پکڑنے کی کوشش کرنے لگی۔ منہ سے نکلے ہوئے خون کے بلبلے کو اُس کی سفید شلوار نے ڈھک دیا تھا۔ اسد کا جی کیا کہ وہ شلوار کے کپڑے کو اُس جگہ سے اُٹھا کر پرے کر دے۔

کسی سوگوار جانور کی طرح حلق سے لگاتار نیچی نیچی، گہری آوازیں نکالتے ہوئے وہ اپنی مٹھیاں سر کے بالوں پر کھولتی اور بند کرتی رہی۔ پھر وہاں کوئی آسرا نہ پا کر اس نے اپنے کان ہاتھوں سے ڈھانپ لیے اور منہ اٹھا کر چیخ پر چیخ مارنے لگی۔ اسد ایک ہاتھ اس کے بازو پہ، ایک سر پہ رکھے تختے پہ بیٹھا تھا اور احمق پن سے دہرائے جا رہا تھا:

"یاس، کوئی بات نہیں —— چپ کر د، یاس، کوئی بات نہیں ——"

باہر احاطہ گارڈن کے لوگوں سے بھرنا شروع ہو گیا تھا۔ بڑھے، جوان، عورتیں اور بچے، ہاتھوں میں لالٹینیں اور لاٹھیاں لیے احاطے کی دیوار پھاند پھاند کر جمع ہو رہے تھے۔ مجمعے میں کہیں کہیں کلہاڑے چمک رہے تھے۔ کچھ بچے زور زور سے رونے لگے تھے۔ وہ سب کمرے سے چند قدم پرنیم دائرے کی شکل میں ایک حد بنا کر کھڑے تھے۔ سب سے آگے چند ادھیڑ عمر کسان تھے جو بازو پھیلا پھیلا کر لوگوں کو آگے آنے سے روک رہے تھے۔ لالٹینوں کی روشنی میں ان کے محنتی ہڈیوں والے چہرے خوابیدہ اور جذبات سے عاری تھے۔ ان کی آنکھیں کمرے کے اندر لگی تھیں جہاں وہ لڑکی، جس کو کسی نے لڑکپن کے بعد آج تک چادر کے بغیر نہ دیکھا تھا، چہرہ پاگل کیے منہ پھاڑ کر رو رہی تھی اور ساتھ ساتھ کچھ کہتی جا رہی تھی، اور اسد اس کو پکڑ کر میٹھا سے سود گردان کیے جا رہا تھا: "کوئی بات نہیں، یاس، چپ کر جاؤ، کوئی بات نہیں" —— وہ زندگی کی سختی کے عادی چہرے روزمرہ کے انداز میں ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے: "قتل ہو گیا ہے۔" "مر گیا ہے۔" صرف ان کی عورتیں آپس میں اس قتل پہ چہ میگوئیاں کر رہی تھیں۔ اس وقت مجمعے میں ایک معمولی سی ہلچل پیدا ہوئی اور سات معتبر بوڑھے لوگوں کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھے۔ دروازے میں داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹک کر رکے اور ایک دوسرے پر گرتے ہوئے دیوار کے ساتھ ساتھ پیچھے کی طرف کھسکنے لگے۔ لڑکی اپنے باپ کے مردہ جسم کے ساتھ لپٹی ہوئی تھی۔ اس کی شلوار پر خون کے بڑے بڑے دھبے تھے اور اس کا ایک ہاتھ لاش کی پشت پر قمیض کے چیر کو ڈھانپے ہوئے تھا، جیسے خون کا بہاؤ بند کرنے کو رکھا ہو، ہرچند کہ خون بہنا بند ہو چکا تھا۔ یاسمین کا دوسرا ہاتھ اس بچی ہوئی گردن پہ تھا اور منہ سفید سر پہ رکھے وہ کچھ بڑبڑا رہی تھی۔ اسد اس کے کندھوں کو پکڑے نیم دلی سے بار بار اسے اوپر اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا اور یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ اپنی اس احمقانہ گردان کو روکنے سے قاصر تھا۔ آخر کار اس نے یاسمین کی بغلوں میں ہاتھ دے کر کمر کے لیرے زور سے اسے اوپر اٹھایا اور یوں اس کو لاش سے جدا کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ایک بازو یاسمین کی کمر کے گرد ڈال کر وہ اسے دروازے کی طرف لیے جا رہا تھا کہ یاسمین کی نظر کمرے کی دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑے چھ بڈھوں پر پڑی (سازاں کہیں غائب ہو چکا تھا)۔ دفعتہً وہ اسد کے بازوؤں میں اس زور سے اچھلی کہ اپنے آپ کو سنبھالنے کے لیے اسد کو دونوں ہاتھوں سے دروازے کے پٹ کا سہارا لینا پڑا۔ یوں اپنے آپ کو اسد کے ہاتھوں سے آزاد کرا کے وہ للکارتی ہوئی بھاگی اور پہلے بڈھے کے اوپر

جاگری۔ اس اچانک حملے سے وہ بڈھا دوسروں پر گرا، اور دوسرا تیسرے کے اُوپر۔ آخر چوتھے اور پانچویں بڈھوں نے مل کر اُن تینوں کو سہارا دیا۔

یاسمین نے بڈھے کے سینے پر مکّوں کی بوچھاڑ کر دی۔

"قاتل۔" وہ دہاڑی۔ "قاتل دو ــــ قتل کر دیا ہے۔ ابا آ آ آ ــــ"

اُس نے بڈھے کی داڑھی دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر اُسے نیچے کو کھینچا۔ اور جب بڈھے نے مدافعت کی تو وہ داڑھی پکڑے پکڑے، بے شرمی سے اُس کی رانوں اور پیٹرو میں گھٹنے مارنے لگی۔ بڈھا درد کے مارے دہرا ہوتے ہوتے گھٹنے ٹیک کر زمین پر بیٹھ گیا اور اُس کی ٹوپی زمین پر گر گئی۔ اسد نے یاسمین کی کمر میں دونوں بازو ڈال کر اسے اُوپر اُٹھایا اور کچھ اٹھاتا، کچھ گھسیٹتا ہوا اُسے دروازے کی طرف لے چلا۔ دروازے کے باہر لوگوں کو دیکھ کر اُس بے قابو لڑکی کے حلق سے ایک ایسی خوفناک، حیوانی سی آواز برآمد ہوئی کہ جس نے اُن پتھریلے چہروں والے سخت کوش کسانوں کے مجمعے کو بھی چونکا دیا۔

"دہقان۔" اُس نے کہا، "بے ایمان دہقان۔" اور آخری بار ایک جھرجھری سی لے کر اسد کے بازوؤں میں ڈھے گئی۔ اُس کا سر چھاتی پر ڈھلک گیا اور بدن شل ہو گیا۔ باہر خاموشی کا یہ عالم تھا کہ سانس کی آواز آتی تھی۔

ایک بڈھے نے آکر اسد کے کان میں کہا: "اِسے گھر کے اندر لے جاؤ۔" اسد نے اُس بھاری، بے ہوش جسم کو بمشکل کندھے پر اُٹھایا اور گھر کی طرف چل پڑا۔ مجمعے کے اندر اِس تیزی سے اُن کے لیے راستہ بنا کہ ایک لمحے کو بھی اسد کو رُکنا نہ پڑا۔ وہیں کہیں سے گھر میں کام کرنے والی حکیم کی قدیم خادمہ بھی، اُونچی آواز میں روتی اور فریاد کرتی ہوئی، دونوں ہاتھوں سے یاسمین کے لٹکتے ہوئے سر کو تھامے، اسد کے پیچھے ہولی۔ یاسمین کو چارپائی پر ڈال کر اسد نے عورت سے دُودھ گرم کرنے کو کہا۔ پھر اُس نے افیون کے مُرکب کی سیاہ گولیاں جن سے وہ واقف تھا، گھر میں سے ڈھونڈ کر نکالیں اور دو گولیاں گرم دودھ میں حل کیں۔ جب کچھ دیر کے بعد یاسمین میں ہوش کے آثار پیدا ہونے لگے تو اسد نے ایک بازو اُس کی پشت کے نیچے ڈال کر اُسے اُٹھایا، اور دُودھ کا پیالہ یاسمین کے مُنہ سے لگا دیا۔ اسد کے اشارے پر بوڑھی عورت نے اُس کا مُنہ کھول کر رکھا، اور اسد نے تھوڑا تھوڑا کر کے دُودھ اُس کے حلق میں اُنڈیلنا شروع کیا۔ کچھ دُودھ نیچے گرا، باقی یاسمین کے حلق سے اُتر گیا۔

★ ★ ★ ★ ★

اسد چار پائی کے پاس دیوار کی اس بھدی سی کرسی پر بیٹھا تھا جو اس نے اپنے ہاتھ سے بنائی تھی۔ کمرے میں ایک دوسری، چوڑی سی آرام کرسی بھی تھی جس پر وہ پہلے بیٹھنے ہی والا تھا کہ اُسے باہر، اس دوسرے کمرے میں اوندھے منہ پڑا ہوا مُردہ جسم یاد آ گیا اور وہ اس کرسی سے پرے سرک گیا۔ چنانچہ تھوڑی دیر کے بعد وہ اپنے کمرے سے جا کر یہ سخت تختے کی سیٹ والی کرسی اٹھا لایا تھا جو اس نے سردیوں میں، احمد علی کے بھائی سے اوزار مانگ مانگ کر گیارہ دن میں، اپنے ہاتھ سے بنائی تھی۔ یاسمین اپنے باپ کے بستر میں لیٹی تھی۔ اسد دراصل یاسمین کو اٹھائے اس کے کمرے میں لیے جا رہا تھا کہ یہاں تک پہنچتے پہنچتے اس کی سانس پھول گئی اور ٹانگیں تقریباً جواب دے گئیں۔ چنانچہ وہ جلدی سے اسی کمرے میں داخل ہو گیا تھا۔ یاسمین کو دودھ پلانے اور کھیس سے ڈھکنے کے بعد اسد نے سوچا تھا کہ اگر وہ اپنے کمرے میں چلا جائے اور جا کر سو جائے تو کیا حرج ہے؟ عورت گھر میں موجود ہی ہے۔ مگر یاسمین نے نیند میں کراہنا شروع کر دیا تھا۔ گہرے نشے کی نیند میں وہ وقفے وقفے پر شیشے کی سی آنکھیں کھولتی، پھر بند کر لیتی۔ اس کا لمبا، ہڈیوں کی موٹھ جسم کھیس کے اندر مسلسل حرکت میں تھا۔ وہ کسماتی، جھرجھراتی، اور کراہنے لگتی۔ اسد وہاں سے اٹھ کر نہ جا سکا۔ اب وہ اپنی کرسی پہ بیٹھا خالی خالی نظروں سے یاسمین کو اور اِدھر اُدھر کمرے کی دیواروں کو دیکھ رہا تھا۔ کمرے کی سب چیزیں اپنی اپنی جگہ پہ ٹھیک اسی طرح رکھی تھیں جیسے ہمیشہ رکھی رہتی تھیں۔ حکیم ایک بانظم آدمی تھا۔ وہ ایک ایک چیز کو اپنی مخصوص جگہ پہ رکھنے کا عادی تھا۔ اس کی چھڑی، جس پہ کھدائی کا باریک کام کیا ہوا تھا، بادام روغن کی شیشی، لکڑی کا کنگھا (جسے وہ اکثر، موقع بے موقع اٹھا کر اپنے چھوٹے چھوٹے سفید بالوں میں، تالو سے شروع کر کے سیدھا ماتھے کی طرف پھیرا کرتا)، شیشہ، خشک مسواک کا بنڈل، صندل کی لکڑی کے دانوں والی تسبیح، سُرمے کی ننھی سی بوتل اور سُرمچو، اس کا لوٹا، جائے نماز، کپڑے کی چوکور ٹوپی (یہ پہلی بار تھی کہ حکیم اپنی ٹوپی گھر میں چھوڑ کر باہر گیا تھا)، موٹی اون کی جرابوں کا جوڑا، اور اس کے علاوہ کپڑوں کے چند جوڑے جو اس کے ٹین کے پرانے بکس میں پڑے تھے۔ کُل یہ چیزیں تھیں جو اس کی ملکیت تھیں۔ حکیم سادہ آدمی تھا۔ اور نفیس۔ بندوق پر زنگ کا نشان تک نہ تھا، گو برسوں سے استعمال میں نہ آئی تھی، مگر ویسی کی ویسی جھاڑی پونچھی اور تیل لگی چمکتی ہوئی ڈبے میں بند پڑی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ حکیم ہر چند ماہ کے بعد باقاعدگی سے اسے نکال کر صاف کرتا تھا۔ اگر لڑکے کے ہاتھ میں ہوتی تو کوئی تُک بھی تھی۔ وہ اسی مقصد سے آیا تھا، اس میں شک کی کوئی گنجائش نہ تھی۔ اسد کو دن کے وقت ہی پتا چل گیا تھا کہ لڑکے کی آنکھوں میں خون ہے۔ جس طرح سے وہ بھاگ کر باہر نکل گیا تھا اور جیسے اس نے دوا کے گرنے کی پروا بھی نہ کی تھی۔ مدقوق حرامی، قتل کے ارادے سے آیا تھا، قتل کر کے گیا۔ اس کو مگر یہ علم کیسے ہوا تھا کہ حکیم رات کے اس وقت مطب میں آئے گا؟ چھپا رہا ہو گا۔ مگر یہ اس کو کیسے پتا تھا کہ حکیم آدھی رات کے وقت وہاں آئے گا؟ حکیم تو اس وقت کبھی وہاں اکیلا نہیں آتا ——

پھر وہ گھر کے باہر چھپ کر انتظار کرتا رہا ہوگا۔ تو کیا اُس کا گھر میں نقب لگانے کا ارادہ تھا؟ اونہوں، اسد نے اس کی تردید کی۔ یہ تو اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ اگر وہ گھر کے باہر بیٹھا تھا تو اُس نے یاسمین کو باہر جاتے تو دیکھا ہوگا؟ ضرور دیکھا ہوگا۔ کیا اُس نے پتا چلایا ہوگا کہ وہ کہاں جا رہی ہے؟ اور خود اسد کو؟ کیا اُسے بھی یاسمین کے پیچھے جاتے ہوئے دیکھا ہوگا؟ خدایا، اسد نے سوچا، رات کے شروع میں، جب وہ سنسان گلیوں سے گزر کر جا رہا تھا تو اُسے خیال ہوا تھا کہ جیسے رات کے اندر کوئی ذی رُوح نہ بستا ہو ماسوا اُن دونوں کے، اور سارا وقت یہ دو چمکتی ہوئی مکار آنکھیں اُن کا تعاقب کرتی رہی ہیں۔ بھیڑیے کی آنکھیں۔ گرل پرندہ آنکھیں۔

بہرحال، جب یاسمین نکل کر چلی گئی تو دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ اُس وقت وہ آسانی سے اندر گھس کر اپنا کام کر سکتا تھا۔ چپکے سے حکیم کے کمرے میں پہنچ کر اُس کا کام تمام کرتا اور یاسمین کی واپسی سے پہلے دروازہ بھیڑ کر اپنے گھر کو بھی چلا جاتا، اور صبح ہونے تک کسی کو پتا بھی نہ چلتا۔ پھر؟ پھر کیوں وہ یہاں چھپا حکیم کے باہر آنے کا انتظار کرتا رہا اور جب وہ باہر آیا تو اُس کے پیچھے پیچھے مطب میں گیا اور وہاں جا کر اُس پہ وار کیا۔ بتی کی روشنی میں جہاں کوئی بھی اندھیری رات میں گزرتا ہُوا اُسے دیکھ سکتا تھا؟ اونہوں! اسد نے دوبارہ اپنے دل میں اس خیال کی تردید کی۔ میر حسن یہاں آیا ہی نہیں۔ وُہ سیدھا مطب میں پہنچا، اور شاید قتل کے ارادے سے نہیں بلکہ بندوق چرانے کی غرض سے گیا تھا۔ ہاں، یہ بات ہوسکتی ہے۔ مگر بندوق حکیم کے ہاتھ میں تھی۔ اوّل حکیم اُس وقت بندوق کو اپنے ہاتھ میں لیے وہاں کر کیا رہا تھا؟

بستر میں لڑکی نے ہلنا اور کراہنا شروع کر دیا تھا۔ اسد اُٹھ کر چارپائی کے پاس جا کھڑا ہوا۔ یاسمین کے حلق سے گہری درد کی لمبی لمبی، مدھم آواز نکل رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے کروٹ لی اور آواز ہلکی ہلکی سسکیوں میں تبدیل ہوگئی۔ پھر اُس کا جسم خاموش ہوگیا۔ اسد واپس آ کر کرسی پہ بیٹھ گیا۔ یہاں تک تو بات عیاں تھی کہ میر حسن ہتھیار اٹھانے کی غرض سے آیا تھا۔ کسی کے کہنے پہ آیا تھا یا خود آیا تھا، مگر آیا اسی مقصد سے تھا اور غالباً شروع رات سے چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔ تفصیل میں جانے کی کیا ضرورت ہے، اسد نے اپنا ذہن صاف کرنے کی کوشش کی، ٹھیک کس وقت آیا تھا اس سے غرض نہیں۔ بات اصل یہ ہے کہ یہاں نہیں بلکہ وہاں آیا تھا۔ وہ رات پڑنے کے انتظار میں چھپ کر بیٹھا رہا تھا۔ مگر جب اُسے پتا تھا کہ رات کے وقت اس گاؤں میں کوئی باہر نہیں نکلتا اور حکیم تو کبھی اس وقت باہر نہیں آیا جب تک کہ کوئی مریض نہ آ پہنچے، پھر اُسے آدھی رات تک انتظار کس بات کا تھا؟ ہوسکتا ہے کہ کسی سوچی سمجھی تجویز کے مطابق نہیں بلکہ محض وقتی جذبے کے تحت آ گیا ہو اور وہاں اسی شش و پنج میں بیٹھا رہا ہو کہ کرے تو کیا کرے۔ آخر کوئی عادی مجرم تو تھا نہیں۔ یہی بات ہے۔ وہاں بیٹھا حجز بز ہو رہا ہوگا کہ حکیم کسی نہ کسی غرض سے مطب میں آیا اور بندوق کو اُلٹنے پلٹنے لگا۔ بندوق کو اُلٹ پلٹ کرنے کا کیا مطلب تھا آخر؟ یہ ایک معمہ

ہے۔ نہیں کوئی ایسا معمہ بھی نہیں۔ کوئی بھی مقصد ہو سکتا تھا۔ آخر اس کی اپنی بندوق تھی۔ صاف وات کرنے کو ہی نکالی ہوگی۔ بندوق پر زنگ کا نشان تک نہ تھا، یوں جیسے باقاعدگی کے ساتھ...... اپنے ذہن کو بھٹکتے پاکر اسد نے سر جھٹکا، لڑکے کے بارے میں سوچو۔ اُس نے اپنے آپ کو تنبیہہ کی، ذہن کو مرکوز رکھو، اِدھر اُدھر مت دوڑنے دو۔ آخر تمہیں یہ سب کچھ بتانا ہے۔

کیا میر حسن حکیم کے واپس جانے تک کا انتظار نہ کر سکتا تھا؟ ٹھیک ہے۔ اُس نے حکیم کے واپس جانے تک رُکنے کا فیصلہ کر لیا، مگر اُس کے دل میں کُھد بُد لگی رہی کہ حکیم اس وقت کرنے کیا آیا ہے، چنانچہ وہ پنجوں کے بل چلتا ہوا دروازے تک آیا اور اندھیرے میں چھُپ کر دیکھنے لگا۔ اُس وقت اُس نے دیکھا کہ حکیم بندوق ہاتھ میں لیے اُسے جوڑ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اُسے گھر میں لے جانے کے لیے آیا تھا، اور بندوق ایک بار گھر میں چلی جاتی تو پھر وہاں سے اُس کا حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا۔ اِتنا وقت نہیں تھا کہ کوئی اور تدبیر لڑاتا، چنانچہ وہ اندر داخل ہوا، اور پھر وہ ہوا جو کچھ کہ ہونا تھا۔ حکیم کو مار گرانے کے بعد ایک نظر ڈالنے کے لیے باہر نکلا اور بندوق حاصل کرنے کے لیے واپس اندر گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب اسد اتفاق سے وہاں سے گزر رہا تھا اور اُس نے پہلی بار میر حسن کا سایہ دیکھا تھا۔ پھر کیوں میر حسن نے بندوق نہ اٹھائی؟ شاید کوشش کی ہو مگر چھُڑا نہ سکا ہو، یا شاید گھبرا گیا ہو، کیونکہ ہو سکتا ہے اُس کا ارادہ حکیم کو قتل کرنے کا نہ ہو بلکہ اُسے چوٹ لگا کر گرانے یا زیادہ سے زیادہ بیہوش کرنے کا ہی ہو، اور جب اُس نے دیکھا کہ اُس نے تو حکیم کا خون ہی کر دیا ہے تو گھبرا گیا ہو، اُس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ اب کیا کرے (سوائے اِس کے کہ باہر آ کر اِدھر اُدھر دیکھے اور واپس اندر چلا جائے)۔ ٹھیک۔ یہ بات کچھ ٹھیک لگتی ہے۔ اسد نے ایک لمبی سانس لی، جیسے کہ اس معمے کے حل کی کوئی صورت نکلتی آ رہی ہو۔ مگر اگلے ہی لمحے واقعات کی صورتیں پھر یلغار کرتی آنے لگیں۔

تو کیا کسی کو بیہوش کرنے کے لیے اُس کی پُشت میں خنجر بھونک دیا جاتا ہے؟ اونہوں۔ بیوقوفی کی بات ہے۔ یہ تو ایسا لگتا ہے کہ پورے ارادۂ قتل سے آیا تھا اور اُس نے واردات کی۔ ٹھیک ہے، اُس نے قتلِ عمد کیا مگر آخر ایک لڑکا ہی تو ہے۔ جب اُس نے ایسا وار کیا کہ حکیم کو فی الواقع زخمی ہو کر گرتے اور پھر اپنی آنکھوں کے سامنے مرتے ہوئے دیکھا تو گھبرا گیا۔ آخر ایک نو عمر لڑکا ہی تو ہے...... اُس وقت وہ کمزور سی آواز جو بازگشت کی مانند اسد کے دماغ میں مُستقل چکر کاٹ رہی تھی، خیالات کے اِس جھنجھٹ کو توڑ کر آگے نکل آئی، اور اُس کے ساتھ ہی وہ منظر اُس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا: سُتا ہوا زرد چہرہ، خوف سے اُبلی ہوئی زرد آنکھیں، اور کانپتے ہوئے

ہونٹ، کھلتے اور بند ہوتے ہوئے، آخر کہتے ہوئے: "تم نے کچھ نہیں دیکھا۔ مَیں تو آیا ہی ہوں۔"

یہ تھے وہ الفاظ جو اُس کو برابر مجبور کر رہے تھے کہ وہ ہر بات کو اُلٹے اور پلٹے، اُن کا کھوج نکالے، اُنہیں پرکھے۔ وہ باتیں جو اوّل اوّل سیدھی سادی معلوم ہوتی تھیں، جیسے جیسے وہ سوچتا اُس کی اُنگلیوں سے ہوا کی طرح نکلتی جا رہی تھیں۔ اُس کی نظر گدلی ہوتی جا رہی تھی اور اُس کے ہاتھ میں کچھ بھی نہ آ رہا تھا۔ ہاتھ میں کچھ نہ کچھ ہونا بہت ضروری تھا۔ اب وہ اِس جھنجھٹ میں پھنس ہی چکا تھا، جتنا بھی ہاتھ پاؤں مارتا اس سے نکلنا دشوار تھا۔ اس وقت تو وہی، تنِ تنہا، اِس معاملے میں پھنسا ہوا تھا، اسد نے افسوس کے ساتھ سوچا۔ مَیں نے کتنی بیوقوفی کا ثبوت دیا ہے۔ چاہیے یہ تھا کہ چپکے سے جا کر اپنے کمرے میں سو رہتا۔ ان لوگوں کو خود ہی یہ قضیہ نمٹانے دیتا۔ اب سارے گاؤں کے علم میں آچکا ہے کہ میں ہی ایک آدمی ہوں جو موقعے پہ موجود تھا اور جو اصل بابت بتا سکتا ہوں، اور کوئی نہیں۔ یہ سوچ سوچ کر ابھی تک اسد کو صرف ایک بات کا علم ہو سکا تھا: کہ اب کتنی باتوں کا، کتنی چیزوں کا انحصار اُس ایک آدمی پہ ہے، اور اس وجہ سے کتنا ضروری ہو گیا ہے کہ وہ جو بات کرے وہ درست ہو۔ وہ اس ذمہ داری کے احساس سے کانپ اُٹھا۔ اسد پہ اب آہستہ آہستہ اِس بات کا اِنکشاف ہونے لگا تھا کہ کسی ایسے معاملے میں پھنسنا کیا ہوتا ہے جس میں بات بات پہ فریب کا احتمال ہو۔ اصل بات کسے کہتے ہیں؟ مَیں کتنا احمق ہوں، اس نے جھلا کر اپنے آپ کو کوسا۔ مگر ساتھ ہی اس انوکھے احساس نے اُسے ہر اُس بات کو جو اُس نے دیکھی تھی، اپنے ذہن میں پرکھنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ آخر یہ قصہ کیا تھا؟ آلۂ قتل! ہاں، آلۂ قتل کہاں تھا؟ آلۂ کار......

یاسمین کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور اُس نے بستر پر ہاتھ پاؤں مارنے شروع کر دیے۔ وہ اپنے پاؤں یوں اُٹھا اُٹھا کر رکھ رہی تھی جیسے من من بھر کے ہوں۔ اسد کو یوں لگا جیسے وہ ایک خواب دیکھ رہا ہے جس کی دو تہیں ہیں۔ اُوپر کی سطح پہ ہر شے کی رفتار غیر قدرتی طور پر سست ہو گئی ہے اور نچلی تہہ پر غیر معمولی طور پر تیز! پتلا سفید کھیس اکٹھا ہو کر یاسمین کے اُوپر سے کھسک گیا تھا اور خون کے دھبوں والی سفید شلوار گھٹنوں تک سرک آئی تھی۔ اسد نے جھک کر یاسمین کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ یاسمین نے خواب میں آنکھیں کھولیں اور بند کر لیں۔ شلوار اور کھیس ٹھیک کرنے سے پہلے اسد کی نظر اُن مزنیا رنگ کی لمبی لمبی پنڈلیوں اور پیازی ٹخنوں کی مدھم سی گولائیوں پر پڑی اور وہ ایک لمحے کو ٹھٹھک کر رُک گیا۔ پھر وہ واپس آ کر کُرسی پہ بیٹھ گیا۔

آلۂ قتل، خنجر، کہیں بھی ہو سکتا تھا۔ چوکی کے نیچے یا کہیں اور۔ اگر وہ اُس وقت اپنے ہوش قائم رکھتا اور اِدھر اُدھر تلاش کرنے کی کوشش کرتا تو اُسے شاید کہیں پڑا ہوا مل جاتا۔ چوکی کے نیچے یا کہیں اور۔ تختے کے نیچے دیکھا تو تھا صرف قینچی پڑی تھی،

بس۔ یہ ایک اور احمقانہ بات ہے۔ بھلا قتل کا ہتھیار بھی کوئی پھینک کے جائے گا؟ وہ تو قاتل کے پاس ہوگا، اُس کی حفاظت میں، نیفے میں اُڑسا ہوا یا کہیں اور، جہاں سے پھر وہ اُسے کسی چوٹی پہ جاکر دُور نیچے کسی کھائی میں پھینک دے گا جہاں عمر بھر اُس پہ کسی کی نظر بھی نہ پڑے گی۔ مگر خون! ہاں، خون کہاں تھا؟ روشنی اس وقت کافی تھی جب اُس نے میر حسن کو دیکھا تھا، اُس نے میر حسن کو صاف طور پہ دیکھا تھا، پھر جب وہ بھاگا تھا تو اُس کی پُشت بھی نظر آئی تھی اور میر حسن پہ خون کا دھبا تک نہ تھا، جب کہ صاف ظاہر تھا۔ زرد کھدّر کے تخت پوش پہ خون کے قطروں کی قطار تھی اور صاف ظاہر تھا کہ جہاں خنجر گھسا تھا وہاں سے خون اُچھل کر نکلا تھا۔ پھر میر حسن کیسے اس سے بچ سکتا تھا؟ روشنی اُس وقت کافی تھی اور اُس نے صاف دیکھا تھا۔ "میں تو آیا ہی ہوں" اس بے سود فریاد کی آواز اسد کے دماغ میں آکر بجنے لگی، "میں تو آیا ہی ہوں۔" جیسے دُور سے ریل گاڑی کی کُوک کی آواز تیزی سے قریب آتی جاتی ہے اور کانوں میں شور مچا دیتی ہے۔ وہ اُٹھ کر کمرے میں چکّر کاٹنے لگا۔ اپنی انگلیوں کو دانتوں سے نوچ نوچ کر اور مُٹھیاں دیواروں پہ مار مار کر اُس نے اپنے ہاتھ سُرخ کر لیے۔ میر حسن کو بھلا یہ ہتھیار استعمال کرنا آتا تھا؟ کیونکہ جو کچھ بھی تھا، کم سے کم ایک بات صاف ظاہر تھی کہ وار بڑی مہارت سے اور کاری لگایا گیا تھا، اس طرح کہ بڈھے کو مدافعت کرنا تو درکنار، پیچھے مڑ کر اپنے قاتل کو دیکھنے کا موقع بھی نہ ملا تھا۔ وہ شاید آواز نکالے بغیر، اسی طرح اوندھے مُنہ گر کر، یا شاید گرنے سے پہلے ہی کھڑا کھڑا مر گیا تھا۔ اُس بیچارے کو مہلت ہی نہ ملی تھی۔ میر حسن نے اس کاریگری سے خنجر استعمال کرنا کہاں سے سیکھا تھا؟ آخر وہ ایک نوعمر لڑکا ہی تو تھا جو شاید اپنی عُمر میں اِس گاؤں سے بھی باہر نہ نکلا تھا —— یا یہ محض اتفاق تھا؟ کہ خنجر والا ہاتھ اتفاقاً اس طور سے پڑا کہ زخم کاری آیا؟ اُس وقت اسد کے دل میں شُبہے کا بے معلوم سا بیج شک کی جڑ بن کر پھوٹنا شروع ہوا۔ کمرے میں اُس کے چکّر تیز ہو گئے۔ اُس کی انگلیوں کے جوڑوں سے خون رسنے لگا، اور ذہن کی افراتفری سے فرار کی سب راہیں مسدود پا کر اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اپنے آپ کو اس جھمیلے میں ڈال کر وہ ایک ایسے مقام پہ آ کھڑا ہوا تھا جہاں وہ سچائی کی تلاش پہ مجبور ہو گیا تھا۔ وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا۔ مہلت اتنی کم تھی اور اُسے جلد از جلد اپنے ذہن کی تصویر واضح کرنا تھی۔ وہ ایسا بھی نہیں کر سکتا تھا کہ جو جی میں آئے کہہ دے۔ "یا اللہ،" اُس نے اپنے آپ سے کہا، "کس مصیبت میں جان آئی ہے۔" آج تک اُس نے کسی نہ کسی طور اپنے آپ کو ایسے جھمیلوں میں پڑنے سے بچائے رکھا تھا۔ وہ ایک طرف کو کھڑا آرام سے دُنیا کا تماشا کرتا رہتا تھا اور اُس کا فاصلہ قائم اور حیثیت مستثنیٰ رہتی تھی۔ مُہلت کی کمی نہ ہوتی تھی اور کوئی دوسرا اُس کا شریک نہ تھا جس پہ اُس کے اعمال کا اثر پڑ سکتا تھا۔ اُس نے سمجھ رکھا تھا کہ زندگی اُس کا ذاتی معاملہ ہے اور اُس کی ایک الگ، ایک گواہ کی سی حیثیت ہے جو دُنیا کے رازوں کو اپنی جان پہ درج کرتا ہے اور جلد یا بدیر اُس پہ حقیقت کا انکشاف ہوتا رہتا ہے۔ اب یہ قضیہ ایک نئی صورت

لے کردار و ہوا تھا۔ اِس صورت سے وہ واقف نہ تھا۔ اب اسے پتا چلا کہ اصل گواہ کی جگہ اور حیثیت کیا ہوتی ہے۔ کہ یہ ایک بے خطر حیثیت نہیں بلکہ ایک ایسی جگہ ہوتی ہے جہاں اپنی ذات کی بنیادوں پہ شک ہونے لگتا ہے اور حاضر دماغی کے سوا کچھ کام نہیں آتا۔ اُس کے ایک ایک لفظ پہ کسی دوسرے شخص کی زندگی کا انحصار تھا، اور اُس نے اِس ایک ایک لفظ کو عجلت میں کھرچ کر نکالا تھا۔ حقیقت کی شکل میں، ممکنہ اور ترجیحاً حقیقت کی شکل میں! اور حقیقت کیا تھی؟ حقیقت یہ تھی کہ اُس نے میرحسن کو جائے وقوعہ پر دیکھا تھا، مگر میرحسن نے کہا تھا "تم نے کچھ نہیں دیکھا۔ میں تو آیا ہی نہیں ہوں۔" میرحسن وہاں پر کیوں آیا تھا، یہ تو بعد کی بات ہے۔ اصل بات تو تھی کہ اُس نے میرحسن کو قتل کرتے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ یہ تھی اصل بات!

تو یہ چکر کیسے رُونما ہوا؟ کہ جو بات پہلے صاف اور سیدھی معلوم ہوتی تھی آخر میں بالکل ہی اُلٹ ہو کر سامنے آگئی؟ یعنی سہ پہر کے وقت میرحسن کا (آگ برساتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ) احاطہ چھوڑ کر بھاگ جانا، یوں جیسے اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔ پھر جائے واردات پر اُس کی موجودگی، اور صرف اُسی کی موجودگی! پھر یہ شکوک و شبہات کیسے اور کب سر اُٹھانے لگے تھے؟ یا اللہ، واقعات کے بھی کیسے اسرار ہوتے ہیں! کاش کہ کوئی دوسرا اس قصے میں اُس کا شریک نہ ہوتا اور وہ الگ کھڑا اس معاملے کو دُور سے دیکھ رہا ہوتا۔ پھر اطمینان سے کہیں بیٹھ کر وہ اِس معاملے کا بغور مطالعہ کرتا اور وقت گزرنے کے ساتھ اس کا ذہن شاید صاف ہو جاتا۔ اب مہلت نہ تھی۔

اتنا وقت گزر جانے پر بھی اسد کے دل میں ایک حسرت (اور ایک موہوم سی اُمید) ابھی باقی تھی کہ کاش کوئی تدبیر، کوئی ترکیب، کوئی معجزہ ایسا رونما ہو کہ وہ اس جھنجھٹ سے صاف چھٹکارا پا کر دُور ایک کنارے پر جا کھڑا ہو اور دُوسرے لوگوں کو اس سے نپٹتے، اِسے نبٹاتے ہُوئے دیکھنے لگے۔ گویا سیمن بھی اُس کے پہلو میں وہیں پر کھڑی ہو اور اُس کا اِس قصے سے کوئی تعلق نہ ہو۔ نیچے ایک کمرے میں کوئی لاش پڑی ہو جسے وہ دونوں محض سرسری طور پر ہی جانتے ہوں۔ اسد کو کل صبح کا وقت یاد آیا جب وہ بہت سویرے، گہری نیند سے محض اپنے جسم کا لذیذ بوجھ لیے اُٹھا تھا اور اپنے روزمرہ کے کام کے لیے نکل آیا تھا۔ اُسے کیا پتا تھا کہ یہ دن اِتنا طویل ہوگا! اب وہ وقت اسد کو محسوس ہُوا، جیسے ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔ اب وہ جس صورت بھی اس جھنجھٹ سے آزاد ہُوا، وہ باضابطہ اور بے خطر وقت اب کبھی لوٹ کر نہ آئے گا۔ اب دُنیا بدل گئی تھی۔ اب ایک مہیب ذمہ داری کا اور دماغ کی عسرت کا وقت تھا۔ اب مہلت نہ تھی۔ دو گھنٹے میں صبح ہو جائے گی، اور کیسی جابر صبح یہ ہوگی۔ کیا نجات کا کوئی رستہ نہ تھا؟

کوئی دُوسرا آدمی! کیا کوئی دُوسرا آدمی بھی تھا؟ تھا تو کون تھا۔ کیا کوئی ہو بھی سکتا ہے؟" کسی اور نے کیا ہے۔" میر حسن نے کہا تھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ جو بات اُس وقت جیلہ جوئی اور سفید جھوٹ لگتی تھی آخر کو سچ پر ہی مبنی ہو؟ اور وہ بدبخت لڑکا فی الواقع وہاں محض آیا ہی ہو؟ خدایا!

اسد کے ذہن میں روشنی کا ایک جھپاکا سا ہُوا اور وہ لمبی سانس لے کر کُرسی پر آ بیٹھا۔ پہلے مجھے اس بات کا خیال کیوں نہیں آیا؟ اُس نے سوچا۔ اپنے طور تو مجھے کسی بات کا کھوج لگانے کی ضرورت ہی نہیں۔ میرا فرض تو صرف اتنا ہے کہ جو کچھ مَیں نے دیکھا ہے حرف بحرف بیان کر دوں اور بس۔ مقتول وہاں مرا پڑا تھا اور لڑکا لاش کے گرد منڈلا رہا تھا جس وقت کہ اتفاق سے میرا گزر اُس طرف سے ہُوا اور موقعے پر پہنچ کر مَیں نے لڑکے کو پکڑ لیا، اور لڑکے نے کہا، مجھے پتا نہیں، مَیں نے نہیں کیا، وغیرہ وغیرہ۔ اگر میر حسن نے کوئی اور کہانی گھڑنی ہے تو اُن کے رُوبرو گھڑتا ہے گا۔ اصل قاتل کا پتا لگانا تو اُن کا فرض ہے نہ کہ میرا۔ مَیں تو بس واقعات کو صاف صاف بیان کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو سکتا ہوں۔ میرا ضمیر صاف ہو جائے گا۔

ضمیر! فرض! یہ الفاظ اُس کے ذہن میں بھاری پتھر کی طرح آ کر لگے۔ بیشک وہ اپنا قانونی فرض پُورا کر سکتا تھا، مگر کیا وہ اُس ذمہ داری سے بھی عہدہ برا ہو سکتا تھا جو اُس پر عاید ہوتی تھی؟ اس لیے کہ اگر میر حسن نے جو کچھ کہا تھا وہ سچ تھا، اور وہ لڑکا، خود اُس کی طرح، محض اُس طرف سے گزرا ہی تھا، تو کیا یہ درست تھا کہ اُسے اُن کے حوالے کر دیا جائے؟ کیا یہ اُس کی ذمہ داری نہ تھی کہ وہ اس بات کا خیال کرے کہ اُس کے کسی ایک نادرست لفظ کی بنا پر لڑکے کو کوئی زک نہ پہنچے؟ اوّل میر حسن یہی کیسے ثابت کر سکتا ہے کہ کوئی اور وہاں پہ تھا، یا پہلے آ چکا تھا جو اصل قاتل تھا نہ کہ وہ، کیونکہ اِس کا کوئی گواہ ہی نہیں۔ موقعے کا اکلوتا گواہ جو تھا وہ کہتا ہے کہ جب وہ پہنچا تو اُس نے لڑکے کو لاش کے پاس کمرے میں موجود پایا۔ میر حسن وہاں پر اپنی موجودگی کی کیا تاویل پیش کر سکتا ہے؟ یہ کہ مَیں تو آیا ہی تھا؟ جب کہ گواہ یہ بھی کہتا ہے کہ یہ میر حسن ہی تھا جو دن کے وقت سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بڈھوں کے پیچھے احاطے سے نکل گیا تھا۔ جہاں تک اُن کا تعلق ہے، کسی شک شبہے کی گنجائش نہیں۔ سیدھا سادا کیس ہے۔ ہاں اگر وہ میر حسن کے احاطے سے بھاگنے کی بات نہ کرے تو کوئی حرج ہے؟ کسی بات کو حذف کر دینا کیا جھوٹ کے مترادف ہے؟ ہے بھی اور نہیں بھی۔ مگر اس سے کیا فائدہ؟ سب لوگوں نے دیکھا ہے۔ میر حسن کا نام نکلا تو ساری بات نکل آئے گی۔ پھر؟

اسد گھبرا کر کُرسی سے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ کھڑکی کے پاس جا کر اُس نے ایک پٹ کھولا۔ باہر پَو پھٹنے سے پہلے کا گھُپ اندھیرا تھا۔ اُس نے پٹ بند کر دیا۔ اگلے چند منٹوں میں اُس نے کئی بار کھڑکی کھولی اور بند کی۔ اُس کے اندر اُتری

کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ اُسے کوئی فیصلہ کرنا ہے، وہ بار بار کہتا، اور اُس پر عمل کرنا ہے۔ عمل! گرم گرم آنسو اُس کی آنکھوں میں بھر آئے اور اپنے پیچھے سرد ہموار راستے بناتے ہوئے گالوں سے ٹپک پڑے۔ بستر پر یاسمین نے ایک سسکی لی جو اسد کے کانوں تک نہ پہنچ سکی۔ عمر میں پہلی بار اُس کے ہاتھوں میں یہ طاقت آئی تھی کہ وہ اپنی ذمہ داری اُٹھا کر کسی اور کے سر پر ڈال دے، اور وہ اِس کے بوجھ تلے پِسا جا رہا تھا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے وہ سُتا ہوا، ہلکے بخار سے چمکتی ہوئی آنکھوں والا چہرہ تھا جو کہے جا رہا تھا، تم نے کچھ نہیں دیکھا، میں تو آیا ہی ہوں۔ اُس کو علم نہیں تھا کہ یہ بات درست ہے یا غلط مگر فرار کا کوئی رستہ بھی نہ تھا۔

کھڑکی پر ماتھا ٹکائے، آنکھیں بند کیے، آہستہ آہستہ اسد کے اندر کی کیفیت سرد پڑنے لگی۔ بستر کے پاس جا کر یاسمین کے اوپر کپڑا ٹھیک کرنے کے بعد وہ آ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ اُس کی گردن میں ہلکا ہلکا درد ہو رہا تھا۔ اُس نے سر کرسی کی پُشت پر رکھا اور آنکھیں بند کر لیں۔ لیمپ کی کانپتی ہوئی روشنی میں اُس کا بے حس و حرکت چہرہ زرد اور بیجان دکھائی دے رہا تھا، جیسے کہ رات بھر کی مدت میں ایک پورا موسم اُس کے اوپر سایہ ڈال کر گزر گیا ہو۔ ایک انوکھی سی خاموشی اب اُس کے اندر سرایت کرتی جا رہی تھی، جو اُس کے بدن کو آرام پہنچا رہی تھی۔ اُس نے چند مختصر سے اڑتے ہوئے خواب دیکھے۔ اُونٹوں کی ایک قطار، ایک پرانے پسندیدہ گیت کا ٹکڑا، ہوا میں تیرتی ہوئی لمبی لمبی سفید پنڈلیاں۔ جب وہ اُٹھا تو اُس کی گردن میں بل پڑ چکا تھا۔ کان کے نیچے ہڈی پر گہرا سرخ نشان پڑ گیا تھا جہاں پہ گردن کرسی کی پُشت پر رکھی رہی تھی۔ سوتے میں اُس کا مُنہ کھلا رہا تھا جس سے حلق خشک ہو گیا تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا، مگر کھڑکی کی درزوں سے آسمان کو دیکھ کر اسد نے اندازہ کیا کہ دن نکل آیا ہے۔ یاسمین گہری نیند سو رہی تھی۔ باہر نکل کر اسد نے کلی کی۔ اُسے بھوک لگ رہی تھی۔ باورچی خانے میں جا کر اُس نے رات کی بچی ہوئی روٹی کا ٹکڑا ایک پیالہ بھر تازہ اُبلے ہوئے دودھ کے ساتھ کھایا۔ اُسے دیکھ کر بوڑھی عورت جو زمین پر خاموش بیٹھی تھی، آنکھوں پہ کپڑا رکھ کر آہستہ آہستہ رونے لگی۔ روٹی چباتے چباتے اسد نے اُسے بتایا کہ یاسمین آرام سے سو رہی ہے اور فکر کی کوئی بات نہیں۔ کھانا ختم کر کے وہ کچھ دیر تک دیگچی میں اُبلے ہوئے دُودھ کی سطح پر بے شمار ننھے ننھے قطروں کی موٹی سی تہہ کو دیکھتا رہا۔ اِس سے اُس کی آنکھوں کو آرام ملا۔ اس نے خیال کیا کہ وہ کھڑکی میں جا کر احاطے پر ایک نظر ڈالے، مگر اُس کے پیٹ میں کنکریوں کی سی بھاری بدمزگی کی لہر اُٹھنے لگی۔ واپس جانے سے پہلے اسد نے نظر بھر کر اُس مُنہ ڈھکے عمر رسیدہ جسم کو، ہچکولے کھا کھا کر اپنے نقصان کو یاد کرتے ہوئے دیکھا۔ پچیس برس پہلے جب یہ اِس گھر میں آئی تھی، اسد نے بے خیالی سے سوچا، تو جوان عورت ہو گی۔ محنت اور بے زبانی ہی شاید اس زندگی کی پائے داری کا راز تھا۔

★ ★ ★ ★ ★

یاسمین نے جب آنکھیں کھولیں تو سورج چوٹی سے نکل کر اوپر آ چکا تھا اور کھلی کھڑکی میں سے دھوپ اندر آ رہی تھی۔ اس سے کچھ ہی دیر کے بعد پولیس کی پارٹی، جو سب انسپکٹر، ہیڈ کانسٹیبل (محرر) اور دو رائفل بردار کانسٹیبلوں پر مشتمل تھی، گاؤں میں وارد ہوئی۔ گاؤں کا ایک معتبر اور دلی چوکیدار، جو رات ہی قتل کی اطلاع دینے تھانے کو روانہ ہو چکے تھے، ان کے ہمراہ آئے۔ پٹواری کے گھر سے ایک میز اور کرسی لا کر مطب کے احاطے میں رکھی گئی۔ گاؤں بھر میں اوّل نمبر کی تین چارپائیاں، سفید سُتلی کی بنائی اور رنگ دار پایوں والی، لا کر پاس بچھائی گئیں۔ ایک کانسٹیبل نے سیاہ ٹین کا صندوقچہ میز پر رکھ دیا۔ ہیڈ کانسٹیبل محرر نے چابی لگا کر اسے کھولا، اور اندر سے ایک رجسٹر نما کاپی نکال کر میز پر رکھی۔ پھر اس نے چار مختلف لمبائیوں کی پنسلیں نکالیں، اور ان کے سکوں کو آہستہ آہستہ میز کی سطح پر رگڑنے کے بعد، صندوقچے کے ایک خانے میں کھڑی کر دیں۔ (بعد میں، ان کی تمام تر کارروائی کے دوران ان میں سے صرف ایک پنسل استعمال ہوئی) تھانیدار نے، جو چالیس کے لگ بھگ تیز آنکھوں والا پتلا دُبلا آدمی تھا، سب سے پہلے مطب میں پہنچ کر لاش کا اور جائے واردات کا تفصیلی معائنہ شروع کیا۔ ایک کانسٹیبل کے ہاتھ میں فیتا تھا، جس کی مدد سے وہ لاش کا حدود اربعہ، زخم کا طول و عرض اور محلِ وقوع، اور وقوعے کی تمام تر ایسی تفصیلات جو گز دو گز کی حدوں میں ناپی جا سکتی تھیں ناپ کر بیان کرتا جا رہا تھا۔ ہیڈ کانسٹیبل پنسل کے ساتھ اس رجسٹر نما کاپی کے ایک صفحے پر جائے واردات کا مکمل نقشہ بنانے اور فیتے والے کانسٹیبل کے بتائے ہوئے ہندسوں کو اس نقشے کے اندر مناسب جگہوں پر لکھنے میں مصروف تھا۔ یہ کام ختم کر کے تھانیدار نے فیتے والے سپاہی کی مدد سے کمرے کی ہر چیز کو الٹ پلٹ کر کے رکھ دیا۔ چوکی کو اٹھا کر دیوار کے ساتھ کھڑا کر دیا، چوکی پوش اور زمین پر بچھی ہوئی دری کو جھاڑا، دیواروں کو ٹھونک بجا کر، اور کونوں کھدروں میں جمی ہوئی مٹی کو چھری کی نوک سے کھرچ کھرچ کر دیکھا۔ لیمپ کو کھول کر اندر نگاہ ڈالی۔ پھر اس نے الماری کا تالا کھلوا کر ایک ایک بوتل، شیشی، مرتبان، پیالے، دواؤں کی پڑیاں، گٹھے، غرضیکہ ہر چیز کو نکلوا کر زمین پر ڈھیر کر دیا۔ کچھ دیر تک وہ اوپر کے خانے میں بغور اس جگہ کو دیکھتا رہا جہاں گرد میں بندوق کے ڈبّے کا نشان موجود تھا۔ پھر اس نے خالی الماری کو اٹھوا کر ایک طرف کو رکھوایا اور اس کے نیچے اور عقب کی زمین کو، جہاں برسوں کی مٹی اور جالے جمع تھے، صاف کروا کے اچھی طرح دیکھا۔ اس طرف سے اطمینان کر لینے کے بعد

تھانیدار نے الماری واپس اپنی جگہ پر رکھوائی، اور اس کے کہنے پر سپاہی نے سب چیزوں کو اٹھا کر الماری میں اِدھر اُدھر بھر دیا۔ پھر تھانیدار نے الماری کو تالا لگایا اور چابی کو اپنے پاس رکھ لیا۔ اس کام سے فارغ ہوتے ہوتے دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا۔ چناروں کے نیچے دو چارپائیوں کے بیچ ایک لمبی سی چوکی بچھائی گئی جس کے اوپر کھانا لا کر رکھا گیا۔ مرغی کا سالن اور سفید چاول۔ دودھ کے لمبے لمبے جستی گلاس۔ کھانا صرف پولیس کے چار آدمیوں نے کھایا۔ گاؤں کے سب لوگ، بڈھے معتبروں سمیت، خاموشی سے چارپائیوں پر اور نیچے زمین پر بیٹھے رہے۔ کھانے کے دوران تھانیدار اور ہیڈ کانسٹیبل چند معتبر لوگوں سے اِدھر اُدھر کی، گاؤں کی، حکیم کی، مویشیوں کی، چیزوں کے بھاؤ کی، ڈوگرا کشمیر کی اور فوجیوں کی، شیر کی اور نمک کی باتیں کرتے رہے۔ کھانے کے بعد ہاتھ دُھلے اور خلال کیے گئے۔ پھر تھانیدار نے ایک گالی دے کر سب فالتو لوگوں کو احاطے سے نکل جانے کا حکم دیا۔ صرف چار بڈھے، ولی چوکیدار، اور بڈھوں کی سفارش پر گاؤں کے تین چار اور لوگ احاطے میں رہ گئے۔

بڈھوں کے بیانات مختصر اور بے سُراغ تھے۔ ولی چوکیدار نے کہا کہ وہ وقوعے سے آدھ گھنٹہ قبل اپنے چکر پر اِدھر سے گزرا تھا، اُس وقت مطب میں زندگی کا کوئی نشان نہ تھا۔ اس پر تھانیدار گالی دے کر بولا کہ وقوعے کے آدھ گھنٹے کے بعد بھی مطب میں زندگی کا کوئی نشان نہ تھا، اور اسی لیے تو وہ زمین میں سے اُٹھ کر وہاں آیا تھا۔ "اور کیا تیری ماں کے نکاح میں شریک ہونے آیا ہوں؟" تھانیدار کے اس مذاق پر سب لوگ ہنسنے لگے۔ پھر ایک شخص کو بھیج کر اطلاع کی گئی کہ تفتیشی افسر گھر میں آنا چاہتے ہیں۔ ایک سپاہی کو خالی احاطے میں چھوڑ کر تھانیدار، ہیڈ کانسٹیبل اور دوسرا سپاہی گھر کی جانب روانہ ہوئے۔ اس دوران میں اسد یاسمین کو بتا چکا تھا کہ بندوق کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ بندوق اب شاید اُن کے کام آئے۔ اُس نے یہ بھی تاکید کی کہ وہ بندوق کا ڈبہ اپنے کمرے سے اٹھا لائے اور اپنے باپ کی چارپائی کے نیچے رکھ دے۔ یہ موزوں جگہ تھی۔

گھر کے چھوٹے سے صحن میں میز اور کرسی رکھی گئی۔ ایک دوسری کرسی اور چارپائی گھر کے اندر سے لا کر بچھائی گئی۔ تھانیدار نے اسد کو اپنے مقابل چارپائی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ سوالات شروع ہوئے:

"نام؟"

"اسد کریم۔"

"ولدیت؟ قوم؟ سکونت؟"

"حسن کریم۔ فضل آباد، ضلع گجرات، پنجاب۔"

"قوم؟" تھانیدار نے دہرا کر پوچھا۔

"پٹھان۔"

"پنجابی پٹھان؟"

"ہاں۔"

"اصلی یا نقلی؟" تھانیدار نے مذاقاً کہا۔

"پتا نہیں۔" اسد تھانیدار کے لہجے سے جھنجھلا گیا۔ "کیا فرق پڑتا ہے۔"

"اچھا آ — ؟" تھانیدار بولا۔ "فرق کیوں نہیں پڑتا؟"

"ان باتوں کا کوئی ثبوت تو ہوتا نہیں۔"

"ثبوت تو بہت سی چیزوں کا نہیں ہوتا۔" تھانیدار دوسرے پانچ آدمیوں کی جانب دیکھ کر دانائی سے ہنسا۔ "لیکن کئی باتوں کا آدمی کو علم ہوتا ہے جن سے اُس کی شناخت ہوتی ہے۔ آپ کو کبھی اپنے والدین یا دوسرے رشتہ داروں نے ایسی باتیں نہیں بتائیں مثلاً آپ کی ذات کیا ہے، کہاں سے آئے ہیں، آباء و اجداد کون تھے، کیا کرتے تھے، وغیرہ؟"

"بتائی تھیں۔"

"آپ نے اُن سے ثبوت مانگا تھا؟"

"نہیں۔"

"پھر؟"

اسد نے جز بز ہو کر جواب دیا: "بہت سی غلط ثابت ہوئیں۔"

تھانیدار اور ہیڈ کانسٹیبل کی آنکھوں میں حیرت اور استہزا کا ملا جلا اثر تھا، جیسے انہیں اسد کی عقل پر شبہ ہو رہا ہو۔ کچھ دیر تک اسی طرح بغور اُسے دیکھتے رہنے کے بعد تھانیدار نے لمبا سا "ہوں" کرتے ہوئے ایک بار — پھر دُوسری بار اثبات میں سر ہلایا۔ اِس کے بعد تھانیدار نے احتیاط سے ایک پنسل چُنی اور رجسٹر کھول کر اُس کے اندر چند الفاظ درج کیے، جیسے یادداشت کے لیے لکھ رہا ہو۔ جب دوبارہ سوالات کا سلسلہ شروع ہوا تو تھانیدار کا لہجہ بدلا ہوا تھا:

"یہاں کب آئے؟"

"پچھلے سال گرمیوں میں۔"

"صحیح تاریخ؟"

"چھبیس جولائی۔"

"کیوں ہ"

"جی ہ"

"کیا مقصد لے کر آئے ہ"

"علاج کی خاطر۔"

"کس بیماری کے علاج کے واسطے ؟"

"سانس کی بیماری۔"

"دمہ ؟"

"اسی قسم کی بیماری ہے۔"

"مقتول نے تمہارا علاج کیا ؟"

"جی ہاں۔"

"کیا یہ درست ہے کہ چند ماہ تک علاج کرانے کے بعد تم کچھ عرصے کے لیے گُنڈسے چلے گئے تھے ؟"

"جی ہاں۔"

تھانیدار نے رجسٹر میں دو چار لفظ لکھتے ہوئے اُونچی آواز میں اپنے آپ سے دہرایا، 'درست ہے۔'
پھر بولا، "اپنے گھر گئے تھے ؟"

"ہُنہہ ؟"

"جب تم کچھ عرصے کے لیے یہاں سے گئے تو کیا اپنے گھر واپس گئے ؟"

"نہیں۔"

"پھر کہاں گئے ؟"

"گجرات۔"

"تمہارے علاقے کا شہر ہے ؟"

"جی ہاں۔"

"وہاں کس کے پاس گئے ؟"

"ایک دوست کے پاس۔"

"وہاں سے تمہارا گاؤں کتنی دور ہے ؟"

"کوئی پندرہ بیس میل۔"

"تو وہاں سے تم اپنے گاؤں نہیں گئے ؟"

"نہیں۔"

"ایک دن کے لیے بھی نہیں ؟"

"نہیں۔"

"کیوں ؟"

"گھر میں صرف میرے ایک چچا رہتے ہیں۔"

تھانیدار کڑی نظروں سے ایک منٹ تک اُسے دیکھتا رہا، جیسے اُس کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"تم کتنا عرصہ وہاں رہے ؟"

"دو ہفتے۔ آپ یہ سوالات مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہیں ؟"

تھانیدار نے جواب دیے بغیر سوالات جاری رکھے: "کیا تم اِس لیے چھوڑ کر چلے گئے تھے کہ علاج تمہاری تسلّی کے مطابق نہیں ہو رہا تھا ؟"

"ان سوالوں کا اِس معاملے سے کیا تعلق ہے ؟"

"ان باتوں کا فیصلہ کرنا میرا کام ہے۔" تھانیدار نے کہا، "یہ قتل کی تفتیش ہے، کوئی چوری چکاری کا معاملہ نہیں۔ مَیں سوال دہراتا ہوں۔ کیا پہلی بار تم ہسپتال چھوڑ کر اِس وجہ سے چلے گئے تھے کہ تمہارے خیال کے اندر علاج تسلّی بخش نہیں ہو رہا تھا ؟"

"جی ہاں۔"

تھانیدار نے اس بار لکھے بغیر 'ہاں' میں سر ہلایا، اور بولا، "درست ہے۔ تو پھر دو ہفتے کے بعد واپس کیوں آ گئے ؟"

"ہماری بگڑ گئی تھی۔"

"جب تمہیں کوئی آرام ہی نہیں آیا تو حالت بگڑ کیسے سکتی ہے ؟"

"مَیں نے یہ نہیں کہا کہ کوئی آرام نہیں آیا۔ کچھ نہ کچھ افاقہ ہوا تھا۔"

"اس بات کی کیا ضمانت تھی کہ واپس یہاں آکر بہتر ہو جائے گی ؟"

"اس کے سوا چارہ نہ تھا۔" اسد نے کہا۔

"کیسے ؟"

"مجھے حکیم کی دوائی سے کافی افاقہ ہو جاتا تھا۔"

"ابھی تم نے کہا تھا کہ کچھ نہ کچھ افاقہ ہوا تھا۔ اب کہہ رہے ہو کہ کافی افاقہ ہو جاتا تھا۔ ان میں سے کون سی بات درست ہے ؟"

"اس بیماری میں جو بھی افاقہ ہو وہی غنیمت ہوتا ہے۔"

"پھر تمہاری بے اطمینانی کا سبب کیا تھا ؟"

"میرا خیال تھا کہ حکیم صاحب کوشش سے میرا علاج نہیں کر رہے۔"

تھانیدار کے منہ سے ایک بھونک کی طرح کی خشک سی آواز نکلی جو اس کی استہزائی ہنسی تھی۔ اُس نے کہنیاں میز پر رکھیں اور آگے جھک کر بیٹھ گیا۔ پنسل کو ہوا میں اُٹھا کر اُس کے سکّے کو گھورتے ہوئے بولا :

"کیا یہ درست ہے کہ جب تم دوبارہ یہاں آئے تو اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد حکیم کے گھر میں تمہارا آنا جانا شروع ہو گیا تھا ؟"

"جی۔"

"درست یا نادرست ؟"

"درست ہے۔"

"جب کہ اور کسی مریض کو کبھی یہ شرف حاصل نہیں ہوا۔"

"پتا نہیں۔"

"ہُنہہ ؟"

"مجھے علم نہیں کہ کبھی کسی اور کو یہ شرف حاصل ہوا یا نہیں۔"

"گھر کے اندر تمہاری اس حیثیت کے حصول میں کس بات کا عمل دخل تھا ؟"

"مجھے علم نہیں۔" اسد نے کہا، "میرا نہیں تھا۔"

"کیا مقتول کے دل میں تمہارے واسطے کوئی خاص جگہ پیدا ہو گئی تھی ؟"

"ہو سکتا ہے۔" اسد نے کہا، "مجھے علم نہیں۔"

"کیا مقتول نے کبھی کسی اور طریقے سے اس کا اظہار کیا تھا ؟"

اسد ایک سیکنڈ کو رُکا، پھر بولا : "ایک بار حکیم نے ذکر کیا تھا کہ اگر میں چاہوں تو اُن سے طب سیکھ سکتا ہوں۔"

"پھر کیا مقتول نے آپ کو طب سکھائی ؟"

"نہیں ۔"

"مگر تمہاری خواہش تھی کہ طب کا علم حاصل کرو ؟"

"نہیں ۔"

"کیا یہ درست ہے کہ اس گھر میں بہ حیثیت ملنے کے فوراً بعد تم نے مقتول کے گھرانے کے ایک فرد کے ساتھ تعلقات استوار کر لیے ؟" اسد نے تیزی سے مُڑ کر چاروں طرف دیکھا۔ پولیس والوں کی توجہ اُس پہ مرکوز تھی، جب کہ بڈھے خلا میں ٹکٹکی لگائے دیکھ رہے تھے۔

"اس کا کیا تعلق —" اسد نے کہنا شروع کیا، مگر تھانیدار نے اُس کی بات کاٹ دی۔

"تعلق ہے یا نہیں، مگر سوال اپنی جگہ پر اہم ہے۔ مہربانی فرما کر جواب دو۔"

کچھ دیر کے بعد اسد نے کہا : "ہاں ۔"

"ان تعلقات کی نوعیت کیا تھی ؟"

"کوئی خاص نہیں تھی ۔"

"کوئی خاص سے تمہارا کیا مطلب ہے ؟"

"سیدھی سادی تھی ۔"

"اسد کریم، دماغ کو صاف کر کے جواب دو۔ میں سوال دہراتا ہوں۔ ان تعلقات کی نوعیت کیا تھی ؟"

"ہم ایک دُوسرے کو پسند کرتے تھے ۔"

"بہت پسند کرتے تھے ؟"

"پسند کرتے تھے ۔" اسد نے دہرایا۔

"یہ تعلقات کس حد تک بڑھ چکے تھے ؟"

"کسی حد تک نہیں بڑھے تھے ۔" اسد نے کہا، "سیدھے سادے تھے ۔"

"سیدھے سادے کا کیا مطلب ہوتا ہے ؟" تھانیدار نے سختی سے کہا۔

اسد خاموشی سے اُس کا مُنہ تکتا رہا۔

"مقتول کا اس بارے میں کیا خیال تھا؟"

"کس بارے میں؟"

تھانیدار نے صبر سے آہستہ آہستہ دہرایا: "مقتول کو آپ کے ان تعلقات کا علم تھا؟"

"پتا نہیں۔ ہوسکتا ہے ہو۔ ہوسکتا ہے نہ ہو۔"

"کیا آپ دونوں میں سے کسی ایک کی طرف سے کبھی یہ کوشش کی گئی کہ یہ بات مقتول کے علم میں لائی جائے؟"

"نہیں۔"

"کیا ایسا کرنے کا آپ ارادہ تھا؟"

"ہاں۔"

"تمہارے خیال میں تمہاری اس حرکت پر مقتول کا رویہ کیا ہوتا؟"

"میرے خیال میں وہ اس پر معترض نہ ہوتا۔"

"گویا آپ کو اُس کی پُشت پناہی حاصل ہو جاتی؟"

"ہاں۔"

تھانیدار کئی لمحوں تک آنکھیں نکالے اُسے دیکھتا رہا، جیسے اپنی ٹکٹکی کے زور سے اسد کو اپنا بیان واپس لینے پر مجبور کر دینا چاہتا ہو۔ پھر بولا:

"مقتول کے بارے میں تمہاری ذاتی رائے کیا تھی؟"

"اُس کے بارے میں میری کوئی ذاتی رائے نہ تھی۔"

"ہوش حواس قائم کر کے جواب دیجیے۔ مقتول کے متعلق تمہاری ذاتی رائے کیا تھی؟"

"یہ ضروری نہیں کہ ہر کسی کے بارے میں میری ذاتی رائے ہو۔" اسد نے کہا۔

"حکیم تمہارے لیے ہر کوئی تھا؟ ناواقف تھا؟ جیسے میں ہوں یا یہ ہے یا یہ ہے؟"

اسد اُس کی درشتی پر چونک کر اُس کا مُنہ تکنے لگا۔

"جواب دو۔"

کچھ دیر کے بعد اس نے جواب دیا: "حکیم ایک عجیب سا آدمی تھا۔"

"کیا مطلب ہے ؟"

"ایسا آدمی تھا جس کے بارے میں کوئی مستقل رائے قائم کرنا دشوار ہوتا ہے۔"

تھانیدار نے پھر پنسل کے ساتھ رجسٹر میں چند الفاظ لکھے۔ جب اُس نے دوبارہ بات شروع کی تو اُس کا لہجہ یک دم نرمی پر آچکا تھا:

"اچھا۔ کل رات کو کیا ہوا ؟"

"کل رات کو ؟"

"ہاں۔ کل رات کو۔"

"میں نے دروازے میں روشنی دیکھی تو ...."

"اونہوں۔" تھانیدار نے نفی میں سر ہلایا، "اتنی جلدی مت کیجیے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ تم اُس وقت وہاں کیا کر رہے تھے ؟"

"مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔"

"سانس کی وجہ سے ؟"

"نہیں۔" اسد نے کہا، "ویسے ہی۔"

"ویسے ہی سے کیا مطلب ؟"

"کسی کسی رات کو مجھے نیند نہیں آتی۔"

"جب نیند نہیں آتی تو کیا کرتے ہو ؟"

"کبھی کبھی ٹہلنے کے لیے نکل جاتا ہوں۔ اکثر اپنے کمرے میں بیٹھا پڑھتا یا لکھتا رہتا ہوں۔"

"خط وغیرہ ؟"

"خط وغیرہ بھی۔"

"اور کیا ؟"

"کبھی کبھی کوئی نظم لکھتا ہوں۔"

"اوہو" تھانیدار کرسی پر آگے سرک کر بیٹھ گیا، "تو آپ شاعر ہیں ؟"

اسد خاموش رہا۔

"آپ کس قسم کی نظمیں لکھتے ہیں ؟"

"کسی خاص قسم کی نہیں۔"

"رومانی نظمیں؟"

"کہہ سکتے ہیں۔"

"اور قومی نظمیں؟"

"نہیں۔"

تھانیدار لمبا سا "اچھا" کر کے بولا، "پھر کیا ہوا؟"

"مَیں ٹہلنے کے لیے نکلا۔"

"آدھی رات کو؟"

"ہاں۔"

"تمہیں علم ہے کہ اِس علاقے میں درندے کا خطرہ ہے؟"

"ہاں۔"

"اور پھر بھی تم آدھی رات کے وقت ٹہلنے کے لیے نکلے؟"

"ہاں۔"

تھانیدار خشک سی ہنسی ہنسا: "دلیر آدمی معلوم ہوتے ہو۔"

"شیر ادھر نہیں آتا۔" اسد نے کہا۔

"ہماری اطلاع تو یہ ہے کہ گزشتہ پر اُس نے کئی بار حملہ کرنے کی کوشش کی ہے۔"

"میرے خیال میں یہ محض مبالغہ آرائی ہے۔"

"تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے؟"

"کس بات کا؟"

"کہ یہ درندہ کبھی حملہ کرنے کی نیت سے گاؤں میں نہیں آیا؟"

"نہیں۔"

"اہا —" تھانیدار نے اپنا پتلا سا ڈنڈا ہوا میں اُٹھایا اور فاتحانہ انداز میں اردگرد کے لوگوں کو دیکھ کر بولا، "تو گویا آپ کے پاس کوئی ثبوت موجود نہیں، اور پھر بھی یہ بات آپ پورے یقین سے کہہ رہے ہیں۔ اب آپ کا ثبوت مہیا کرنے کے بارے میں کیا خیال ہے، جناب؟"

اسد لاجواب ہو کر خاموش ہو رہا۔

"ڈھانچے کے بارے میں کیا خیال ہے؟" تھانیدار نے پوچھا۔

"کوئی پرانا ڈھانچا ہے۔"

"ہمارے پاس لیبارٹری کی رپورٹ موجود ہے کہ ڈھانچا چھ ہفتے سے لے کر چھ مہینے تک پرانا ہو سکتا ہے۔"

"ہو سکتا ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"کسی اور وجہ سے اس کی موت واقع ہو سکتی ہے۔"

"تمہارا اس بات پہ یقین ہے کہ یہ ڈھانچا شیر کا شکار نہیں بنا؟"

"ہاں۔"

"اور تمہارے خیال کے اندر یہ بات بالکل سچ ہے؟"

"میرے خیال میں سچ ہے۔ دُوسرے لوگوں کے خیال میں نہیں۔"

"مگر تمہیں اپنی بات پر شک کا کوئی گمان نہیں۔"

"نہیں۔"

تھانیدار کی آنکھوں میں اب اصل اچنبھے کے آثار نمایاں ہونے لگے تھے۔

"اچھا۔ آگے چلو۔" تھانیدار نے کہا۔

"مَیں واپس آ رہا تھا....."

"کہاں سے؟"

"ابھی بتا چکا ہوں۔ ٹہلنے نکلا تھا۔"

"مَیں پہلے بھی کہہ چکا ہوں مسٹر اسد کریم۔ عقل کو قائم رکھ کر جواب دیجیے۔ کہاں سے واپس آ رہے تھے؟"

"شرقی میدان سے۔"

"شرقی میدان تک ٹہلتے ہوئے چلے گئے تھے؟"

"ہاں۔"

"گلیوں میں سے ہو کر گئے تھے؟"

"ہاں۔"

"جاتے یا آتے ہوئے کسی شخص سے تمہاری مڈھ بھیڑ ہوئی یا کوئی نظر آیا؟"

"نہیں۔"

"کوئی سایہ بھی نہیں؟"

"سایہ بھی نہیں۔"

"پھر؟"

"میں احاطے کی اندرونی دیوار کے ساتھ ساتھ چلا آ رہا تھا کہ میری نظر مطب کے دروازے پر پڑی۔ دروازہ کھلا تھا۔ اندر مدھم سی روشنی ہو رہی تھی۔ میں ٹھٹکا۔ حکیم صاحب کبھی رات کے وقت مطب میں نہیں آئے، جب تک کہ انہیں خاص طور پر بلایا نہ جائے۔ مگر اس صورت میں احاطے کے اندر مریض کے علاوہ کئی اور لوگ بھی موجود ہوتے ہیں، جب کہ اس وقت احاطہ خالی تھا۔ میں دیوار پھاند کر بھاگتا ہوا مطب تک پہنچا۔ جب اندر داخل ہوا تو .... لاش اوندھے منہ پڑی تھی۔"

"تم نے کسی اور شخص کو اس وقت وہاں دیکھا؟"

"نہیں۔"

"کوئی آواز سنی؟"

"نہیں۔"

"قطعی طور پر نہیں؟"

"قطعی نہیں۔"

"تو گویا، اسد کریم،" تھانیدار بولا، "تم تسلیم کرتے ہو اور تم اس بات کی تصدیق کرتے ہو کہ تم نے ابھی جو واردات بیان کی ہے یہ درست ہے اور فی الواقع ایسا ہی ہوا اور تم اس وقت مکمل طور پر اپنے ہوش و حواس میں ہو۔"

"ہاں۔"

"کیا وقوعے کے بعد تم اپنے کمرے میں جا کر سو گئے تھے؟"

"نہیں۔ میں رات کو کرسی پر بیٹھا اونگھتا رہا۔"

"تو گویا تم نے کل رات کو شرقی میدان تک جانے اور واپس آنے اور مطب میں داخل ہونے اور لاش

کو دریافت کرنے کے بعد تک کے عرصے میں اپنے اور مقتول کی لاش کے علاوہ کسی تیسرے شخص کو نہ دیکھا نہ کوئی آواز سُنی۔ درست ہے؟"

"ہاں۔"

"جب تم نے پہلی مرتبہ لاش کو دیکھا تو تمہارے خیال میں مقتول کو مرے ہوئے کتنا عرصہ گزر چکا تھا؟"

"مجھے کوئی اندازہ نہیں۔" اسد نے کہا، "مگر لاش سرد ہو چکی تھی۔"

"اس کا تمہیں کیسے اندازہ ہُوا؟"

"مَیں نے لاش کو چھُو کر دیکھا تھا۔"

"کہاں پر؟"

"چہرے پر۔"

"کیوں؟"

"مجھے یقین نہیں آرہا تھا کہ حکیم صاحب مر چکے ہیں۔"

"جس وقت تم ٹہلنے کے لیے اپنے کمرے سے نکلے، اور جب واپسی پر مطب میں پہنچے، اس کے دوران تقریباً کتنا عرصہ لگ گیا ہوگا؟"

"کوئی ایک گھنٹہ۔"

"تاہم شرقی میدان کی طرف جاتے وقت مطب میں کوئی نہ تھا اور دروازہ بند تھا۔"

"جاتے وقت مَیں باہر کی دیوار کے ساتھ ساتھ گیا تھا۔ مطب کی جانب میری پُشت تھی۔ مَیں نے مُڑ کر نہیں دیکھا۔"

تھانیدار کُرسی سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ "میرے ساتھ آؤ۔" وہ بولا اور باہر کی طرف چل پڑا۔ اسد اور ایک سپاہی اُس کے پیچھے ہو لیے، باقی سب لوگ صحن میں بیٹھے رہے۔ احاطے میں چارپائیاں لوگوں سے بھری تھیں اور گاؤں کے سب لوگ دوبارہ احاطے کے اردگرد جمع ہوئے تھے۔ چارپائیوں پر بیٹھے ہُوئے لوگ تھانیدار کو دیکھ کر اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ مجمعے پر خاموشی چھا گئی۔ مطب کے کمرے میں داخل ہو کر تھانیدار نے اپنے پتلے سے ڈنڈے کے ساتھ چاروں طرف اشارہ کیا:

"کمرے میں اچھی طرح دیکھ کر بتاؤ کہ یہاں پر ہر چیز وہی ہے جو تم نے کل رات کو دیکھی تھی؟"

"ہاں۔"

"صرف ہاں یا نہ میں جواب کافی نہیں۔ کھُل کر جواب دو۔"

"یہاں پر ہر چیز وہی ہے جو میں نے کل رات کو دیکھی تھی۔"

"اور اپنی جگہ پر موجود ہیں؟"

"کم و بیش۔" اسد نے کہا، "کچھ اِدھر اُدھر کی ہوئی ہیں۔"

"یعنی ہِلی ہوئی ہیں؟"

"ہاں۔"

"مگر کوئی چیز یہاں سے لے جائی یا باہر سے لائی تو نہیں گئی۔"

"نہیں۔"

"سمیت مُردے؟"

پیلے اور بھورے رنگ کی لاش نے اس وقت اسد کے اندر صرف ہلکے سے جذبات پیدا کیے۔

"مُردے سمیت۔" وہ بولا۔

"سوا ایک کھُرے کے۔" تھانیدار نے احاطے میں کھڑے ہوئے بڈھوں کی جانب مُنہ کر کے اونچی آواز میں گالی دی، "تمہاری ڈاڑھیاں کھینچ کر چوتڑوں میں دے دوں تو تمہیں پتا چلے، گانڈوؤ۔ کھُرے پر ناچ ناچ کر اس کا نشان تک ضائع کر دیا ہے تمہارے ریوڑوں نے ——" وہ اسد کی طرف مُڑا، "چلو۔"

احاطے سے نکلتے نکلتے اسد نے اُسے بتایا کہ کس طرح وہ بیہوش لڑکی کو اُٹھا کر گھر لے گیا اور اُسے گرم گرم دُودھ پلا کر لٹانے کے بعد صُبح ہونے تک اُس کے پاس بیٹھا رہا تھا۔

"تمہیں کسی پہ شُبہ ہے؟" تھانیدار نے پُوچھا۔

"نہیں۔"

"سوچ کر جواب دو۔ تمہیں کسی پر شُبہ ہے؟"

"مجھے کسی پر شُبہ نہیں۔"

"کسی پر بھی نہیں؟"

"نہیں۔"

"اِس قتل کے پیچھے کس چیز کا ہاتھ ہو سکتا ہے؟"

"میرے ذہن میں کوئی ایسی بات نہیں آتی۔" اسد نے کہا، "دن کے وقت بندوق کا قصّہ ہُوا

تھا۔"

"ہاں" تھانیدار نے سوچتے ہوئے سر ہلایا۔" ذہن پر زور دے کر سوچو۔ تمہارا مقتول سے قریبی تعلق تھا۔ کوئی سابق مریض۔ کوئی قرض خواہ۔ کوئی ایسا ویسا آدمی جس پہ شک کی وجہ نکل سکتی ہو؟"

"اوہنوں" اسد نے نفی میں سر ہلایا۔

چلتے چلتے تھانیدار اُس مقام پہ رُک گیا جہاں سے اسد نے پہلی بار مطب کے اندر کی روشنی کو دیکھا تھا۔

"وہ شرقی میدان ہے" تھانیدار اپنے ڈنڈے سے اشارہ کر کے بولا" اور وہ تمہارا کمرہ۔ ٹھیک؟"

"ہاں"

"پھر ادھر آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"ہنہہ؟"

"شرقی میدان سے واپسی پر تم سیدھے باہر باہر سے اپنے کمرے کو جا سکتے تھے" چند لمحوں تک اسد خالی خالی نظروں سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ تھانیدار پھر بولا" اس طرف سے چکر کاٹ کر آنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"کوئی خاص وجہ نہیں تھی" اسد نے کہا۔

"مَیں خاص وجہ نہیں پُوچھ رہا۔ وجہ پُوچھ رہا ہُوں"

"مَیں زیادہ سے زیادہ دیر تک تازہ ہوا میں رہنا چاہتا تھا۔ اِس لیے لمبے رستے سے آیا۔"

تھانیدار نے طنزیہ لہجے میں لمبی سی آواز نکالی: "اچھا ـــــ!"

گھر کے دروازے پر پہنچ کر اُس نے گھر کو اندر سے دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔

"اِس گھر میں کون کون رہتا ہے؟" اُس نے پُوچھا۔

"حکیم" اسد نے کہنا شروع کیا،" میرا مطلب ہے اُن کی بیٹی، اور ایک بوڑھی عورت جو گھر کا کام وغیرہ کرتی ہے۔"

"یہ کام کاج کرنے والی عورت کا کمرہ ہے؟" تھانیدار نے دروازے پر کھڑے کھڑے اندر جھانک کر دیکھا۔ کمرے میں بہت سی بوریاں ایک دُوسری کے اُوپر رکھی تھیں۔ ایک طرف دیوار کے ساتھ جو تھوڑی سی جگہ بچ رہی تھی وہاں پہ زمین پر خادمہ کا بستر بچھا تھا۔" ان بوریوں میں کیا ہے؟"

"جی جنس ہے" تھانیدار کے عقب سے عورت نے جواب دیا۔

یاسمین کے کمرے پہ تھانیدار نے سرسری سی نظر ڈالی اور باہر نکل آیا۔ حکیم کے کمرے کا دروازہ بھڑا ہوا تھا۔

"اس کمرے میں کون ہے؟"

"حکیم صاحب کا کمرہ ہے۔" اسد نے کہا، "اُن کی بیٹی یہاں ہے۔"

"اچھا۔ اس کا اب کیا حال ہے؟"

"اچھا نہیں۔"

"ذرا پتا کرکے بتاؤ۔ بیان دینے کے قابل ہے؟"

"میرے خیال میں بیان دینے کے قابل نہیں۔"

"ہوں۔" تھانیدار سوچتے ہوئے بولا، "چلو خیر۔ اُس کا بیان کل ہو جائے گا۔" وہ چل کر ہیڈ کانسٹیبل کے پاس گیا اور اُس سے کوئی بات کرنے لگا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے مُنّی کا صندوقچہ بند کرکے اُسے مقفّل کر دیا۔ تھانیدار اسد کی طرف مُڑا، "باقی بیان سٹیشن پر چل کر مکمّل ہوگا۔ تمہیں ہمارے ساتھ سٹیشن تک چلنا پڑے گا۔"

"مجھے؟"

"ہاں۔"

اسد ہکّا بکّا رہ گیا۔ "میرا بیان ختم نہیں ہوا؟"

"اونہوں۔" تھانیدار نے ہلکی سی معنی خیز مُسکراہٹ کے ساتھ نفی میں سر ہلایا۔

"مگر میں نے اپنا بیان ختم کر دیا ہے۔"

"تم ہمارے اکلوتے گواہ ہو۔" تھانیدار بولا، "ابھی بہت سی باتیں مزید دریافت کرنی ہیں۔"

"مگر میں نہیں جا سکتا۔"

"کیوں؟"

"یہاں گھر میں اور کوئی نہیں۔"

"اس کی فکر کرنے کی تمہیں ضرورت نہیں۔ ہماری یہاں پر مُستقل نگہداشت رہے گی۔"

"مگر ——"

حکیم کے کمرے کا دروازہ کھُلا اور یاسمین آہستہ آہستہ چلتی ہوئی صحن میں اسد کے پاس آکھڑی ہوئی۔ تینوں پولیس والے آنکھیں پھاڑ کر اُسے دیکھنے لگے۔

"آپ انہیں کیوں اپنے ساتھ لے جا رہے ہیں؟" یاسمین نے کمزور مگر متوازن آواز میں پوچھا۔

"آپ حکیم صاحب کی بیٹی ہیں۔"

"جی ہاں۔"

"مجھے اِس حادثے کا دلی رنج ہے۔ آپ تشریف رکھیے۔" تھانیدار نے کرسی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ یاسمین وہیں کھڑی خالی خالی سوالیہ نظروں سے تھانیدار کو دیکھتی رہی۔

"مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اِس افسوس ناک حادثے کی پوری پوری تحقیقات کی جائے گی۔ اسد کریم موقعے کا گواہ ہے۔"

"اس نے اپنا بیان دے دیا ہے۔"

"کچھ باتیں ابھی تفصیل طلب ہیں۔ آپ کا بیان بھی ضروری ہے، مگر کوئی جلدی نہیں۔ کل تک آپ کی طبیعت سنبھل جائے گی تو لے لیا جائے گا۔"

"اسد نے جو کچھ دیکھا بتا دیا ہے۔ اِس کے علاوہ اسے کسی بات کا علم نہیں۔ مَیں اس کے ساتھ تھی۔"

تھانیدار کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ "کب؟"

"کل رات کو۔"

"کہاں؟"

"ہم ٹہلتے ہوئے شرقی میدان تک گئے تھے۔"

"آپ دونوں ساتھ تھے؟" پھر جواب کا انتظار کیے بغیر وہ اسد سے مخاطب ہوا، "تم نے اپنے بیان میں اس کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ کیوں؟"

اسد نے بوکھلاہٹ میں یاسمین سے تھانیدار، اور تھانیدار سے یاسمین کو دیکھا۔ "مَیں یاسمین کو اس میں لانا نہیں چاہتا تھا۔"

"لانا نہیں چاہتے تھے؟ ہاہ۔"

"میرا خیال تھا اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"ہاہ۔ فرق نہیں پڑتا۔ تم جانتے ہو کہ تم نے حقیقت کا جزوی طور پر اخفا کیا ہے؟ یہ قتل کی تفتیش ہے، کوئی چوری چکاری کا معاملہ نہیں۔"

"مَیں بیان دے سکتی ہوں۔" یاسمین کرسی پر بیٹھ گئی۔ پھر وہ بولنے لگی، "جب مَیں گھر سے گئی تو ابا اپنے

کمرے میں تھے۔ واپسی پر اسد نے مطب میں روشنی دیکھی۔ اُس کے بعد جو اُس نے دیکھا وہ آپ کو بتا دیا ہے۔ اس کے علاوہ اسے کسی بات کا علم نہیں۔"

تھانیدار کئی لمحوں تک آنکھیں سکیڑے باورچی خانے کے دروازے میں دیکھتا رہا، یُوں جیسے اُسے تفتیش کے لیے کوئی نیا سُراغ ہاتھ لگ گیا ہو۔ پھر اچانک اُس کا چہرہ کھل اُٹھا اور اُس نے یاسمین سے سوال کیا:

"شرقی میدان تک جاتے ہُوئے یا وہاں سے واپس آتے ہُوئے کسی شخص سے آپ کی مُٹھ بھیڑ ہوئی یا کوئی نظر آیا؟"

"نہیں۔" یاسمین نے جواب دیا۔

"کوئی سایہ بھی نہیں؟"

"سایہ بھی نہیں۔"

"کوئی آواز سُنی؟"

"نہیں۔"

"قطعی نہیں؟"

"قطعی نہیں۔"

"تو گویا آپ نے کل رات کو شرقی میدان تک جانے اور واپس آنے تک کے عرصے میں اپنے اور اسد کریم اور مقتول کی نعش کے علاوہ کسی چوتھے آدمی کو نہ دیکھا نہ کوئی آواز سُنی۔ درست؟"

"ہاں۔"

"آپ کو کسی پر شبہ ہے؟"

یاسمین خاموش رہی۔

"دیکھیے،" تھانیدار ایک پاؤں اُٹھا کر ڈنڈے سے جُوتے کا تلا بجاتے ہُوئے بولا، "آپ کو مطلع کرنا میرا فرض ہے کہ آپ اِس وقت پولیس کے تفتیشی افسران کی موجودگی میں ہیں اور بلا خوف و خطر اپنے دل کی بات کہہ سکتی ہیں۔"

"اسی گاؤں سے کوئی ہوگا۔" یاسمین نے کہا۔

"ہاں۔" تھانیدار نے کہا۔ "حالات کا مجھے علم ہے۔ مَیں اس وقت آپ کو مزید زحمت نہیں دُوں گا۔ وقت آنے پر آپ کا مکمل بیان درج کر لیا جائے گا۔ البتہ ایک آخری سوال پُوچھنا چاہتا ہُوں۔ آپ کے

پاس اس بات کا کوئی ثبوت ہے کہ کل رات، واردات کے لگ بھگ، آپ اسد کریم کے ہمراہ تھیں؟"

یاسمین نے ایک لحظے کو سوالیہ نظروں سے اسد کو دیکھا، پھر بولی: "نہیں۔"

"ہوں۔" تھانیدار اُوپر کا ہونٹ پھیلا کر اپنی مونچھوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"بارش ہونے لگی تھی۔ بجلی چمک رہی تھی، بڑے زور سے۔" یاسمین نے یوں بات کی جیسے ان باتوں کو گواہی کے طور پر پیش کر رہی ہو۔

"آپ دونوں اُس وقت کہاں تھے؟"

"سفید پتھر کے نیچے۔ بارش شروع ہو گئی تھی....."

پھر ایسے معلوم ہوا جیسے تھانیدار نے یکدم اس تفتیش میں اپنی تمام تر دلچسپی کھو دی ہو۔ یاسمین کی بات کے دوران وہ مُڑ کر سپاہی سے کوئی بات کرنے لگا۔

"بہرحال،" پھر وہ بولا، "مَیں ایک بار پھر آپ کو یقین دلاتا ہُوں کہ اِس جرم کی مکمل تحقیقات کی جائے گی اور مجرم کو کیفرِ کردار تک پہنچایا جائے گا۔ تمہارے تعاون سے ہمارا کام آسان ہو سکتا ہے۔ اسد کریم کو بہرحال اپنے ہمراہ لے جانا ضروری ہے۔ یہ اکلوتا عینی شاہد ہے۔"

"مگر اُس نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔" یاسمین نے کہا، "مَیں اس کے ساتھ تھی۔"

"جیسا کہ مَیں پہلے کہہ چکا ہُوں، اس کی واحد گواہی ہے۔ اِس کیس کے لیے اشد ضروری ہے کہ اس کا مفصل بیان جلد از جلد مکمل کر لیا جاوے۔" تھانیدار دروازے کی طرف چل پڑا۔ چاروں دُوسرے آدمی اُس کے پیچھے پیچھے دروازے سے باہر نکل گئے۔ صحن میں یاسمین اور اسد کھڑے رہ گئے۔ بوڑھی عورت چارپائی پر بیٹھ کر پھر رونے لگی۔

یاسمین نے دونوں ہاتھوں سے اسد کا بازو پکڑ لیا اور خوفزدہ آواز میں بولی:

"مت جاؤ۔"

"کوئی بات نہیں۔" اسد نے بازو چھڑا کر اُس کے کندھوں کے گرد ڈال دیا، "شام تک واپس آ جاؤں گا۔"

"مت جاؤ، اسدی۔" وہ بے دم لہجے میں بولی، "میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

"گھبرانے کی کوئی بات نہیں، یاس۔" اسد نے کہا، "مَیں انکار کیسے کر سکتا ہُوں؟"

نچلے ہونٹ کو دانتوں میں دبائے، پھیلی ہوئی آنکھوں والا گنگ چہرہ اُس نے کئی بار نفی میں ہلایا، پھر سر اسد کے سینے پر رکھ کر خشک آنکھوں سے روتی ہوئی بولی: "نہیں مت جاؤ، اسدی۔"

اسد احاطے میں داخل ہو رہا تھا جب اُس نے اُس مجمعے پر نگاہ ڈالی جو تین طرف سے احاطے کی دیوار کو گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔ دُور دُور تک سر ہی سر نظر آتے تھے۔ میر حسن اُن میں موجود نہ تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ گمشدہ کی ساری آبادی، مرد عورتیں بچے، وہاں پر آ جمع ہوئی تھی، اور ان سب کی آنکھیں اُس پر لگی تھیں۔ اسد نے محسوس کیا کہ جیسے وہ ایک بہت بڑی بندوق کی مار پر چل رہا ہے، اور وہ مہیب نالی اُسے شِست پر لیے اُس کے ساتھ ساتھ حرکت کرتی جا رہی ہے۔ اُن سینکڑوں آنکھوں کی مجموعی نظر تلے اُس کے پاؤں من من بھر کے ہو گئے اور وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا تھانیدار کے پاس جا کھڑا ہوا۔ چشم زدن میں، ایک ان کہے فرمان کے تحت، وہ ایک مُلزم بن چکا تھا۔ لاش کو ایک چارپائی پر ڈال کر اُسے سفید چادر سے ڈھک دیا گیا تھا۔ مطب مقفل پڑا تھا۔ سُورج غروب ہونے میں کوئی دو گھنٹے تھے۔ گاؤں والوں کی طرف سے دیے گئے چار مزدوروں نے چارپائی کندھے پر اُٹھا لی، اور وہ وہاں سے روانہ ہوئے۔ مجمعے نے شرقی میدان تک اُن کا تعاقب کیا۔ چھ بڈھے جنگل میں کچھ دُور تک اُن کے ہمراہ گئے، جہاں سے تھانیدار نے اُنہیں واپس کر دیا۔ پھر اسد، سر جھکائے چلتا ہوا، اُن تین آدمیوں کے ساتھ راستے کی ڈھلان پر اُتر کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

(۵)

فرار کی خواہش کے پیچھے ایک خیال ہردم اسد کے دِل میں گشت کرتا تھا: یہ شخص، گمشدہ والا حکیم عمر، آخر چاہتا کیا تھا۔ اُس عجیب و غریب شخص کی زندگی کا راز کیا تھا؟ اب یہ راز جاننے کا وقت ہمیشہ کے لیے ہاتھ سے نکل چکا تھا۔

گر اُمید کی ایک کرن ابھی باقی تھی کہ ایک نہ ایک دن کہیں نہ کہیں پر وہ میر حسن کو جا لے گا، اور اُس سے حقیقت معلوم کرے گا، اس معاملے کی حقیقت کہ یہ شخص آدھی رات کو وہاں بندوق ہاتھ میں لیے کیا کر رہا تھا، میر حسن وہاں پہ کیسے پہنچا، اور اصل قاتل کون تھا، اُس کا مقصد کیا تھا۔ شاید میر حسن کو پتا ہو۔ اُس وقت اگر، اسد نے سوچا، میں اپنے ہوش وحواس کو قابو میں رکھتا، اور آرام سے لڑکے کی بات سُنتا، تو آج اس مصیبت خانے میں کیوں ہوتا — اب دیکھو !

حوالات کی آٹھ فٹ لمبی اور چھ فٹ چوڑی کوٹھڑی کا لوہے کی سلاخوں والا دروازہ اور پتھر کا فرش تھا جس پر دو بھورے رنگ کے پتلے کمبل، ایک بچھانے اور ایک اوڑھنے کے لیے، دیوار کے ساتھ رکھے تھے۔

ایک بڑا سا بھاری ہموار پتھر آدھا زمین میں گڑا ہوا نجانے کس مقصد کے لیے وہاں موجود تھا جس کو اسد تکیے کے، اور کبھی چوکی کے طور پر استعمال کرتا تھا۔ ایک کونے میں رفع حاجت کے لیے ٹین کا گندا سا برتن پڑا تھا۔ اِس کوٹھڑی میں اسد دو راتیں اور ایک دن بسر کر چکا تھا جس کے دوران صرف تین مرتبہ اُسے تھانیدار کے روبرو لے جایا گیا تھا۔

ہاں، آرام سے اگر وہ، اسد نے سوچا، اُس رات کو میر حسن کی بات سُنتا تو آج یہاں نہ ہوتا۔ مگر خیر، اُمید کی ایک کرن ابھی باقی تھی۔ (ایک بار پھر وہ اپنے پُرانے مشغلے میں لگا تھا —— نت نئی، دور از کار اُمیدوں کی کرنوں کو دریافت کرنے، اور اُن پر اطمینان سے وقت گزارنے کے شغلے میں)، گُنبد سے پولیس سٹیشن تک کے سفر میں حوالات کا جو ذہنی نقشہ اُس نے بنایا تھا وہ تو کم و بیش ٹھیک نِکلا۔ اُسے حیرانی اُس وقت ہوئی جب اُس کو بُوٹ اُتارنے کے لیے کہا گیا۔ جُوتے اُتارنے کی کیا تُک تھی؟

"کیوں؟" اُس نے سوال کیا، جس کے جواب میں سپاہی نے درشتی سے محض اپنا حکم دہرایا، "جُوتے اتارو۔" چنانچہ وہ چُپکے سے جُوتا اُتار کر کوٹھڑی میں داخل ہُوا۔

کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کھڑے رہنے کے بعد وہ جا کر پتھر پر بیٹھ گیا۔ پُوچھنے کا یہاں کیا فائدہ؟ اُس نے بددلی سے سوچا۔ اپنے ننگے پاؤں کو دیکھ کر اُسے خیال آیا کہ جیسے وہ کسی پاک جگہ پر ہے۔ ننگی دیواروں اور ننگے پتھریلے فرش والی یہ جگہ کسی عبادت گاہ سے ہی مُشابہ تھی، جیسے کوئی مسجد ہو۔ ایک عرصہ ہوا، اُس نے چونک کر سوچا، وہ مسجد نہیں گیا تھا۔ آٹھ؟ نو سال؟ اس عرصے میں اُس نے کسی قسم کی عبادت نہیں کی تھی کیونکہ خیال ہی نہیں آیا تھا۔ ایک بار پھر (متعجب ہو کر) اُس نے سوچا کہ اتنا عرصہ عبادت نہ کرنے کے خیال پر اُس کے دل میں کوئی تاسف پیدا نہیں ہوا! اور ایک وقت تھا کہ وہ باقاعدگی کے ساتھ خدا کے حضور سجدہ کیا کرتا تھا۔ اُس نے چھوڑ کیوں دیا تھا؟ ابھی وہ چھوٹا ہی تھا کہ اُس نے محلے کی مسجد میں پانچ وقت نماز کے لیے جانا شروع کر دیا تھا۔ وہ اپنے باپ کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ اُس کے باپ نے اُسے نصیحت کی تھی کہ اسے حتی الوسع باقاعدگی سے نماز پڑھنی چاہیے۔ اس کے باپ نے نماز کی نیکیاں بھی بتائی تھیں: دل اور دماغ کی پاکیزگی۔ اور اس کے فوائد: ثوابِ دارین، اعتماد، ضبط، تحمل۔ اُس وقت اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ ان الفاظ کا مطلب کیا ہے۔ مگر ایک بات تھی جس کا براہِ راست تعلق نماز سے تھا۔ یہ وہ احساس تھا جو اُس کے اندر وضو کر لینے کے بعد پیدا ہوتا —— ایک ایسی کیفیت جو وضو کر لینے اور اِسے زیادہ سے زیادہ دیر تک قائم رکھنے سے آتی تھی۔ وضو کرنے کے بعد وہ نماز پڑھتا، اور پھر وہ مسجد سے باہر آتا تو اِس کیفیت میں ہوتا۔ وہ اِس کیفیت کو بھلا کیسے بیان کر سکتا تھا؟ ہاں، یہ

کیفیت اُس کے اندر ہی نہیں بلکہ باہر بھی اُس کے بدن کے اوپر طاری ہوتی تھی، ایک ان دیکھی مضبوط جلد کی مانند جس میں کوئی جوڑ نہ لگا ہو۔ یہ جلد اُسے ایک اکائی کی صورت میں باندھے رہتی، یک جا و توی رکھتی۔ اُسے احتیاط لازم تھی کہ وہ گندی زبان استعمال نہ کرے، پیشاب وغیرہ نہ کرے اور اگر کرے تو چھینٹے اُس کے بدن پہ نہ پڑیں، ہوا خارج نہ کرے اور پیٹھ پیچھے کسی کی بُرائی نہ کرے۔ اگر ان میں سے کوئی سی بات بھی کر بیٹھتا تو سیدھا تلکے پہ جا کر دوبارہ وضو کرتا خواہ نماز کا وقت ہوتا یا نہ ہوتا۔ جماعت کے کمرے میں بیٹھے بیٹھے اگر اُس کا وضو ٹوٹ جاتا تو اُس کے دل میں زیاں کا احساس رہتا۔ ایسی دل کش کیفیت سے بھی وہ لڑکپن کی عمر میں اور نہ اُس کے بعد کبھی آشنا ہوا تھا۔ ثابت و سالم ہونے کی یہ کیفیت! یہ بڑی پُرشکوہ، بڑی ہی عزیز اور کنواری کیفیت تھی جس پہ زمانے کا ایک دھبا تک نہ تھا۔ نامعلوم طور پر، زندگی کے کسی مرحلے پہ وہ کیفیت کہیں کھو گئی۔ اُسے پتا بھی نہ چلا کہ کب، اور کیسے۔ ایک مدت تک اُس کے بعد وہ برابر مسجد میں جاتا اور رٹی ہوئی نماز ادا کرتا رہا اور جب جا کر اُس کو اِس بات کی خبر ہوئی۔ تب اُس وقت اُس کی باقاعدگی میں فرق آنے لگا۔ آہستہ آہستہ اُس کا مسجد جانا بالکل چھوٹ گیا۔ اُس کی عمر میں یہ شاید پہلی شے تھی جو اُس کے ہاتھ آئی تھی اور ضایع ہو گئی تھی۔ اس کے بعد ایک مدت کے لیے اُس کا دل اکھڑ گیا، کوئی شے اُس کے دل کو نہ لگی، کسی شے کی اُسے پروا نہ رہی، جیسے کہ اب کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ کوٹھڑی کی ایک دیوار پر ہواداری کی خاطر ایک اُونچا سا روشن دان نکالا گیا تھا جس کی سلاخوں میں آسمان کا ایک چوکھٹا مقید تھا۔ وہ اب نماز پڑھے؟ اسد نے دوبارہ ننگے پاؤں کو دیکھ کر سوچا۔ دُعا مانگنے کا اگر کوئی وقت تھا تو یہی تھا —— جوتے اُتروانے کی کیا تک ہے بھلا۔ کچھ بتاتے نہیں، اندھوں اور بہروں کی طرح حکم دیے جاتے ہیں، جیسے رٹی ہوئی زندگی گزار رہے ہوں۔

انتہائی تھکاوٹ کی وجہ سے ایک ظاہری جمود اُس پہ طاری تھا، مگر نیچے نیچے غیض و غضب کی ایک لہر اُس کے اندر کودتی رہی۔

آدمی تو شاید ٹھیک ٹھاک تھا۔ ولی جیسے شخص نے بھی کہا تھا کہ مَیں اِس پہ یقین کرتا ہوں، اس نے کبھی جھوٹ بات نہیں کی۔ بات ٹھیک ہی تھی۔ اُس نے کبھی یہ دعوے نہیں کیا تھا کہ وہ اپنے علاج سے مکمل طور پہ تندرست کر دے گا۔ یہی کہتا تھا کہ ٹھیک ہو جاؤ گے، صبر کرو، صبر سے علاج کرو تو آرام آ جائے گا۔ آرام تو آتا رہتا تھا، جسم کی گرانی رفع ہوتی رہتی تھی۔ مگر صبر کون کرتا تھا؟ بے صبری میں وہ سارا وقت ضایع کر دیتے تھے جو صبر کرنے کے کام آتا۔ مگر وقت بہرحال وقت تھا، اِس کی خاصیت زیاں کی خاصیت تھی، جیسے ایک سانس جو کھینچا جاتا ہے، ہر چند کہ ابھی بدن کے اندر مقید ہوتا ہے، بدن کے اختیار سے نکل چکا ہوتا ہے، خارج کرنے

کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نہیں ہوتا۔ سائنس کی خاصیت کا وہ ماہر ہو چلا تھا۔ بندوق کو نکال کر ہاتھ میں پکڑے آدھی رات کو، اسد نے سوچا، وہ کیا کر رہا تھا؟ اگر گھر لے جانے کے لیے آیا ہوتا تو ڈبے میں بند کی بند اٹھا کر لے جا سکتا تھا۔ میر حسن اگر بندوق چرانے کی غرض سے آیا تھا تو اول اُسے پتا ہی کیسے چلا کہ بندوق مطب کی الماری میں رکھی ہے ؟ سربستہ راز ! میر حسن کے بارے میں سوچتے سوچتے وہ سو گیا۔ رات پڑے ایک سپاہی اُس کا کھانا لے کر آیا۔ سپاہی نے اُسے اٹھا کر دیوار کے ساتھ بٹھایا، بالوں سے پکڑ کر اس کے منہ پر چپت لگائے، اسد نے کئی بار آنکھیں کھولیں، مگر دو دن اور ایک رات کی بے خوابی نے اُسے بیہوش کر رکھا تھا۔ آخر تھک کر سپاہی نے اُس کی رانوں پہ ایک ٹھڈا لگایا اور گالیاں دیتا ہوا نکل گیا۔

اسد جب سو کر اٹھا تو دن کی روشنی دروازے میں سے اندر آ رہی تھی اور پیتلے رنگ کا شوربہ مٹی کے برتن میں اُس کے پاس رکھا سرد ہو چکا تھا۔ جوار کی آدھی روٹی، جو شاید برتن کے کنارے پر رکھی گئی تھی، زمین پہ گری پڑی تھی۔ اسد کو گہرے زرد رنگ کا تھوڑا سا پیشاب آیا۔ سخت قبض کی حالت میں وہ کچھ دیر تک ٹین کے برتن پر بیٹھا جوار کی روٹی کو گھورتا رہا، پھر اُٹھ کھڑا ہوا۔ اُسے بھوک محسوس ہو رہی تھی۔ جب دو گھنٹے تک کوئی اُسے پوچھنے نہ آیا تو اُس نے روٹی کے ٹکڑے کو اٹھا کر کپڑوں سے پونچھا اور بے مزہ شوربے کے ساتھ چبا چبا کر کھانے لگا۔

دوپہر سے ذرا پہلے اُسے تھانیدار (کلیم اللہ خان) کے سامنے پیش کیا گیا۔ تھانیدار نے چند مختصر سے سوالات پوچھ کر اُن کے جوابات ایک ردی سے سادہ کاغذ پہ درج کیے۔ پھر تھانیدار نے اُس کی عمر کے بارے میں استفسار کیا۔ "اُنیس سال گیارہ مہینے"، اسد نے بتایا۔ اس کے بعد اسد کو واپس حوالات لے جا کر بند کر دیا گیا۔ دو گھنٹے کے بعد دوبارہ پیشی ہوئی۔ اس بار جیسے ہی اسد تھانے کے دفتر میں داخل ہوا اُس نے محسوس کیا کہ ماحول یکسر بدل چکا ہے۔ ہیڈ کانسٹیبل کی ٹکٹکی، تین سپاہیوں کے کھڑے ہونے کا بیباک انداز، اور تھانیدار کے چہرے کی خشونت۔ چھوٹتے ہی تھانیدار نے اُس سے سوال کیا:

"اقبالِ جرم کر رہے ہو؟"

"کیسا اقبالِ جرم ؟"

"کہ تو نے اپنی ماں کے ساتھ زنا کیا ہے، اور کیسا۔"

اسد باری باری ہر ایک کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ تھانیدار کرسی سے اُٹھا اور میز کے گرد سے نکل کر اُس کے سامنے آ رکا۔ وہ اپنے دونوں بازو چھاتی پر باندھ کر ایک چوتڑ میز پر رکھ کر بیٹھ گیا۔

"بھتھ بھتھ بھتھ"۔ اُس نے مصنوعی تاسف سے سر ہلایا، "تم اتنے معصوم نہیں جتنے دکھائی دیتے

ہو۔"

"میں نے کیا کیا ہے؟" اسد نے پوچھا۔

"اس بڈھے کو قتل کیا ہے۔"

"نہیں۔"

تھانیدار نے کس کے دو تھپڑ اس کے منہ پہ مارے۔ اسد نے خون کا نمکین مزا دانتوں میں محسوس کر کے، منہ ہلائے بغیر زبان دانتوں پہ پھیری۔

"بند کر دو اسے۔" تھانیدار نے ایک سپاہی کو حکم دیا۔ "اس کا مزاج ابھی درست نہیں ہوا۔"

کوٹھڑی میں پتھر پہ اکڑوں بیٹھے بیٹھے، کھٹے مسوڑھے کو زبان سے سہلاتے ہوئے، اسے بہت سی پرانی پرانی دھنیں یاد آتی رہیں۔ کوئی ایک گھنٹے کے بعد ایک سپاہی کھٹاک سے دروازے کا کنڈا کھول کر اندر داخل ہوا اور اسد کو بازو سے پکڑ کر چلاتا ہوا دفتر میں لے گیا۔ اسد نے اپنے آپ سے اس بار ہوش و حواس قائم رکھنے کا عہد کیا۔

اس کا بازو چھوڑنے سے پہلے سپاہی نے اسے جھنجھوڑ کر سیدھا کھڑا ہونے کی تنبیہہ کی۔

"دماغ ٹھکانے آیا؟" تھانیدار نے پوچھا۔

"میرا دماغ ٹھکانے پر ہے۔"

"گویا تم اقبالِ جرم کر رہے ہو؟"

"میں کسی ایسی بات کا اقبال نہیں کر رہا جو میں نے نہیں کی۔"

"اوہو، اب تو تم چٹاخ پٹاخ بول رہے ہو، شاعر صاحب۔"

"میں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے کسی بات کا علم نہیں۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ میں صرف ایک گواہ ہوں۔"

"تمہیں معلوم ہے اس کا نتیجہ کیا ہوگا؟"

"کیا ہوگا؟"

"میں تمہیں بتاتا ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ساری عمر یہاں،" اس نے اپنا ڈنڈا اٹھا کر حوالات کی کوٹھڑی کی جانب اشارہ کیا، "سڑتے رہو گے۔"

"آپ لوگ مجھے زیادہ سے زیادہ پیٹ سکتے ہیں یا گالیاں دے سکتے ہیں۔ مگر مجرم قرار نہیں

دے سکتے۔" اسد نے کہا۔

"اوہو ہو۔ تو گویا ہم یہی کچھ کر سکتے ہیں؟ اُدہنوں۔" تھانیدار نے چالاکی سے سر ہلایا۔ "تجھ جیسے نازک اندام لڑکے کو مارنے پیٹنے کا کیا فائدہ؟ تیرے تو یہاں چاہنے والے ہی بہت ہوں گے۔" اسد کے ساتھ کھڑا سپاہی ہاتھ بڑھا کر اُس کے چُوتڑ مسلنے لگا۔ اسد اُس کے ہاتھ کی زد سے باہر کھسک کر کھڑا ہو گیا۔ "میں تو رات کو پھر گمشد جا رہا ہوں۔ پیچھے لال خاں تمہارا انچارج ہے۔ سردی لگی تو اسے بلا لینا۔ تمہارا بستر گرم کر دے گا۔" سپاہی لال خاں نے اسد کے گال پر ایک سخت سی چٹکی بھری۔ اسد نے اُس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ "بلانے کی کیا ضرورت ہے جی۔" سپاہی بولا، "ہم خود ہی حاضر ہو جائیں گے۔ ایسے ایسے نرم ہڈے کوئی روز روز آتے ہیں؟" اسد آنسوؤں کو ضبط کر رہا تھا۔ "تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں۔" وہ رُکتے ہوئے گلے سے بولا، "تم کچھ ثابت نہیں کر سکتے۔"

"ثابت کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ موٹو موجود ہے۔"

"وہ کیا ہے؟"

"ایسے جیسے یہ دن چڑھا ہے۔" تھانیدار ہاتھ پھیلا کر خلوص سے بولا، "مقتول کے طریقۂ علاج سے بددل ہو کر تم گمشد چھوڑ گئے۔ جب تین ہفتے کے بعد واپس لوٹے تو تمہارے پاس ایک سوچی سمجھی ہوئی سکیم تھی۔ تم نے اپنا راستہ ہموار کرنے کے لیے کسی نہ کسی طریقے سے اُس کے گھر تک رسائی حاصل کی۔ مزید تفتیش سے پتا چلے گا کہ یہ کارروائی کیسے عمل میں آئی، مقتول کی لڑکی پر ڈورے تم نے پہلے ڈالے یا بعد میں۔ بہرحال اُس کے ساتھ تم نے تعلقات قائم کیے اور قابلِ مذمت حد تک بڑھا لیے۔ تمہارا مقصد اس سٹیج پر مقتول کی لڑکی سے، جو مطب کے کام میں اپنے باپ کی شریک تھی، اپنی دوائی کا نسخہ حاصل کرنا تھا۔ اس کے علاوہ تم لڑکی کے ساتھ اپنے طول پکڑتے ہوئے تعلقات کو زمانے کی نظروں سے چھپا کر نہ رکھ سکے۔ آدھے سے زیادہ گاؤں کو اس کا علم ہو چکا تھا۔ تمہیں اس بات کا بھی اندیشہ تھا کہ اگر یہ بات مقتول کے علم میں آ گئی تو اُس کا ردِ عمل بڑا سخت ہو گا۔ اُس کی زندگی کا واحد سہارا اُس کی لڑکی ہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہ تمہیں کھڑے کھڑے مطب سے نکال دیتا۔ لڑکی بھی ہاتھ سے جاتی اور علاج بھی۔ چنانچہ تم نے اُس کا کام تمام کرنے کی سکیم کو عملی جامہ پہنانے کی ٹھان لی۔ واردات سے پہلے اور واردات کے بعد صرف دو آدمیوں نے مقتول کو دیکھا۔ ایک مقتول کی لڑکی تھی اور دوسرے تم۔ لڑکی اس جرم میں تمہارے ساتھ شریک ہے یا نہیں، اس کا ابھی ہمیں علم نہیں۔ مگر تفتیش جاری ہے۔ جلد یا بدیر سچائی نکل آئے گی۔"

" سچائی مَیں نے آپ کو بتا دی ہے "۔ اسد نے کہا۔

" دیکھو ـــــ " تھانیدار آگے جُھک کر نرم لہجے میں بولا " آخر اُس بڈھے شیطان کو کون نہیں جانتا تھا۔ علاقے بھر میں وہ مشہور تھا۔ کسی نہ کسی نے ایک دن تنگ آ کر اُس کا کام تمام کر ہی دینا تھا۔ تمہاری بدقسمتی ہے کہ بلا تمہارے سر آ پڑی۔ حاشا وکلا مَیں تمہیں اس میں قصوروار نہیں ٹھہراتا۔ بُرائی کو ختم کرنا کوئی جرم نہیں۔ مگر قانونی چارہ جوئی کا معاملہ ہے، مکمل کرنی ہی پڑتی ہے۔ قانون میں مگر چھوٹ ہے "۔ اُس نے سمجھانے کے انداز میں اُنگلی کھڑی کی، " قانون اندھا نہیں۔ قانون خدا خوف انسانوں کا بنایا ہُوا ہے۔ حالات و واقعات کا مقدمے کے فیصلے پر براہِ راست اثر پڑتا ہے اور حالات و واقعات بیان کرنا میرا فرض ہے۔ مَیں وعدہ کرتا ہوں کہ مقدمے میں تمہاری جتنی مدد ہو سکی کروں گا۔ عین ممکن ہے کہ میرے بیان کے اُوپر تم بالکل معمولی سی سزا پر چھوٹ جاؤ۔ مگر شرط یہ ہے کہ سچائی بیان کرنی ہوگی "۔

" مَیں نے جو کچھ دیکھا ہے بتا دیا ہے "۔ اسد نے کہا، " مَیں نے سچی گواہی دی ہے "۔ تھانیدار نے کرسی سے اُچک کر اپنا ڈنڈا اِس زور سے میز پر مارا کہ میز پر پڑی ہوئی دو پنسلیں اُچھل پڑیں اور ایک زبردست دھماکا ہُوا۔

" لے جاؤ "۔ وہ گرجا، " اِس مادر زاد " گراہ " کو۔ "

★ ★ ★ ★ ★

سہ پہر کے وقت وُہی پیلے رنگ کا پتلا سا شوربہ اور جوار کی آدھی روٹی اُس کے لیے لائی گئی۔ اسد نے کہا، " مجھے بھوک نہیں "، جس کے جواب میں سپاہی آنکھیں نکال کر بولا، " جب گانڈ کے رستے شوربا چڑھا تو تیرے باپ کو بھی لگے گی، بیٹا۔ کھا۔ " وہ چیخا۔ پتھر پر بیٹھ کر اُس ٹھنڈے نمکین شوربے کو گھونٹ گھونٹ پیتے ہُوئے اسد نے سوچا، یہاں سے کیسے نکلوں، کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکلنا ہے۔ مگر کیسے؟ فضلے والا برتن خالی نہیں کیا گیا تھا اور پیشاب کی تیز بُو کوٹھڑی میں پھیل رہی تھی۔ اس کو خالی کرنے کے لیے فرش میں ایک سوراخ ہونا چاہیے، اُس نے

بے دھیانی سے سوچا، جس کے مُنہ کو اینٹ سے بند کیا جا سکے تاکہ بُو نہ پھیلے۔ اسد کو محسوس ہوا کہ جیسے اُس کا ذہن دو بالکل مختلف تہوں میں بٹ گیا ہے۔ اُوپر والی تہہ کا رنگ گدلا ہے جس کے آرپار کچھ نظر نہیں آتا۔ اُس کے اندر ایک خلفشار کی کیفیت ہے بے شمار چیزیں ننھی ننھی مچھلیوں اور دُم دار مینڈکوں کی مانند اندھا دُھند بے سمتی سے بھاگ رہی ہیں، ایک دُوسرے سے ٹکرا کر سر پھوڑ رہی ہیں اور چیخ پکار کر رہی ہیں۔ جب کہ دُوسری تہہ جو پہلی سے نچلی سطح پر واقع ہے، شیشے کی طرح صاف اور شفاف ہے۔ اُس کے اندر خلاء کی سی کیفیت اور روشنی ہے، اور کہیں کہیں پر کوئی شے، کوئی چہرہ، کوئی آواز، کوئی کوئی بات، بڑی واضح اور عام فہم طور پر گڑی کھڑی ہے یا اپنے اپنے محور کے گرد بڑی آسانی اور دلجمعی کے ساتھ گھوم رہی ہے۔ شوربہ ختم کر کے اسد نے بچی ہوئی ایک چپڑی روٹی کمبل کے نیچے چھپا دی اور پاؤں پتھر پر رکھ کر، گھٹنے چھاتی سے لگا کر بیٹھ گیا۔ جرم کا موڑ تو اِس نے ثابت کر دیا ہے، کوشش کر کے اُس نے سوچنا شروع کیا۔ چھوٹا سا سچا، مگر موڑ اس نے بنا لیا ہے۔ اب کیا کیا جائے؟ ایک بات بہر حال اُمید افزا ہے۔ یہ سب محض واقعاتی شہادت ہے۔ کوئی ٹھوس ثبوت مہیا نہیں ہو سکتا۔ کوئی آلۂ قتل۔ کوئی عینی شاہد۔ کچھ نہیں۔ جُرم کا عینی شاہد تو کوئی بھی نہیں، مَیں بھی نہیں۔ کیا ہی اچھا ہوتا، اسد نے حسرت سے سوچا، اگر مَیں نے میر حسن کو قتل کرتے ہُوئے دیکھا ہوتا، یا اُس نے ہی کسی کو دیکھا ہوتا، کسی کا نام لیا ہوتا، معاملہ صاف ہو جاتا۔ کوئی الزام دھرتا، کسی پہ الزام آتا، فیصلہ ہو جاتا۔ یہ معاملہ ایسا گنجلک کیوں ہو گیا ہے؟ معاملے دو ٹوک کیوں نہیں ہوتے؟ کہ یہ اچھا ہے، یہ بُرا۔ یہ درست ہے، یہ غلط۔ اچھا اور بُرا تو مگر مذہبی وطیرہ ہے، اُس نے سوچا، اور غلط یا درست قانونی نقطۂ نگاہ۔ پھر پیچھے کیا بچا؟ معاملے کا گنجلک ہو جانا قدرتی امر ہے۔ کیونکہ ذمہ داری کا سوال بیچ میں آتا ہے، جو دو ٹوک معاملہ ہرگز نہیں۔ اب صورتِ حال یکسر بدل چکی ہے۔ میر حسن آخر میری ذمہ داری کیسے بن گیا؟ کسے پتا تھا کہ حالات یہ رُخ اختیار کر لیں گے، کہ مجھے ہی قیدی بنا لیا جائے گا؟ صورتِ حال کی تبدیلی سے ذمہ داری کی نوعیت بھی آخر بدل جاتی ہے۔ سب سے اوّل مجھے اپنا تحفظ لازم ہے۔ میر حسن کا نام اب بھی میرے اختیار میں ہے۔ ایک جملہ کہوں اور آزاد ہو جاؤں۔ آزاد! آزادی کا خیال آتے ہی اسد کے دل میں ایک ہُوک اُٹھی۔ کسی نہ کسی صورت مجھے یہاں سے بچ کر نکلنا ہے، اُس نے سوچا۔ مَیں قید میں نہیں رہ سکتا۔

مگر کیا صُورت ہو؟

رات کو وہی سپاہی بھورا شوربہ اور جوار کی روٹی لے کر آیا اور اُس وقت تک بیٹھا مونچھیں مروڑتا رہا جب تک کہ اسد نے کھانا ختم نہ کر لیا۔ نمکین پانی جیسے شوربے اور ریتلی روٹی کو ہاتھ لگانے کو بھی اسد کا جی نہ چاہ رہا

تھا، مگر اُس وقت اُس میں سپاہی لال خاں سے ردّ و قدح کرنے کی ہمت نہ تھی۔ آخری گھونٹ پر اُسے گہری اُبکائی آئی۔ لال خاں باہر جانے لگا تو اسد نے ٹین کے برتن کی طرف دیکھ کر کہا: "یہ خالی نہیں ہو سکتا؟"

"پہلے اِسے بھر پھر خالی بھی کر لینا۔ تیرے باپ کا ہوٹل ہے؟" سپاہی نے کہا۔

رات بھر تکیے کا پتھر اُس کی گردن کو کاٹتا اور پیشاب کی بُو اُس کے دماغ کو چڑھتی رہی۔ جب وہ اُٹھا تو اُس کی پسلیاں درد کر رہی تھیں۔ روشن دان کی سلاخوں کے پیچھے آسمان کا چوکھٹا چمک رہا تھا۔ نیم خواب کی حالت سے ہی اُس کے دماغ کی سطح پر ایک سوال گشت کر رہا تھا: یہاں سے کیسے نکلوں؟

★ ★ ★ ★ ★

سہ پہر کے وقت ایک دُوسرا سپاہی، جو نسبتاً شریف طبع تھا، کوٹھڑی کا تالا کھول کر اندر داخل ہُوا۔ اُس نے اسد کو چھوئے بغیر ساتھ چلنے کا حکم دیا۔ تھانیدار دفتر کی کُرسی پر یوں نیم دراز تھا جیسے آرام کُرسی پہ بیٹھا ہو۔ اس وقت اُس کے دفتر میں ایک دُوسرا آدمی بھی موجود تھا جو میز کے دہنے ہاتھ کُرسی پر بیٹھا تھا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس اس شخص کا چہرہ اسد کو مانوس معلوم ہوا، مگر اُس وقت اُسے یاد نہ آیا کہ کہاں دیکھا ہوا ہے۔ سپاہی لال خاں ہاتھ پیچھے باندھے ایک طرف کھڑا تھا۔ تھانیدار اُس نووارد سے کسی انجانے موضوع پر بات کرنے میں مصروف تھا۔ اسد کھڑا انتظار کرتا رہا۔ بات کرتے کرتے تھانیدار نے دو ایک بار بے خیالی کے انداز میں، غور سے اسد کو دیکھا۔ چند منٹ کے بعد وہ بات ختم کر کے اسد کی طرف متوجہ ہُوا۔

"بیٹھ جاؤ۔" وہ بولا۔

اسد وہیں کھڑا اسے دیکھتا رہا۔ اُسے اپنے کانوں پہ اعتبار نہ آ رہا تھا۔ تھانیدار نے بے صبری سے آنکھیں میچ کر، تھکے ہُوئے انداز میں ہاتھ سے اُسے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ اسد آگے بڑھ کر میز کے پاس پڑے ایک سٹول پر بیٹھ گیا۔

"اسے پہچانتے ہو کیا ہے؟" تھانیدار نے فرش کی طرف اشارہ کر کے پُوچھا۔

میز کے پاس زمین پر بندوق کا ڈبا رکھا تھا۔

"ہاں۔"

"کیا ہے؟"

"حکیم کی بندوق۔"

"تو تمہارے علم میں تھا کہ اُس کے پاس بندوق ہے؟"

"ہاں۔"

"کیا تمہارے علم میں تھا کہ اس کا لائسنس دس سال ہُوئے ختم ہو چکا ہے؟"

اسد نے انکار میں سر ہلایا۔

"اور دس سال سے بڈھا،" تھانیدار دُوسرے آدمی کی طرف دیکھ کر بولا، "اسے غیر قانونی طور پر جوڑوں میں لیے بیٹھا ہوا ہے۔"

وہ آدمی آہستہ سے مُسکرایا۔

"اگر میرے ہاتھ آجاتا،" تھانیدار بولا، "تو سات سال بامشقت دِلواتا، حکیمی ساری نکل جاتی۔ اُس کی قِسمت اچھی تھی ـــــ"

"جو مر گیا۔" دُوسرے شخص نے کہا، جس پر تھانیدار نے ایک بلند قہقہہ لگایا۔ دونوں سپاہی بھی ہنسنے لگے۔ کچھ دیر تک اس مذاق پر محظوظ ہونے کے بعد تھانیدار پھر اسد کی طرف متوجہ ہُوا۔

"قتل کی رات والے دن، یعنی پیر کو، ظہر کے وقت تمہارے اور مقتول کے مابین اس کے،" اُس نے بندوق کے ڈبے کی طرف اشارہ کیا، "بارے میں کیا بات ہوئی تھی؟"

"یاسمین اپنے باپ سے بضد تھی کہ بندوق گاؤں والوں کے حوالے کر دی جائے۔"

"مَیں نے یہ نہیں پوچھا کہ لڑکی کس بات پر بضد تھی۔ تمہاری،" تھانیدار نے اپنی اُنگلی اسد کے سینے پر رکھی، "کیا بات ہوئی؟"

"مَیں نے کہا تھا کہ بندوق گاؤں کے لوگوں کو نہیں دینی چاہیے۔"

"کیوں؟"

"میرے خیال میں اس کا کوئی فائدہ نہ تھا۔"

"اوہو۔ تو تمہارے خیال میں اس کا کیا نقصان ہوتا؟"

"یہ بندوق شیر کے شکار کے لیے موزوں نہیں۔" اسد نے کہا۔ "خواہ مخواہ اُسے زخمی کر کے خطرہ

مول لینے والی بات تھی۔"

"اچھا آ — ؟" تھانیدار نے مصنوعی حیرت سے آنکھیں پھیلا کر پوچھا، "تو تم شیر کے شکار کے بھی ماہر ہو؟"

"یہ بندوق پرندوں اور چھوٹے موٹے جانوروں کے شکار کے لیے ہے۔" اسد نے کہا، "میرے والد کے پاس ایسی بندوق تھی۔"

"اپنے مؤقف کی حمایت میں تم نے مقتول پر دباؤ ڈالا تھا؟"

"نہیں۔ میں نے صرف اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔"

"پھر مقتول نے کیا وطیرہ اختیار کیا؟ اُس نے تمہاری بات مانی یا اپنی بیٹی کی۔"

"مجھے علم نہیں۔ میں وہاں سے چلا آیا تھا۔"

"تمہارا خیال ہے اُس نے بندوق گاؤں والوں کو دے دی؟"

"ظاہر ہے کہ نہیں دی۔"

"ظاہر کیسے ہے؟"

"بندوق آپ — جو لے آئے ہیں۔"

"تو گویا میں گاؤں والوں سے برآمد نہیں کر سکتا؟"

اسد لاجواب ہو کر اُس کا مُنہ دیکھنے لگا۔ پھر کمزور سی آواز میں بولا: "کر سکتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ تمہارے علم میں تھا کہ بندوق گھر میں موجود ہے۔"

"ہاں۔" اسد آہستہ سے بولا۔

"یعنی تم نے دیکھی تھی۔"

"ہاں۔"

"کب؟"

"اُسی روز۔"

"کب؟" تھانیدار ایک دم اپنا مُنہ اسد کے قریب لا کر چیخا، "کب؟ کس وقت؟ میرے ساتھ جو جھوٹ بولتا ہے،" اُس نے چیخ کر اپنی اُنگلی اسد کی آنکھوں کے آگے لہرائی، "یاد رکھو میں اُس کا وہ حشر کرتا ہوں کہ سات پُشتیں یاد رکھتی ہیں۔"

"مَیں جھُوٹ نہیں بول رہا۔" اسد نے کہا۔

"تو بولو۔ کس وقت دیکھی ؟ قتل سے پہلے یا بعد میں ؟"

"بعد میں۔"

"قتل کرنے کے بعد دیکھی ؟"

"اُس کی موت کے بعد دیکھی۔" اسد چیخ اُٹھا۔

"کہاں پڑی تھی ؟"

"اُس کی چارپائی کے نیچے۔"

"چارپائی کے نیچے صرف یہ رکھی تھی یا کچھ اور بھی تھا ؟"

"ایک صندوق بھی تھا۔"

"اور بندوق کس جگہ پڑی تھی ؟"

"صندوق کے پیچھے۔"

"تو گویا تم نے اُس کی موت کے فوراً بعد اُس کے کمرے کی تلاشی لی ؟"

"نہیں۔"

"صرف بندوق دیکھی ؟"

"ہاں۔"

"کیوں ؟"

اسد اپنی آنکھوں سے ایک اِنچ کے فاصلے پر اُس کی اُبلتی ہوئی سُرخ آنکھوں کو دیکھتا رہا۔

"کیوں ؟" تھانیدار میز پر مُکّا مار کر گرجا۔ "کیا وجہ تھی کہ قتل کے کہرام کے بعد، اور ایک بپھری ہوئی لڑکی پر قابو پانے کے بعد تمہیں ایک اور صرف ایک چیز کا خیال رہا ؟ تمہیں کسی اور چیز کا خیال نہ آیا سوائے اس کے کہ بستر کے نیچے گھُس کر صندوق کے پیچھے چھُپی ہوئی بندوق کو دیکھو کہ موجود ہے یا نہیں۔ کیوں ؟ کیا وجہ تھی ؟ کیا مقصد تھا تمہارا ؟"

"مَیں نے اُس وقت اپنے آپ کو خطرے کی حالت میں محسوس کیا تھا۔" اسد نے کہا۔

"پھر بندوق جڑی ہوئی کیوں نہ تھی، تمہارے ہاتھ میں کیوں نہ تھی، بند کیوں پڑی رہی ؟ تمہارا خیال تھا اپنے آپ نیچے سے نکل کرے گی ؟"

پورے ایک منٹ تک وہ اُسی طرح جُھکا غصّے سے پھٹی ہُوئی آنکھیں اسد کے چہرے پر جمائے رہا پھر بہت آہستہ آہستہ —— گویا کئی مرحلوں میں —— کُرسی پر بیٹھنے لگا۔ بیٹھ کر اُس نے ایک ہاتھ سے کان کے اُوپر کے بال سنوارے اور اپنی سوالیہ نظروں سے باری باری دونوں سپاہیوں اور میرے آدمی کو دیکھا۔ پھر اسد کی طرف مُڑا۔ جب وہ بولا تو گرجتی ہُوئی آواز اور چمکتا ہُوا لہجہ دب چُکا تھا۔

"یہ دیکھ رہے ہو؟" اُس نے اپنے سامنے پڑی ہُوئی فائل کی طرف اشارہ کر کے پُوچھا۔ اسد نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مقتول کی بیٹی کا بیان ہے۔" تھانیدار بولا، "اُس نے تمہارے جُرم کی نشان دہی کی ہے۔"

اسد کا مُنہ کُھل گیا۔ "کیسے؟"

تھانیدار نے فائل اپنے سامنے کھینچ کر کھولی اور پڑھنا شروع کیا:

"مسمّی اسد کریم عرصہ گزشتہ ساڑھے آٹھ ماہ یا اس سے کچھ زیادہ سے میرے مرحوم باپ (حکیم محمد عمر گمشدہ والے) کے زیرِ علاج سانس کی بیماری کی وجہ سے ہے۔ اوّل عرصہ پانچ ماہ کے قریب اس طرح گزارنے کے بعد مسمّی مذا گمشدہ چھوڑ کر بغیر اطلاع چلا گیا تھا۔ مگر چند ہی روز کے بعد بوجہ بیماری بگڑ جانے کے (بقول اُس کے) واپس آ کر دوبارہ زیرِ علاج ہو گیا۔ میرے مرحوم باپ نے بوجہ مہربانی مسمّی اسد کریم مریض کو دواؤں کے گھولنے ملانے اور بناوٹ کے دُوسرے کاموں میں بطور مددگار کے حصّہ لینے اور گھر کے اندر آنے جانے کی اجازت دے دی۔ اُس وقت سے اسد کریم کے ساتھ میری جان پہچان شروع ہو گئی۔ مسمّی مذا نے میرے مرحوم باپ سے طب کی تعلیم کے سلسلے میں اُسے اپنی شاگردی میں لے لینے کی درخواست بھی کی تھی۔ میری دانست میں ایسا کرنے سے اُس کا مقصد سانس کے عارضے کے بارے میں، جو کہ اُسے لاحق تھا، علم حاصل کرنا تھا۔ اسد کریم ایک پڑھا لکھا اور ہشیار آدمی ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ میرے مرحوم باپ سے وہ سانس کی دوا کا نُسخہ حاصل کرنے میں کامیاب ہوا یا نہیں، مگر اُس نے کچھ ہی مدّت میں اپنی ذہانت اور ہشیاری کی بنا پر میرے باپ کے دل میں کچھ نہ کچھ جگہ پیدا کر لی۔ چنانچہ اپنے باپ کے کہنے پر مَیں بھی اسد کریم سے بات چیت کرنے لگی۔ مَیں مسمّی اسد کریم کو ایک دُکھی اور تنہا شخص گردان کر اُس کے ساتھ ہمدردی کرتی تھی اور بعض دفعہ اُس کی احمقانہ باتوں پہ ہنسا کرتی تھی۔ مثلاً کئی مرتبہ اُس نے ذکر کیا تھا کہ وہ تن تنہا جنگل میں جا کر شیر کا شکار کرنا چاہتا ہے۔ مسمّی اسد کریم شاعرانہ ذہنیت کا مالک ہے اور بعید از قیاس باتوں پہ اکثر توجہ دیتا رہتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ہی ساتھ دنیاداری کی باتوں سے بھی ناآشنا نہیں رہتا۔ اُس نے ایک مرتبہ . . . . . ." اِس مقام پر تھانیدار پڑھتے

پڑھتے الفاظ کو مُنہ میں تیز تیز گنگنانے لگا، جیسے اِس حصّے کو اسد کی سماعت کے لیے غیر ضروری سمجھتا ہو۔ کچھ آگے جاکر اُس نے پھر سے عبارت کو صاف صاف پڑھنا شروع کر دیا۔ "بتاریخ دس مئی بروز پیر ظہر کی نماز سے ذرا پہلے اسد کریم اور میرے مرحوم باپ کے مابین بندوق کے لین دین کے بارے میں بات چیت ہوئی۔ قبل ازیں اس کے مَیں اپنے باپ سے درخواست کر چکی تھی کہ گاؤں (گمشدہ) کے نمبرداروں کی خواہش کے مطابق بندوق اُن کو مستعار دے دی جاوے تاکہ اس کی مدد سے وہ خونی درندے کا قلع قمع کر سکیں۔ اُدھر سے اسد کریم وہاں آن پہنچا۔ وہ دواؤں کے برتن لے کر گھر میں آیا تھا اور برتنوں کو ایک طرف رکھ کر وہ بن بلائے میرے والد کے کمرے میں آن کر داخل ہو گیا جہاں پر مَیں اپنے والد کے سر میں بادام روغن کی مالش کر رہی تھی، اور اسد کریم نے میری بات سُن لی اور اُس کی مخالفت کرنے لگا۔ اُس نے اپنا مؤقف واضح طور پر بیان نہ کیا بلکہ قرینِ قیاس وجہ سے صرف اتنا کہنے پر اکتفا کیا کہ بندوق گاؤں والوں کے حوالے کرنا مناسب نہیں۔ جس پر میرے والد نے اُس کی بات نہ مانی بلکہ خاموشی اختیار کر لی۔ مسمّی اسد کریم بھی چُپ ہو رہا اور کچھ نہ بولا اور باہر چلا گیا۔ قیاس ہے کہ اِس بات کی وجہ سے اُس کو رنج ہُوا۔ اُسی روز اسد کریم کے بے حد اصرار پر مَیں رات کے وقت اُس کے ہمراہ تھوڑی دُور تک ٹہلنے کے لیے چلی گئی اور جلد ہی واپس آگئی۔ مَیں نے واپس آکر ......" یہاں پہنچ کر پولیس افسر کی آواز پھر دھیمی ہو گئی۔ اُس نے ایک آدھ جملہ تیز تیز زیرِ لب پڑھا اور رُک گیا۔ کھُلی ہُوئی فائل اُس نے اپنے آگے میز پر رکھ دی اور استفسارانہ نظروں سے اسد کو دیکھنے لگا۔ اسد جو برابر مُنہ کھولے، بے یقینی سے ایک ایک لفظ کو سُن رہا تھا، بے اختیار بول اُٹھا:

"مَیں نہیں مانتا۔"

"کیا نہیں مانتے؟"

"کہ یہ اُس کا بیان ہے۔"

"یہ تمہاری ماں کے دستخط ہیں؟"

تھانیدار نے فائل اُسی طرح اُٹھا کر اسد کے سامنے میز پر کھڑی کر دی۔ اسد کا ذہن ایک لمحے کے لیے یکسر خالی ہو گیا۔ وُہ ایسے اُس عبارت کو شروع سے پڑھنے لگا جیسے کسی نئی کتاب کو آرام سے کھول کر پڑھ رہا ہو۔

"مسمات یاسمین گل دخترِ حکیم محمد عمر مرحوم قوم شیخ سکنہ گمشدہ بعمر پچیس سال قریباً نے وقوعہ ہذا کے متعلق جو کچھ حالات تحریر کرائے مذکوریہ کا مفصل بیان زیرِ دفعہ ــــ ضابطہ فوجداری لیا جا کر لف رپورٹ

ضمنی بنا کیا جاتا ہے : بیان ازان مسمات ——"

تھانیدار کی ہلتی ہوئی اُنگلی نے اسد کی پڑھائی کا سلسلہ توڑ دیا۔ بیان کافی طویل تھا، جو باریک شکستہ خط میں لکھے ہوئے دو بڑے صفحات پر مشتمل تھا۔ تھانیدار نے اُس میں سے صرف دو مختصر حصے پڑھ کر سُنائے تھے۔ دُوسرے صفحے کے دامن میں جس جگہ پر تھانیدار اُنگلی رکھے تھا، بڑے حروف میں لکھا تھا : یاسمین گُل دختر حکیم محمد عمر مرحوم۔

"یہ اُس کے دستخط نہیں۔" اسد نے کہا۔

"تم نے اُس کے دستخط دیکھے ہیں؟"

"اُس کا نام گُل یاسمین ہے۔"

"مَیں کہتا ہوں تُو نے اُس کے دستخط دیکھے ہیں؟"

"نہیں۔" اسد نے رُک کر کہا۔

"تو یہ تیری ماں کے دستخط ہیں؟" تھانیدار چیخا، "کوئی بات اس میں غلط بیان کی گئی ہے؟"

"کوئی بات غلط نہیں۔" اسد نے کہا۔ "مگر جس طریقے سے بیان کی گئی ہے غلط ہے۔"

"اچھا آ —" تھانیدار بولا، "تو اور کس طریقے سے بیان ہونی چاہیے؟"

"یاسمین اس طرح کا بیان نہیں دے سکتی۔" اسد نے کہا، "مَیں اُسے جانتا ہوں۔"

"یہ تو اس وقت پتا چلے گا، بچہ، جب پھانسی چڑھوگے۔" تھانیدار نے کہا۔ "ابھی تیرے ہوش ٹھکانے پر نہیں آئے۔" اُس نے بازو کے ایک لمبے اشارے سے سپاہیوں کو حکم دیا، "بند کر دو اسے۔"

★ ★ ★ ★ ★

ہو سکتا ہے کاغذوں میں اُس کا نام یاسمین گُل ہی ہو، اسد نے سوچا، یعنی رجسٹر پیدائش میں یا سکول

میں داخلے کے وقت نام غلط لکھا دیا گیا ہو اور بعد میں ٹھیک کروانے کی بجائے ویسے ہی رہنے دیا گیا ہو؟ نہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو کبھی نہ کبھی مجھ سے ذکر ضرور کرتی۔ مثلاً یہ کہ میرا اصل نام تو گل یاسمین ہے مگر کاغذوں میں ابا نے یاسمین گل لکھا دیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔ نام سے مگر کیا ہوتا ہے؟ بیان سرے سے جھوٹا ہے۔ یاسمین ایسی باتیں کر ہی نہیں سکتی۔

یا کر سکتی ہے؟

ایک بے معلوم سے نکتے کی تلاش میں اسد کا ذہن دُور و نزدیک گھومنے لگا۔ اس نکتے کا شائبہ اُسے اُس وقت ہوا تھا جب تھانیدار لڑکی کا بیان پڑھ رہا تھا — مگر بہت مدھم، جیسے بہت دُور سے کسی کی پُشت کو دیکھ کر اُس کی پہچان کی جائے اور پھر وہ غائب ہو جائے۔ یہ ایک ایسا نکتہ تھا جو یاسمین سے منسوب اُس بیان کے جھُوٹ کو ظاہر کرتا تھا، اور جواب ہزار کوشش اُس کی گرفت میں نہ آ رہا تھا، گو اس کی یادداشت بہت واضح طور پر اُس کے ذہن میں موجود تھی۔ ایک نکتہ ایسا ہے، وہ بار بار اپنے آپ سے کہتا، اتنا صاف مجھے یاد ہے کہ ہے۔ اب یاد نہیں آ رہا۔ یاسمین ایسا بیان نہیں دے سکتی۔

رات کو سپاہی کرم دین بھُورے رنگ کا شوربہ اور جوار کی روٹی لے کر آیا۔ اسد کا معدہ خالی ہو چکا تھا، چنانچہ اُس نے روٹی کے چند لقمے شوربے کے ساتھ کھائے اور باقی شوربہ گھونٹ گھونٹ کر کے پی گیا۔ اُس بے مزہ نیم گرم پانی نما شوربے سے اُس کا جی قطعاً بھر چکا تھا۔

"روٹی پاس رکھ لے،" سپاہی نے جاتے جاتے کہا، "کسی وقت کھا لینا۔ کھائے گا نہیں تو طاقت زائل ہو جائے گی۔"

"شوربے میں نمک ذرا زیادہ ڈالا کرو،" اسد نے آہستہ سے درخواست کی۔

بیٹھے رہنے سے پتھر کی ہموار سطح نوکدار کنکروں کی مانند اُس کی ہڈیوں کو چُبھنے لگی۔ وہ اُٹھ کر اندھیری کوٹھڑی میں پھرنے لگا۔ چلتے چلتے کبھی وہ ایک دیوار سے کبھی دُوسری سے لگ کر کھڑا ہو جاتا۔ تھانے کی عمارت قدیم اور بھاری پتھروں سے تعمیر شُدہ تھی۔ برآمدے میں ایک لالٹین لٹک رہی تھی اور پہریدار سپاہی کھاٹ پہ بیٹھا ایک بوسیدہ سی قاعدہ نما کتاب کو اُلٹ پلٹ کر رہا تھا۔ گرمیوں کا موسم تھا، مگر رات پڑے اس جگہ پہ سردی ہو جاتی تھی۔ بیٹھے بیٹھے اسد کے پاؤں برف کی مانند یخ ہو جاتے، یہاں تک کہ چلنے پھرنے پر بھی گرم نہ ہوتے۔ پھر وہ پنجوں کے بل پتھریلے فرش پہ اُچھلنا شروع کر دیتا، جیسے رسّی ٹاپتے ہیں، حتّیٰ کہ اُس کا دم پھُول جاتا اور بھُوک شدت سے لگنے لگتی۔ عجیب بات تھی کہ اس طرح دم پھُولنے سے اُس کی سانس پہ کوئی

اُتر نہ پڑتا۔ آج چوتھی رات تھی اور سانس ایسی ہموار چل رہی تھی جیسے تازہ تازہ مرمت شدہ مشین میں چلتی ہے۔ بھوک آہستہ آہستہ اپنے آپ ختم ہو جاتی۔ پھر ادھ بنے خیالات کا ایک سلسلہ چلتا۔ عجیب عجیب سوالوں کی گتھیاں آتیں اور روئی کے ریشوں کی طرح اُلجھی اُلجھائی، اُڑتی ہوئی گزر جاتیں۔ بیچ بیچ میں، گندم کی تندوری روٹی اور سالن کھانے کی طلب اُس کے ریشے ریشے میں بُری طرح پیدا ہوتی۔ ٹھنڈک ایک بار پھر پاؤں کے تلوؤں سے چڑھنی شروع ہوتی، جیسے موت ہو۔

اوڑھنے والے کمبل کو تہہ کر کے اسد نے اُسے پتھر پر رکھا اور اُوپر بیٹھ گیا۔ اِس بے دید، بے صوت کوٹھڑی پر اُسے ایک ایسے دربند مقبرے کا گمان ہوا جو مدت ہوئی کسی تلاطم میں آکر زیرِ زمین دفن ہو چکا ہو۔ یہ احساس کہ یہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں، کہ اب وہ ایک قیدی ہے اور اُس کا کوئی پرسانِ حال نہیں، اُس کے دل کو شل کیے جا رہا تھا۔ کوئی سبیل، کوئی چل، کوئی چکمہ، کوئی آدمی، اُس نے سوچا، کوئی تو ہو گا۔ کیسے ممکن ہے کہ کوئی راستہ ہی نہ ہو۔ ہر کسی کا کہیں نہ کہیں، کوئی نہ کوئی راستہ ضرور نکلتا ہے۔ وگرنہ تو زندگی ختم ہو جائے۔

تو کیا زندگی ختم ہو رہی تھی؟ اُس نے حیرت سے سوچا۔ نہیں۔ یہ مان لینا اُس کے لیے انتہائی دشوار تھا کہ اُمید کی رمق بھی نہیں رہی۔ یہ بات اُسے بعید از قیاس ہی نہیں، نہایت احمقانہ لگتی کہ وہ ابھی زندہ ہو اور کوئی ایک راستہ بھی نہ رہے؟ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں ابھی زندہ ہوں، اس نے پیٹ میں بھوک کو محسوس کر کے سوچا، جان میری ابھی قائم ہے۔ پاؤں پر جرابوں کا ایک جوڑا ہو تو کچھ گرم رہیں۔ کمبل لپیٹنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ یا اللہ، میرے پیٹ میں کیسی قبض ہو رہی ہے۔ اس کوٹھڑی کی طرح۔ کوئی جنبش نہیں۔ آواز تک نہیں آتی۔ مجھے ایک ہلکے سے جلاب کی ضرورت ہے، ورنہ جان پیٹ میں دفن ہو جائے گی۔ دو روز سے پیشاب کا برتن خالی نہیں ہوا۔ اب کوئی آیا تو اس کے سر پہ انڈیل دوں گا، دیکھا جائے گا۔ خدایا، کیسی سڑاند ہے۔ کیا کروں۔

مگر اس ابتری کے باوجود، اُس کے ذہن کی زیریں سطح حیرت ناک طور پر صاف سے صاف تر ہوتی جا رہی تھی۔ ایک گدلی اور متلاطم سطح کے نیچے شیشے کے اس مکعب کی خاموش اور مستحکم فضا میں نظر کی شعاع بڑی دُور تک بے روک ٹوک جاتی تھی۔ یہاں پر پہلے جو چند چہرے، یا کچھ آوازیں موجود تھیں، اب ایک ایک کر کے غائب ہو چکی تھیں۔ پرانی باتوں میں ایک یاسمین کا چہرہ ابھی باقی تھا، مگر وہ بھی اب دھندلا چلا تھا۔ اس کی بجائے اب اس جگہ کے اندر ایک بالکل نئی شبیہہ عین درمیان میں اُبھر رہی تھی۔ یہ شبیہہ پتھر پر بیٹھے ہوئے

ایک قیدی کی تھی۔ اس کے پاؤں ننگے اور ہاتھ خالی تھے، اور وہ سر اٹھائے سامنے کو دیکھ رہا تھا۔ اس بے سروسامانی کی کیفیت میں بھی اس شبیہہ کے اندر ایسا انداز تھا جیسے لوہے کے سُرخ پتھر کو کاٹ کر بنائی گئی ہو۔ اُس کے سر میں کوئی جنبش نہ تھی۔ کبھی کبھی اِس بھاری مجسّمے کو اپنے دل میں نصب دیکھ کر اسد خود پریشان ہو جاتا۔ مگر اس کو وہاں سے ہٹانا اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ کیا مَیں اب ایک مستقل قیدی کی شکل میں تبدیل ہو چکا ہُوں ؟ ہمیشہ کے لیے ؟ یاسمین کا چہرہ بھی دھندلاتا جا رہا ہے۔ یاسمین کسی صُورت اس قسم کا بیان نہیں دے سکتی۔ ظاہر ہے کہ اُس پہ تشدد کیا گیا ہے۔ ایک عورت پہ کیسا تشدد کیا جا سکتا ہے ؟ نہیں۔ تشدد کی ضرورت ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ وُہ بیان دیتی رہی اور اسے توڑ موڑ کر لکھا جاتا رہا۔ یا اُس سے صرف سوال جواب ہُوئے اور بیان بعد میں لکھا گیا، یہیں تھانے میں یا کہیں اور۔ یہ تحریر اُس کے بیان پر مبنی تو ہے مگر اسے یہ شکل بعد میں دی گئی ہے۔ اس میں باتیں سب ٹھیک ٹھیک بتائی گئی ہیں سوائے آخری جملے کے۔ باہر وہ اُس رات کو آئی نہ میرے اصرار پر نہ تو میرے بیحد اصرار پر۔ اور یہ کہ پھر جلد ہی واپس چلی گئی ؟ جھُوٹ۔

وہ نکتہ مگر کہاں ہے۔ وُہ نکتہ، زمین پر پڑے ہوئے کمبل کو پاؤں کے گرد لپیٹتے ہُوئے اسد نے جھنجھلا کر سوچا، جو میرے خیال میں ایک لحظے کے لیے اُبھرا تھا۔ میری یادداشت کو کیا ہوتا جا رہا ہے ؟ ایسی باتوں کو میری یادداشت ہواؤں سے اُچک لیا کرتی تھی۔ اب معمولی چیزیں اس کے جال کو پھاڑ کر نکل جاتی ہیں۔

ایک دفعہ مَیں نے ایک کتاب پڑھی تھی ـــ اُس نے یاد کیا ـــ کیا نام تھا اُس کا ؟ وہ بھی اب یاد نہیں آ رہا۔ اس میں ایک بُوڑھا آدمی اپنی زندگی کو یاد کرتا ہے۔ اپنے لڑکپن کی اُسے ایک ایک بات یاد ہے۔ چھوٹی چھوٹی تفصیل، رنگ و بُو، مختلف جگہوں کے پانیوں کے ذائقے۔ پھر جوانی کی بیشتر باتیں اُس کی یاد میں تھیں۔ چار عورتوں کی رانوں کی مختلف بُو، اُن کے مُنہ کے الگ الگ مزے۔ پھر میانی عمر کی آدھی پَون باتیں، اُس کے بچّوں کے لڑکپن کی آوازیں، سکول کی کتابوں کے رنگ۔ پھر بچے بڑے ہو کر گھر سے چلے جاتے ہیں، بیوی اُسے چھوڑ کر جائے نماز پہ بیٹھ جاتی ہے، اور وہ اکیلا رہ جاتا ہے۔ پچھلے دس برس کی ایک بات بھی اُسے ٹھیک سے یاد نہیں۔ ایک ایک بات کو چار چار دفعہ یاد کرتا ہے اور ہر بار اُس کی شکل الگ ہوتی ہے، وہ فیصلہ نہیں کر پاتا کہ کون سی شکل صحیح اور کون سی غلط ہے، کہ یہ بات اِس طرح واقع ہوئی تھی یا اُس طرح۔ یادداشت کی بھی کیا آزاد زندگی ہے۔ جہاں یہ جوان ہوتی ہے وہاں ہمیشہ جوان رہتی ہے۔ جہاں بوڑھی ہو جاتی ہے وہاں سایوں کی طرح ڈھلتی جاتی ہے، ابھی یہاں، ابھی وہاں...

مگر وہ نکتہ ؟ میری یادداشت ابھی بوڑھی تو نہیں ہوئی۔ اِس نکتے کا کھوج ضروری ہے۔ اس سے فائدہ خواہ کچھ بھی نہ ہو، مگر ضروری ہے۔ کیونکہ مجھے یاد ہے کہ اُسی ایک لحظے میں مجھے یہ خیال بھی ہُوا تھا کہ اس نکتے سے مجھے

کوئی مدد تو مِل نہیں سکتی البتہ یاسمین کے بیان کی صورت واضح ہو جاتی ہے۔

یاسمین کے بیان کی صورت ہی تو اصل بات ہے، اُس نے سوچا۔

زمین پر پڑا ہوا کمبل اُٹھا کر اسد نے اپنے کندھوں پر ڈالا اور اُٹھ کر کوٹھڑی میں اِدھر سے اُدھر پھرنے لگا۔

"اُلّو کھا کر آئے ہو؟" پہریدار نے اُسے دروازے کی سلاخوں کے پاس کھڑے دیکھ کر کہا، "نہ رات کو سوتے ہو نہ دن کو۔ مر جاؤ گے۔"

اسد خاموشی سے لوٹ آیا۔ دیوار کے پاس آ کر وہ اپنے پاؤں کو زور زور سے زمین پر مارنے لگا۔ اُن کی دھمک سے کرم دین سپاہی چونک کر اُٹھا۔ اُس نے لالٹین برآمدے کی کھونٹی سے اُتاری اور دروازے کی سلاخوں کے پاس آ کر، لالٹین اُوپر اُٹھا کر اندر دیکھنے لگا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" اُس نے سختی سے پُوچھا۔

اسد کچھ دیر تک جواب دیے بغیر پَیر دھپ دھپ زمین پر مارتا رہا۔ "پَیر گرم کر رہا ہوں۔" وہ بولا۔

"کمبل لپیٹ لے۔" سپاہی بولا، "نہ کھاتا ہے نہ پیتا ہے۔ مر جائے گا۔"

"کمبل سے گرم نہیں ہوتے۔" اسد سلاخوں کے قریب آ کر بولا، "ایک مہربانی تو کرو۔ پیشاب والا برتن خالی کر دو۔"

"تیری ماں کی ــــ مَیں تیری ماں کا جمعدار ہوں؟"

"دیکھو۔ تمہاری بڑی مہربانی ہو گی۔" اسد نے لجاجت سے کہا۔

"مجھے تالا کھولنے کی اجازت نہیں۔ سویرے لال خاں ڈیوٹی پر ہے۔ اُس سے کہنا، جمعدار سے صاف کروا دے گا۔"

"لال خاں میرے ساتھ بڑی سختی کرتا ہے۔" اسد نے کہا، "کبھی نہیں کروائے گا۔ پتا نہیں مَیں نے اُس کا کیا بگاڑا ہے۔ تم تو خدا ترس آدمی ہو۔ دو دن ہو گئے ہیں، بُو سے سر چکرا گیا ہے۔ مجھے نیند نہیں آتی۔ جاگتا رہتا ہوں تو پَیر ٹھنڈے ہونے لگتے ہیں۔"

کرم دین کچھ دیر تک شک بھری نظروں سے اسد کو دیکھتا رہا، "بدمعاشی کرنے کی صلاح تو نہیں؟"

"نہیں۔" اسد نے دونوں ہاتھوں میں سلاخیں پکڑ کر جواب دیا، "خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں۔" کچھ دیر اور بے اعتمادی سے اُس کی طرف دیکھتے رہنے کے بعد سپاہی نے احتیاط سے پہلے دائیں پھر بائیں نظر دوڑائی، "اگر کسی کو خبر ہو گئی تو میری

بیٹی اُتر جائے گی۔" وہ بولا، "مگر تمہارے اوپر مجھے بڑا ترس آتا ہے۔ لا یہاں رکھ دے۔" اسد جلدی سے لبالب بھرا ہوا ٹین کا برتن دونوں ہاتھوں میں اُٹھا لایا۔ "تمہاری بڑی مہربانی۔" برتن کو دروازے کے پاس زمین پر رکھتے ہوئے وہ بولا۔

"اب پرے جا کر بیٹھ جا۔"

اسد پتھر کی طرف بڑھا تو عقب سے سپاہی بولا: "اِدھر نہیں۔ اُدھر۔ سامنے۔"

اسد سامنے والی دیوار کے پاس جا کر پاؤں کے بل بیٹھ گیا۔

"مُنہ دیوار کی طرف کر۔" کرم دین نے حکم دیا۔ اسد نے مُنہ دیوار کی طرف موڑ لیا۔

کرم دین اِدھر اُدھر دیکھ کر برآمدے کے کونے میں گیا اور ایک چیتھڑا اُٹھا لایا۔ واپسی پر اُس نے لالٹین برآمدے کی کھونٹی پر لٹکا دی۔ پھر اُس نے چیتھڑے کے دو ٹکڑے کیے اور اُنہیں ہاتھوں پر لپیٹنے لگا۔ اچھی طرح ہاتھوں کو ڈھک کر اُس نے چابیوں کا گُچھا نکالا اور پھر ایک بار دائیں بائیں دیکھ کر آہستہ سے چابی تالے میں گھمائی۔ تالے کو نکال کر اُس نے اِس خاموشی سے کُنڈا کھولا کہ بے معلوم سی آواز پیدا ہوئی۔ قیدی کی پُشت پر نظریں جمائے وہ جھکا اور دونوں ہاتھوں میں برتن کو اُٹھا کر سُرعت سے دروازے کے باہر ہو گیا۔ برتن کو زمین پر رکھ کر اُس نے اُسی آہستگی سے کُنڈا واپس کھسکایا اور اُسے تالا لگایا۔ پھر اُس نے برتن پکڑا اور اُسے جسم سے دُور اٹھائے اٹھائے برآمدے سے باہر نکل گیا۔ جب پاؤں کی چاپ دُور چلی گئی تو اسد نے گردن موڑ کر دیکھا۔ کرم دین کی رائفل برآمدے کے ستون کے ساتھ کھڑی تھی۔ وہ کسی طور بھی اسد کی زد میں نہ آتی تھی، پھر بھی اُس بے پہرہ ہتھیار کو وہاں پڑے دیکھ کر اُس کا دل یکبارگی اُچھلا اور دھک دھک کرنے لگا۔ جب صحن سے قدموں کی چاپ پھر آئی تو وہ مُنہ دیوار کی طرف کر کے بیٹھ گیا۔ کرم دین نے اُسی چابکدستی سے آہنی دروازہ کھولا اور برتن اندر رکھ کر اُسے تالا لگا دیا۔

"لے جا۔" وہ بولا۔ جب برتن اُٹھانے کے لیے اسد دروازے پر آیا تو کرم دین بولا، "کبھی اپنا بھی نجس برتن میں نے ہاتھ میں نہیں لیا۔"

"تمہاری یہ مہربانی میں کبھی نہیں بھول سکتا۔" اسد نے کہا۔

کرم دین کچھ دیر تک وہیں کھڑا عجیب سی نظروں سے اسد کو دیکھتا رہا۔ پھر بولا، "تم ٹٹی نہیں کرتے ہو؟"

اسد نے پشیمان سی آواز میں جواب دیا: "نہیں۔"

"روٹی ساری کھا یا کرو۔" کرم دین نے کہا، "پھانسی تو چڑھتے ہی چڑھو گے۔ حرام موت کیوں مرتے ہو۔"

جب سپاہی جا کر اپنی چارپائی پر بیٹھ گیا تو اسد ہوا میں کمبل ہلا ہلا کر پیشاب کی بُو باہر نکالنے لگا۔

رات کے کسی وقت، سر پتھر پہ رکھے، گھٹنے چھاتی سے لگائے لیٹے لیٹے وہ یکدم اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ سوتی جاگتی ہُوئی حالت میں اُس کے ذہن کا کوئی پھنسا ہُوا پُرزہ کڑک کر کے اپنی جگہ پر جم کر بیٹھ گیا تھا، جیسے کوئی شہد کی مکھی جو بڑی دیر سے پھُول کے ایک نقطے پر نظریں جمائے بھنبھنا رہی ہو، آخر اُس نقطے پر آہستہ سے آکر بیٹھ جائے۔ وہ نکتہ دفعتہً اُس کی یاد کی گرفت میں آگیا تھا۔ اُس کی آدھ مچی آنکھیں کھُل گئی تھیں اور نیند آنکھوں سے غائب ہوگئی تھی۔ خدایا، کس قدر خراب کیا ہے مجھے اِس ایک بات نے، اسد نے اپنے آپ سے کہا۔ یاسمین کے بیان کا بنیادی جھُوٹ تو اس قدر صاف موجود ہے۔ یعنی اگر وہ میرے خلاف ہی بیان دینے پر آمادہ ہوگئی تھی تو اُس نے یہ کیوں نہ بتایا کہ میں بندوق مطب سے اُٹھا کر گھر میں لے گیا تھا؟ ہاں، اس بیان کی کوئی حقیقت نہیں۔ جب بھی لکھا گیا، جیسے بھی اور جہاں پربھی لکھا گیا غلط لکھا گیا ہے۔ بیان کی منطق میں ہی اتنا بڑا جھول ہے۔ اسد اپنی دریافت پر دل ہی دل میں خوش ہُوا۔ پھر اُس نے اپنے آپ کو ملامت کرنی شروع کردی۔ مَیں کیسے یاسمین کی نیت پر شُبہ کرسکتا تھا؟ میرے دماغ کو کیا ہوگیا ہے۔ اپنے دماغ پر مجھے توجہ دینی چاہیے۔ اِس کے بغیر کام نہیں چلے گا۔ یہاں سے نکلنے کی کیا صورت ہو؟ وقتی طور پر اسد کے جسم میں حرارت کی لہر دوڑ گئی تھی۔ یاسمین کے بیان کے بارے میں اُس کے ذہن سے ایک بوجھ اُتر گیا تھا۔ وہ کمبل میں ٹانگیں پھیلا کر دیوار کے ساتھ لیٹنے لگا۔ لیٹتے لیٹتے اندھیرے میں اُس کا اندازہ کچھ غلط ہوگیا جس وجہ سے اس کا ماتھا پتھر کے کنارے سے جا ٹکرایا۔ اُس کی آنکھوں کے سامنے تارے ٹوٹنے لگے اور اُس کا ہاتھ بے اختیار ماتھے کی طرف اُٹھا۔ ماتھا تر تھا۔ دہنی آنکھ کے اُوپر ایک ہلکا سا چیر آگیا تھا جس میں سے خُون ٹپک رہا تھا۔ اُس نے جلدی سے کمبل کا ایک کونہ زخم پر رکھا، مگر موٹے موٹے بالوں والا کھُردرا کمبل زخم کو چُبھنے لگا۔ اُس نے قمیض اتاری اور اُسے زخم کے اُوپر دبا کر بیٹھ گیا۔ یہ اور مصیبت کیا آن پڑی، اُس نے اپنے آپ سے کہا، پہلے کیا کم تھیں۔ ہر روز رات کو یہاں لیٹتا ہوں۔ آج کیا ہُوا۔ میرا دماغ کام نہیں کر رہا۔ اگر مَیں نے دلجمعی سے کام نہ لیا تو اسی طرح مارا جاؤں گا۔ یہ کوئی تک ہے ..... کافی دیر تک وہ قمیض کے گولے کو ماتھے پر دبائے دیوار کے ساتھ پُشت لگائے بیٹھا رہا۔ پھر اُس نے آہستہ آہستہ کپڑے کو ہٹایا اور انگلیوں سے ٹٹول کر زخم کو محسوس کیا۔ خُون بہنا بند ہوچکا تھا، مگر زخم ابھی گیلا تھا۔ قمیض بھی خُون میں گیلی ہوچکی تھی۔ اسد نے اندھیرے میں قمیض کا ایک خشک حصہ تلاش کرکے نکالا اور اُسے زخم پر جما کر قمیض کو سر کے گرد دو بل دیے اور کس کر گانٹھ لگا دی۔ پھر وہ آہستہ سے سر پتھر پر رکھ کر، کمبل کو اچھی طرح سے اپنے گرد لپیٹ کر سونے کے لیے لیٹ گیا۔

★ ★ ★ ★ ★

علی الصبح اسد نے سر پتھر سے اُٹھایا تو لوہے سے بھرا ہوُا معلوم ہُوا۔ وہ اُٹھ کر دیوار کے سہارے بیٹھ گیا۔ قمیض ماتھے کے زخم سے چمٹی تھی اور کئی جگہ سے خُون کے خشک دھبوں کی وجہ سے اکڑی ہوئی تھی۔ کچھ دیر کی کاوش کے بعد وہ قمیض کی پٹی کو زخم سے جُدا کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ اُس نے تھوک لگا کر زخم کے اُوپر کپڑے کو گیلا کرنے کی کوشش کی تھی مگر اُترتے اُترتے چمٹے ہوئے کپڑے کی تہہ سے خُون کا ایک باریک سا قطرہ زخم پر نمودار ہوگیا، جسے اسد نے قمیض سے جذب کیا۔ وہ چہرہ کو دیکھ نہ سکتا تھا مگر انگلیوں سے اُس نے محسوس کیا کہ تقریباً خشک ہوچکا ہے مگر ہلا نہیں، کنارے سُوج چکے ہیں اور اندر سے کچھ کچا گوشت ننگا ہوگیا ہے۔ اُس نے قمیض کا ایک خشک حصہ تلاش کر کے اُسے زخم پر رکھا اور اوُپر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گیا۔ اُس کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیا کرے۔

دن چڑھے سپاہی لال خاں بھوُرے رنگ کا شوربہ اور جوار کی روٹی لے کر آیا تو اسد کو دیکھ کر کھڑا رہ گیا۔ وہ باری باری خُون آلود قمیض، اسد کی ناک پر سُوکھے خُون کی لکیر اور پتھر پر گرے ہُوئے چند خون کے قطروں کو دیکھتا رہا۔

"یہ کیا کِیا ہے ؟" اُس نے پوُچھا۔

"چوٹ آگئی ہے۔" اسد نے جواب دیا۔

"کیسے ؟" لال خاں آنکھیں نکال کر بولا۔

"پتھر سے۔"

"دکھا۔"

اسد نے زخم سے کپڑا ہٹا دیا۔ سپاہی ہاتھ میں مٹی کا پیالہ اور روٹی پکڑے پکڑے پاؤں کے بل بیٹھ کر غور سے زخم کو دیکھنے لگا۔ دیکھتے دیکھتے اُس نے ہاتھ میں پکڑی ہُوئی چیزیں زمین پر رکھ دیں اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ کھڑا ہوکر وہ متلاشی نظروں سے کوٹھڑی میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اُس نے پاؤں سے کمبلوں کو اُٹھا کر دیکھا، پھر جا کر پیشاب کے برتن میں جھانکا، پھر زمین پر نظریں گاڑے تینوں دیواروں کے ساتھ ساتھ کوٹھڑی میں ایک چکر لگایا۔ مزید چند لمحوں تک اسد کو شکی نظروں سے دیکھنے کے بعد وہ خاموشی سے باہر نکل گیا۔

چند منٹ کے بعد دروازہ ایک آہنی جھنکار کے ساتھ کھلا اور تھانیدار اندر داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے سپاہی لال خاں اور ایک نیا سپاہی تھا جسے پہلے اسد نے نہیں دیکھا تھا۔ قیدی پر نظریں جمائے پہلے وہ تینوں آدمی پیشاب والے برتن کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ برتن میں جھانکنے اور پیر سے ذرا سا سرکا کر دیکھنے کے بعد تھانیدار اسد کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"کھڑا ہو۔" اس نے حکم دیا۔

اسد اٹھ کھڑا ہوا۔

"پیشاب کہاں ہے؟"

اسد نے لاعلمی کے انداز میں کندھے اچکائے۔ تھانیدار نے گھما کر ایک ڈنڈا اس کے چوتڑوں پر مارا۔

"پیشاب کہاں ہے؟" وہ چیخا۔

"مجھے نہیں پتا۔" اسد نے چیخ کر جواب دیا، "گرا دیا ہے۔"

"کہاں؟"

"اندھیرا تھا۔ مجھے نہیں پتا۔ اس طرف۔" اسد نے غیر معین سی سمت میں اشارہ کیا۔ وہ تینوں اسی سمت میں چل پڑے۔ پہلے انہوں نے ٹارچ کی مدد سے تمام نیم روشن کونوں کھدروں میں دیکھا، پھر ایک ایک انچ زمین کا جائزہ لیا۔ کمبل کے نیچے سے انہیں جوار کی روٹی کے چند خشک ٹکڑے ملے۔ پھر تینوں الگ ہو گئے اور اونچی دیوار کا قریب سے بغور ملاحظہ کرنے لگے۔ نئے سپاہی کی نظر روشندان پر پڑی تو اس نے لال خاں کو قریب آنے کا اشارہ کیا۔ جب لال خاں اس کے پاس پہنچا تو سپاہی گھوڑا بن کر کھڑا ہو گیا۔ لال خاں اس کے کندھوں پر پاؤں رکھ کر چڑھا اور سلاخوں کو مضبوطی سے پکڑ کر، بازوؤں کے زور پر اوپر اٹھا۔ سلاخوں کے ساتھ منہ لگا کر وہ روشندان سے باہر جھانکنے لگا۔ جب ساری کوٹھڑی میں ایک بھی گیلا نشان انہیں نظر نہ آیا تو تھانیدار پھر اسد کے سامنے آکھڑا ہوا۔

"پی گئے ہو، حرامی؟" وہ چیخا۔

اسد خاموش کھڑا اسے دیکھتا رہا۔

"حرام موت مرنا چاہتا ہے؟" تھانیدار نے ڈنڈے سے اس کے پیٹ میں ٹھوکا دیا، "یہ کیا کیا ہے؟" اس نے ڈنڈے کا سرا اسد کے ماتھے کے قریب لہرا کر پوچھا، "کیسے کیا ہے؟ کس چیز سے کیا ہے؟"

"پتھر لگا ہے۔" اسد نے کہا۔

"پھر تجھے لگاتا ہوں، بچے۔ اپنے آپ کو زخمی کر کے بدمعاشی کرنا چاہتا ہے؟ اُتار یہ شلوار۔"

اسد دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ تھانیدار نے ڈنڈے سے دونوں سپاہیوں کو اشارہ کیا۔ اسد نے مزاحمت کی کوشش کی، مگر سپاہیوں نے دونوں طرف سے اُسے قابو میں کر کے اُس کی شلوار الگ کر دی۔ ایک سپاہی نے شلوار اور قمیض گول کر کے بغل میں دبا لی۔ اسد کچھ دیر تک بازو لٹکائے کھڑا اُنھیں دیکھتا رہا، پھر کمبل اُٹھا کر اپنے گرد لپیٹنے لگا۔ تھانیدار نے ڈنڈا مار کر کمبل اُس کے ہاتھ سے گرا دیا۔

"کڑی ڈال دو۔" اُس نے سپاہی سے کہا۔ لال خاں جا کر دو زنجیریں اُٹھا لایا۔ کڑک کر کے ایک ہتھکڑی اسد کے دہنے ہاتھ کو لگا دی گئی، اور ایسا ہی ایک زنجیر والا کڑا اُس کے بائیں ٹخنے کے گرد ڈال کر بند کر دیا گیا۔ پھر زنجیروں کے دوسرے سروں والے کڑے دیوار میں نصب ایک تنگ اور موٹے سے کُنڈے میں ڈال کر "کڑک" بند کر دیے گئے۔ پتھر کی اوٹ میں زمین کے قریب، دیوار میں گڑے ہوئے اِس کُنڈے پر کئی بار اسد کی نظر پڑی تھی اور اُس نے سوچا تھا کہ خبر نہیں یہ یہاں پر کیوں لگا ہے؟

اب قیدی کی تلاشی شروع ہوئی۔ لال خاں نے اُس کے بالوں میں اُنگلیاں دوڑائیں، پھر کانوں کو کھینچ کھینچ کر اُن میں ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ "منہ کھولو۔" اسد نے منہ کھول دیا۔ زبان اُٹھوا کر، گالوں کو چٹکیوں میں بھر کر مسوڑھوں کے اندر دونوں طرف اُنگلی گھمائی گئی۔ اس کے بعد بازو اُٹھوا کر بغلوں کا معائنہ ہوا۔ پھر تھانیدار نے حکم دیا کہ جھک کر کھڑے ہو جاؤ۔ "یوں۔" اُس نے ڈنڈے کی مدد سے قیدی کے ہاتھ گھٹنوں پر جمائے۔ اُس کے چوتڑوں کے بیچ ٹارچ کی روشنی ڈالی گئی اور اُنگلیاں گھسا گھسا کر دیکھا گیا۔ فوطوں کے گرد سختی سے تلاشی ہوئی۔ جب متلاشیوں کی تسلی ہو گئی کہ کوئی بھی تیز دھار آلہ جسم کے کسی حصے میں پوشیدہ نہیں جس سے قیدی اپنے آپ کو نقصان پہنچا سکتا ہے تو وہ الگ ہو کر کھڑے ہو گئے۔ تھانیدار نے پٹی کرنے کا حکم دیا۔ نیا سپاہی باہر جا کر زرد دوائی میں بھیگا ہوا روئی کا تونبہ اور پٹی لے آیا۔ زرد دوائی سے سپاہی نے زخم کو صاف کیا اور اُسی روئی کو اُوپر رکھ کر پٹی باندھ دی۔ کوٹھڑی سے نکلتے نکلتے وہ پیشاب والا ٹین کا برتن بھی اُٹھا کر لے گئے۔ اُس برتن سے سخت نفرت ہونے کے باوجود اس وقت اسد کو یوں محسوس ہوا جیسے ایک سہارا اُس سے چھن گیا ہو۔ چار پانچ روز میں پہلی بار اُسے پیشاب اور پاخانے کی سخت حاجت ہوئی۔ کچھ دیر کے بعد جب نیا سپاہی مٹی کا ایک بڑا سا پیالہ لے کر آیا تو اسد کی حاجت غائب ہو چکی تھی۔ سپاہی مٹی کا برتن اُس کے قریب رکھ کر باہر چلا گیا۔ اسد کمبل اپنے اُوپر لپیٹے پتھر پر بیٹھا یہ سوچتا رہا کہ اب وہ کوٹھڑی میں کہاں تک پہنچ سکتا ہے۔ دو ایک بار اُس نے پورے زور سے زنجیروں کو کھینچا جس سے اُس کی کلائی اور ٹخنے میں درد ہونے لگا۔ کُنڈا ٹس سے مس نہ ہوا۔ اُس نے حساب لگایا کہ اگر زنجیریں اُس

کے دہنے ہاتھ اور دہنے پاؤں میں ہوتیں تو وہ کھڑا ہو کر اور ٹانگیں پھیلا کر سامنے والی دیوار کو ہاتھ لگا سکتا تھا۔ مگر دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں زنجیر بند ہونے کے باعث اُس کا دائرۂ حرکت کافی محدود ہو گیا تھا۔ اگر وہ اِس پتھر کو اُٹھا سکتا، اُس نے سوچا، تو اسے کنڈے پر گرا کر زنجیریں توڑی جا سکتی تھیں۔ مگر پتھر تو آدھا زمین میں گڑا ہے۔ اب کیا کروں؟

شام سے ذرا پہلے آہنی دروازہ مانوس جھنکار کے ساتھ کُھلا اور تھانیدار، ہیڈ کانسٹیبل کے ہمراہ اندر داخل ہُوا۔ ہیڈ کانسٹیبل کے ہاتھ میں میلے کپڑے میں لپٹی ہُوئی کوئی شے تھی۔ تھانیدار نے اُس کے ہاتھ سے لے کر کپڑا کھولا اور اسد کے سامنے پھیلا دیا۔ کپڑے میں رنگین دستے والا لمبا سا چاقو تھا جس کا آدھا پھل خشک خُون میں تقریباً ملفوف تھا۔ مچھلی کی شکل والے پیتل کے دستے میں سُرخ اور سبز رنگ کے متعدد چھوٹے چھوٹے چمکدار پتھر جڑے ہُوئے تھے۔

"اسے پہچانتے ہو؟"

"نہیں۔"

"تیرے کمرے سے برآمد ہوا ہے۔"

"کہاں سے؟"

"تیرے سونے کے کمرے میں؟" تھانیدار بولا، "کالے ٹرنک میں سے۔ کتابوں کے نیچے چھپا تھا۔ اسی طرح لپیٹا ہوا۔"

"مَیں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔" اسد نے کہا۔ پھر وہ لایعنی طور پہ بولا، "ٹرنک کو تالا لگا تھا۔"

"لے۔" تھانیدار نے کپڑے کے اُوپر دھرا ہوا چاقو آگے بڑھایا، "اچھی طرح سے پہچان۔ بول۔"

"مَیں نے اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ یہ میرا نہیں۔"

"ایگزامنر کی رپورٹ ہے کہ یہ انسانی خون ہے۔"

"ہو گا۔" اسد نے کہا، "میرا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ نہ یہ میرے ٹرنک میں تھا۔ پتا نہیں کہاں سے لے آئے ہو۔"

"تیری ماں کی بچہ دانی سے کھینچ کر لایا ہُوں۔ لے۔ یہ لے۔" اُس نے چاقو اسد کے ہاتھوں کی طرف بڑھایا، "پکڑ کے دیکھ اپنا چاقو۔"

"یہ میرا چاقو نہیں۔ تم جُھوٹا چاقو مجھ پہ ٹھونس رہے ہو۔" اسد دونوں ہاتھ پُشت پہ باندھ کر دیوار سے

لگ کر کھڑا ہو گیا۔ "مَیں کسی وکیل سے بات کرنا چاہتا ہُوں۔"

"وکیل سے۔" تھانیدار نے طنزاً دہرایا۔ "کسی وکیل سے۔ اچھا۔ ایڈووکیٹ جنرل کا انتظام نہ کر دوں تیرے لیے؟"

"یہ میرا حق ہے۔ تم مجھے اِس طرح یہاں نہیں رکھ سکتے۔ تم مجھ پہ تشدّد کر رہے ہو۔ مَیں نے کوئی جُرم نہیں کیا۔ مَیں صرف ایک گواہ ہُوں۔"

"اور یہ کیا ہے؟" تھانیدار چاقو کو اسد کی آنکھوں کے آگے لہرا کر بولا، "یہ۔ یہ۔ اور جب یاسمین کُل تیرے خلاف بھگتے گی تو پھر دیکھوں گا تیرا 'گواہ' کہاں گُھس جاتا ہے۔"

"تو بھگتاتے کیوں نہیں؟ مجھے عدالت میں پیش کیوں نہیں کرتے؟ مَیں بے قصور ہُوں۔ انصاف میرا حق ہے۔"

"اچھا؟ بہیمانہ مُجرم اب اِنصاف کا حق مانگتے ہیں؟ آج ہی تیرے لیے انصاف کا بندوبست کرتا ہُوں۔" تھانیدار سپاہیوں کی طرف دیکھ کر بولا، "تلاشی لو۔"

ایک بار پھر قیدی کی تلاشی سر کے بالوں سے شروع ہُوئی۔ کانوں میں روشنی پھینکی گئی۔ مُنہ کھولو۔ آگے جُھکو۔ بھدی کرخت اُنگلیاں اُس کے پوشیدہ حصّوں میں گُھستی اور نکلتی رہیں۔ پھر سپاہی بولا: "کوئی زخم نہیں۔ کوئی ہتھیار نہیں۔"

تھانیدار نے خُون آلود چاقو کو، ہاتھ لگائے بغیر، کپڑے میں لپیٹا اور ہیڈ کانسٹیبل کے ہمراہ باہر نکل گیا۔ کھٹاک سے آہنی دروازہ بند ہُوا اور مقفّل ہو گیا۔ قیدی نے کمبل زمین سے اُٹھایا اور جسم کے گرد لپیٹ کر پتھر پر بیٹھ گیا۔ زنجیروں سے ابھی وہ پُوری طرح مانوس نہیں ہوا تھا، چنانچہ بار بار انہیں کھینچتا، خاص طور پہ ہتھکڑی والی کو، کبھی آہستہ، کبھی زور سے، جیسے ہاتھ چُھڑانے کی کوشش کر رہا ہو۔ کئی بار اُسے خیال آیا کہ زنجیریں پڑ جانے سے کیا فرق پڑتا ہے، پہلے وہ کون سا آزاد تھا، صرف اِتنا ہوا ہے کہ اُس کا دائرۂ حرکت چھ آٹھ فٹ مربع سے گھٹ کر چار فٹ مُربع رہ گیا ہے۔ اگر وہ کسی طرح زنجیروں سے چھٹکارا حاصل کر بھی لے تو کہاں جائے گا؟ کوٹھڑی میں ہی مقید رہے گا۔ اپنے آپ کو اس طرح سمجھانے کے باوجود اُس کا ہاتھ نہ تھمتا۔ قطعی غیر ارادی طور پر اُس کا بازو بار بار پھڑک اُٹھتا، بار بار اپنی ہڈیوں اور پٹھوں سے اُس مضبوط آہنی زنجیر کو توڑنے کے لیے زور مارتا جس کو توڑنا نہ صرف ناممکن تھا بلکہ توڑنے کا کوئی فایدہ بھی نہ تھا۔ مگر اُس کے ہاتھ کی یہ کوشش سراسر خود کار تھی، جیسے کہ اس کی تحریک، اور اِس کا اشارہ اُس کے دماغ کے شعوری دائرے کے باہر سے آ رہا ہو۔ اس طرح ہاتھ کھینچتے کھینچتے وہ

تھک جاتا تو کسی لمبے خیال میں پڑ جاتا۔ آزادی کی خواہش کے طول و عرض کا شاید کوئی پیمانہ نہیں، اُس نے سوچا۔ دو فٹ کی آزادی ہو چاہے دو میل کی۔ تھوڑی دیر کے بعد سپاہی کرم دین، جو ڈیوٹی پر آ لگا تھا، مٹی کے پیالے میں بھورے رنگ کا شوربہ اور جوار کی روٹی لے کر آیا۔ اسے قیدی کے سامنے زمین پر رکھ کر وہ کھڑا دیکھتا رہا۔ اسد نے اُس کی طرف دیکھا تو وہ بولا :

"کھا لے۔"

"میرا جی نہیں کرتا۔" اسد نے کہا، "بھوک نہیں۔"

"کھا لے کھا لے۔ مر جائے گا کمزوری سے۔ کسی کھڈ میں ڈال کر اُوپر پتھر پھینک دیے گئے تو پتہ بھی نہیں چلے گا کہاں سے آیا کہاں گیا۔ طاقت قائم کرنے کی کوشش کر۔ اسی طرح بچے گا جب تک بچے گا۔"

"کچھ اور نہیں مل سکتا؟" اسد نے بھورے شوربے کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"شکر کر یہی مل رہا ہے۔ کھا لے۔"

شوربے کی متلی آور بُو سے بچنے کے لیے اسد نے سانس بند کر کے جو اُسے پینا شروع کیا تو غٹاغٹ آدھا پیالہ پی گیا۔ پھر وُہ روٹی کے نوالے توڑ توڑ کر، شوربے میں بھگو کر کھانے لگا۔

"میری پیشی ہو گئی تھی۔" سپاہی بولا۔

"کیوں؟"

"میرے پہرے میں تُو نے اپنا سر جو پھاڑ لیا تھا۔ اب کوئی بدمعاشی مت کرنا۔"

"اچھا۔" روٹی چباتے چباتے اسد نے اثبات میں سر ہلایا۔

جب کرم دین باہر چلا گیا تو اسد نے باقی روٹی کمبل کے نیچے چھپا دی اور شوربے کا پیالہ اُٹھا کر ایک طرف رکھ دیا۔ دانتوں میں زبان پھیرتے ہُوئے اُس نے سوچا، کرم دین ٹھیک کہتا ہے۔ اس وقت زندہ رہنا ہی اصل کام ہے۔ اگر طاقت ہی قائم نہ رہی تو یہاں سے کیسے نکلوں گا؟

بیٹھے بیٹھے تھک کر جب وہ لیٹنے لگا تو اُسے ایک ایسا مسئلہ درپیش ہوا جس کی طرف اُس کا خیال نہ گیا تھا : لیٹا کیسے جائے؟ پُرانی جگہ پر لیٹنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ جس جس جگہ اس نے لیٹنے کی کوشش کی، کبھی ہاتھ کی زنجیر کم پڑ جاتی کبھی پاؤں کی۔ زنجیروں کے دائرے کے اندر اندر اس نے ایک ایک جگہ پر لیٹ کر دیکھا۔ آخر سب سے آرام دہ جگہ جو اُسے ملی وہ پتھر کے دُوسری طرف، دیوار سے الگ، فرش پر آڑا لیٹنے کی تھی۔ اس جگہ پر بھی اُس کی بیڑی والی ٹانگ سیدھی نہ ہوتی بلکہ صرف تین چوتھائی کھلتی۔ اب جو وُہ

کمبل یہاں بچھا کر اور دُوسرا اوڑھ کر لیٹا تو اُسے عجیب سا محسوس ہونے لگا۔ کھُردرا کمبل اُس کے ننگے جسم کو ہر طرف سے چبھ رہا تھا۔ اِس کے علاوہ اُس کی بغلوں اور رانوں کے درمیان کوئی کپڑا نہ تھا اور اپنے ہی گوشت کا لمس اُسے اجنبی سا لگ رہا تھا۔ آخر جب ٹھنڈک اُس کے پاؤں کو چڑھنے لگی اور وُہ کمبل اوڑھے اوڑھے اُٹھ کر فرش پر کودنے لگا تو زنجیروں کی جھنکار نے رات کی خموشی میں شور برپا کر دیا۔ سپاہی گرم دریں لالٹین اُٹھا کر بھاگتا ہُوا آیا اور بتی اُٹھا کر سلاخوں سے اندر جھانکنے لگا۔

"کیا ہو رہا ہے؟" اُس نے سختی سے پُوچھا۔

"پَیر گرم کر رہا ہُوں۔"

"تیرے مادر چود پَیر——" سپاہی بدمزگی سے بولا، "روز ٹھنڈے ہو جاتے ہیں۔ انہیں کمبل میں لپیٹ۔ اور شور مت کر، ورنہ اندر آ کر پتھر سے باندھ دوں گا۔ پھر پیشی کروائے گا؟ بیٹھ جا۔"

اسد نے پتھر پر بیٹھ کر پہلے اپنے آزاد پَیر کو اُٹھا اُٹھا کر زمین پر مارا، اور جب وہ کچھ گرم ہو گیا تو اُسے کمبل میں لپیٹ لیا۔ پھر دُوسرے پاؤں کی زنجیر کو آزاد ہاتھ سے تھام کر پَیر زمین پر مارنے لگا۔ اس سے زنجیر کے بجنے کی آواز قدرے رُک گئی۔ ٹھنڈک اب اُس کے ننگے بدن میں سرایت کرتی جا رہی تھی اور جلد پر رونگٹے سر اُٹھا رہے تھے۔ اُس نے زمین پر بچھا ہُوا کمبل اُٹھا کر اوپر والے کمبل سے جوڑا اور اُن میں لپٹ لپٹا کر پتھر کے سہارے نیم دراز ہو گیا۔

آدھی رات کے وقت پہرہ بدل گیا۔ نیا سپاہی جو پہرے پر آیا اُس نے ایک نئی حرکت شروع کر دی۔ ہر آدھ گھنٹے کے بعد وہ لالٹین کھونٹی سے اُتارتا، دروازے کے پاس آ کر قیدی کو دیکھتا، پھر اپنی رائفل کا دستہ سلاخوں کے درمیان ڈال کر اُسے زور زور سے سلاخوں پر بجاتا، جیسے سکول کی گھنٹی بجا رہا ہو، اور ایک آدھ منٹ تک بجائے جاتا۔ پھر مُنہ سے کچھ بولے بغیر واپس جا کر لالٹین ٹانگ دیتا اور برآمدے میں پھرنے لگتا۔ قیدی ہر آدھ گھنٹے کے بعد، کبھی اونگھتا ہُوا کبھی وا آنکھوں کے ساتھ، اس شور سے چونک کر اُٹھ بیٹھتا۔ پَو پھٹنے سے کچھ دیر پہلے پہریدار نے سلاخیں بجانے کا سلسلہ بند کر دیا۔ اُس وقت اسد نے کچھ نیند کی۔ دو گھنٹے کی نیند میں بھی اُس کا بازو وقفے وقفے پر زنجیر کو چھوٹے چھوٹے، خود کار جھٹکے مارتا رہا۔

★ ★ ★ ★ ★

جب اسد کی آنکھ کھلی تو چاروں طرف گھپ اندھیرا تھا۔ اُس نے باہر دن کے شروع ہونے کی، لوگوں کے چلنے پھرنے کی آوازیں سنیں، مگر جہاں وہ پڑا تھا وہاں پر اُسے کچھ بھی نظر نہ آ رہا تھا۔ اس حالت میں لیٹے لیٹے اُس کا جسم اکڑ چلا تھا، چنانچہ اُس نے مشکل سے پہلو بدلا، زنجیر بکف بازو اور ٹانگ کو جہاں تک پھیلا سکتا تھا پھیلایا، اور نقاہت کے مارے سر بچھر پر رکھ کر پھر اونگھنے لگا۔ جب وہ اُٹھا تو اُس کے اردگرد ابھی اندھیری رات تھی۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بڑی لمبی نیند سے بیدار ہوا ہے۔ اُس نے حیرت سے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ ایک لحظے کے لیے اُسے خیال آیا کہ وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہے، ایسا خواب جس میں حقیقی اور غیر حقیقی کیفیتیں ایک ساتھ موجود ہیں، جیسے باہر دن کی آوازیں آ رہی ہیں، لوگوں کے باتیں کرنے کی، پرندوں کے اُڑنے کی، پاؤں کی چاپ، برتنوں کی کھڑک، دھوپ میں چمکتی ہوئی آوازیں، اور اندر یہاں پر اندھیری رات ہے۔

مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ میں جاگ رہا ہوں، اُس نے زنجیروں کو جھٹکا دیا۔ زنجیریں مجھے لگی ہیں، میری کلائی اور ٹخنے میں گڑی جا رہی ہیں۔ میں پہلو بدل کر سو رہا تھا۔ اب سیدھا ہو گیا ہوں۔ جو خواب میں ابھی دیکھ رہا تھا وہ بھی مجھے یاد ہے۔ کم از کم اس کا آخری حصہ مجھے یاد ہے۔ خواب وہ تھا۔ یہ حقیقت ہے.....

مگر اُس کے دل کا شک رفع نہ ہوا۔ کیا فی الواقع یہ حقیقت ہے؟ اس غیر حقیقی ماحول کے تاثر نے اسد کی روح پر نامیاتی ہراس طاری کر دیا۔ وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اُس نے پورے زور سے اپنی زنجیروں کو کھینچا۔ پیشاب والا برتن تلاش کر کے اُس میں پیشاب کیا اور اُٹھا کر پرے رکھ دیا۔ آج کتنے روز ہو گئے اجابت ہوئے؟ اُس نے سوچنے کی کوشش کی، مگر دنوں کا حساب اُس کے ذہن سے نکل چکا تھا۔ اُسے نہ دن یاد آ رہا تھا نہ تاریخ۔ اُس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ کون سے دن حکیم قتل ہوا تھا۔ وہ دن بھی اُسے یاد نہ آیا۔ یا اللہ، یہ ماجرا کیا ہے؟ اُس کے ہراس میں لحظہ بہ لحظہ اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اسد۔ اسد کریم، اُس نے زیرِ لب دہرایا۔ میں اسد کریم ہوں۔

شدید بے یقینی کی حالت میں اُس نے سوچا کہ اگر اس وقت اُس نے کچھ نہ کیا، ہاتھ پاؤں نہ مارے، تو اس خود رفتگی کی حالت میں شاید اُس کا وجود بھی تحلیل ہو جائے گا۔ اُس نے متعدد بار زور زور سے ہاتھ اور پاؤں کی زنجیروں کو جھٹکے دیے، پھر کان لگا کر سننے لگا، جیسے اس اشارے کے جواب کا متوقع ہو۔ اُس نے حکیم کے قتل کے دن والے واقعات کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ کئی واقعات اُس کو یاد آئے، مگر اُن کی ترتیب گڈمڈ تھی، ایک سلسلہ دار کڑی کی شکل نہ بنتی تھی، کوئی بعد میں آنے کوئی پہلے۔ مثلاً اُسے یاد نہ آ رہا تھا کہ یاسمین سے اُس کی ملاقات قتل سے

پہلے ہوئی تھی یا بعد میں، اور قتل کا آلہ اُس نے کہاں دیکھا تھا، کہاں رکھا تھا، پھر وہ آلہ کہاں سے برآمد ہوا تھا۔ اُسے اپنے جُرم کا شدید احساس تھا، ساتھ ہی اُسے اپنی بے قصوری کا بھی مدھم سا احساس تھا، مگر یہ احساس اُس کی گرفت میں نہ آرہا تھا۔ اِس ہراس کی کیفیت میں اپنی ذات کی شناخت کرنے اور اس کی نشان دہی کرنے کی خواہش بڑی شدت سے اُبھری۔ اسد کریم، اُس نے کہنا شروع کیا، مَیں اپنے علاج کی خاطر یہاں آیا ہُوں، اس گاؤں میں، گمشدہ ہیں، اور پکڑ کر قید کر دیا گیا ہوں، اِس تھانے میں ...... اُسے تھانے کا نام یاد نہیں آ رہا تھا۔ پھر یاد آ گیا۔ تھانہ کوٹ میر میں۔ تھانہ کوٹ میر کی حوالات میں۔ مجھے ہتھکڑی اور بیڑی ڈال دی گئی ہے، خطرناک مجرم کی طرح۔ آلۂ قتل ...... یکایک ہوا کے ایک ریلے سے دروازے میں روشنی کی ایک چوکور لکیر اُبھری اور قیدی کی آنکھیں تیزی سے پھسلتی ہوئی جا کر اُس پر گڑ گئیں۔ یہ کیا ہے؟ یہ تو کوئی کپڑا ہے، جیسے بھاری پردہ ہو۔ اُس کی نگاہیں تیزی سے مڑ کر روشندان پر پڑیں۔ اُسی ہوا کے جھونکے نے روشندان میں بھی باریک سی سفید چوکھٹ ڈال دی تھی۔ خدایا، باہر تو دن نکلا ہوا ہے۔ کون سا وقت ہوگا، دوپہر کا؟ یہ لوگ اب کون سا کھیل کھیل رہے ہیں میرے ساتھ۔ مجھے اندھیرے میں رکھنا چاہتے ہیں؟ ہاں، وُہ اپنے آپ سے ہنسا، مجھے اندھیرے میں رکھنا چاہتے ہیں۔ خُوب۔ یہ مجھے کیا ہو گیا تھا؟ کچھ یاد ہی نہیں آ رہا تھا۔ احمق! پیر کا دن تھا، اور اُسی رات کو حکیم قتل ہوا تھا۔ قتل سے پہلے یاسمین کو جنگل میں جا کر ملا تھا جہاں سے ہم بارش کے بعد واپس آئے تھے اور واپسی پر مطب میں روشنی دیکھ کر مَیں وہاں گیا تو مَیں نے میر حسن کو دیکھا تھا اور حکیم کی لاش اوندھے مُنہ پڑی تھی، اور میرے پاس کوئی ثبوت نہیں کہ میر حسن اس قتل میں ملوث تھا۔ اُس سے اگلے روز مجھے یہاں لایا گیا تھا، آج پانچواں یا چھٹا دن ہے، یا شاید ساتواں، اس حساب آج پیر یا منگل ہونا چاہیے۔ اور قتل کا آلہ مَیں نے نہ کہیں دیکھا ہے نہ رکھا ہے، مَیں نے کوئی جُرم نہیں کیا۔ مجھے یہاں قید میں رکھ کر تشدد کیا جا رہا ہے اور جھوٹا آلۂ قتل میرے اُوپر ٹھونسنے کی کوشش کی جا رہی ہے، مَیں بے قصور ہُوں، میرا ان لوگوں سے، ان کے معاملات سے کوئی تعلق نہیں، مَیں اپنے علاج کی خاطر یہاں آیا ہُوا ہوں اور اِس واقعے کا گواہ ہوں۔ بس۔ یااللہ! مجھے کیا ہو گیا تھا۔

چند منٹ کے خلفشار نے اُسے ہلا کر رکھ دیا تھا۔ اب اُس کے ذہن میں بکھرے ہُوئے الفاظ، گڈمڈ چہرے، واقعات چشم زدن میں جیسے مقناطیسی رَو کے دوڑ جانے سے کھٹاک کھٹاک اپنی اپنی اصلی جگہوں پہ جا کر جم گئے تھے۔ کافی دیر تک وہ اندھیرے میں بیٹھا اپنے حواس درست کرتا رہا۔ اُس کے دماغ کی روشن فضا نے نظر کی صفائی کو بحال کر دیا تھا، اور سینے سے ایک بوجھ کے اُٹھنے سے خوشی کی لہر اُس کے اندر دوڑ گئی تھی۔ کوٹھڑی

کا اندھیرا بھی اُس وقت اُسے تسکین بخش معلوم ہو رہا تھا۔ اتنے عرصے تک پہریداروں کی ننگی آنکھوں نے اُس کے اندر جو مستقل احساسِ خطر پیدا کر دیا تھا، تاریکی میں وہ کسی قدر معدوم ہو گیا تھا۔ اُس کے ننگے بدن کو تاریکی نے اپنی حفاظت میں لے لیا تھا۔ اسد کو ان کے پردہ لٹکانے پر کوئی شکایت نہ تھی۔ یہ ٹاٹ تو نہیں ہو سکتا، اُس نے سوچا، ٹاٹ خواہ کتنا بھی موٹا ہو اُس کے سوراخوں سے دن کی روشنی بند نہیں ہوتی۔ ہوا بھی خاصی تیز تھی، پردہ معمولی سا ہلا ہے۔ یا تو یہ کوئی بھاری چیز ہے، کمبل یا لحاف وغیرہ۔ یا اگر ہلکا کپڑا ہے تو چاروں کونوں پر کیلیں ٹھونک کر دروازے پر منڈھ دیا گیا ہے۔ مگر منڈھ کیسے سکتے ہیں، اندر نہیں آنا انھوں نے؟ کھانا دینے کے لیے، یا تلاشی لینے، پٹی تبدیل کرنے، دھمکیاں دینے، الزام لگانے کے لیے۔ کیا اب یہ مجھے بھوکا رکھیں گے؟ آخر روشنی بند کرنے کا کیا مطلب ہے۔ کہ یہیں مر جاؤں اور کسی کو پتا نہ چلے؟

اسد نے زور زور سے، ہاتھ اُٹھا اُٹھا کر زنجیروں کو کھینچنا اور زمین پر پٹخنا شروع کر دیا۔ دو تین منٹ تک برابر وہ کوٹھڑی میں اسی طرح شور برپا کرتا رہا۔ پھر رُک کر دروازے کو دیکھنے لگا۔ دروازے کے غلاف میں ذرا سی حرکت بھی نہ ہوئی۔ وہ دوبارہ دونوں زنجیروں کو ایک دوسری کے اوپر بجانے اور پھر زمین پر پٹخنے لگا۔ آخر دروازے پر روشنی کی ایک شعاع پیدا ہوئی۔ پردہ ایک طرف سے ذرا سا اُٹھا اور وہاں سے صرف دو آنکھیں اندر جھانکنے لگیں۔ قیدی نے ہاتھ روک دیا۔ ایک منٹ تک پہریدار کی آنکھیں پردے کی درز میں چمکتی رہیں، پھر غائب ہو گئیں۔ روشنی کی شعاع بند ہو گئی۔ کوٹھڑی میں تاریکی چھا گئی۔ قیدی نے پھر دونوں ہاتھوں میں زنجیریں پکڑ کر انھیں جھنجھنانا شروع کیا۔ جب پردے کا کونا اُٹھا تو وہ رُک گیا۔ دو آنکھوں نے خاموشی سے جھانکا، پھر پردہ گر گیا۔ اسد نے پھر زنجیروں کو کھینچ کھینچ کر بجایا اور رُک کر دروازے کو دیکھنے لگا، جیسے کسی بے زبان جانور سے کھیل رہا ہو۔ کچھ دیر کے بعد وہ اس کھیل سے اُکتا کر چٹخر کے ساتھ نیم دراز ہو گیا۔ اب اندر اور باہر مکمل خاموشی تھی۔ پہریدار کے قدموں کی چاپ بھی نہ تھی۔ سہ پہر کا وقت ہو گا، اُس نے سوچا۔ آج انھوں نے مجھے کھانا بھی نہیں دیا۔ کوئی آیا بھی نہیں۔ یہ کیا حکمتِ عملی ہے؟ پردہ سرکائے جانے سے بہر حال اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ایک بڑا سا لحاف ہے جو دروازے پر لٹکا ہے، کوئی ٹاٹ واٹ نہیں۔ اور لحاف کو صرف اوپر سے باندھا گیا تھا، نچلا حصہ اپنے بوجھ سے لٹک رہا تھا۔ لحاف سیاہ رنگ کا تھا، یا گہرے نیلے یا عنابی رنگ کا۔ بہر حال روشنی کو اس نے نہایت کامیابی سے بند کر رکھا تھا، ایک شعاع تک اندر نہیں آ رہی تھی۔ کیسا اندھیرا ہے، اُس نے اپنی آنکھوں کو تاریکی سے مانوس کرنے کی کوشش کرتے ہوئے سوچا۔ اب دیواروں کی مدھم مدھم حدیں پیدا ہو رہی تھیں۔ مگر اندھیرے میں فاصلے کا تعین نہ ہوتا تھا۔ کبھی یہ حدیں ہٹتے ہٹتے بہت دُور تک چلی جاتیں، اور کبھی معلوم ہوتا کہ بڑھتے بڑھتے

بالکل قریب آ گئی ہیں۔ ہوتے ہوتے وہ اندھیرا جو کچھ دیر پہلے ایک محفوظ اور آرام دہ گھروندے کی مانند اُس کے بے پردہ جسم پر محیط ہو گیا تھا، ایک تنگ و تاریک قبر کی صورت اختیار کرنے لگا۔ اُس کی سانس بھاری ہو چلی تھی۔ کچھ نہ کچھ کرنے کی خاطر اُس نے پیشاب والا برتن اندھیرے میں ڈھونڈ کر اپنے پاس کھینچا اور پاؤں کے بل اُس کے اوپر بیٹھ گیا۔ کافی دیر بیٹھنے کے بعد اُسے بہت تھوڑی مقدار میں، خشک سی اجابت ہوئی۔ پانچ چھ روز میں پہلی بار اُس کی انتڑیوں میں ذرا سی حرکت پیدا ہوئی تھی۔ اُس نے اطمینان سے برتن پرے رکھا اور پتھر کے اوپر بیٹھ گیا۔ مگر سانس کی گرانی ختم نہ ہوئی۔ اب دفعتاً اُسے خیال ہُوا کہ بالآخر سانس نے اُسے آ ہی لیا ہے، کب تک چھٹی منائے گا۔ سینہ بھرنے لگا تھا، سانس گھٹتی گھٹتی آدھی رہ گئی تھی۔ وہ پتھر پہ سر نیہوڑائے، کہنیاں گھٹنوں پہ رکھے بیٹھا حلق میں پھنسی ہُوئی جان کو چھوٹے چھوٹے، تیز تیز دھکے دیتا رہا۔ کافی وقت اسی طرح گزر گیا مگر دورے میں کمی نہ آئی۔

جب تھانیدار اور ایک سپاہی دروازے کا لحاف اٹھا کر، قفل کھول کر اندر داخل ہوئے تو اس نے ہاتھوں سے سر اٹھا کر ایک بار ان کی طرف دیکھا اور سر کو پھر ہاتھوں پر ٹیک دیا۔ سپاہی کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ قیدی کے پاس آ کر اُس نے لالٹین کی روشنی قیدی کے سر پر ڈالی۔ پھر سپاہی نے جھک کر ایک ہاتھ سے اُس کا کمبل جھٹک کر اُتارا، اور اُسے بازو سے پکڑ کر کھڑا کر دیا۔ پھر لالٹین کو اُس کے چہرے کے برابر لا کر اشارے سے مُنہ کھولنے کو کہا۔ اسد نے چند لمحے مُنہ کھُلا رکھا، پھر بند کر لیا۔

"زیادہ دیر تک مُنہ نہیں کھول سکتا۔" اُس نے کہا، "مجھے دورہ ہو رہا ہے۔"

سپاہی نے اُس کے نچلے جبڑے کو مضبوطی سے ہاتھ کی گرفت میں لیا اور انگلیاں گالوں میں گاڑ کر زبردستی اُس کا مُنہ کھولا۔ مُنہ کے اندر جھانک کر سپاہی لالٹین اٹھائے قیدی کے جسم کا معائنہ کرتا ہُوا چاروں طرف گھوم گیا۔ جب اسد گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر جھک کر کھڑا ہوا تو اُسے سانس میں ذرا آسانی محسوس ہُوئی۔

"آج ٹٹی کی ہے حرامی نے۔" سپاہی بدمزگی سے بولا۔ پھر وہ عقب سے نکل کر تھانیدار کے پاس آ کھڑا ہُوا، "کوئی زخم نہیں۔ کوئی ہتھیار نہیں۔" وہ بولا۔

"سیدھا ہو جا۔" تھانیدار نے حکم دیا۔

قیدی سیدھا کھڑا ہو گیا۔ تھانیدار نے جیب سے وہی تہہ شدہ ملگجا سا کپڑا نکالا اور اُسے کھول کر اندر سے رنگین دستے اور خون آلود پھل والا چاقو برآمد کیا۔

"اب بتا۔ اسے پہچانتا ہے؟" وہ چاقو کو قیدی کے مُنہ کے پاس لے جا کر بولا۔

"نہیں۔"

"تیرے کمرے سے برآمد ہوا ہے۔ کالے ٹرنک میں سے، نیلی جلد والی اردو انگریزی ڈکشنری کے نیچے

چھپا ہوا تھا۔"

"یہ میرا چاقو نہیں۔ میرے ٹرنک میں کہاں سے آ سکتا ہے؟"

"یہ چاقو تو نے شہر سے جس دکان پر خریدا تھا اس کا پتا بھی نکل آیا ہے۔ دکان والے نے تیری نشان دہی کی ہے۔"

قیدی نے نفی میں سر ہلایا۔

"کیا سر ہلا رہا ہے۔ منہ سے بول۔"

"میں زیادہ نہیں بول سکتا۔ میری سانس رکتی ہے۔"

یہ سن کر تھانیدار کی آنکھوں میں ایک حریصانہ چمک پیدا ہوئی۔ وہ ٹانگیں پھیلا کر، جم کر کھڑا ہو گیا۔

"بول نہیں سکتا تو سچ کیوں نہیں کہہ دیتا۔ تیرا چھٹکارا اسی میں ہے۔"

"میں سچ بول رہا ہوں۔" قیدی کا سینہ دھونکنی کی مانند چل رہا تھا۔

"سارے واقعات تیرے خلاف گواہی دے رہے ہیں۔ تو قانون کو مجبور کر رہا ہے کہ وہ تجھے سخت سے سخت سزا دے۔" تھانیدار نے کہا۔

"میرا اس چاقو سے کوئی واسطہ نہیں۔" اسد بولا، "واقعات کا گواہ صرف میں ہوں۔ واقعات میرے خلاف گواہی کیسے دے سکتے ہیں؟ یہ کیسا قانون ہے؟" اس کا دم پھول گیا۔

"یہ دیکھو۔" تھانیدار نے انگلی سے چاقو کے پھل پر خشک خون کے نشان کی طرف اشارہ کیا، "مقتول کی پشت پر زخم اتنا ہی گہرا ہے جتنا یہ نشان۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ آلۂ قتل یہی ہے۔"

"ہو گا۔ مجھے کچھ پتا نہیں۔"

"جب تو دوسری بار اپنی سکیم بنا کر لوٹا تو تو نے یہ چاقو اسی مقصد کے تحت خریدا۔"

ہمیشہ کی طرح، سانس کی یورش کے آگے، اسد کا ذہن دوپہر کی دھوپ کی مانند صاف شفاف تھا۔

"پہلے روز جو الزام تم نے لگایا تھا"، وہ بولا، "وہ تو یہ تھا کہ میں جب دوسری بار آیا تو میری سکیم صرف اس کے گھر کے اندر رسائی حاصل کرنے کی تھی۔ اب کہتے ہو میں آیا ہی ارادۂ قتل سے تھا؟"

"بالکل۔" تھانیدار بولا، "وہ تو اس وقت کی بات تھی جب تک آلۂ قتل برآمد نہیں ہوا تھا۔ اب معلوم ہوا ہے کہ تیری سکیم میں شروع سے ارادۂ قتل شامل تھا۔"

"جھوٹ۔"

"تو یہ چاقو تُو نے حکیم کا ختنہ کرنے کے لیے خریدا تھا؟ نہ تُو قصاب نہ شکاری۔ کس مقصد سے تُو نے یہ قیمتی چاقو خریدا؟"

"مَیں نے نہیں خریدا نہیں خریدا۔ میرا اس چاقو سے کوئی واسطہ نہیں۔ مَیں نے دیکھا بھی نہیں۔"

"اور جو دکاندار گواہی دے گا پھر؟ پھر بھی انکاری ہو گا؟"

"گواہی مَیں دُوں گا۔" اسد نے کہا، "گواہ مَیں ہوں۔"

اب اُس سے کھڑا نہ رہا جا سکا۔ وہ تھانیدار کے سامنے پتھر پر بیٹھ گیا۔ اپنا سر اُس نے ہاتھوں پر رکھ دیا اور مشکل سے سانس لینے لگا۔ تھانیدار نے جھک کر کپڑے پہ رکھا ہوا چاقو قیدی کی آنکھوں کے آگے کیا۔

"دیکھ۔ اچھی طرح سے اپنا چاقو دیکھ۔ تُو نے اِس سے ایک معصوم شخص کی جان لی ہے۔ دیکھ اس کو دیکھ۔ دیکھ یہ تیرا چاقو ہے۔"

سانس کی یورش سے اسد کا دل ڈوبنے لگا۔ اُوپر دیکھے بغیر اُس نے خاموشی سے نفی میں سر ہلایا۔ پھر دہنا ہاتھ اُٹھا کر، گویا تھانیدار کی بات کے جواب میں، پُورے زور سے ہتھکڑی کی زنجیر کو دو جھٹکے دینے، جس سے کوٹھڑی میں آہن کی جھنکار بلند ہُوئی۔ پھر اُس نے کہنی گھٹنے پہ رکھ کر سر ہاتھ پہ ٹیک دیا۔ سانس کو جاری رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے اُس کی نظر اپنے فوطوں پہ پڑی جو عجیب مُردہ شکل میں سُکڑے اور ایک طرف کو مڑے ہُوئے تھے، اور پہلی بار اُسے اپنی عُریانی کا احساس ہوا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے جو اُس نے بڑی مشکل سے ضبط کیے۔ تھانیدار نے احتیاط سے چاقو کپڑے میں لپیٹ کر جیب میں رکھا اور کوئی مزید بات کیے بغیر سپاہی کو لے کر باہر نکل گیا۔

جب وہ دروازے کو مقفل کر کے جا رہے تھے تو اسد نے اُٹھتے ہُوئے پردے سے باہر دُھوپ کو دیکھا اور اُس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ مگر برآمدے کے سایے کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ ابھی صُبح کا وقت تھا اور دوپہر میں کم از کم دو گھنٹے باقی تھے۔ لحاف کا پردہ گرا تو اندر تاریکی چھا گئی۔ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد وہ اُسی طرح پتھر پہ بیٹھا تھا کہ ایک سپاہی بھورے رنگ کے پھیکے شوربے کا پیالہ اور جوار کی روٹی لے کر داخل ہوا اور اُس کے پاس رکھ کر چلا گیا۔ ایک بار پھر اندھیرا ہو گیا۔ سانس کا یہ ریلا شدید تھا، کئی گھنٹے تک جاری رہا، پھر بہت آہستہ آہستہ اُترنے لگا۔ جب اِس کی شدّت میں کچھ کمی ہُوئی تو اسد نے اندھیرے میں ڈھونڈ کر شوربے کا پیالہ اُٹھایا اور روٹی چبا چبا کر گھونٹ گھونٹ شوربے کے ساتھ نگلنے لگا۔ جب سانس نے ذرا مہلت دی تو وہ کمبلوں میں سر لپیٹ کر سو گیا۔

کئی گھنٹے تک وہ بے سُدھ سویا رہا۔ نیند کے دوران اُس کی بچی کھچی سانس اُسے واپس مل گئی۔ جب وہ جاگا تو اُس کے پیٹ میں ہلکا ہلکا درد اُٹھ رہا تھا۔ کوٹھری میں رات پڑی تھی۔ باہر بھی ایک خاموشی کا عالم تھا۔ کسی آواز کی جُنبش نہ تھی، جیسے وقت تھم گیا ہو۔ یہ خیال کر کے اسد کو حیرت ہُوئی کہ شاید وہ دن بھر سوتا رہا ہے اور اب رات ہو گئی ہے۔ اندھیرے میں اس نے ہاتھ پھیلایا تو اُسے خالی پیالہ اور صبح کی روٹی کا بچا ہُوا ٹکڑا زمین پر پڑا ملا، جس سے اُسے اندازہ ہُوا کہ شاید ابھی رات نہیں ہوئی، رات کا کھانا نہیں آیا۔ جب لحاف کا پردہ اُٹھا اور دروازہ کھول کر تھانیدار اور سپاہی اندر داخل ہُوئے تو اسد نے دیکھا کہ دن کی روشنی ابھی قائم ہے۔

سپاہی نے اُس کی پٹی کھول کر زخم کو پیلی دوائی سے صاف کیا اور پٹی دوبارہ اُوپر باندھ دی۔ پھر حسبِ معمول لالٹین کی روشنی میں قیدی کی تلاشی ہُوئی۔ پھر وہی آلۂ قتل کی تکرار۔ قیدی نے کہا: "مَیں نے کچھ نہیں کیا۔ مَیں بے قصور ہُوں۔" تھانیدار نے زور سے گھٹنا اُس کی رانوں کے بیچ مارا اور باہر نکل گیا۔ وہ درد کے مارے دُہرا ہوتے ہوتے پتھر پر بیٹھ گیا۔ دروازہ دُرشتی سے بند ہُوا اور کوٹھری میں رات پڑ گئی۔ پیشاب کی بُو اب کوٹھری میں پھیلنی شروع ہو گئی تھی۔ باہر دن کی روشنی کی ایک جھلک نے اسد کو پریشان کر دیا تھا۔ جب تک لحاف نہ اُٹھا تھا اُسے گمان بھی نہ تھا کہ باہر روشنی اتنی تیز ہو گی۔ نیند میں اور کوٹھری کی رات میں کوئی فرق نہ رہ گیا تھا، جب کہ باہر دن کی روشنی ابھی قائم تھی۔ سونے اور جاگنے کا فرق مٹ چکا تھا، اور باہر کی دُنیا سے اُس کا رشتہ کٹ گیا تھا۔ زندگی ٹھہر گئی تھی۔ یا ختم ہو گئی تھی؟ پتھر پر بیٹھا وہ بار بار دروازے کی طرف دیکھتا۔ رات کا کھانا کب آئے گا؟ اُسے بھوک قطعاً نہ تھی، مگر لحاف کے پردے کا کونا اُٹھنے کی، دن کی روشنی کی کسی صورت کو دیکھنے کی، کسی آدمی کے اندر آنے اور قیدی کی زندگی کی تصدیق کرنے کی خواہش اُس کے دل میں پیدا ہو رہی تھی۔ ہر چند منٹ کے بعد وہ دہنے ہاتھ اور بائیں پاؤں کی زنجیروں پہ زور مارتا، جیسے کوئی مویشی رسّا تڑانے کی کوشش کر رہا ہو، کبھی آہستہ، کبھی اینٹھ کر، اور اپنی نیل زدہ کلائی اور ٹخنوں کی ہڈیوں پر لوہے کے کڑوں کی لذیذ کاٹ کا مزا لیتا، جیسے کہ دُنیا سے اُس کا تعلق اب ان زنجیروں کے واسطے سے ہی قائم تھا، باقی زندگی معدوم ہو چکی تھی۔ بیٹھے بیٹھے اُس پر یہ بھی انکشاف ہُوا کہ جب سے وہ جاگا تھا دل ہی دل میں تھانیدار کی آمد کا متوقع اور منتظر رہا تھا۔ اور جب اُس کی تلاشی ہو چکی، اور خون آلود چاقو کی تکرار ہو چکی، اور وہ یہ کہہ کر کہ مَیں بے قصور ہُوں اپنی مدافعت کر چکا، تو فوطوں پہ چوٹ کھانے کے باوجود، یا شاید اُس کے باوصف، اُس کے دل کو اطمینان سا ہُوا تھا، کہ جیسے کسی نے اُس کے وجود کو تسلیم کرنے کی حامی بھر لی تھی، خواہ کچھ دیر کے لیے ہی سہی، اگلے دن تک کے لیے، اگلی شام تک کے لیے۔ وقت؟ اُس نے زنجیروں کو جھنجھنا کر سوچا، اب سب سے اہم شے ہے۔ وقت کا مسئلہ سب سے اہم مسئلہ ہے، وقت پر قابو

پانے کا، وقت کاٹنے کا، وقت حاصل کرنے کا، وقت کا استعمال کرنے کا مسئلہ۔ دماغ کو متوازن اور نظر کو صاف رکھنا اصل مقصد ہے، اگر مزاحمت ہاتھ سے چھوٹ گئی، تو سب کچھ چھوٹ جائے گا، گواہی آخر میں نے دینی ہے، اُس وقت کے لیے مجھے تیار رہنا ہے، اپنے آپ کو حاضر دماغ رکھنا ہے، جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے، سچ سچ ہی ہوتا ہے، سب کہی ہوئی باتیں غلط تو نہیں ہوتیں، جب تک غلط ثابت نہ ہو جائیں۔ اور انہیں غلط ثابت کون کرتا ہے۔ وہ جو دماغ کو حاضر اور نظر کو صاف نہیں رکھتا، جو مزاحمت چھوڑ دیتا ہے۔ جی کا نہ چھوڑنا اصل بات ہے۔ اگر میں ان کے آگے کھڑا رہوں تو یہ لوگ میرا کچھ بھی نہیں کر سکتے، میں نے کچھ نہیں کیا، ان کے پاس کسی بات کا ثبوت نہیں، صرف وقت کی بات ہے، کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ وقت پر دسترس کیسے حاصل کی جائے؟ کوئی آتا کیوں نہیں۔ اب تو شام پڑ چکی ہوگی ....

جب سپاہی بھورے رنگ کا شوربہ اور جوار کی روٹی لے کر آیا تو قیدی نے ہاتھ بڑھا کر دونوں چیزیں اُس سے پکڑ لیں اور چبا چبا کر روٹی کھانے لگا۔ سپاہی صبح کا خالی برتن اُٹھا کر باہر نکل گیا۔ آہنی کنڈے کے لگنے کی کرخت آواز بلند ہوئی، پردہ اُٹھا اور گر گیا۔ اسد نے منہ روک کر ایک لمحے کے لیے باہر ملگجی شام کے رنگ کو دیکھا، پھر اندھیرے میں آہستہ آہستہ روٹی چبانے لگا۔ روٹی میں ملی ہوئی ریت کے ذرے جب اس کے دانتوں میں کرکرانے لگتے تو وہ شوربے کے گھونٹ سے نوالے کو نگل جاتا۔ اُسے آج تک پتا نہ چل سکا کہ شوربہ کس چیز کا ہوتا تھا، آلوؤں کا، دال کا، یا کسی سبزی کا۔ نمک اب گھٹتے گھٹتے نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ فضلے والے برتن کی بو تیز ہوتی جا رہی تھی۔ آدھا شوربہ پی کر اسد نے باقی کا زمین پر گرا دیا، اور اندھیرے میں پیشاب والے برتن کو شوربے کے خالی پیالے سے ڈھکنے کی کوشش کرنے لگا، تاکہ بو رُک جائے۔ مگر پیشاب والے برتن کا قطر بڑا نکلا۔ وہ آدھی بچی ہوئی روٹی کو ایک طرف پھینک کر، پتھر سے کمر لگا کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد پہرہ بدلا تو رات کو سلاخیں بجانے والا سپاہی پہرے پر آکھڑا ہوا۔ اسد کے پاؤں اور کندھے ٹھنڈے ہونے شروع ہو گئے تھے مگر اتنی سکت نہ تھی کہ اُٹھ کر کود پھاند کرتا۔ وہ اپنے آپ کو دونوں کمبلوں میں لپیٹے بیٹھا اونگھتا رہا۔ ہر آدھ گھنٹے کے بعد سپاہی لحاف کے پردے کا کونا اُٹھاتا، لالٹین اونچی کر کے قیدی کو دیکھتا، اور رائفل کا دستہ دو سلاخوں کے اندر ڈال کر زور زور سے بجانا شروع کر دیتا۔ رات کی خاموشی میں یکبارگی شور کا ایک طوفان کھڑا ہوتا اور اونگھتا ہوا قیدی چونک کر اُٹھ بیٹھتا۔ ایک منٹ کا وہ شور یوں لگتا جیسے کبھی نہ تھمے گا۔

آدھی رات کے قریب اسد اتنے زور سے چونکا کہ نیم خواب کی حالت میں گھٹنوں کے بل اُٹھ کھڑا ہوا۔ جس آواز نے اُسے چونکایا وہ پہرے دار کا شور نہ تھا۔ یہ کسی مرد کے چیخنے کی آواز تھی۔ پہلے یہ

آواز اتنے قریب سے آتی ہوئی معلوم ہوتی جیسے کوٹھڑی ہی میں سے آ رہی ہو۔ اسد نے دونوں ہاتھوں سے آنکھیں مل کر ادھر اُدھر دیکھنے کی کوشش کی۔ تاریکی میں اُسے کچھ نظر نہ آیا، مگر یہ پتا چل گیا کہ کوٹھڑی خالی ہے۔ اُس کے کان اُس آواز کا پیچھا کرتے کرتے دروازے تک گئے۔ آواز دروازے کے باہر سے آ رہی تھی۔ اُس ٹوٹی پھوٹی، بلبلاتی ہوئی آواز میں ایسی حیوانی سی پکار تھی کہ اسد بے اختیار اُٹھ کر دروازے کی طرف چل پڑا، مگر قدم اُٹھاتے ہی زمین پر آ رہا۔ اندھیرے میں اُس کے مُنہ سے گالی نکلی اور وہ چاروں ہاتھوں پاؤں پہ چوپاؤں کی طرح کھڑا کھڑا زور زور سے زنجیروں کو جھٹکے دینے لگا۔ آواز کسی جوان آدمی کی بھی نہ تھی بلکہ بھدی اور کرخت سی آواز تھی جس میں کسی چیخ کا توازن اور زیر و بم نہ تھا، بس پھٹتی اور بند ہوتی ہوئی بے ترتیب سی آواز تھی، جیسے کسی ادھیڑ عمر اکھڑ کسان کو اذیت دی جا رہی ہو، یا کوئی نزع کی حالت میں مشکل موت مر رہا ہو۔ اس آواز کے ساتھ کسی اور آواز کی، تماشائی یا حامی یا اذیت دینے والی آواز کی آمیزش نہ تھی بلکہ ایک ہی، تنِ تنہا فریادی کی بلبلاہٹ تھی، اتنی خوفناک کہ اسد کی روح اُس کے جسم کے اندر سکڑنے لگی۔ یہ آواز ایک تار، کبھی بھاری کبھی تیز اور باریک اور بند ہوتی ہوئی، ماں اور خدا اور آلاتِ تناسل کا نام لیتی، بے ترتیبی سے فریاد کرتی ہوئی اسد کے کانوں پر، اُس کے اعصاب پر یلغار کر رہی تھی، حتّٰی کہ وہ اس حیوانی کرب کو برداشت نہ کر سکا اور اُس نے کان اپنے ہاتھوں سے ڈھانپ لیے اور زمین پر اکڑوں بیٹھ گیا۔ آواز اب بھی آتی رہی، مگر دبی دبی۔ چند منٹ کے بعد آواز یکدم بند ہو گئی۔ اسد نے ہاتھ کانوں سے ہٹا کر اپنے سانس کی آواز کو سُنا۔ ایسا سکوت تھا کہ اُسے شک ہونے لگا کہ ابھی جو شور اُس نے سُنا محض اُس کا تصور تھا۔ وہ گھٹنوں کے بل گھسٹتا ہوا جا کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اُس کا دل اونچی آواز سے دھڑک رہا تھا۔ اس حملے نے اُسے اچانک آ لیا تھا، اُس کا دماغ بھرے ہوئے پھوڑے کی مانند تھرتھرا رہا تھا۔ خدایا، یہ کیسا دوزخ ہے۔ یہاں کوئی سُننے والا نہیں ہے۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ چیخیں پھر بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ اب ان میں ایک اور آواز بھی شامل تھی، دھپ دھپ کی آواز جیسے کوئی لکڑی کے بھاری تختے کو اُٹھا اُٹھا کر کسی چیز پہ مار رہا ہو۔ ہر ایک چوٹ کے ساتھ ایک کُوک خنجر کے باریک اور تیز پھل کی مانند سینے کو پھاڑ کر نکلتی اور دُور تک ہوا کو چیرتی ہوئی چلی جاتی۔ اُس وقت یہ آواز انسانی اذیت کی آواز ہوتی، جیسے ایک ایک کر کے ہڈیاں ٹوٹ رہی ہوں۔ پھر جب نیچے گرتی تو حیوانی وحشت کی گہری، گنگ تھرتھراہٹ میں بدل جاتی، جیسے مویشیوں کے باڑے سے کبھی زچگی کے کرب کی آوازیں آتی ہیں۔ اسد نے بوکھلاہٹ میں اپنی دونوں زنجیروں کو پکڑ کر کھینچا اور ایک دوسری کے اوپر بجانا شروع کر دیا۔ پھر وہ دیوار کے بہت قریب بیٹھ کر پورے زور سے زنجیروں کو پتھر پر پٹخنے لگا، جیسے کہ ان کا شور سن کر کوئی آ جائے گا اور اُن چیخوں کو بند کروا دے گا۔ مگر اُن کے سامنے زنجیروں

کے شور کی کوئی حقیقت نہ نکلی۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے زنجیروں کو چھوڑ کر دونوں کمبل اٹھائے اور اپنے سر اور مُنہ پر لپیٹ لیے، کمبلوں کے نیچے دونوں کانوں میں انگلیاں ٹھونسیں اور سر کو گھٹنوں میں دے کر بیٹھ گیا۔ آواز پھر بھی آتی رہی۔ اُس آواز کو، جو انگلیوں کے راستے بدن میں داخل ہو کر اُس کے دل کو کاٹ رہی تھی، روکنے کے لیے اُس نے سر گھٹنوں میں دبا دیا۔ جب آواز پھر بھی بند نہ ہوئی تو اُس کے دل پر درد کی جگہ بیکسی کا ایک خوف طاری ہونے لگا۔ گھٹنوں کے بیچ جھکتا جھکتا وہ زمین پر گر پڑا۔ زمین پر گر کر وہ بچوں کی طرح لوٹنے اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

آواز کچھ دیر تک، وقفے وقفے پر آتی رہی، پھر بند ہوگئی۔ اُس نے انگلیاں کانوں سے نکال دیں، اور تاریکی میں آنکھیں وا کیے، پہلو کے بل زمین پر بے سُدھ لیٹا رہا۔ کبھی کبھی کسی کیڑے پتنگے کی سرسراہٹ اُس کے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح لگتی، وہ چونک کر سر اُٹھاتا، اِدھر اُدھر دیکھتا، پھر سر زمین پر رکھ دیتا۔ ایک دو بار تھکاوٹ کے مارے اُس نے آنکھیں بند کیں، مگر فوراً ہی گھبرا کر کھول دیں۔ اُس کے وجود پر ہراس کا مکمل قبضہ ہو چکا تھا۔ کئی گھنٹے تک وہ اسی طرح کمبل اوڑھے زمین پر پڑا کسی خوفزدہ مویشی کی طرح کپکپاتا رہا۔ رات نکل گئی۔ باہر دن شروع ہونے کی آوازیں اُٹھنے لگیں، مگر اندھیری کوٹھری کے اندر قیدی آنکھیں کھولے زمین پر بے حس و حرکت پڑا رہا۔ جب تھانیدار اور ایک سپاہی لحاف کا کونا اٹھا کر اندر داخل ہوئے تو دھوپ کو دیکھ کر اُس کی آنکھیں چُندھیا گئیں۔ وہ اُٹھ بیٹھا۔ اُس کے دل میں مستقل ہلکا ہلکا درد اُٹھ رہا تھا۔ سپاہی نے ہاتھ بغلوں میں دے کر قیدی کو اُٹھایا اور لالٹین کی روشنی میں چاروں طرف سے اُس کی مکمل تلاشی لی۔

"کوئی زخم نہیں۔ کوئی ہتھیار نہیں۔" آخر میں سپاہی نے کہا اور ایک طرف کو کھڑا ہو گیا۔

تھانیدار نے جیب سے ملگجا تہہ شدہ بنڈل نکال کر احتیاط سے کھولا اور اُس میں سے خون آلود چاقو برآمد کیا۔

"یہ تیری امانت ابھی تک میرے پاس رکھی ہے۔" تھانیدار بولا۔

اسد خاموشی سے چاقو کو دیکھتا رہا۔ اُس کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا۔

"جب تک اسے تسلیم نہیں کرتا تیری امانت میرے پاس رہے گی، اور تو قید میں رہے گا۔"

"یہ میری امانت نہیں۔" اسد نے کہا، "تمہاری اپنی ہے۔"

"اِس پہ تمہارا نام لکھا ہوا ہے۔"

"کہاں؟"

"یہاں۔" تھانیدار نے انگلی سے خون آلود حصّے کی طرف اشارہ کر کے کہا، "اس خون میں تمہارا نام لکھا ہے۔"

"تم نے خود لکھا ہے۔" اسد نے کہا، "تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں۔"

"تمہارا جرم میرا ثبوت ہے۔ یہ جسم کا خون میرا ثبوت ہے۔ یا سین گل میرا ثبوت ہے۔ چاقو پر تمہاری ملکیت میرا ثبوت ہے۔ مسلم بازار کا مولوی محمد حسین دکاندار میرا ثبوت ہے۔ اور کوئی ثبوت مانگتا ہے؟"

"میں کوئی ثبوت نہیں مانگتا۔" اسد نے کہا، "مجھے عدالت میں پیش کرو۔"

اُس کی متوازن آواز میں ایک مستقل زیریں لرزش تھی۔

"عدالت میں بھی پیش کر لیں گے۔" تھانیدار مسکرا کر بولا، "ابھی تو ہمارے کاغذوں میں تیری گرفتاری ہی عمل میں نہیں آئی۔"

"کیوں؟"

"ہا ہا۔" تھانیدار سپاہی کی طرف دیکھ کر ہنسا، "پوچھتا ہے کیوں۔ اس لیے کہ تفتیش ابھی جاری ہے اور تو ابھی مفرور ہے۔ ثبوت ثبوت کرتے ہو، تیرے پاس کیا ثبوت ہے کہ تو یہاں پر موجود ہے۔"

"مجھ پہ تشدد ہو رہا ہے۔"

"کیا ثبوت ہے تیرے پاس کہ تشدد ہو رہا ہے؟"

"یہ۔" اسد نے اپنی زنجیریں اُسے دکھائیں۔ پھر ہتھکڑی کھسکا کر کلائی اُس کے آگے کی، جو کوڑے کی ضربوں سے سُرخ اور نیلی ہو کر سُوج چکی تھی۔ "اور یہ۔" اس نے اپنے ننگے غلیظ بدن کی طرف اشارہ کیا، "اس کے لیے ثبوت کی ضرورت ہے؟"

"بالکل۔" تھانیدار نے سر ہلا کر تصدیق کی۔ "ثبوت کے بغیر نہ تیرا وجود ہے نہ میرا، نہ اس مقدمے کا۔"

"میرا اور تمہارا تعلق تشدد پر قائم ہے۔" اسد نے کہا، "اس کے لیے ثبوت کی کوئی ضرورت نہیں۔"

"تشدد سے پہلے گرفتاری لازمی ہے۔ گرفتاری اُس وقت تک عمل میں نہیں آتی جب تک کارروائی درج نہ ہو۔ جب تک کارروائی درج نہیں ہوتی ہمارے پاس تیرا کوئی ثبوت نہیں۔ تو یہیں ہمارا ثبوت دے دے، ہم تجھے تیرا ثبوت دے دیں گے۔ جب تک تو جھوٹ بولتا رہے گا ہم تیرا وجود تسلیم نہیں کریں گے۔ یہاں صرف سچ کا وجود ہے۔ سچ کا۔"

"میں سچ بول رہا ہوں۔" اسد نے چیخ کر کہا، "دیکھ۔" اُس نے بازو تھانیدار کے سامنے پھیلا دیے۔

"دیکھ یہ میرا وجود ہے۔ تم اس سے انکار نہیں کر سکتے۔ میں بے قصور ہوں۔"

تھانیدار پھٹی پھٹی نظروں سے اُسے دیکھتا رہا۔ پھر اچانک تھکی ہوئی آواز میں بولا: "اچھا، بیٹا۔ یہاں سے نکل کر کہاں جائے گا۔ یہیں پڑا پڑا گل سڑ جائے گا۔" اُس نے احتیاط سے چاقو کپڑے میں لپیٹا اور جیب میں رکھ کر چل دیا۔ دروازے پر مڑ کر وہ بولا: "مشت زنی زیادہ مت کرنا۔ اندھا ہو جائے گا۔" اور باہر نکل گیا۔

قیدی تاریکی میں ہاتھ لٹکائے کھڑا کپکپاتا رہا۔ اُس نے اپنی زنجیروں کو جھٹکے دے دے کر کلائی اور ٹخنوں پر میٹھی میٹھی درد کو محسوس کیا، پھر کمبل اوڑھ کر پتھر پر بیٹھ گیا۔ نیند سے اُس کا سر چکر کھا رہا تھا، مگر اُس کی آنکھیں بند نہ ہوتی تھیں۔ بے اندازہ بوجھ سے اُس کے پپوٹے ایک لحظے کو گرتے تو وہ ایکدم نیم خواب کی حالت میں پہنچ جاتا اور وہاں عجیب وغریب بھیانک شکلوں والے جانور اُس کی طرف بڑھنے لگتے۔ وہ گھبرا کر آنکھیں کھول دیتا۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد جیسے جیسے ہمت اُس کا ساتھ دیتی، وہ اپنی زنجیروں کو کھینچتا، اُن پہ زور مارتا، پھر کس کس کر کے اپنے سر پہ لگاتا، کہ یہ گندگی کسی طور صاف ہو جائے۔ کبھی ایک زوردار جھٹکا کھا کر اس کا سر گھومنے لگتا، گو تاریکی میں اس کا احساس اُسے کم ہی ہوتا، صرف گول گول آتشبازی کے چکر اندھیرے میں ابھرتے، جس سے اُسے پتا چلتا کہ اُس کا سر گھوم رہا ہے۔ کبھی کبھی ان چکروں میں سے مختلف چہرے اُبھرتے: ادھ کھلی بے نُور آنکھوں والا اوندھے منہ پڑا ہوا چہرہ، بھیپھڑوں کے قدیم بخار سے چمکتی ہوئی آنکھوں والا ستا ہوا چہرہ، یا سپاہی کبھی اُس کے پاس آ کھڑی ہوتی، وہ سر جھٹک کر اس شبیہہ کو مٹا دیتا۔ لحاف کا کونا جب اُٹھا تو چکا چوند پیدا ہوئی۔ سپاہی نے اُس کے پاس آ کر بھورے رنگ کے پھیکے شوربے والا پیالہ زمین پہ رکھا اور جوار کی روٹی اُسے پکڑائی۔ پھر وہ باہر نکل گیا۔

پھیکے شوربے کے ساتھ کڑوی، بدبودار روٹی کھاتے ہوئے قیدی نے سوچا، کیا واقعی میرا کوئی وجود نہیں ہے؟ جھوٹ اور سچ کی اصلیت کیا ہے؟ میرا سچ اُن کا جھوٹ ہے، اُن کا سچ میرا جھوٹ۔ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے کیوں؟ یہ روٹی اس اندھیرے میں مجھے نظر بھی نہیں آ رہی، مگر یہ میرے ہاتھ میں پکڑی ہے اور میں اسے کھا رہا ہوں، اس کا مزہ چکھ رہا ہوں، دو سال پرانی کیڑا لگی جوار کی بنی ہے، میرا پیٹ خراب کرے گی مگر کچھ نہ کچھ گرمی بھی پیدا کرے گی۔ اس کی حقیقت سے انکار کیسے ہو سکتا ہے؟ اگر میرا وجود نہیں تو پھر تشدد کس پر کیا جا رہا ہے؟

اس خیال پر وہ دل میں حیران ہوا کہ اُس کے وجود کی تصدیق ہی تشدد سے ہوتی تھی۔ اگر میرا سچ، اُس نے سوچا، میرا وجود ہے، تو اس سچ کی بنیاد ہی تشدد پر پڑی ہے۔ ان کے "سچ" کا پول اُن کا تشدد ہی کھول رہا ہے۔ اندھیرے میں ڈال کر وہ مجھے گم نہیں کر سکتے۔

کئی روز کے بعد اُس کا ذہن اس وقت دن کی روشنی کی طرح صاف ہوا تھا۔ نیند اور درد کے اس عالم میں گویا اُس کے دماغ میں ایک نئی کھڑکی وا ہو گئی تھی۔ اُس کو محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ دُور نیچے تک دُنیا کی تہہ میں دیکھ سکتا

ہے اور ایسے جیسے بہت قریب سے دیکھ رہا ہو۔ بیٹھے بیٹھے اُس کا کمبل ڈھلک کر کندھوں سے نیچے جا گرا تھا، مگر اس کے کندھے سرد نہ ہوئے، یوں جیسے اُس کے اندر والی دھوپ کی حدت سارے جسم میں پھیل رہی تھی۔ اُس کے جسم کی باریک کپکپاہٹ غائب ہو چکی تھی۔ اُس نے دیوار سے ٹیک لگانے کی ضرورت بھی محسوس نہ کی۔ اپنے بدن کا بوجھ آسانی سے سہارے، پتھر پہ آنکھیں کھولے بیٹھا وہ اُس بلوریں منظر کو دیکھتا رہا۔ کوٹھڑی کی متعفن تاریکی معدوم ہو گئی تھی۔ اُس کی جگہ اب اُس کی آنکھوں کے سامنے اُس بے سایہ، روشن مکعب کی فضا تھی جس میں نظر آ رہا جاتی تھی اور وسط میں پتھر پہ بیٹھے ہوئے قیدی کی قدیم تشبیہ گڑی تھی جس کے ہاتھ اور پاؤں میں زنجیریں پڑی تھیں، مگر جس کے بیٹھنے کا انداز نہ بدلا تھا، سر میں جنبش نہ آئی تھی۔ اُس کے سامنے یاسمین کا چہرہ، جو کچھ عرصے تک دھندلایا رہا تھا، اب صاف ہو چلا تھا۔ بیچ مانگ نکلے ہوئے چوڑے سے سر اور کھلی کھلی آنکھوں والا لمبا اور پتلا، متبسم چہرہ......

جب دروازہ کھلا تو اسد اُٹھ کھڑا ہوا۔ باہر شام پڑ رہی تھی۔ تھانیدار اور سپاہی قیدی کو اس طرح کمبل اتارے تیار کھڑا دیکھ کر ٹھٹک سے گئے۔ تھانیدار کی آنکھوں میں اُمید کی چمک پیدا ہوئی۔

"کیوں،" وہ بولا، "تیار ہو؟"

"کس کے لیے؟"

تھانیدار کی آنکھوں کی چمک ماند پڑ گئی۔ وہ اپنی جیب تھپتھپاتے ہوئے بولا: "اس کی ملکیت تسلیم کرنے کے لیے۔"

"تم تشدد کرنے آئے ہو۔" اسد نے کہا، "کرو اور جاؤ۔ میری کوئی ملکیت نہیں۔ میں بے قصور ہوں۔"

تھانیدار کے منہ سے ایک گالی نکلی۔ سپاہی نے لالٹین زمین پر رکھ دی اور غیر معمولی درشتی سے قیدی کی تلاشی شروع کر دی۔ جب وہ آگے جھک کر کھڑا تھا تو سپاہی کی اُنگلی کے ٹھوکے سے گھٹنوں کے بل زمین پہ آ رہا۔ پھر تھانیدار گول لپٹا ہوا کپڑا جیب سے نکالے بغیر سپاہی کو لے کر باہر نکل گیا۔ اُس رات کو بھورے رنگ کا شوربہ بھی کڑوا تھا۔ اسد نے ایک گھونٹ چکھا اور زمین پہ گرا دیا۔ روٹی اس نے خالی پیالے میں رکھ دی۔ اُس کے پیٹ میں درد کی لہریں برابر اُٹھ رہی تھیں۔ وہ پتھر پہ بیٹھا بوجھل آنکھوں سے دروازے کی جانب دیکھتا رہا۔ خلافِ معمول آج نہ لحاف اُٹھا نہ کسی پہرے دار نے سلاخیں بجائیں۔ اس موت کے سے سکوت میں اسد کے دل میں وسوسے سر اُٹھانے لگے۔ کئی بار اُس نے بازو کی حرکت سے زنجیر کو اُٹھا اُٹھا کر پتھر پہ مارا، مگر دروازے پر جنبش نہ ہوئی۔ اب اُس کے پاؤں ٹھنڈے ہونے لگے تھے۔ اُس نے ایک کمبل نکال کر ٹانگوں پہ لپیٹ لیا۔ دوسرا کمبل اُس نے سر اور کندھوں پہ ڈالا اور اُس کے اندر آنکھیں بند کرنے کی کوشش کی۔ مگر اندر کے اندھیرے کے عفریت بھی باہر کے اندھیرے کے سے پُرخطر

نکلے۔

رات کے کسی وقت دروازہ کھلنے کا شور ہوا۔ قیدی نے سرکمبل سے نکال کر دیکھا۔ سفید کپڑوں میں ملبوس ایک اجنبی، لالٹین اٹھائے دروازہ بھیڑ کر اُس کی طرف آرہا تھا۔ پہرے دار نے باہر سے دروازہ مقفل کر دیا، اور پردہ گرا کر غائب ہو گیا۔

★ ★ ★ ★ ★

اجنبی شخص اسد کے سامنے کھڑا تھا۔ اسد نے آنکھوں پہ زور دے کر دیکھا تو اُسے یاد آیا کہ یہ وہی شخص تھا جو پہلے یا دُوسرے روز اُس کی پیشی کے وقت تھانیدار کے دفتر میں موجود تھا، اور جس کو وہ اس سے پہلے بھی کہیں دیکھ چکا تھا۔ اُس شخص نے لالٹین زمین پر رکھ دی اور تعفّن کی وجہ سے ناک سکیڑ کر کوٹھڑی میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ اُس کی نظر فُضلے کے برتن پر پڑی۔ ایک قدم آگے بڑھ کر اور ذرا سا جھک کر اُس نے غور سے برتن کو دیکھا اور جیب سے رومال نکال کر ناک پر رکھ لیا۔ پھر وہ برتن کی طرف پُشت کر کے کھڑا ہو گیا۔

"میرا نام ذوالفقار ہے۔" وہ بولا۔

ابھی اُس نے اپنا جملہ بھی پُورا نہ کیا تھا کہ اسد کو یاد آیا کہ اُس نے کہاں اُس شخص کو دیکھا تھا۔ اُس کا ذہن کئی برس، اور سیکڑوں کوس، پیچھے کی طرف دوڑ گیا اور وہ حیرت زدہ آنکھوں سے بیٹھا اُسے دیکھتا رہا۔ اس شخص کو اسد نے اپنے شہر کے سکول میں دیکھا تھا۔ جب وہ چھٹی میں پڑھتا تھا تو چند مہینے کے لیے یہ آدمی بڑی جماعتوں کا اُستاد مقرر ہو کر اُن کے سکول میں آیا تھا۔ وہ غالباً نویں اور دسویں درجے کو کوئی مضمون پڑھایا کرتا تھا اور جلد ہی نوکری چھوڑ کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ اُن قصباتی سکولوں میں ایسے نوجوان اُستاد اکثر آتے جاتے رہتے تھے جو وقت گزارنے کی خاطر یا کسی مجبوری کی بنا پر تھوڑی دیر کے لیے سکول کی نوکری لے لیتے تھے اور پھر بہتر موقع ملنے پر ــــ یا اس کی تلاش میں باہر نکل جاتے تھے۔ ایسے اُستاد سکولوں اور طالب علموں کے مخصوص ماحول کے ساتھ کوئی مستقل تعلق قائم نہ کر پاتے تھے۔ مگر اس آدمی کی شکل اسد کو یاد رہی تھی۔ اُس کی گول گول چمکدار آنکھیں اُس کے چہرے پر ایک دُوسرے کے بہت قریب

واقع نہیں، اور گو اُس کا سر بڑا ساتھا مگر گھنے بال، جن میں تقریباً آدھے سفید ہو چکے تھے، ایک سیدھی لائن میں اُس کے ماتھے پر نیچے تک اُگے ہوئے تھے، جس سے اُس کا ماتھا ایک تنگ سی چوڑی ٹکڑی کی شکل اختیار کر گیا تھا۔ اُس کی عُمر کا اندازہ مشکل سے ہوتا تھا، گو ظاہر تھا کہ پچیس تیس کے لگ بھگ ہوگی۔ اُس کے جوان چہرے کے اُوپر سفید اور مضبوط بالوں کی فصل نے اُس کی شکل میں ایک ایسی خاصیت پیدا کر دی تھی جو ایک بار دیکھ لینے کے بعد دوبارہ دیکھنے پر مجبور کرتی تھی۔

"آپ پولیس کے آدمی ہیں؟" اسد نے پوچھا۔

"نہیں۔ مَیں سرکاری ملازم ہُوں۔ پولیس سے میرا براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ سب انسپکٹر کلیم اللہ خان میرا دوست ہے۔"

"پیشاب والے برتن کو آپ صاف کروا سکتے ہیں؟" اسد نے اُس کی بات کاٹ کر پُوچھا۔

"کوشش کروں گا۔" اُس نے ایک نظر پیچھے کی طرف ڈال کر مُنہ پھیر لیا، "تم فضل آباد کے ہو؟"

"ہاں۔ آپ چند مہینوں کے لیے ہمارے سکول میں آئے تھے۔ مَیں اُس وقت چھٹی میں تھا۔"

ذوالفقار کے لہجے میں ہلکی سی گرمجوشی پیدا ہُوئی۔ "تمہاری یادداشت اچھی ہے۔"

"آپ بھی فضل آباد کے ہیں؟" اسد نے پوچھا۔

"نہیں، مَیں واصل پور کا رہنے والا ہُوں۔ اگلے روز مَیں نے تمہیں سب انسپکٹر کے دفتر میں دیکھا تھا۔ آج مَیں نے خان صاحب سے چند منٹ کے لیے تم سے مِلنے کی اجازت لی ہے۔"

"کیوں؟"

وہ قیدی کے اس سوال پر چونک پڑا۔ "تُم میرے علاقے کے آدمی ہو آخر۔ میرا حق بنتا ہے کہ تمہارے بارے میں دریافت کروں۔ اس کے علاوہ تم ایک تعلیم یافتہ آدمی ہو اور یہاں پر اجنبی ہو۔ تم جیسے لوگ عموماً ایسے جرائم کے مرتکب نہیں ہوتے۔ تاہم۔"

"مَیں نے کوئی جرم نہیں کیا۔"

"تاہم سارے حالات تمہارے خلاف جا رہے ہیں۔"

"حالات کی گواہی آدمی کی گواہی سے برتر ہوتی ہے؟" اسد نے پُوچھا، "مَیں گواہ ہُوں۔"

"جب گواہ ایک ہی ہو، اور وہ مشتبہ یا مجرم کی نشان دہی نہ کر سکے، تو قانون کو واقعاتی شہادت کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ تم صرف یہ کہہ کر تو نہیں چھُوٹ سکتے کہ مَیں گواہ ہُوں اور مجھے کچھ پتا نہیں۔"

"میں جرم کا گواہ نہیں، موقعے کا گواہ ہوں۔"

"تو پھر تمہاری بھی واقعاتی شہادت ہوئی اور اُن کی بھی واقعاتی شہادت۔ سوال یہ ہے کہ کس کی بات مانی جائے۔"

"میں حقیقت بیان کر رہا ہوں۔"

"کیسی حقیقت؟" ذوالفقار نے سوال کیا۔ اُس کے لہجے میں گرمجوشی کے اثرات غائب ہونے لگے تھے اور آنکھوں میں ایک دُوری کی کیفیت پیدا ہونی شروع ہو گئی تھی۔ "حقیقت کے کئی درجے ہوتے ہیں۔ ہر آدمی کی حقیقت اس کے اپنے حالات اور واقعات سے بنتی ہے۔ آج یہ لوگ تمہارا جرم ثابت کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو قطع نظر اس کے کہ فی الواقع تم نے جرم کیا ہے یا نہیں، تم درحقیقت مجرم قرار پاؤ گے اور مجرم ہی تسلیم کیے جاؤ گے۔ تم پولیس کے ساتھ تعاون کیوں نہیں کرتے؟"

"کیسا تعاون؟"

"مجھے علم ہے کہ اس کیس میں کچھ اور لوگ بھی مشتبہ ہیں۔ تم کسی نہ کسی طرح ان کی نشان دہی کر کے پولیس کی مدد کر سکتے ہو۔"

"میں کسی پر جھوٹا الزام نہیں لگا سکتا۔ جس بات کا مجھے علم نہیں میں کیسے اسے بیان کرنے کا دعویٰ کر سکتا ہوں؟"

"جھوٹے الزام کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں پولیس کی مدد کرنے کا سوال ہے۔ سچائی صرف وہی نہیں ہوتی جو تم نے دیکھی اور جس کا علم تمہارے حافظے میں ہے۔ سچائی ہمیشہ کھوج کر نکالنی پڑتی ہے۔ اسی لیے پولیس کے بعض اقدام ہمیں ناانصافی پر مبنی نظر آتے ہیں، مگر ان کے کام کا جائزہ لیں تو پتا چلتا ہے کہ کس قدر مشکل سے ان کا سابقہ ہے۔ تمہارے جیسے گواہوں کی مدد کے بغیر وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ تمہارا فرض ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ان کی مدد کرو۔ آگے سزا اور جزا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

"تو یہ کیا ہے؟" اسد نے ہاتھ کے جھٹکے سے زنجیر کو کھینچا، "اگر سزا اور جزا اللہ کے ہاتھ میں ہے تو یہ سزا کس جرم کی ہے؟"

"بیوقوفی کے جرم کی۔ خدا نے تمہیں اپنے دماغ پہ اختیار دیا ہے۔ مزاحمت تو سب سے زیادہ پتھر کے بت میں ہوتی ہے، مگر ہتھوڑے کی ضربوں سے آخر بت ریزہ ریزہ ہو جاتا ہے۔ انسان کی برتری یہ ہے کہ اللہ نے اسے دماغ دیا ہے۔ عقل استعمال کرو۔ قانون کے کل پرزوں کی مدد کرو اور خود بچ کر نکل جاؤ۔ اگر تم اپنی جان بچانے میں کامیاب ہو جاؤ تو یہی تمہاری بے گناہی کا ثبوت ہو گا۔"

"آپ کی بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔" اسد نے کہا، "آپ کے خیال میں جو بچ نکلتا ہے وہ بے گناہ ہوتا ہے اور جو مارا جاتا ہے وہ گناہ گار؟ یہ تو قانون کو اُلٹا لٹکانے والی بات ہے۔"

"اونہوں۔" رومال کو ناک پر رکھے رکھے ذوالفقار نے نفی میں سر ہلایا، "اُلٹا لٹکانا تو درکنار، مَیں قانون کی بات ہی نہیں کر رہا۔ مَیں تم کو زندگی کا طریقہ بتا رہا ہُوں، جو قانون سے کہیں زیادہ اہم ہے۔ قانون اقتدار کی ایک شاخ ہوتی ہے۔ جب اقتدار کا عہد بدلتا ہے تو قانون بھی بدل جاتا ہے مگر زندگی کا طریقہ ہمیشہ ایک سا رہتا ہے۔ زندگی میں حالات سے حتی الوسع بچ نکلنا ہی اصل حکمت ہے۔"

اس کی باتوں نے اسد کو بھول بھلیوں میں ڈال دیا تھا۔ حقیقت کی ایک انوکھی شکل اس کے سامنے آئی تھی جو اس کے ذہن کو پھسلا رہی تھی گو اپنے دل کی کسی تہہ میں اس کو یہ شک تھا کہ یہ بات سچ نہیں ہو سکتی یا اگر سچ ہے تو درست نہیں ہے۔ مگر اس شخص کی باتوں میں ایک خاص قسم کی کشش تھی جس نے، اس حالتِ غیر میں بھی، اسد کے ذہن کو اپنی طرف مائل کر لیا تھا۔ بے انتہا تھکاوٹ کے باوجود وہ چاہتا تھا کہ یہ شخص اپنی گفتگو جاری رکھے۔ اس کے ذہن کو یہ باتیں جیسے تھپکیاں دے دے کر آرام پہنچا رہی تھیں۔

"مگر میری حالت سے ان باتوں کا کیا تعلق ہے؟" اس نے کہا، "عہد۔ اقتدار۔ قانون۔ میرا ان سے کیا واسطہ ہے؟ مَیں تو یہاں — " اس نے ہتھکڑی کی زنجیر کو جھٹکا دیا، " — قید ہُوں اور مجھ پر تشدد ہو رہا ہے۔ مجھے آج تھانیدار نے بتایا ہے کہ سرکاری طور پر میری گرفتاری ہی عمل میں نہیں آئی۔ گویا مَیں یہاں پر موجود ہی نہیں ہُوں۔ یہاں کوئی سننے والا نہیں ہے۔"

"بالکل،" اجنبی نے صبر سے سر ہلایا، "یہاں کوئی سننے والا نہیں۔ تم نے پھر کنوئیں کے مینڈک کی سی بات کی ہے۔ اپنی ذات کی تکلیف کو تم ہر شے پر فوقیت دے رہے ہو۔ یہ ایک انتہائی خود غرض نقطۂ نظر ہے۔ تمہاری ایک آدمی کی مزاحمت آخر کیا اہمیت رکھتی ہے۔ کیا تمہارا یہ فرض نہیں کہ تم اپنی افتاد کو پرے رکھ کر اجتماعی جدوجہد میں حصہ لو؟"

"کیسی اجتماعی جدوجہد؟" اسد نے کہا۔

"یہاں سے بچ کر نکلنا تمہارا اوّلین فرض ہے۔ اس کا راستہ مَیں نے تمہیں بتا دیا ہے۔ یہاں سے جان چھڑانے کے بعد تمہارے آگے ایک ہی راستہ ہے۔ اجتماعی جنگ تاکہ انصاف کی کوئی شکل پیدا کر سکو۔"

"کیسے؟"

"تم اس خطّے کے حالات سے ناواقف نہیں ہو۔ یہاں ایک عظیم جدوجہد جاری ہے، آج سے

نہیں، بیس سال سے ــــ پچاس سال سے۔ اس جدوجہد کے پیچھے حق اور باطل کی جنگ ہو رہی ہے۔ کسانوں کی، مزدوروں کی، چرواہوں کی، لکڑہاروں اور دستکاروں کی جنگ۔ یہ بدقسمت لوگ جو پیسوں کے عوض ایک ہاتھ سے دوسرے کو بیچے گئے ہیں اور بندوقوں سے ہانکے جا رہے ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ان کی مدد کریں۔"

"کیسے؟" اسد نے دہرایا۔

"جیسے بھی کر سکتے ہیں۔ ہر ایک طریقے سے۔ اگر جان بھی دینی پڑے تو کیا۔ جان کی کیا قیمت ہے؟" ذوالفقار نے ایک لمحے کو رُک کر متلاشی نظروں سے اسد کی آنکھوں میں دیکھا، پھر ذرا سے بدلے ہوئے لہجے میں بات جاری رکھی، "تم اگر یہاں سے کبھی بچ نکلے تو ہماری بہت مدد کر سکتے ہو۔"

"آپ کی؟" اسد نے حیرت سے پوچھا۔ "کس طرح؟"

"سرحد پار بھیجنے کیلئے ہمیں عموماً گنوار کسان ملتے ہیں۔ جو یا تو پکڑے جاتے ہیں یا بیکار وقت گزار کے واپس آجاتے ہیں۔ تمہارے جیسے پڑھے لکھے لوگ۔۔۔۔"

"آپ فوج میں ہیں؟" اسد نے پوچھا۔

"اس بات کو چھوڑو کہ میں کس محکمے میں ہوں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ ہم ان لوگوں کے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ اگر ہم انہیں ان کے حقِ خود ارادیت کی ذرا سی پہچان بھی کرانے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ ہم نے بیک جنبش اس چالیس لاکھ آبادی کو زمانۂ جہالت سے نکال کر بیسویں صدی میں پہنچا دیا ہے۔"

اسد ہکا بکا رہ گیا۔ یہ شخص میرے پیچھے گُنبد گیا تھا؟ حکیم نے اس سے کیا کہا ہوگا؟ یہ کس کی ملازمت کرتا ہے۔ پولیس کی؟ فوج کی؟ یا کسی اور محکمے کی؟ یہ ہے کون؟ اسد کو محسوس ہوا کہ جیسے یہ شخص آسمان کی باتیں کرتا کرتا زمین پر اُتر آیا ہے، اور اس کے ساتھ ہی وہ خود جو چند منٹ کے لیے اپنی زنجیریں توڑ کر کھلی فضا میں قلانچیں بھرنے لگا تھا، اپنی اصلی شکل میں دھڑام سے نیچے آگرا ہے۔ اب وہ پھر ایک قیدی تھا۔ اُس کے دل میں اُس اجنبی کے لیے شکایت کا جذبہ پیدا ہوا جواب ایک عام روزمرّہ کے لہجے میں بات کر رہا تھا: "تمہارے جیسے پڑھے لکھے لوگ۔۔۔۔" اور اسد سوچ رہا تھا کہ کیسے ممکن ہے کہ وہ باتیں، جن کے اثر سے اس کوٹھڑی کا ناقابلِ برداشت تعفن بھی کچھ دیر کے لیے اُڑ گیا تھا، اب بے کھنک اور سپاٹ آوازوں میں بدلتی جا رہی تھیں۔ جب اس نے ذوالفقار کو سوالیہ نظروں سے اپنی طرف تکتے ہوئے پایا تو بولا: "میں کسی جھنجھٹ میں نہیں پھنسنا چاہتا۔"

"جھنجھٹ!" ذوالفقار بولا۔ پھر اُس نے نیم اندھیرے میں ہاتھ پھیلائے۔ "اور یہ کیا ہے؟" اُس نے رومال والے ہاتھ سے فضلے کے برتن کی طرف اشارہ کیا، "اور یہ؟" اُس نے کمبل کا کونا اسد کے کندھے سے اٹھایا، جیسے اُس کو اپنا ہی ننگا بدن دیکھنے کی دعوت دے رہا ہو۔ "اور یہ؟ یہاں کالی کوٹھڑی میں غلاظت میں بیٹھے لایعنی طور پر کہے جا رہے ہو میں گواہ ہوں، میں گواہ ہوں۔ صرف یہی نہیں کہ تم ایک خطرناک 'جھنجھٹ'،" اُس نے لفظ پر زور دے کر کہا، "میں پھنسے ہو، بلکہ تم ایک قیدی ہو۔ ایک گمنام قیدی۔"

"میں علاج کرانے یہاں آیا ہوں۔" اسد نے کہا، "میرا اور کوئی کام نہیں۔"

"اور اب کس سے علاج کراؤ گے؟ وہ تو مر گیا جو علاج کرتا تھا۔ یہاں اِس کوٹھڑی میں تمہارا علاج کرنے کون آئے گا؟ اور یاسمین گُل؟ اُس کی شکل تک تم نہیں دیکھ پاؤ گے۔ تمہارا اُس سے تعلق ہے۔ تمہارا دل نہیں کرتا کہ اُس سے جا کر ملو؟"

"یاسمین میری گواہ ہے۔" اسد نے کہا، "وہ میری گواہی دے گی۔ اُس کا نام گُل یاسمین ہے۔"

"کیا لایعنی باتیں کر رہے ہو۔ نام یہ ہے، تم گواہ ہو۔ وہ گواہ ہے۔" ذوالفقار ناگواری سے بولا، "تمہارا خیال ہو گا کہ تمہیں یاسمین گُل کی اَبلی بائی میسر ہے؟ اُس کی حقیقت بھی میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔ تم دونوں نے جھوٹ بولا ہے۔"

"کیا جھوٹ بولا ہے؟"

"یاسمین گُل نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ جب تم نے آدھی رات کے وقت مطب میں روشنی دیکھی تو وہ تمہارے ساتھ تھی۔ اُس وقت تم دونوں شرقی میدان کی جانب سے واپس آ رہے تھے۔"

"ہاں۔"

"اِس بیان سے تم دونوں نے یہ اثر دینے کی کوشش کی ہے کہ گویا تم ایک ساتھ مطب میں داخل ہوئے اور وہاں حکیم کو مُردہ پایا۔ مگر یہ بات غلط ہے۔ غلط ہے یا نہیں؟"

اسد جواب دینے کی بجائے مُنہ اُٹھائے اُسے دیکھتا رہا۔

"حقیقت یہ ہے کہ یاسمین گُل اِس ڈر سے کہ اُس کے باپ کو تم دونوں کی خفیہ ملاقاتوں کا علم نہ ہو جائے، اُس جگہ سے سیدھی گھر بھاگ گئی جب کہ تم وہاں سے اکیلے مطب میں گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اُس وقت مطب میں سوائے تمہارے اور حکیم کے ـــ یا حکیم کی لاش کے ـــ کوئی تیسرا آدمی نہ تھا۔ بعد میں تم نے جا کر یاسمین گُل کو قتل کی اطلاع دی۔"

اسد حیرت زدہ بیٹھا ذوالفقار کو دیکھ رہا تھا۔ "آپ میرے پیچھے گنبد جا چکے ہیں ؟"

"میرے جانے یا نہ جانے سے کیا ہوتا ہے۔ تفتیش میں سب کچھ نکل آتا ہے۔ تمہاری ایلی بائی ناکارہ ہو چکی ہے۔"

اسد سوچ رہا تھا، یاسمین اتنی احمق نہیں ہو سکتی، وہ پوچھ گچھ کے دوران اپنے بیان کو بدل نہیں سکتی، چہ جائیکہ ایک غلط بیان کو دوسرے غلط بیان سے بدل دے۔ یہ ناممکن ہے۔ پھر کس نے یہ بات بنائی ہے۔ میر حسن ؟ ولی ؟ کون ہو سکتا ہے ؟ اسد کی دلیل جواب دے گئی تھی، مگر ایک بات اُس کے دل میں اُسی کی اُسی طرح اٹل کھڑی تھی —— کہ وہ بے گناہ ہے۔ ان باتوں سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اُسے کسی نہ کسی طرح اپنا بچاؤ کرنا ہے۔

مگر کس طرح ؟ ذوالفقار برابر سوالیہ نظروں سے قیدی کو دیکھے جا رہا تھا۔ اسد کو اب اِس اجنبی سے، اُس کی باتوں کی عام فہم دلیل سے، اُن کی ناقابلِ تردید سچائی سے خوف آنے لگا تھا۔ اس انجانے سے خوف نے اس کے دل میں مدافعت پیدا کی، وہی پرانی مدافعت جس کا وہ اب عادی ہو چلا تھا، جیسے کہ یہ مدافعت، یہ دیوانگی اُس کی آخری پناہ گاہ ہو۔

"میں کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکل جاؤں گا۔" اُس نے کہا۔

"کیسے نکل جاؤ گے ؟"

"کسی نہ کسی طرح میں نکل جاؤں گا۔" اسد نے دہرایا، "یہاں شاہ رُخ میرا دوست ہے، چھٹی سے واپس آ کر وہ کچھ نہ کچھ کرے گا۔ کسی وکیل سے اگر رابطہ ہو سکے تو میں یہاں سے نکل سکتا ہوں۔"

"قتل کے ملزم کی کوئی وکیل ضمانت نہیں کروا سکتا۔ اور وکیل آئے گا کہاں سے ؟ شاہ رُخ سرکاری ملازم ہے۔ قتل کے ملزم کی طرف داری کا خطرہ مول نہیں لے سکتا۔ اس کے علاوہ تمہارا صرف ایک علیل چچا ہے جس سے تمہاری تھوڑی بہت خط و کتابت ہے۔ اُس کو خبر بھی نہیں کہ تمہارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ ہو بھی جائے تو وہ اِس قابل نہیں کہ یہاں تک تمہارا پیچھا کر سکے۔ اور تمہارا کوئی کنبہ نہیں۔ نہ ماں نہ باپ، نہ بہن نہ بھائی۔ یہ بھائی بندوں کے کام ہوتے ہیں۔ تمہارا کون ہے ؟ تم خود دائم المریض ہو ۔ ۔ ۔ ۔"

اسد منہ اٹھائے خالی خالی نظروں سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔ اُسے سمجھ نہ آ رہی تھی کہ کیا جواب دے۔ ذوالفقار کا چہرہ کوٹھڑی کی سیاہ دیوار کی مانند بے حرکت تھا۔ صرف آنکھوں کے دو سوراخ دکھائی دے رہے تھے، جن میں اب پھر بے نام سی چمک پیدا ہو چلی تھی۔ اسد کو محسوس ہوا کہ یہ وہی آنکھیں ہیں جو پردے

کے پیچھے سے، اور کبھی پردہ اُٹھا کر، دن رات اُس پہ لگی رہتی ہیں۔ کوٹھڑی میں تعفن پھر عَود کر آیا تھا۔ غصے کی ایک لہر اسد کے دماغ کو چڑھنے لگی۔

"آپ میری مدد کرنے آئے ہیں یا سزا دینے؟" اُس نے پُوچھا۔

"مدد کرنے۔" ذوالفقار بولا، "حقیقت یہ ہے، اسد کریم، کہ میرے علاوہ تمہارا کوئی پُوچھنے والا نہیں۔ سوائے ایک خدا کے۔" وہ بات کرتے کرتے رُک گیا، جیسے اُس کے ذہن میں کوئی نئی بات آگئی ہو۔ قیدی کے چہرے پہ نظریں گاڑ کر وہ بولا، "تم خدا پر یقین رکھتے ہو؟"

اسد اُنہی خالی، لاجواب نظروں سے اجنبی کی طرف دیکھتا رہا۔ اس نے دوبار زنجیر والے ہاتھ کو کھینچا جیسے اندھیرے میں کسی شے کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔

"خدا سے اِس کا کیا تعلق ہے؟" وہ چلّا کر بولا، "میں نے کوئی جرم نہیں کیا۔ میں انصاف طلب کرتا ہوں،" وہ دونوں زنجیروں کو کھینچتا ہُوا دہاڑا، "انصاف!"

ذوالفقار اس ناگہانی حملے پر ٹھٹک سا گیا۔ اُس کے چہرے پر مایُوسی کے آثار نمودار ہونے لگے۔ اُس نے ایک چھوٹا سا قدم پیچھے کی طرف اُٹھایا، کچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولا، پھر ارادہ تبدیل کر دیا۔ اس کی بجائے اُس نے جُھک کر لالٹین اُٹھائی اور تیزی سے دروازے کی طرف چل دیا۔ دروازے پر اُس نے اپنا ہاتھ سلاخوں کے بیچ سے باہر نکال کر تالا کُنڈے پہ بجایا۔ پہرے دار سپاہی نے آکر دروازہ کھولا۔ پھر دروازہ کھٹاک سے بند ہُوا اور پردہ گر گیا۔

گُھپ اندھیرا اس طرح کوٹھڑی میں لوٹ آیا جیسے مدت سے ادھر کسی نے قدم بھی نہ دھرا ہو۔ قیدی پتھر پہ بیٹھا کھوئی کھوئی نظروں سے تاریکی میں دیکھتا رہا۔ اُس نے تاسف سے سوچا کہ باتیں کرتے ہُوئے اُس نے دل میں ارادہ کیا تھا کہ اجنبی کے جانے سے پہلے وہ ایک بار پھر اُس سے پیشاب والے برتن کے بارے میں درخواست کرے گا۔ تعفن اُس کے دماغ میں کیل کی طرح گڑا ہوا تھا۔ ذوالفقار کے الفاظ اُس کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ تمہارا کون ہے؟ نہ ماں نہ باپ، نہ بھائی نہ بہن . . . . اتنے دنوں میں آج پہلی بار اپنی اصل حالت اُس پہ اجاگر ہوئی تھی: اُس کا کوئی پوچھنے والا نہیں۔ پہرے داروں سے، کھانا دینے والوں سے، تلاشی لینے والوں سے، تشدد کرنے والوں سے قیدی نے جو رشتہ جوڑا تھا اِس اجنبی نے اسے منقطع کر دیا تھا۔ اجنبی نے ایک قدِ آدم شیشہ اُس کے آگے رکھ کر اُسے اپنی شکل دکھائی تھی۔ اُس کا رشتہ کسی ذی رُوح سے نہیں تھا۔ وہ ایک خلا میں بیٹھا تھا اور اس خلا کے مرکز کے ساتھ بندھا ہوا تھا۔ وہ کسی کو دکھائی نہیں دے رہا، کوئی اُس کی آواز نہیں

سُنتا، کوئی جواب نہیں دیتا، کسی کو اُس کی خبر نہیں۔ وہ وہاں پر موجود ہے مگر نظروں سے اوجھل ہو گیا ہے۔ اب یہاں روشنی کی ایک کرن تک داخل نہ ہو گی۔ وہ اِس کوٹھری میں یکہ و تنہا ہے، یکہ و تنہا ختم ہو جائے گا۔ یہ اُس کی صورت ہے۔

اسد۔ اسد کریم۔ اُس نے اپنے نام کو زیرِ لب دہرایا۔ وقت۔ وقت ہاتھ سے نکل کر بھاگ گیا تھا۔ اُسے محسوس ہوا کہ وہ اسی کوٹھری میں پیدا ہوا تھا، اسی کوٹھری میں مر جائے گا۔ دُنیا اُس کے حالات سے بے خبر رہے گی۔ وقت ہاتھ سے چھوٹ گیا ہے۔ اُس کا ہاتھ مُستقل اپنی زنجیر کو چھوٹے چھوٹے جھٹکے دیے جا رہا تھا۔ ایک تاریک دیوار سے اُس کا رشتہ ابھی قائم تھا بہرحال —— اس خیال سے اُس کے بدن کو کچھ تقویت پہنچی۔ اُس نے آنکھیں مل مل کر اندھیرے میں دیکھنے کی کوشش کی۔ اُس کے پیٹ میں ایک وسیع خلا پیدا ہو رہا تھا جس کے اندر درد کی ایک رَو چل رہی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیٹ کو پکڑ کر آہستہ آہستہ اُسے مَلنے لگا۔ اُس وقت دروازے کے باہر رات کی پہلی چیخ بلند ہوئی۔

یہ ہیبت ناک آواز اُس کے دماغ میں گڑی ہوئی کیل پر ہتھوڑے کی طرح آ کر لگی۔ اُس نے تیزی سے ایک کمبل اپنی ٹانگوں سے اُتارا اور سر پر ڈال کر کانوں کے گرد اُس کے تین چار بل دیے۔ پھر اُس نے دونوں ہاتھ کانوں پہ رکھے اور سر کو گھٹنوں میں دبا لیا۔ انسانی اذیت کی چیخیں اُس کے روئیں روئیں میں داخل ہو کر اُس کے بدن کو تھرتھرانے لگیں۔ اُس کا دماغ درد کے مارے بلبلا اُٹھا۔ اُس نے ایک جھرجھری لی اور زمین پہ آ رہا۔ اُس کے پیٹ میں درد کا ایک طوفان اُٹھا اور خارج ہو گیا۔

دفعتہً اس کی بند آنکھوں کے پیچھے آوازیں اور مناظر آپس میں گڈمڈ ہو کر ٹھہر گئے۔ اُس کے دماغ میں شیشے کا مکعب برف کی سِل میں تبدیل ہونے لگا، سرد اور سُن اور پُر سکوت، چمکدار۔ وقت کی رفتار بدل گئی۔ ہر چیز غیر قدرتی رفتار سے حرکت کرنے لگی، جیسے خواب میں کرتی ہے —— بہت تیز یا بہت دھیمی —— مگر وہ خواب کی حالت میں نہ تھا، اِتنا اُسے علم تھا۔ صرف اپنے اندر سے نکل کر جُدا ہو گیا تھا۔ اُس برف کی سِل میں سے ایک چوڑا عمودی راستہ نمودار ہوا جس پہ تیز روشنی پڑ رہی تھی۔ اُس راستے نے باہر نکل کر ایک چوڑی سفید پٹی کی شکل میں اُس کے گرد لپٹنا شروع کر دیا۔ تھوڑی ہی دیر میں اُس پٹی نے مکمل طور پر اُسے اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اب یہاں مکمل سکوت تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو اس خول کے اندر، اُسی طرح کانوں پہ ہاتھ رکھے، گھٹنے چھاتی سے لگائے، پہلو کے بل زمین پر پڑے ہوئے دیکھا۔ اُسے پتا تھا کہ اُس کے پیٹ میں درد کا طوفان ختم ہو چکا ہے اور چیخوں کی آواز بہت دُور سے آ رہی ہے، مگر وہ اپنے خول میں محفوظ پڑا ہے۔ اُس کو مزید علم تھا کہ کچھ چیزیں ہاتھ سے چھوٹ

گئی ہیں۔ مثلاً یادداشت۔ اُس کی یاد کی گداز، دانے دار عمیق سطح جس پہ اب تک اُس کی گرفت مضبوط رہی تھی اب اِس برف کی سخت پھسلواں سطح بن گئی تھی جس پہ پاؤں جمنا تھا نہ ہاتھ۔ اُس کی زندگی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر آگے پیچھے، گرتی پڑتی اور اُڑتی ہوئی گزر رہی تھی۔ وہ بے دم پڑا اس کے دھاروں میں نکلتا اور داخل ہوتا رہا۔ اس چوڑے روشن راستے کا سرا نظر نہ آتا تھا۔ کہیں کہیں تاریک سُرنگیں پڑتی تھیں جن سے وہ ہوا کی تیزی سے اُڑتا ہوا گزر جاتا، پھر جب دھوپ میں نکلتا تو بازو کھول کر آرام سے فضا میں تیرنے لگتا۔ کبھی اُس کے ٹکڑوں کا جلوس چلتا، کبھی وہ خود یکجا ہو کر، شہ پہ پرندے کی مانند ٹوٹی پھوٹی مٹی ہوئی جگہوں کے اوپر پرواز کرنے لگتا، ایک جگہ سے دُوسری، ایک شے سے دُوسری تک۔ زمین اور پانی کے بیچ بیچ اُس کی عجیب بے ڈھنگی پرواز تھی جس کا ایک سرا دُوسرے سے نہ ملتا تھا۔ کہیں کہیں کوئی بازو پنجہ کھولے سطح آب سے نکلا ہوتا، ڈوبتی ہوئی آوازیں اِدھر اُدھر سے آتیں۔ کہیں پانی صاف ہوتا تو دُور نیچے تہہ آب میں غرقاب آنکھوں کی زمین بچھی ہوتی۔ یہ کون لوگ تھے ـــ یہ کون لوگ تھے جن کی آنکھیں ڈوب چکی ہیں؟ چشمہ لگائے ایک ماسٹر جو چوتھی جماعت کو صبح سویرے گالیاں دیتا ہے، ماں بہن کی، گندی گندی، ہر روز صبح سویرے وہ کام دیکھتا ہے اور اتنے زور سے کان مروڑتا ہے کہ کان جڑوں سے نکل آتا ہے اور دیر تک کچھ سُنائی نہیں دیتا۔ وہ آدمی اپنی میز پر جا کھڑا ہوتا ہے جب کہ اُس کی عینک کے شیشوں پر سلاخوں والی روشن کھڑکیاں بنی ہوتی ہیں اور آدھی آدھی آنکھیں نفرت سے چمکتی ہوئی نظر آتی ہیں، مُنہ اُٹھا کر شرمگاہوں کے گندے گندے نام لے کر گالیاں دینے لگتا ہے اور ساتھ ساتھ ہاتھ میں پکڑے ہوئے ڈنڈے کو ہوا میں اُوپر نیچے حرکت دیتا جاتا ہے، کبھی ڈنڈے کو میز پر رکھ کر ہاتھ کا مُکا کس لیتا ہے اور دُوسرا ہاتھ کہنی میں رکھ کر بے شرمی سے ہلاتا ہے۔ بچے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھتے ہیں اور ہراس کا دیواُن کے دل کو جکڑ لیتا ہے۔ اُس کے دانت۔ سفید دانت۔ پیلے چہرے میں سفید دانت جن سے زخمی ہوئی گالیاں نکلتی ہیں۔ اب اُس کے دانت رہ گئے ہیں، اور کچھ نہیں رہا۔ بچے کو ایک عمر کے بعد سمجھ آتی ہے کہ یہ غصہ کہاں سے آیا مگر کیا فائدہ، جب کہ ہراس نے اُس وقت اُس کے دل کو پکڑ لیا تھا اور وہ دانت وہیں کے وہیں گڑے ہیں؟ لحاف میں دبکا ہوا نو سال کا بچہ، درد سے اُس کا کان پھٹا جاتا ہے، کان اور سر اور گردن کے پیچھے۔ ڈاکٹر غوری، موٹے ڈاکٹر غوری بابا کے دوست، اُس کا گال تھپتھپاتے ہیں اور کہتے ہیں، واجی وا، کان کے درد سے روتا ہے میرا بیٹا؟ لو ابھی ٹھیک کر دیتے ہیں، ہُش ش ش، ایسا بہادر بیٹا روتا ہے؟ لو یہ ایک چمچہ پی لو، ایسے ے ے، شاباش، اور یہ ایک چمچہ کان میں، ایسے ے ے، باس بس بس، لو اب آرام سے سو جاؤ، ٹھیک ہو گئی نا؟ پھُررر سے اُڑ گئی۔ واجی وا۔ ہاتھ سے ہوا میں پھُررر سے اُڑنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ جب وہ جانے کے

لیے مُڑتے ہیں تو بچے کا رونا ایک دم تھم جاتا ہے۔ پیٹھ پیچھے اُن کی پتلون خون سے تر ہے۔ ہیں؟ بابا دیکھ کر چونک پڑتے ہیں، یہ کیا عوزی؟ اللہ رحم کرے۔ ڈاکٹر عوزی آہستہ سے خون آلود پتلون کو ہاتھ لگاتے ہیں اور ان کے سرسوں کی طرح زرد گال پہلی بار بچے کی نظر میں آتے ہیں۔ ہاں فضل، وہ اُداسی سے بولتے ہیں، بگڑتی جا رہی ہے۔ کیا بگڑتی جا رہی ہے، بچے کی سمجھ میں نہیں آتا مگر اُن کو عجیب طرح سے ٹانگیں پھیلا کر چلتے ہوئے دیکھ کر اُس کے دل میں خیال آتا ہے کہ ڈاکٹر عوزی اب مر جائیں گے، اور وہ دوبارہ رونا شروع کر دیتا ہے۔ اُسے خیال آتا ہے کہ اُس کے کان کو کبھی آرام نہیں آئے گا۔ ڈاکٹر عوزی پھر کبھی نظر نہیں آتے۔ اُن کی دکان بند رہتی ہے، جب کھلتی ہے تو کاپیوں پنسلوں کی دکان ہوتی ہے جہاں ایک ڈاڑھی والا لڑکا کمبل اوڑھ کر بیٹھا رہتا ہے۔ اُس کے کان کو آرام آ جاتا ہے، مگر اُس کا اعتبار اُٹھ گیا ہے۔ اب سرسوں کے سے گال اور ہوا میں پھُرر سے اُڑ جانے کا اشارہ رہ گیا ہے۔ زرد رنگ کی موت ٹانگیں پھیلا کر آہستہ آہستہ چلتی ہے۔ کیوں؟ کیوں؟ نیم خواب کی حالت میں وہ لیٹا لیٹا حیران ہوتا ہے۔ میرا ہاتھ سو گیا ہے۔ سر کے نیچے دبا دبا ہاتھ سو گیا ہے۔ اسے میں نکال کیوں نہیں سکتا؟ مجھے علم ہے کہ میں یہاں پڑا ہوں۔ اس بات کا مجھے علم ہے۔ مگر ہل نہیں سکتا۔ کیوں؟ میں مر گیا ہوں؟ اکڑا ہوا سیدھا بدن، عبادت کی صورت یا بغاوت کی، سب سے پہلے میں نے دیکھی تھی۔ پھوپھی اُرما کی شادی کے تیسرے دن۔ جان۔ جان محمد۔ اُس کا ہلکے ہلکے بالوں والا بڑا خوبصورت چڑا سا سر تھا، اور گہرے بادامی رنگ کا چہرہ کوئی اُس کو نوکر نہ سمجھتا تھا، بابا کے ساتھ کھیلا ہوا تھا۔ مگر وہ بڑا نہ تھا، جب میرے ساتھ باتیں کرتا تو میرے جتنا ہو جاتا تھا۔ سیڑھیوں کی بغل میں اُس کا کمرہ تھا اور جب اور کوئی نہ ہوتا تو میں اُس کے ساتھ کھیلنے کے لیے چلا جایا کرتا۔ دوپہر کو شور کرتی ہوئی رنگ برنگی دھوپ میں میں کھیل رہا تھا اور جان بابا لگی پگڑی باندھے، اچکن پہنے برات کے مہمانوں کو شربت پیش کر رہا تھا۔ یہ میری پہلی شادی تھی۔ تیسرے دن تڑکے میری نیند کھل گئی۔ سب سوئے پڑے تھے۔ میں اُٹھ کر جان کے کمرے کو چل دیا۔ دروازہ اندر سے بند تھا۔ ایک دو دھکے دینے کے بعد میں نے درز سے آنکھ لگا کر دیکھا۔ اندر کچھ اندھیرا تھا، اور دو سیدھی ٹانگیں اور دو پَیر ہوا میں لٹک رہے تھے۔ ایک دو دھکے اور دیے اور واپس لوٹ آیا اور چارپائی پر بیٹھ گیا۔ گھر میں صرف چڑیوں کے چہچہانے کی آواز تھی۔ دن نکل رہا تھا۔ اُس کے بعد میں نے جان کو نہیں دیکھا۔ بابا نے اُدھر جانے کو منع کر دیا۔ شام تک ہجوم چھٹ گیا۔ شام کو پھوپھی اُرما اپنے خاوند کے ساتھ آئیں تو نیلی ساٹن کے لباس میں سُرخ ہونٹوں والا اُن کا چہرہ بوڑھا لگ رہا تھا۔ وہ بھی اُدھر نہیں گئیں۔ کچھ دیر کے لیے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ جب باہر آئیں تو ہنس رہی تھیں، مگر آنکھوں سے پتا چلتا تھا کچھ روتی رہی ہیں۔ پھوپھا نواز۔ چھوٹے سے قد کے چھوٹے سے منہ والے فوڈ انسپکٹر۔

پشاور میں نوکر ہیں۔ کون کہتا ہے میرا کوئی پوچھنے والا نہیں ؟ ذوالفقار کو شاید پتا نہیں، میرا کنبہ تو ہے۔ مگر اُن کو خبر کیسے ہو ؟ میں ہل بھی نہیں سکتا۔ حالانکہ ہوش میں ہُوں، دیکھ رہا ہُوں۔ کواڑ کی درز میں لٹکتے ہُوئے پَیر اب برف کے اُوپر پھسل رہے ہیں۔ کُوچھک چھک۔ گاڑی چل رہی ہے۔ گھر کی بجلی چلی گئی ہے۔ رات کو انھوں نے موم بتی کی روشنی میں کھانا کھایا ہے۔ کھانے کے بعد وہ دُوسری موم بتی جلاتا ہے اور مُلکوں کی سیر کو چل پڑتا ہے۔ اِس کمرے میں کوئی نہیں آتا۔ بکسوں پیٹیوں اور ٹوٹے پھُوٹے فرنیچر کے انبار لگے ہیں۔ کُوچھک چھک چھک۔ یہ لاہور ہے۔ لاہور میں چوڑی چوڑی سڑکیں اور بجلی کی تیز تیز روشنیاں ہوتی ہیں۔ کھڑکی میں ایک شیشے کا کونا ٹوٹا ہوا ہے، مگر اِس قسم کا رنگین پھُول دار شیشہ اب نہیں ملتا۔ جاڑوں میں تیز ہوا جب چلتی ہے تو اِس موری میں سیٹی بجتی ہے اور دُوسرے کمرے میں بچّے کی نیند کھُل جاتی ہے۔ گاڑی چھُوٹ رہی ہے۔ کُو وو چھک چھک۔ گرم گرم موم کے کانٹے ہوئے قطرے اُس کے ہاتھ پر گرتے ہیں اور وہ ٹھہر کر اُن کا مزا لیتا ہے، ہاتھ اُلٹا کر کے اُسے موم کے قطروں سے سجاتا ہے پھر ہاتھ کو ہوا میں لہراتا ہے۔ کوئی موتی نہیں گرتا، سب وہیں رہتے ہیں۔ یہ سمرقند ہے۔ سمرقند میں لومڑی کی کھال کی ٹوپیاں پہنے لوگ چائے پی رہے ہیں، جیسے تصویروں میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ عین مین۔ یہاں پُرانے قالین میں بڑے بڑے سوراخ ہیں جہاں سے چوہوں نے کھا لیا ہے۔ چوہے واقعی قالین کو کھا جاتے ہیں ؟ اُن کے پیٹ میں درد نہیں ہوتا ؟ پیٹ میں ہلکا ہلکا درد پھر اُٹھ رہا ہے۔ کیا کروں ؟ یہاں پر لیٹا لیٹا محسوس کر رہا ہُوں۔ ہوش میں ہُوں۔ کوشش کروں تو سب کچھ ہو سکتا ہے۔ وقت پہ، اُس نے دُور سے سوچا، دسترس کیسے حاصل ہو ؟ شیشے والی میز کی سطح پر گرد کی تہہ جمی ہے۔ گرد فریم کی ٹوٹی تصویر پر بھی پڑی ہے جو وہاں رکھی ہے۔ تصویر کے آگے گرد میں وہ موم کے قطروں والی اُنگلی سے لکھتا ہے: اماں۔ بابا۔ سمرقند۔ ۱۹۵۲ء۔ اُوپر ایک جالے میں ایک مکھی مری ہُوئی اٹکی ہے۔ بچّے کو پتا ہے وہ نظر اُٹھائے گا اور مکھی وہاں پہ ہوگی۔ ہمیشہ ہوتی ہے۔ وہ نظر اُٹھا کر دیکھتا ہے۔ مکھی وہاں پہ اٹکی ہے۔ اُس سے کچھ فاصلے پر مکڑی بھی چُرمُر ہوئی لٹک رہی ہے۔ مکھی کو کھانے سے پہلے ہی کیسے مرگئی ؟ بچّہ سوچتا ہے۔ شاید بیمار ہو گئی۔ کُوچھک چھک۔ چلو رنگون چلیں۔ کُو وو چھک چھک چھک۔ رنگون سے گزرنا آسان کام نہیں۔ یہاں سے گزرنے کا کوئی راستہ نہیں۔ میزوں اور کرسیوں اور چارپائیوں کی چوکھٹوں کے پائے سر کو لگتے ہیں۔ مگر ایک دو جگہیں بیٹھنے کے لیے بنی ہُوئی ہیں۔ خاص طور پر ایک، جہاں دو کرسیاں ساتھ ساتھ اس طرح رکھی ہیں کہ چھوٹا سا گھر بن گیا ہے جس کے اُوپر میز کی چھت ہے۔ اِس گھر کو جانے کا راستہ بھی ہے۔ پہلے سٹول کے اُوپر کھڑے ہو جاؤ اور وہاں سے پیٹی پر گھٹنا رکھ کر چڑھو، پھر پیٹی پر چلتے ہُوئے آرام کرسی تک جاؤ اور اُس کے اُوپر پاؤں رکھ کر دوسری طرف اُتر جاؤ تو تہہ کی ہوئی دری پڑی

ہے ۔ اُس پہ پاؤں رکھ کر گزر جاؤ ۔ سامنے گھر ہے ۔ صرف اُس میں جُھک کر داخل ہونا پڑتا ہے ۔ پھر پلٹنے کی مصیبت ہے ، سر میز کو لگتا ہے ۔ ایک دفعہ پلٹ جاؤ تو ٹانگیں سمیٹ کر اور گھٹنے چھاتی سے لگا کر آرام سے بیٹھ سکتے ہیں ۔ گرمیوں کی دوپہروں کو جب بابا اور پھپھو اور جان سو جاتے ہیں تو اُسے نیند نہیں آتی ، پھر وہ یہاں آ کر بیٹھ جاتا ہے ۔ اس گھر کے عین سامنے دوسری دیوار کے ساتھ ایک اور جگہ ہے جہاں صوفے کے اُوپر میز کھڑی ہے اور میز کے اُوپر ایک کرسی ، جہاں ایک دوپہر کو روشن اُس کے ساتھ چلی آتی ہے ۔ وہ گھوڑی بن کر روشن کو اُوپر چڑھاتا ہے ، پھر جا کر اپنی جگہ پر بیٹھ جاتا ہے ۔ شش شش شش ۔ باتیں کرنے سے بابا جاگ جائیں گے ۔ وہ آمنے سامنے بیٹھے باہر فاختہ کے بولنے کی خوابیدہ آواز کو سُنتے رہتے ہیں ۔ کچھ دیر کے بعد روشن وہاں بیٹھی بیٹھی اُکتا جاتی ہے ۔ روشن اس سے تین سال بڑی ہے ۔

”چلو چلیں ۔“ وہ کہتی ہے ۔

”نہیں بیٹھیں ۔“

”یہ کوئی جگہ ہے ؟ پھر باتیں کرو ۔“

”اونہوں ۔ شور ہو گا ۔“

”کیا کریں ؟“

”گھگو کی آواز سنیں ۔ تم سوچ لیتی ہو ؟“

”کیا ؟“

”کچھ بھی ۔“

”اوہ ۔“ وہ اچک کر کہتی ہے ، ”یہ کوئی جگہ ہے ؟ یہاں چوہے ہوں گے ۔“

”اونہوں ۔ میں روز یہاں آتا ہوں ۔“

”روز ؟“

”ہاں ۔“

”کیوں ؟“

”یہ زنگون ہے ۔“

”وہ کیا ہوتا ہے ؟“

”مُلک ہے ۔“

”مُلک ہے“ وہ مُنہ پر ہاتھ رکھ کر ہنستی ہے ۔

"شور مت کرو۔" وہ ڈر کر کہتا ہے، "اصلی مُلک ہے۔"

"وہاں کیا ہوتا ہے؟"

"اوو ــــ درخت۔ بڑی دُور ملک ہے۔"

"بڑی دُور ہے تو پھر یہاں کیسے آگیا؟"

"بس یہ زنگون ہے۔"

"مگر یہ تو مُلک نہیں۔"

"تمہیں پتا ہے مُلک کیا ہوتا ہے؟"

"ہاں۔"

"کیا ہوتا ہے؟"

"مُلک؟ اوو ــــ مُلک ہوتا ہے۔"

"دیکھا؟ تمہیں پتا ہی نہیں مُلک کیا ہوتا ہے؟"

"مگر یہ تو کمرہ ہے، اسدی۔"

"ملک بھی ہے۔" وہ کہتا ہے، "وہ لاہور ہے۔ وہ سمرقند ہے۔ یہ زنگون ہے۔"

وہ ایک ہاتھ مُنہ پہ ایک پیٹ پہ رکھے ہنسے جاتی ہے۔ "تم تو بیوقوف ہو، اسدی۔" پھر وہ کہتی ہے، "مَیں تو چلی ــــ" وہ وہیں سے نیچے چھلانگ لگا دیتی ہے۔ کُرسی میز پر اوندھی ہو جاتی ہے مگر گرتی نہیں، پھر ایک سیکنڈ کے بعد لُڑھک کر گر جاتی ہے۔ شور سارے مکان میں گونج اُٹھتا ہے۔ روشن اُڑتی ہوئی کمرے سے نکل کر غائب ہو جاتی ہے۔ وہ بیٹی سے اُتر رہا ہے کہ بابا سُرخ آنکھیں ملتے ہُوئے دروازے پر دکھائی دیتے ہیں۔ بچے، تم سوتے کیوں نہیں؟ تمہیں نیند کیوں نہیں آتی؟ گُو و چھک چھک چھک ـــــ

روشن کی کالی آنکھیں ہیں جنہیں وہ ہر وقت جھپکایا کرتی ہے۔ پھر ایک روز روشن کہیں چلی جاتی ہے۔ بابا، روشن کہاں چلی گئی ہے؟ وہ پُوچھتا ہے۔ روشن اپنے رشتہ داروں کے ہاں گئی ہے، دُوسرے شہر میں۔ کون سے شہر میں؟ تمہارا کوئی مطلب نہیں، بابا سختی سے منع کر دیتے ہیں۔ روشن اب چلی گئی ہے۔ روشن پھر نظر نہیں آتی۔ سردیوں کی شام ہے اور روشن کے چوبارے پہ کھیلتے کھیلتے چاند نکل آیا ہے۔ سب بچے آوازیں پڑنے پر اپنے اپنے گھروں کو جا چکے ہیں۔ وہ دونوں وہاں کھڑے رہ جاتے ہیں۔ وہ اُسے گلے سے لگا لیتی ہے، اچانک مُنہ چُوم کر گرم گرم آنکھوں سے ہنستی ہے، پھر اُس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے پر رکھ لیتی ہے۔ اُسے سمجھ نہیں آتی۔ دکھاؤں؟ وہ پوچھتی ہے۔

وہ ہاں میں سر ہلاتا ہے۔ روشن اپنے آگے سے قمیض کھینچ کر اوپر اُٹھا دیتی ہے۔ دیکھا؟ او نہیں، وہ نفی میں سر ہلاتا ہے۔ وہ قمیض کو اور اوپر کھینچتی ہے اور چاند کی طرف منہ کر کے کھڑی ہو جاتی ہے۔ روشن کی دونوں کہنیاں پرندے کے کٹے ہوئے پروں کی مانند ہوا میں اُٹھی ہیں۔ اس کے سینے پر ساتھ ساتھ دو تنی ہوئی ذرا ذرا اُبھری ہوئی جگہیں ہیں جن کے اوپر گلابی رنگ کے چاٹج ہیں۔ روشن اُس کا ہاتھ پکڑ کر ایک کے اوپر رکھ دیتی ہے۔ وہ انگلیوں کے پوروں کو آہستہ سے چاٹج پر دباتا ہے، تنے ہوئے گوشت میں چھوٹے چھوٹے گڑھے پڑ جاتے ہیں۔ وہ ہاتھ اُٹھاتا ہے تو جلد پھر تن جاتی ہے۔ روشن آنکھیں جھپک جھپک کر خاموشی سے ہنستی ہے۔ ابھی پہلے تو نہیں تھے، وہ دل میں حیران ہوتا ہے۔ کہاں سے آ گئے؟ اُس کا ہاتھ بے اختیار اپنی چھاتی پہ جاتا ہے۔ سیدھی اور سپاٹ! دونوں خوشی سے ہنستے ہیں۔ پھر کیسے وہ ایک روز کوئی بات کیے بغیر کسی کے ساتھ بھاگ جاتی ہے اور کبھی واپس نہیں آتی؟ ایک عرصہ گزر جاتا ہے تو اُسے پتا چلتا ہے کہ کیسے، مگر کیا فائدہ' چاند کی روشنی میں روشن کی کالی کالی جھپکتی ہوئی آنکھیں وہیں ہیں اور دل میں اُس کے جانے کا احساس رہ گیا ہے ــ

ـــ وہ بوڑھا خاکسار ہمارے سکول کے ساتھ رہتا تھا ایک کمرے میں اور خاکی شلوار قمیض پہنے دن بھر اپنی سائیکل لیے بازاروں میں پھرتا رہتا تھا اور اُس کی سائیکل کے آگے ہینڈل پہ ایک شیشے کے ڈھکنے والا لکڑی کا کیس لٹکا رہتا تھا جس کے اندر چند پرانی عینکیں کیلوں پہ ٹنگی ہوتی تھیں جن سے معلوم ہوتا تھا کہ کسی چشمہ ساز فرم کا ایجنٹ ہے۔ مگر وہ کبھی عینکیں بیچنے کی آواز نہ لگاتا تھا اور نہ کبھی رک کر کسی سے عینکوں کی بات کرتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ کسی زمانے میں ایجنٹ ہو مگر بعد میں انھوں نے نکال دیا ہو اور وہ عینکوں کا کیس اپنی سائیکل سے اُتارنا بھول گیا ہو۔ اس کیس کی لکڑی پرانی ہو کر بدرنگ ہو چکی تھی اور شیشے کا ڈھکنا مکھیوں کی بیٹوں سے گدلا ہو گیا تھا اور ایک کونے سے ذرا سا ٹوٹا ہوا تھا۔ دن بھر وہ خاکسار جو اب ٹھیک طرح کا خاکسار بھی نہ تھا بلکہ پہلے کبھی خاکسار رہا تھا خاکساروں کی وردی پہنے سائیکل لیے بازاروں میں گھومتا رہتا تھا اور ہر دس پندرہ بیس منٹ کے بعد رک کر اونچی آواز میں ایک نعرہ لگاتا تھا: "چور اُچکے چودھری تے لُنڈی رن پردھان" اور پھر چل دیتا تھا اور شہر کے سب لوگ اُسے جانتے تھے اور کوئی اُس کے نعرے کی طرف توجہ نہ دیتا تھا مگر کئی لوگ اُس کے دوست تھے اور خوش دلی سے اُس کا حال احوال پوچھا کرتے تھے، صرف کبھی کبھار کوئی دیہاتی بازار سے گزرتا ہوا اُس کا نعرہ سن کر رک جاتا تھا اور تعجب سے اُسے دیکھنے لگتا تھا۔ پھر ایک روز اُس کو پولیس پکڑ کر لے گئی اور ہمارے سکول کے ساتھ اُس کے کمرے پر تالا پڑ گیا۔۔۔

رات کو ایک دھکا لگتا ہے اور وہ بستر پہ اُٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ بستر گیلا پانی ہے، وہ سہم جاتا ہے، ابھی آواز آئے گی، پھر اوپر کر دیا، اسدی ہے؟ تین سال کے ہو گئے ہو تمہیں پتا نہیں چلتا، اسدی ہے؟ ہیں؟ آواز نہیں آتی۔ وہ ہاتھ پھیلاتا ہے۔ بستر خالی ہے۔ وہ رونے لگتا ہے۔ کوئی نہیں آتا۔ وہ چارپائی سے اُتر کر ٹھنڈے فرش پہ چلنے

لگتا ہے۔ پاؤں کو سردی کاٹتی ہے۔ دُوسرے کمرے سے آوازیں آ رہی ہیں۔ وہ جا کر دروازہ کھولتا ہے تو تیز روشنی اُس کی آنکھوں پر پڑتی ہے۔ وہ آنکھیں بھینچ لیتا ہے اور بند آنکھوں میں کھنچے ہوئے منظر کو دیکھتا ہے۔ فرش پر کوئی ننگے بدن لیٹا ہے، مُنہ دکھائی نہیں دیتا۔ کسی کی کالے بالوں والی ٹانگیں بیچ میں آتی ہیں، جیسے چچا کی ٹانگیں ہوں، صرف ایک چھاتی ہے جو ڈھلک کر خون میں ڈوب گئی ہے۔ بابا کے ہاتھ میں بندوق ہے۔ ان کو سردی نہیں لگتی؟ پھپھو ایک چیخ مار کر اُسے زمین سے اُچک لیتی ہے اور اٹھا کر اپنے کمرے کو بھاگ جاتی ہے۔ اب وہ پھپھو کے ساتھ سوتا ہے مگر نیند نہیں آتی، آنکھیں بند کرتا ہے تو بندوق دروازے میں کھڑی ہوتی ہے اور بستر گیلا پانی —— میرے چاروں طرف پانی ہے۔ اب چیخوں کی آواز رُک گئی ہے۔ مَیں جانتا ہوں کہاں پڑا ہوں۔ فرش پر پڑا ہوں اور میری کمر اور ایک ٹانگ گیلی ہو گئی ہے۔ مَیں خواب میں نہیں ہوں، سوچ سکتا ہوں، سونگھ سکتا ہوں۔ یہ کیسی بُو ہے؟ فضلے کے تعفن کی بُو تو نہیں، عجیب سی بُو ہے، پہلے کبھی نہیں سُونگھی، سردی کی بُو ہے، سرد اور مکروہ۔ میرے حواس قائم ہیں۔ اُٹھنے کی کوشش کروں؟ کوشش کروں تو اُٹھ سکتا ہوں۔ اُس نے لیٹے لیٹے سر ذرا سا اُٹھایا، پھر فرش پر رکھ دیا۔ مَیں ہوش میں ہوں۔ ان میں سے کچھ تو خواب ہیں، کچھ حقیقت۔ کچھ خواب جو اتنی بار آئے کہ حقیقت معلوم ہوتے ہیں۔ کچھ واقعات جو پُرانے ہو کر خواب بن گئے ہیں۔ اب ان میں تمیز کرنا مُشکل ہو گیا ہے۔ مگر مَیں زندہ ہوں، اس نے بے انتہا طمانیت سے سوچا۔ اب وہ پُورے ہوش میں تھا۔ وقت کے کندھے پر، اُس نے سوچا، میرا ہاتھ تھا۔ پھسل گیا ہے۔

پھر وہ خواب میں چلا گیا۔ خواب میں جگہ بہ جگہ یاسمین کے چہرے گردش کر رہے تھے، اور عقب میں دُور دُور تک، وسیع سرزمین پر ایک شیر کا ننھا سا سایہ لمبی زقندیں بھرتا تھا۔

★ ★ ★ ★ ★

دن چڑھے جب تھانیدار کوٹھڑی میں داخل ہوا تو تعفن کانٹے دار جھاڑی کی طرح اُڑتا ہوا آ کر اُس کے مُنہ پر لگا۔ اُس نے ہاتھ سے اپنی ناک ڈھانپ لی۔ لالٹین کی روشنی میں انہوں نے قیدی کو اِس حالت میں پایا کہ وہ دیوار

کے ساتھ نیم دراز، ڈھیر ہوا پڑا ہے۔ اُس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا اور کندھے دیوار کے ساتھ لگے تھے، اور اُس کا فضلہ اُس کے چاروں طرف زمین پر بہہ رہا تھا۔ رات کو کسی وقت اُس نے اُٹھنے کی کوشش کی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ متعدد بار کی ہے۔ اُس کی ٹانگیں اور پیٹ فضلے میں لتھڑے ہوئے تھے۔ تھانیدار کے چہرے پر شدت ناگواری کے آثار پیدا ہوئے۔ اُس نے قیدی کو ٹھوکر مار کر اُٹھانے کے واسطے پاؤں اُٹھایا، مگر کراہت کے مارے کھینچ لیا۔ معاً تھانیدار کا ہاتھ ناک سے ڈھلک گیا اور وہ جھک کر بغور اُس بے جان شبیہ کو دیکھنے لگا۔ اُس کی آنکھوں میں ایک انجانے سے خوف کے آثار نمودار ہوئے۔ قیدی کا رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا اور اُس کے چہرے پر زندگی کا کوئی نشان نہ تھا۔ اُس کے ہونٹوں کے کونوں سے رال کے قطرے بہہ کر داڑھی کے بالوں پر اٹکے ہوئے تھے۔ اُس کے سینے میں سانس کی جنبش تک نہ تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا کہ جان سارے بدن سے آہستہ آہستہ کھنچتی ہوئی آخر اب ایک ہاتھ تک آ پہنچی تھی۔ کئی منٹ تک تھانیدار متحیر کھڑا قیدی کے داہنے ہاتھ پہ نظریں گاڑے رہا جو اپنے بدن سے الگ تھلگ ہل رہا تھا۔ اُس ہاتھ میں ایک کمزور سی، لرزتی ہوئی میکانکی حرکت تھی جس سے وہ اپنی زنجیر کو ہلکے ہلکے جھٹکے دے رہا تھا، جیسے کہہ رہا ہو، میں ابھی زندہ ہوں، مجھے چھوڑ دو۔ اُس عجیب الخلقت عمل کو دیکھتے دیکھتے دفعتاً تھانیدار کے چہرے پر ناگواری کے ساتھ ساتھ، بوکھلاہٹ کے آثار نمودار ہونے لگے۔ اُس نے ناک پر ہاتھ رکھا اور کچھ کہے بغیر، تیزی سے پلٹ کر باہر نکل گیا۔ لالٹین والا سپاہی کچھ دیر تک رک کر قیدی کو اور اُس کے آس پاس کی زمین کو دیکھتا رہا۔ جب وہ باہر نکلا تو تھانیدار اسی طرح ناک پہ ہاتھ رکھے کھڑا تھا، اور دو سپاہی لحاف کا پردہ دیوار سے اُتارنے میں مصروف تھے۔

(۶)

جب اسد نے آنکھیں کھولیں تو وہ ایک روشن اور ہوادار کمرے میں چارپائی پہ لیٹا تھا۔ اُس نے گردن موڑ کر دیکھا تو اُسے بستر کی صاف ستھری چادر دکھائی دی۔ وہ چھاتی تک ایک شوخ سُرخ رنگ کے کمبل سے ڈھکا ہوا تھا۔ اُس آرام دہ اور گرم بستر میں وہ کئی منٹ تک ساکت پڑا رہا۔

اپنے وجود کی خبر اُسے تہہ آب پہ ہوئی تھی۔ کانوں میں گہرے پانی کی سُن کی سی کیفیت والی جھپک اور سرسراہٹ کی آواز تھی، جیسے آہستہ آہستہ —— بہت آہستہ آہستہ —— دُنیا کے محور سے نکل کر میدان میں آ رہے ہوں۔ ہوش میں آ کر وہ کتنی ہی دیر تک آنکھیں بند کیے دبکا رہا۔ میدان میں پہنچ کر آنکھیں کھولنے کی اُسے ہمت نہ ہوئی۔ جب اُس نے آنکھیں کھولیں تو پہلا شخص جس پہ اُس کی نظر پڑی، ذوالفقار تھا۔ ذوالفقار کمرے میں داخل ہوا اور چارپائی کے پاس پڑی ہوئی کُرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ اسد نے اُٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی مگر ذوالفقار نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے لٹا دیا۔

لیٹے لیٹے اسد نے اپنی ٹانگیں اور بازو ہلائے۔

"مَیں آزاد ہُوں ؟" اُس نے حیرت سے پُوچھا۔

"بالکل،" ذوالفقار نے کہا، "آزاد ہو۔"

"کیسے ؟"

ذوالفقار نے ہاتھ ہوا میں اُٹھایا اور مُسکرا کر چٹکی بجائی: "ایسے۔"

اسد نے کمبل ہٹا کر اپنے ہاتھ اور پاؤں کو دیکھا۔ اُس کی کلائی اور ٹخنے پر سیاہ رنگ کے متورم حلقے موجود تھے۔ مگر اُن میں زنجیریں نہ تھیں۔ وہ آزاد تھے۔ اُس وقت پہلی بار اسد کو حقیقتاً آزادی کا احساس اُس ورم شدہ بدرنگ جلد کو دیکھ کر ہوا۔ اُس کا دل یکبارگی حلق کی جانب لپکا۔ اُس کی نظریں دروازے پر گئیں۔ در وا تھے اور نیلے آسمان کی چمک اُن پہ پڑ رہی تھی۔ اسد ہاتھ سے آہستہ آہستہ دل کے اُوپر سینے کو ملنے لگا۔

ذوالفقار آگے جُھک کر بولا: "اب تُم بالکل آزاد ہو۔"

"مَیں کہاں پر ہُوں ؟" اسد نے پُوچھا، "یہ کس کا گھر ہے ؟"

"اپنا ہی ہے۔"

"آپ کا گھر ہے ؟"

"میرے ایک جاننے والے کا ہے۔" ذوالفقار نے کہا، "جب تمہیں رہا کیا گیا تو تم بیہوشی کی حالت میں تھے۔"

"کتنی دیر ہو گئی ہے ؟"

"دو روز۔"

"مجھے پرسوں رہا کیا گیا تھا ؟"

"ہاں۔ پہلے روز تمہیں کافی تیز بخار تھا۔ ڈاکٹر کی دوائی سے اگلے روز بخار تو اُتر گیا مگر بیہوشی قائم رہی۔ ڈاکٹر اس کی وجہ صرف صدمہ اور کمزوری بتاتا ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ چند روز آرام کرنے سے تندرست ہو جاؤ گے۔"

اسد نے تپائی پر نگاہ دوڑائی جس پہ سبزی مائل شیشے کی دو بوتلیں پڑی تھیں جن پر کاغذ کی تراشیدہ خوراکوں کے نشان چپکے تھے۔ بوتلوں کے پاس دو لوہے کے گلاس پڑے تھے۔ اُس نے چھاتی سے کمبل اُٹھا کر ایک لمبا سانس لیا۔ اُس کا جسم بے بو تھا۔

"مجھے صاف کس نے کیا ؟" اسد نے جھجکتے ہوئے پُوچھا۔

"تھانے میں۔" ذوالفقار نے بتایا، "گیلے کپڑے سے بدن کو اچھی طرح صاف کر دیا گیا ہے۔ تمہارے

کپڑے بھی وہیں پر دھو دیے گئے ہیں۔ پٹی بھی بدلی گئی۔ زخم اب تقریباً بھر چکا ہے۔"

اسد نے ہاتھ اُٹھا کر ماتھے کے زخم کو چھُوا۔ "مَیں رہا کیسے ہُوا؟" اُس نے پُوچھا۔

"ابھی آرام کرو۔ پھر بات کریں گے۔"

"مگر مَیں چھُوٹا کیسے؟"

"مزید تفتیش کے نتیجے کے طور پہ ایک اور گرفتاری عمل میں آئی ہے۔"

"کون گرفتار ہوا ہے؟"

"ایک شخص ہے۔ گُنڈ سے تعلق نہیں رکھتا۔ جنگلات میں کٹر تھا۔"

"کیا نام ہے؟"

"نام مجھے معلوم نہیں۔"

"کس کی گواہی پر گرفتار ہُوا ہے؟" اسد نے پُوچھا، "کوئی ثبوت مِلا ہے؟"

"تفصیلات مجھے معلوم نہیں۔ سُنا ہے اُس نے اقبالِ جُرم کر لیا ہے۔"

"ثبوت کیا ملا ہے؟"

"دیکھو،" ذوالفقار اُس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر بولا، "ڈاکٹر نے کہا ہے تمہیں ابھی مکمّل آرام کی ضرورت ہے۔ ان باتوں سے دماغ کو پریشان کرنے کی ضرورت نہیں۔ بہت وقت پڑا ہے۔"

"آلۂ قتل برآمد ہو گیا ہے؟" اسد نے پُوچھا۔

"غالباً ہو گیا ہے۔"

"کیا ہے؟ چاقو ہے؟"

ذوالفقار اُٹھ کھڑا ہوا: "تمہاری باتوں سے تو معلوم ہوتا ہے اُس کی وکالت کرنا چاہتے ہو۔ مَیں تمہارے لیے کچھ کھانے کو لے کر آتا ہوں۔" وہ بولا۔

اُس کے جانے کے بعد اسد نے محسوس کیا کہ اُس کی سانس پھُول گئی ہے۔ چند منٹ کی گفتگو سے ہی اُس کے سینے میں ہلکا ہلکا درد ہونے لگا تھا۔ وہ آنکھیں بند کیے بستر پر پڑا رہا۔ جب ذوالفقار یخنی کا پیالہ اور ساتھ ڈبل روٹی لے کر آیا تو پیالے میں اُس پتلے سے شوربے کو دیکھ کر ایک بار اسد نے کراہت سے منہ پھیر لیا۔ مگر یخنی کی خوشبو نے اُس کی زبان کے نیچے سے اشتہا کا لعاب کھینچ نکالا۔ ڈبل روٹی بھگو بھگو کر کھاتے اور گھونٹ گھونٹ یخنی پیتے ہوئے اسد نے اپنے سُوکھے ہوئے بدن کے گوشوں تک پھیلی ہوئی لاکھوں ننھی ننھی شریانوں میں قوت اور حرارت کو سرایت کرتے

ہوئے محسوس کیا۔ یخنی ختم کرتے ہی اُس پر نقاہت کی نیند طاری ہوگئی۔ گہری نیند میں جانے سے پہلے اُس نے ذوالفقار کی آواز سُنی، "دو روز تک تمھے سے مشکل کچھ خوراک اندر جاسکی ہے۔ اب ٹھیک طرح کھاؤ گے تو طاقت آجائے گی۔"

خواب میں اُس نے دیکھا کہ اُس کے دونوں ہاتھوں میں ناسُور کی قسم کے زخم پیدا ہوگئے ہیں جو رِس رہے ہیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اُس کے ہاتھ جھڑ کر نیچے گر پڑتے ہیں۔ اُسے درد کا احساس قطعاً نہیں ہوتا، مگر اُس کے دل میں ایک ناقابلِ تلافی نقصان کا ہَول پیدا ہوتا ہے —— اِس ہول سے چونک کر وہ جاگ پڑا۔ مگر چند ہی لمحے بعد نیند نے دوبارہ اُس پر غلبہ پالیا۔ اُس مختصر سے عرصے میں، جب وہ جاگا تھا، اُس نے محسوس کیا کہ اُس نے وہ بُو سُونگھی ہے جو ایک بار پہلے نیم خواب کی حالت میں سُونگھی تھی اور پریشان ہوگیا تھا، کیونکہ ایسی بُو اُس نے پہلے کبھی نہ سُونگھی تھی، سرد سی بُو، جو شاید موت کی بُو تھی۔ جب اُس کی آنکھ کھُلی تو دن ڈھل چکا تھا۔ اُس گرم بستر میں اپنے آپ کو آسودگی سے لیٹے ہُوئے پا کر اسد کو اچانک بے انتہا طمانیت کا احساس ہُوا، جیسے ایک بار پتھر کے فرش پر لیٹے لیٹے اُس کو منظر دکھائی دینے لگے تھے اور اُسے خیال ہُوا تھا کہ وہ مَر چکا ہے۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد منظر دکھائی دینے بند ہوگئے تھے اور اُس کو پتا چلا تھا کہ وہ زندہ ہے۔ اب خواب اُس کا دل دہلاتے تھے۔ ذوالفقار اُس کے لیے یخنی کا بھرا ہُوا پیالہ اور موٹی سی نرم خمیری روٹی لے کر آیا۔ اب ایک مُستقل بھوک اُس کے پیٹ میں پیدا ہو چلی تھی۔ یخنی کے ساتھ روٹی کھاتے ہُوئے اُس نے شاہ رُخ کے بارے میں پُوچھا۔

"چھٹی سے واپس آگیا ہے۔" ذوالفقار نے کہا، "کل اور پرسوں، دونوں دن آتا رہا ہے۔ ابھی شاید آئے گا۔"

ذوالفقار کرسی پر بیٹھا اِدھر اُدھر کی باتیں کر رہا تھا کہ شاہ رُخ آ پہنچا۔ اسد کو بستر پر اُٹھ کر بیٹھے ہُوئے دیکھ کر اُس کا چہرہ کھِل اُٹھا۔ اُس نے گرمجوشی سے اسد کے ساتھ ہاتھ ملایا اور دیر تک دونوں ہاتھوں میں اُس کا ہاتھ پکڑے زور زور سے ہلاتا اور اُس کے چہرے پر نظریں جمائے خاموشی سے ہنستا رہا۔ پھر وہ اُس کے پاس ہی چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"تم کس مصیبت میں پھنس گئے تھے؟" وہ ہنس کر بولا، "میرے واپس آنے تک تو رُک گئے ہوتے۔" پھر وہ خود ہی اپنی بات پر پشیمان سا ہو کر خاموشی سے اسد کو دیکھنے لگا۔ "تمہارے ساتھ زیادتی ہُوئی ہے۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

اسد دروازے سے باہر شام کے اندھیرے کو دیکھ رہا تھا۔ "ہاں۔" اُس نے آہستہ سے جواب دیا۔

شاہ رُخ نے ذوالفقار کی خیریت دریافت کی۔

"شاہ رُخ،" کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد اسد نے کہا، "وہ کٹڑ چور پکڑا گیا ہے۔"

"ہاں۔"

"کون ہے؟"

"تھا۔" شاہ رُخ نے کہا، "پچھلے سال نکال دیا گیا تھا، چوری میں۔"

"کون ہے؟"

"خوشی محمد۔" شاہ رُخ نے کہا، "باغ کا ہے۔"

"خوشی محمد!" اسد حیرت سے تقریباً چلّا اُٹھا، "مَیں اُسے جانتا ہوں۔"

"ہاں۔ یہ شخص عادی چور ہے۔"

ذوالفقار نے یخنی کا خالی پیالہ اور تھوڑی سی بچی ہوئی روٹی اُٹھائی اور باہر نکل گیا۔

"مگر حکیم کے ساتھ اُس کے پُرانے تعلقات تھے۔" اسد نے کہا، "زیادہ تر جڑی بُوٹیاں تو وہی سرحد پار سے لا کر حکیم کو سپلائی کیا کرتا تھا۔"

"ہاں۔ حکیم کے ذمّے اُس کے کچھ پیسے بھی بقایا تھے۔ مگر چور کے لیے کوئی وجہ ہوتی ہے؟ اس علاقے میں زیادہ تر چوریاں اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھوں ہوتی ہیں، اور عموماً پُرانے تعلقات رکھنے والے کرتے ہیں۔"

"مگر خوشی محمد کے لیے تو چوری کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر اُس کے پیسے حکیم کی طرف نکلتے تھے تو چوری کرنے کا کیا مطلب؟ کرنی ہی تھی تو اپنے پیسے وصول کرنے کے بعد کرتا۔ اور فرض کیا کہ وہ چوری کرنے ہی آیا ہے تو حکیم کو قتل کر دینے سے تو اُسے کچھ بھی نہیں ملتا۔" اسد نے آہستہ سے سر کو نفی میں ہلایا، "مَیں نہیں مانتا۔"

شاہ رُخ ٹکٹکی باندھے اسد کو دیکھتا رہا۔ اُس وقت پہلی بار شاہ رُخ کو احساس ہُوا کہ یہ شخص، اسد، جس کے ساتھ اُس کی گہری واقفیت رہی تھی، وہ شخص نہیں تھا جسے وہ چند روز پہلے گُمشدہ میں چھوڑ کر چھٹی پر گیا تھا۔ گو اُس کی دوستانہ مُسکراہٹ اُسی طرح بے ساختہ تھی، اُس کی باتوں کا رُخ، اُس کی آنکھوں کی عجیب سی ضدی، زخم خوردہ شکل مختلف تھی۔ اس چند روز کے عرصے میں وہ بدل گیا تھا۔

"قتل کی واردات،" شاہ رُخ نے کہا، "ٹیڑھی سی چیز ہے۔ بُہت کم قتل ایسے ہوتے ہیں جو سیدھے سادے واقعات پر بنیاد رکھتے ہیں۔ خوشی محمد کے بارے میں دو باتیں اس وقت کم و بیش یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ چوری کی نیّت سے آیا تھا۔ دُوسری کہ اُس کے ہاتھ سے قتل ہُوا۔ چوری کی نیّت سے

لے کر قتل کی واردات تک کا درمیانی علاقہ نامعلوم ہے۔ کس نے پہلے حملہ کیا، کیوں کیا، کیونکر کیا ؟ ان باتوں کا تعین تفتیش سے ہو گا۔"

"قتل کی شہادت کیا ہے ؟"

"آلۂ قتل۔"

"برآمد ہو گیا ہے ؟"

"ہاں۔"

"کیا ہے ؟" اسد نے بے صبری سے پوچھا، "چاقو ہے ؟"

"ہاں۔"

"مچھلی کی شکل کے دستے والا ؟ پیتل کے دستے والا جس میں رنگ برنگے پتھر جڑے ہوئے ہیں ؟"

"مجھے خبر نہیں۔" شاہ رخ حیرت سے بولا، "تمہیں کیسے خبر ہے ؟"

"اس شکل کا ایک چاقو آلۂ قتل کے نام سے میرے سر منڈھا جاتا رہا ہے۔"

"جو ہتھیار برآمد ہوا ہے بہرحال اصلی ہی معلوم ہوتا ہے۔"

"کیسے ؟ تمہیں کیسے یقین ہے ؟"

شاہ رخ نے اُن سُنی ہوئی، لیکن آنکھوں میں پھر اس انتہا اجنبیت کی جھلک دیکھی۔

"اول اس کے گھر سے برآمد ہوا ہے۔ دوم اس پہ انسانی خون موجود تھا۔ سوم زخم کی شکل و صورت اور نوعیت اس سے میل کھاتی ہے۔ کسی اور ثبوت کی ضرورت نہیں رہتی۔"

ابھی ابھی، اسد نے سوچا، اس نے کہا تھا قتل ایک ٹیڑھی سی چیز ہے۔ وہ پھیلی ہوئی، خالی خالی آنکھوں سے شاہ رخ کو دیکھتا رہا۔ پہلے اتنا اسرار، پھر اتنی سادگی! یہ لوگ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ مجھے ان کی سمجھ کیوں نہیں آتی۔ میں ان لوگوں کی باتوں سے کیسے ایک دم اتنا دور ہو گیا ہوں ؟ اسد نے محسوس کیا کہ اب وہ پہلے کی طرح واقعات کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ کر کسی سیدھے سادے تسلی بخش نتیجے پہ پہنچنے سے قاصر ہو چکا تھا۔ یہ نہیں کہ گتھی کو سلجھانے کی اس کے اندر خواہش نہ رہی تھی۔ مگر حالات پہ اور واقعات کی ظاہری شکل پہ اس کا اعتبار اٹھ گیا تھا۔

"خوشی محمد کو تم نے پکڑوایا ہے ؟" اسد نے پوچھا۔

"اونہوں۔" شاہ رخ نے نفی میں سر ہلایا، "اس کے بھائی بندوں نے ہی مخبری کی تھی۔ مخبری میرے

تک پہنچی، مَیں نے آگے بڑھادی۔ میرا اس میں اتنا ہی حصّہ ہے۔"

ذوالفقار نے دروازے سے اندر جھانکا، جیسے کسی چیز کی تلاش میں ہو۔ میز پر اپنی سگریٹ کی ڈبیا دیکھ کر اندر چلا آیا۔ کرسی پر بیٹھ کر اُس نے ایک سگریٹ سُلگایا اور ڈبیا جیب میں ڈال لی۔ اُس کے سر پر بالوں کی فصل اس شکل میں اُگی تھی جیسے اُس نے ملگجے رنگ کی ٹوپی پہن رکھی ہو۔

"میرا خیال ہے،" وہ کش لے کر بولا، "تم اب آرام کرو۔"

"مَیں اب ٹھیک ہُوں۔" اسد نے کہا۔

"واہ۔" وہ ہنس کر بولا، "بستر پر اُٹھ کر بیٹھنے سے ٹھیک ہو گئے ہو؟ تمہیں کم از کم دو چار دن اور خوراک کی اور آرام کی ضرورت ہے۔" ذوالفقار اُٹھ کھڑا ہوا۔ "مَیں ابھی آتا ہوں۔" اُس نے شاہ رُخ سے کہا اور باہر نکل گیا۔

باہر نکلتے نکلتے ذوالفقار نے دروازہ بھیڑ دیا۔ رات کی روشنی اسد کی نظر سے اوجھل ہوگئی۔ دروازہ بند ہوتے دیکھ کر اُس کا دِل دفعتہً سکڑنے لگا۔ اُس کا جی چاہا کہ شاہ رُخ سے کہے، دروازہ کھول دو۔ مگر باہر پہاڑوں کی رات یک دم سرد ہوگئی تھی۔ اسد بستر پر اکڑوں بیٹھا دروازے کو گھورتا رہا۔

"شاہ رُخ،" اُس نے پُوچھا، "ذوالفقار کو تم کتنی دیر سے جانتے ہو؟"

"چند مہینے سے۔ تم تو اِس کے پُرانے واقف ہو۔"

"میرے ساتھ والے گاؤں کا رہنے والا ہے۔" اسد نے کہا، "یہ اس کا سرکاری مکان ہے؟"

"نہیں۔ ایک کشمیری کا ہے۔"

"یہ کیا کام کرتا ہے؟"

"سرکاری ملازم ہے۔"

"سرکاری ملازم تو تم بھی ہو۔" اسد نے کہا، "یہ کس قسم کا سرکاری ملازم ہے؟"

"تمہیں نہیں پتا؟" شاہ رُخ مُسکرا کر بولا۔

"نہیں۔"

"تمہارے ساتھ اِس کی ملاقات تو ہو چکی ہے۔"

"ایک بار حوالات میں ہُوئی تھی۔ مَیں نے پُوچھا پولیس میں ہو، کہنے لگا نہیں، سرکاری ملازم ہُوں۔" کچھ دیر کے بعد شاہ رُخ نے جواب دیا: "غالباً فوج کے ساتھ اس کا تعلق ہے۔ ٹھیک سے مجھے بھی علم نہیں۔"

"پولیس کے ساتھ اِس کا اثر رسُوخ کیسے ہے ؟"

" تھانیدار کلیم اللہ خاں کے ساتھ اس کا اچھا میل جول ہے ۔ ویسے اس علاقے میں فوج اور پولیس کا آپس میں کچھ نہ کچھ تعلق رہتا ہی ہے ۔ یہاں کا بہت سارا کاروبار فوج کے دم پر چلتا ہے ۔ دراصل فوج کی آمد سے اِس علاقے کے لوگوں کی مالی حالت کافی بہتر ہو گئی ہے ۔ چنانچہ انتظامیہ کے کاموں میں فوج کا تھوڑا بہت دخل قدرتی امر ہے ۔"

" ہوں ــ" اسد ٹھوڑی گھٹنوں پہ رکھے دروازے کو گھورتا رہا ۔" مجھے یہاں کیوں لے آیا ہے ؟" پھر اُس نے کہا ۔

" جب میں چھُٹی سے واپس آیا تو اس نے تمہارے بارے میں میرے ساتھ بات کی تھی ۔ میرے خیال میں تمہارے ساتھ اِسے وَیسے ہی ہمدردی ہو گئی ہے ۔ آدمی دل کا اچھا ہے ۔ فوج میں ہونے کے باوجود بہت جذباتی اور مخلص شخص ہے ۔ پڑھا لکھا آدمی ہے ۔"

" ہاں ۔" اسد نے کہا ،" یہاں کیوں لے آیا ہے ؟"

شاہ رُخ کمرے میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا ۔" سب سے مناسب جگہ غالباً یہی تھی ۔" وہ بولا ۔

" مناسب جگہ سے کیا مطلب ؟"

شاہ رُخ نے جواب دینے سے احتراز کیا ۔ جب اسد نے اپنا سوال دُہرایا ، تو بولا :" میں نے پُوری کوشش کی تھی کہ تمہیں بنگلے لے جاؤں ۔ مگر پولیس نے اعتراض لگا دیا ۔"

" کیسا اعتراض ؟"

" اُن کے خیال میں گُشند کے علاقے میں تمہارا جانا مناسب نہیں ۔"

" کس کے خیال میں ؟ تھانیدار کے ؟"

" پولیس کے خیال میں ۔" شاہ رُخ نے کہا ۔

" کیوں ؟"

" نقضِ امن ــ"

" نقضِ امن !" اسد بولا ،" میں جرائم پیشہ آدمی ہوں ؟" غصّہ اُس کے دماغ کو آندھی کی طرح چڑھا ۔ "جرائم پیشہ میں ہوں یا وہ ہیں ؟ جو بے گناہوں کو پکڑ کر اُن پر تشدد کرتے ہیں ؟"

وہ کئی لمحوں تک اُبلتی ہوئی آنکھوں سے جواب طلب کرتا رہا ۔ شاہ رُخ نے خاموشی سے بھنوئیں اور کندھے

اُچکا کر بے بسی کا اظہار کیا۔ شاہ رُخ کی اُس حرکت کا اثر تھا یا کہ اپنی آواز کی بے جوابی کا احساس، اسد کا غصہ جس سُرعت سے چڑھا تھا، اُسی تیزی سے ٹھنڈا پڑ گیا۔

"یا شاید اُسے یہ خدشہ ہے،" اسد متوازن آواز میں بولا، "کہ میں اُس کی کارگزاری لوگوں میں بیان کر دوں گا؟"

"نقصِ امن کا حیلہ کسی بھی مقصد کے لیے استعمال ہو سکتا ہے۔" شاہ رُخ نے کہا، "قانون نے اس سلسلے میں انہیں وسیع اختیارات دیے ہیں۔"

"مگر میں وہاں ......"

شاہ رُخ گویا اُس کے دل کی بات جان گیا۔ "یاسمین اب بالکل ٹھیک ہے۔" وہ اسد کی بات کاٹ کر بولا، "اُس پر صدمے کے اثرات کافی حد تک زائل ہو گئے ہیں۔ کچھ اُن کے مزارعوں نے ہاتھ پاؤں نکالنے شروع کیے تھے۔ میں نے انہیں دبا دیا ہے۔"

غصہ ایک بار پھر اسد کے دل میں اُچھال مارنے لگا۔ مگر اب کے یہ غصہ ایک بندھی بندھائی، باضبط صورت میں ظاہر ہو رہا تھا۔ شاہ رُخ اُس کے پاس گیا ہے؟ جاتا رہتا ہے؟ کتنی بار ملا ہے؟ وہ سوچنے لگا۔ یاسمین نے شاہ رُخ سے میرے بارے میں پوچھا ہے؟ وہ اب مجھ سے ملنے تو آ سکتی ہے۔ آتی کیوں نہیں؟ شاہ رُخ نے اُسے بتایا ہے؟ —— جب اسد کا دل اس اُچھال کی کوہان پر اُٹھتا تو ایک ایک کرکے یہ سوال اُبھرتے، پھر ڈوب جاتے۔ اُسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اُسے گُنبد جانے سے روکا جا سکتا ہے۔

"مگر میں وہاں رہتا ہوں۔" وہ بے سمجھ آواز میں بولا، "علاج کروا رہا ہوں۔"

"علاج کرنے والا تو چل بسا۔" شاہ رُخ نے کہا، "پولیس کو خواہ مخواہ چیلنج کرنا مناسب نہیں۔ اس قصّے کو اب ــ ــ ــ"

"مناسب نہیں!" اسد بولا، "یہاں پر کیا مناسب ہے اور کیا مناسب نہیں۔ بے گناہوں کو پکڑنا مناسب ہے؟ میری بے گناہی ثابت ہو چکی ہے۔"

"یہ بات نہیں۔" شاہ رُخ نے صبر سے کہا، "تمہارے ذاتی تحفظ کے لیے بھی نقصِ امن لاگو ہو سکتا ہے۔"

"ذاتی تحفظ تو مجھے اُسی روز حاصل ہو گیا تھا جب میں اُن کی قید سے چھوٹا تھا۔" اسد طنز سے بولا۔ "گُنبد میں مجھے کیا خطرہ ہے؟"

"میں اُن کا نقطۂ نظر بیان کر رہا ہوں۔"

"تمہارا نقطۂ نظر کیا ہے؟" اسد تیزی سے بولا، "یا تمہارا کوئی نقطۂ نظر نہیں؟"

جواب میں اسد کو شاہ رُخ کے فراخ چہرے پر کھُلی ہُوئی بے صوت آنکھیں ملیں، جن میں نسل در نسل اطاعت کی خاموشی اور اطمینان تھا۔

اُس نے چیں بجبیں ہو کر کمرے میں ایک نظر دوڑائی۔ کوئی حیلہ۔ کوئی بہانہ۔ جب اُسے اور کچھ کہنے کو نہ مِلا تو بولا: "میرا سامان وہاں پر ہے۔"

شاہ رُخ کی آنکھوں کا رُخ بدلا۔ اسد کی نظروں نے اُن کا پیچھا کیا، پھر اُس نے جلدی سے جھک کر چارپائی کے نیچے نظر ڈالی تو اُس کا سامان پڑا تھا۔ کالا ٹرنک، مقفّل، اُوپر کمبل کا چھوٹا سا بُغچہ، سب سے اُوپر بُوٹوں کا ایک جوڑا۔ سب چیزیں ادوائن کی رسّی سے کس کر ایک گٹھڑی کی صورت میں باندھ دی گئی تھیں۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے، شاہ رُخ کو دیکھتے ہُوئے، ہاتھ چارپائی کے نیچے لے جا کر اپنے سامان کو ٹٹولتا رہا۔ بہت آہستہ آہستہ، اُس کا دل بیٹھ گیا۔

کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد اسد نے کہا: "تم کچھ نہیں کر سکتے؟"

"میں نے پوری کوشش کر کے دیکھ لی ہے۔" شاہ رُخ نے کہا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ وہ چارپائی کے پاس کھڑا بند دروازے کو دیکھتا رہا۔ "ذوالفقار نہیں آیا۔ بہت دیر ہو گئی ہے۔ میں اب چلتا ہُوں۔" اُس نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

"بنگلہ یہاں سے کتنی دُور ہے؟" اسد نے ہاتھ ملاتے ہُوئے پُوچھا۔

"پانچ میل۔" شاہ رُخ نے جواب دیا۔ "کل آؤں گا۔" وہ ہاتھ ہوا میں لہرا کر دروازے سے نکل گیا۔ باہر جا کر اُس نے آہستہ سے دروازہ بھیڑ دیا۔

اُس وقت ایک بار پھر اسد پر وہ دہلا دینے والا، بے بسی اور تنہائی کا احساس طاری ہونے لگا۔ اُسے محسوس ہُوا کہ اُس کے وجود کی جڑیں ہلنے لگی ہیں، اُن میں خلا پیدا ہو گئے ہیں اور ہوا بیچ سے نکلی جا رہی ہے اور دُور دُور تک کوئی اُن پہ ہاتھ رکھنے والا نہیں۔ وہ بستر پہ ڈھلک گیا۔ اُس نے کمبل سے اپنے آپ کو ڈھانپ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ذوالفقار دروازہ کھول کر اندر داخل ہُوا، اسد کو سویا ہوا پا کر آہستہ آہستہ قدم رکھتا کمرے کے وسط تک آیا اور چند منٹ تک رُکا رہا۔ اسد نے سر اُٹھایا نہ آنکھیں کھولیں۔ اُس میں اتنی ہمت نہ رہی تھی کہ ذوالفقار کا سامنا کرتا۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے پھُونک سے لیمپ بجھانے کی آواز سُنی۔ پھر قدموں کی چاپ باہر نکل گئی اور

دروازہ بند ہو گیا۔

خواب میں اُس نے بند دروازے اور یاسمین کے کھلی کھلی آنکھوں والے لمبے تکونی چہرے دیکھے۔ پہاڑ کی ڈھلان پہ وہ لڑھک رہا تھا۔ کوئی شے دل سے نکل گئی تھی، مگر پتا نہیں چلتا تھا۔ دل ایک شکنجے میں تھا۔

★ ★ ★ ★ ★

"مَیں آج باہر جا رہا ہوں۔" صبح سویرے ذوالفقار نے اسد سے کہا، "رات کو دیر سے واپس آؤں گا۔ کریم کو کہہ دیا ہے۔ تمہارا کھانا تیار کر دے گا۔ آرام کرنا۔"

اسد چارپائی پر بیٹھا، دُودھ والی اُبلتی ہوئی کشمیری چائے کا بڑا سا پیالہ پکڑے مَیلی سی ڈبل روٹی بھگو بھگو کر کھا رہا تھا۔

"کل رات کو شاہ رُخ ــ ــ" اسد نے کہنا شروع کیا۔

"ہاں۔" ذوالفقار نے اُس کی بات کاٹ کر کہا، "مَیں واپس آ رہا تھا تو ملاقات ہوئی تھی۔ شام کو آئے گا۔"

ذوالفقار کرسی پہ بیٹھا سگریٹ پی رہا تھا۔ اُس کا دُھلا دُھلا، داڑھی مُنڈا صحت مند چہرہ ایک مستعد اور فرض شناس شخص کا چہرہ تھا۔ صرف اُس کی گول گول تیز آنکھوں میں کسی ایسے جذبے کی چمک تھی جو اُسے دوسروں سے ممتاز کرتی تھی۔ اُسے دیکھتے ہوئے اسد کو بلاوجہ شاہ رُخ کا چہرہ یاد آیا۔ شاہ رُخ کا چہرہ نسبتاً خوبصورت اور فراخ تھا، مگر اُس میں کوئی خاص بات نہ تھی، جیسے کہ اُس کے پیچھے کی زمین سپاٹ ہو۔ اُس کا چہرہ ایک عام سرکاری ملازم کا چہرہ تھا، ذہین، خداخوف، کسی حد تک با اصول۔ اُس پہ نظر ڈال کر معلوم ہوتا تھا کہ وہ سپاٹ زمین غیر آباد اور زرخیز ہے، اسے قبضے میں لے کر کچھ بھی پیدا کیا جا سکتا ہے۔ وہ ایک ایسے آدمی کا چہرہ تھا جسے اصول کے نام پہ حکم دے کر بے مثال سفّاکی کا اہل بنایا جا سکتا تھا۔ اس کے برعکس ذوالفقار کا چہرہ سنگلاخ زمین پر قائم تھا۔ اُس زمین پر بے شمار زیر و بم، دھوپ سائے، خاردار جھاڑیوں کے نشان ملتے

تھے۔ یہ احساس ہوتا تھا کہ مستعدی اور فرض شناسی کے علاوہ کوئی اور "قوت" بھی ہے جو اِس شخص کی جڑوں کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہے۔ یہ کون سی شے تھی؟ علم؟ جنون؟ جبر؟ ---- اس چہرے کا ایک ذہن تھا۔ یہ شخص ان لوگوں میں سے تھا جن کے اُوپر پُرشکوہ حکومتوں کے عہد چلتے ہیں۔ اِس چہرے پر بھروسا کیا جاسکتا تھا۔ اسد کے دِل میں اچانک، پہلی بار، ذوالفقار کے اُوپر اعتماد کا جذبہ پیدا ہوا۔

"مَیں گمشدہ کیوں نہیں جاسکتا ہے؟" اُس نے پُوچھا۔

"ہُنہہ؟"

"گمشدہ میں میرا داخلہ کیوں بند ہے؟"

"تمہاری حفاظت کا معاملہ پولیس کے پیشِ نظر ہے۔"

"مجھے کِس سے خطرہ ہوسکتا ہے؟"

"حکیم کے کچھ مزارعے پہلے ہی سر اُٹھا چکے ہیں۔ شاہ رُخ کی مداخلت سے معاملہ رفع دفع ہوگیا ہے۔ یاسمین گُل پھر بھی گاؤں کی اپنی لڑکی ہے۔ جیسے تیسے حالات کے مطابق رہنا سیکھ لے گی۔ تمہارا معاملہ مختلف ہے۔"

"کیسے؟"

"تم اجنبی ہو۔ جرم اور سزا کا معاملہ ایک عجیب معاملہ ہے۔ ایک طرف یہ سراسر قانونی معاملہ ہے تو دوسرے ہاتھ پر ذاتی معاملہ بن جاتا ہے۔ آج اگر خوشی محمد کا جُرم ثابت ہوجاتا ہے اور اُسے سزا ہوجاتی ہے، تو بھی تمہارے خلاف ان دیہاتیوں کا بُغض قائم رہے گا۔ مجھے یقین ہے کہ ان میں سے کئی ایسے ہوں گے جو آخری دم تک خوشی محمد کو بے گناہ ہی سمجھیں گے۔"

میری بے گناہی ثابت ہوچکی ہے، اسد نے کہنا چاہا۔ مگر زبان روکے ذوالفقار کو دیکھتا رہا۔

"پھر اگر تم انہی لوگوں کے درمیان جاکر، اُسی گھر میں رہنا شروع کردو تو معاملہ ذرا ٹیڑھا ہوجاتا ہے۔ بیشک اس کا ایک اور رُخ بھی ہے۔ پولیس نہیں چاہتی کہ اُن کے اُوپر بھی کسی قسم کا کوئی حرف آئے۔"

"مَیں پولیس کے بارے میں کوئی بات نہیں کروں گا۔" اسد نے کہا۔

"تمہیں علم ہے یہ علاقہ اپنی تاریخ کے نازک ترین دَور سے گزر رہا ہے۔ ان حالات میں کسی چھوٹی سے چھوٹی بدامنی کا رِسک بھی نہیں لیا جاسکتا۔ یہ قوم اِس وقت جس مرحلے پر ہے اُس کو اگر ہم نے کامیابی سے سر کرنا ہے تو اتھارٹیز کا مکمل کنٹرول اس کے لیے پہلی شرط ہے۔"

"اتھارٹیز!" اسد نے اچنبھے سے دہرایا، "اتھارٹیز تو نظم و نسق چلانے کے لیے ہوتی ہیں۔ قومیں

کے مرحلے کیسے سر کر سکتی ہیں ؟"

ذوالفقار کے چہرے پر ہلکی سی پُر اعتماد مسکراہٹ ظاہر ہوئی ۔ "پراپیگنڈا ، میرے دوست، جو تمہیں اخباروں اور کتابوں میں ملتا ہے ، وہ سیاست کے مرحلے طے کرتا ہے نہ جنگ کے ۔ قوم ۔ جمہوریت ۔ انقلاب ۔ یہ سب کیا ہے ؟" اُس کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے ہوا میں اُٹھا اور ایک ہلکے سے دھماکے کے ساتھ میز پر آرہا ۔ "ایکشن" ۔ وہ فیصلہ کن انداز میں بولا ۔ "ایک ہزار کتابیں لکھی جاتی ہیں تو ایک دُور عمل آتا ہے ۔ دُنیا کے بڑے بڑے انقلابوں میں لاکھوں آدمیوں کو ، انقلاب کے سپاہیوں کو مروا دینا ضروری سمجھا گیا ۔ کیوں ؟ ڈسپلن ۔ تمہیں علم ہے اِس وقت بڑی بڑی نامور انقلابی حکومتوں کو کون چلا رہا ہے ؟" اُس نے اعلانیہ انداز میں اُنگلی ہوا میں اُٹھائی ، "ملٹری" ۔

ذوالفقار کی آنکھوں کی پوشیدہ آگ چمک اُٹھی تھی ۔ اسد اُس کے جذبے کے چنگل سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا ۔

" اس قوم کو اب قیادت اور کنٹرول کی ضرورت ہے ——— " ذوالفقار کہہ رہا تھا ۔

" مجھے اپنی ذمہ داری کا احساس ہے ۔" اسد نے کہا ۔

ذوالفقار نے گہری نظروں سے اُسے دیکھا ۔ " ٹھیک ہے ۔ تمہیں اپنی ذمہ داری کا احساس ہے تو بہت کچھ کر سکتے ہو ۔ مگر تم جانا ہی چاہتے ہو تو بہتر یہی ہے کہ واپس اپنے گاؤں چلے جاؤ ، اور یاسمین کو خط لکھ کر بلوا لو ۔ وہ اپنی جائداد وغیرہ بیچنے کا بندوبست کر سکتی ہے ——— بشرطیکہ وہ جانا چاہے ۔"

" وہ جانا چاہتی ہے ۔" اسد نے جلدی سے کہا ۔

" تمہیں یقین ہے وہ جانا چاہتی ہے ؟" ذوالفقار نے مسکرا کر پوچھا ۔

" ہاں ۔ مجھے یقین ہے ۔ جائداد کا بندوبست کرنے میں کچھ وقت لگے گا ۔" اسد نے بات بنائی ، " مگر سب سے پہلے مجھے اپنی دوا حاصل کرنی ہے ۔ اس کے بغیر میرا زندہ رہنا بہت مشکل ہے ۔ یاسمین کو ——"

ذوالفقار کی ہنستی ہوئی ، ٹھٹھا کرتی ہوئی آنکھوں کے سامنے اُس کا عزم ٹوٹنے لگا ۔ اُس نے بمشکل جملہ پورا کیا ، " اس دوا کا علم ہے ۔"

کھلے دروازے سے صبح کی دھوپ میں ملبوس پہاڑ کی چوڑی پُشت نظر آ رہی تھی ۔ جگہ جگہ پر گھنے بلند درختوں کے جھنڈ تھے جو دُور سے گھنی سیاہ جھاڑیوں کی مانند دکھائی دیتے تھے ۔ اسد کی طویل ، ٹھہری ہوئی نظر ان پہ اٹکی رہی ۔ کوئی حیلہ ، کوئی بہانہ ! آسمان کا رنگ کس قدر صاف ہے ، اس نے حیرت سے سوچا ۔ صاف اور نیلا ۔ اتنا خالص اور شوخ رنگ آسمان کا مَیں نے کبھی نہیں دیکھا ۔ اسد کو پہلی بار احساس ہُوا کہ وہ

بے گھر ہوگیا ہے۔ گنبد کا نقشہ اس کی آنکھوں کے آگے آ کر ٹھہر گیا۔ سنسان دیواروں سے لپٹی ہوئی دھوپ سناٹے کے عالم میں تھی، اور ہر دیوار کے ساتھ ایک ہی صورت کھڑی تھی۔ اسد کا دل حلق کی جانب لپکا۔ یاسمین! اس نے آنکھیں اٹھا کر ایک پیلی سی نظر آسمان پر ڈالی۔ آسمان کے بیچوں بیچ دھوپ میں ہیرے کی مانند چمکتا ہوا ایک پرندہ اڑ رہا تھا۔ اسد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس کے ہاتھ کی کپکپاہٹ سے پیالے کی تہہ میں بچی ہوئی چائے کے گول دائرے میں لرزش پیدا ہوئی۔ اس نے پیالہ اپنے آگے بستر پر رکھ دیا۔ دفعتاً، اس کا ضبط ٹوٹ گیا۔

"اگر آپ —" اس نے دروازے سے باہر دیکھتے ہوئے بمشکل کہا، "کچھ مدد کریں، تو چند روز میں یہ کام ہو سکتے ہیں۔"

انصاف کی طلب سے، اس نے سوچا، مدد کی طلب تک، آنکھ جھپکنے کا وقفہ ہے۔

ذوالفقار کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ وہ گہرے تفکر کی نظر سے اسد کو دیکھنے لگا۔ اس نے سگریٹ کا ایک آخری کش لگایا، سگریٹ کو زمین پر پھینک کر اسے چمکتے ہوئے سیاہ بوٹ کی ایڑی سے مسلا، اور لمبے سانس کے ساتھ دھواں چھوڑ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

اس نے دو بار آہستہ آہستہ سر کو اثبات میں ہلایا۔ "ہوں۔" اس نے حلق سے مرافق آواز نکالی، اور پیالہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

★ ★ ★ ★ ★

رات کے گھپ اندھیرے میں درختوں کی حد پر پہنچ کر دونوں آدمی رک گئے۔ کچھ دیر تک وہاں کھڑے وہ تاریکی میں ڈوبے ہوئے گاؤں پر نظر دوڑاتے رہے۔ گنبد میں کوئی حرکت نہ تھی۔

پھر شاہ رخ نے اپنی رائفل دہنے ہاتھ سے بائیں میں منتقل کر کے خالی ہاتھ آگے بڑھایا۔ "امید نہیں کہ کوئی گڑبڑ ہو۔" اس نے کہا، "ہوئی تو فکر مت کرنا۔ مجھے خبر ہو جائے گی۔ خدا حافظ۔"

اسد نے خاموشی سے ہاتھ ملایا اور کوئی بات کیے بغیر کھلی زمین پر نکل آیا۔ ہوا میں خنکی آ چلی تھی۔ آہستہ آہستہ

چلتا ہوا وہ اُس مختصر سے سفید میدان کو پار کرنے لگا۔ ایک بار اُس نے مڑ کر دیکھا۔ شاہ رُخ درختوں میں غائب ہو چکا تھا۔ چار پانچ میل کے پیدل سفر کے بعد اُس کی ٹانگیں کمزوری سے لرز رہی تھیں۔ کپڑوں کا چھوٹا سا بُقچہ بغل میں دبائے وہ گُنبد کی دیواروں تک پہنچا۔ اچانک ایک طرف سے کُتّے نے بھونکنا شروع کر دیا۔ اُس نے رُک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ کُتا رات کے اندھیرے میں عادتاً بھونک رہا تھا۔ اُس کی آواز پر گاؤں کی تین چار مختلف سمتوں سے کُتّے جواباً بھونکنے لگے۔ چند منٹ تک یہ شور جاری رہا۔ کدھر سے جاؤں؟ اسد نے دیوار کے پاس کھڑے سوچا۔ اِس وقت کیا کر رہی ہوگی؟ بستر پر لیٹی ہوگی؟ سو رہی ہوگی؟ سونے کی کوشش کر رہی ہوگی؟ شاید حسین بی بی سے باتیں کر رہی ہو؟ بڑھیا ابھی وہاں رہتی ہوگی؟ بڑھیا کہاں جائے گی؟ اُس کی ماں کی جگہ پر ہے۔ کھڑکی کی طرف سے جانا ٹھیک نہیں۔ یاسمین کو خیال بھی نہیں ہوگا میں اس وقت آسکتا ہوں۔ رات کافی پڑ گئی ہے۔ مجھے دیکھ کر وہ کیا کرے گی؟ دھڑک۔ دھڑک۔ دھڑک۔ اسد کا دِل اُچھل اُچھل کر پسلیوں کی دیواروں پر سر ٹیک رہا تھا۔

جب تک وہ فی الواقع گُنبد کی گلیوں میں آ کھڑا نہ ہوا تھا اُسے اِس بات کا خیال بھی نہیں آیا تھا کہ گاؤں کے لوگوں کا رویہ اُس کے ساتھ کیسا ہوگا۔ اب سنسان دیواروں کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اُس نے اُن لوگوں کی خاموش سُلگتی ہوئی مخالفت کو، اُن کی پوشیدہ جارحیت اور اُن کے تنگ و تاریک دہقانی شبہے کو اپنی ہڈیوں میں محسوس کیا۔ تھکاوٹ سے اُس کی پنڈلیوں میں درد ہونے لگا تھا۔ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر اپنی چھاتی اور حلق کو سہلایا، دِل کو ٹھہرانے کی کوشش کی، لمبے لمبے سانس لیے، مگر دِل زخمی پرندے کی مانند پھڑکتا رہا۔ مطلب تاریک پڑا تھا۔ اسد نے فیصلہ کیا تھا کہ وہ دروازے کی طرف سے جائے گا، مگر دروازے پر پہنچ کر اُس نے رُخ بدلا اور دیوار کے ساتھ دبے پاؤں چلتا ہوا کھڑکی کے نیچے جا کھڑا ہوا۔ اُس نے کھڑکی کی درزوں سے آنکھیں لگا کر دیکھا، اندر تاریکی تھی۔ اُس نے کان لگا کر سُنا۔ دھڑک۔ دھڑک۔ دھڑک۔ اُس کے دِل کے دھڑکنے کی آواز تھی، اتنی اُونچی کہ اُسے خدشہ ہونے لگا کہیں اندر یاسمین تک نہ پہنچ جائے۔ وہ واپس دروازے پر آ کھڑا ہوا۔ اُس کے پیٹ کے اندر سردی کا تشنج پیدا ہو رہا تھا اور ٹانگیں کانپ رہی تھیں۔ اُس نے ہاتھ اُٹھانا چاہا، مگر اُسے محسوس ہوا کہ کہنی میں طاقت نہیں رہی۔ اُس نے ایک لمبا سانس کھینچ کر اِدھر اُدھر دیکھا اور ہاتھ اُٹھا کر دروازے پر رکھ دیا۔ (دروازے کی سرد اور کھردری لکڑی کا وہ لمس اُسے عُمر بھر یاد رہا۔) دروازے کی درزوں میں روشنی اُبھری اور آواز آئی: "کون ہے؟" آواز حسین بی بی کی تھی۔

"میں ہُوں۔" اُس نے کانپتی ہُوئی آواز میں جواب دیا۔

بڑھیا نے کُنڈی اُتار کر دروازہ ذرا سا کھولا اور لالٹین اُٹھا کر روشنی اسد کے چہرے پر ڈالی، پھر کواڑ کھول کر ایک طرف کو ہٹ گئی۔ اونچے نیچے ٹوٹے ہُوئے فرش والی ڈیوڑھی میں کھڑی وہ اسد کو خالی خالی، بوڑھی بے پہچان نظروں سے دیکھتی رہی۔

"یاسمین کہاں ہے؟" اسد نے پوچھا۔

"سو رہی ہے۔" حسین بی بی نے نیچی آواز میں جواب دیا۔

اسد نے اُس کے ہاتھ سے لالٹین پکڑ لی اور یاسمین کے کمرے کے دروازے پر جا کھڑا ہُوا۔

"اپنے ابا کے کمرے میں سوتی ہے۔" حسین بی بی نے کہا۔

اسد نے حیرت سے اُسے دیکھا اور حکیم کے کمرے کی طرف لَوٹ آیا۔ دروازے پر ہاتھ رکھ کر اُس نے آہستہ سے دھکیلا تو دروازہ کھُل گیا۔ لالٹین اُٹھائے وہ کمرے میں داخل ہُوا۔

کمرے میں خواب آلود سانس کی ہلکی ہلکی حرارت اور خوشبو تھی۔ تازہ خمیری روٹی کی سی نیم گرم آسودہ خوشبو۔ لالٹین کی روشنی میں کمرے کا نقشہ ایک دم اُبھر آیا۔ ہر ایک چیز اُسی جگہ پر تھی جہاں ہمیشہ سے رکھی تھی، صرف بستر کے آگے چپل کا جوڑا یاسمین کا تھا۔ بستر پر یاسمین موٹی زرد رنگ چادر سے ادھ ڈھکی ابتدائی شب کی گہری نیند سو رہی تھی۔ وہ سیدھی پُشت پر پڑی تھی اور اُس کا سر تکیے پر ایک طرف کو مُڑا ہوا تھا۔ ایک ٹانگ میڑھے زاویے پر چارپائی کے کنارے تک چلی گئی تھی اور پیر چادر سے باہر نکلا ہُوا تھا۔ اُس کے ڈھیلے ڈھالے کھُلے ہُوئے، تازہ تازہ تیل لگے بال ماتھے اور کانوں کو ڈھانپے ہُوئے تھے۔ نیند میں وہ بے معلوم سے، سُست رفتار آسودہ سانس لے رہی تھی۔ اسد دیر تک چارپائی کے پاس کھڑا لالٹین ہلا ہلا کر، مختلف جگہوں سے روشنی ڈال کر اُس کے چہرے کے سایوں کو حرکت کرتے ہُوئے دیکھتا رہا۔ اُس نے کبھی یاسمین کو آرام دہ خواب کی حالت میں نہ دیکھا تھا۔ اُس کے رُخساروں کی ہڈیاں اُبھر آئی تھیں۔

اسد نے محسوس کیا کہ اُس کی پُشت پر کوئی کھڑا ہے۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ کمرے میں کوئی نہ تھا، مگر دروازے پر اُسے حسین بی بی کا چہرہ نظر آیا جو اُس کے مُڑنے پر غائب ہو گیا۔ اسد نے لالٹین زمین پر رکھی اور دروازے کے پاس جا کر کواڑ بند کر دیے۔ کمرے کے فرش پر دبے پاؤں چلتا ہوا وہ واپس آ رہا تھا کہ یاسمین نے آنکھیں کھول دیں۔ ایک لمحے تک وہ بے نظری سے چھت کو دیکھتی رہی۔ پھر اُس نے اسد کو دیکھا اور جھٹکے سے سانس کھینچ کر اُٹھ بیٹھی۔ خوف کے مارے اُس کے مُنہ سے ایک چیخ نما آواز نکلی جسے اُس نے فوراً مُنہ پر ہاتھ رکھ کر دبا لیا۔ اُس نے مُڑی ہُوئی ٹانگ کو کھینچ کر دُوسری ٹانگ کے برابر رکھا اور گھُٹنے چھاتی سے لگا کر، ایک ہاتھ مُنہ

پہ اور دُوسرا اگلے پہ رکھتے، پھٹی پھٹی وحشی نظروں سے اسد کو دیکھتی رہی۔ اسد کی ٹانگوں کی تھکاوٹ اور بدن کی لرزش غائب ہو چکی تھی۔ اُس کا دل ٹھہر گیا تھا اور وہ چارپائی سے ایک گز کے فاصلے پر آسانی سے اپنے آپ کو سنبھالے کھڑا ہلکے ہلکے سانس لے رہا تھا۔ اُس کے پیٹ کا تشنج حرارت کی لہر نے پگھلا دیا تھا۔

"اسد۔" یاسمین نے سرگوشی کی، جیسے اپنے آپ کو بتا رہی ہو۔ پھر وہ تڑپ کر بستر سے اُٹھی اور ایک گہری آواز نکال کر اسد کے بہت قریب آ کھڑی ہوئی۔ اندھوں کی طرح مُنہ اُٹھا کر اس نے ہاتھوں سے اسد کے چہرے کو ٹٹولنا شروع کیا۔ ناک۔ مُنہ۔ آنکھیں۔ بال پھر کندھے۔ بازو۔ سینہ۔ پھر کمر۔ کمر کے گرد بازو۔

"اسدی۔" وہ بولی۔ اُس کی آواز حیرت ناک طور پہ پُرسکون تھی۔ "تم آ گئے ہو؟" مگر اُس کے ہاتھ، اُس کے لب اُسی طرح مضطرب، بے اعتماد، بے قرار رہے۔ اُس کا ایک پَیر لالٹین کے تپے ہوئے شیشے سے لگا اور وہ "سی" کر کے ایک طرف کو اُچھل گئی، مگر اُس نے مُڑ کر نہ دیکھا۔ اُس کے ہاتھ تھے، نظریں سامنے مرکوز رہیں، جیسے عبادت کی حالت میں۔ اُس کی ٹھوکر سے لالٹین اوندھی ہو گئی تھی اور چمنی سے شیشے کا ایک گول ٹکڑا تڑخ کر علیحدہ ہو گیا تھا، جس میں سے بتی سیاہ دُھواں اُگل رہی تھی۔ کچا تیل جلنے کی بُو اسد کی ناک میں پہنچی تو وہ چونکا۔ لالٹین کی کُپی کا ڈھکنا ڈھیلا تھا اور اُس میں سے تیل رِس رِس کر زمین پر بہہ رہا تھا۔ اسد نے جُھک کر لالٹین سیدھی کی اور سُوراخ میں پھونک مار کر بتی بجھا دی۔ کچے دھوئیں کی بُو آہستہ آہستہ اندھیرے میں تحلیل ہونے لگی۔ یاسمین کے ہاتھوں کو روشنیاں لگی تھیں، جن میں دیکھ بھال کر وہ اسد کی پہچان کر رہی تھی۔ "اسدی۔" وہ اسد کے ساتھ چمٹ کر دھیمی، متوازن آواز میں رونے لگی، جیسے عام لہجے میں کوئی بات کر رہی ہو۔

★ ★ ★ ★ ★

"اسدی۔" یاسمین نے کہا، "تمہیں کیا ہو گیا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" اسد نے ہنس کر جواب دیا۔ "مَیں ٹھیک ٹھاک ہوں۔"

اسد اُٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا اور اُس کے پٹ کھول کر باہر دیکھنے لگا۔ پَو پھٹ رہی تھی۔ مشرقی آسمان پر اُجالا

تھا، اور آسمان کے اندر پہاڑ کی چوٹیوں کی کٹی پھٹی، اونچی نیچی لکیر زیادہ شوخ اور واضح ابھرتی چلی آ رہی تھی۔ دائیں طرف کو ایک چوٹی تھی جس کے قریب ایک گاؤں واقع تھا، اور کبھی کبھی چوٹی کی لکیر کے اوپر کوئی بکری یا کوئی بھیڑ آ جلے آسمان کے مقابل نیچے سے سیاہ پتھر کے بت کی مانند کھڑی نظر آ جاتی تھی۔ پہاڑ کی چوٹی کے پاس بود و باش رکھنے والے یہ لوگ اسد کو بے حد اجنبی لگتے تھے، جیسے کوئی غیر ملک ہو۔ اتنی اونچائی پر، الگ تھلگ۔ برف اور برفانی ہوائیں اور دشوار گزار راستے، اس نے کھڑکی میں کھڑے کھڑے سوچا، گرم ٹوپیاں، موٹی موٹی گالوں والے بچے۔ راہب گاؤں ....

مغرب کی جانب آسمان ابھی سیاہ تھا۔ پہاڑ کا مہیب، تاریک جثہ آسمان کے اندر سے بہت مدھم مدھم ابھر رہا تھا۔ اسد نے دو تین لمبے لمبے سانس لیے اور صبح کی ہوا کو اپنے چہرے پر چلتے ہوئے محسوس کیا۔ کھڑے کھڑے اس کی ٹانگوں کو سردی لگنے لگی تھی۔ وہ کھڑکی سے لوٹ آیا۔

یاسمین پہلو کے بل لیٹی، سر ہاتھ پہ اٹھائے اسے بستر کی طرف آتے ہوئے دیکھتی رہی۔

"تمہارے گھٹنے بجتے ہیں۔" وہ شرارت سے ہنسی۔

"ہنہہ؟"

"چلتے ہوئے تمہارے گھٹنے ایک دوسرے سے بجتے ہیں۔"

"کہاں بجتے ہیں!" وہ جھینپ کر بولا۔

"دیکھو لو۔" وہ ہنسی، "میں نے آج دیکھے ہیں۔"

اسد آ کر اس کے برابر لیٹ گیا۔

"اسدی۔" یاسمین نے اس کی ٹانگوں کو چادر سے ڈھک کر کہا۔

"ہوں۔"

کھڑکی کے راستے آسمان کی ہلکی ہلکی روشنی اسد کے سر پر پڑ رہی تھی۔

"سوروں نے،" وہ روتی ہوئی غضب ناک آواز میں بولی، "تمہارے ساتھ کیا کیا ہے!"

اسد اس کے اٹھے ہوئے کندھے پر ہاتھ رکھے اسے دیکھتا رہا۔

"سولہ دن میں تمہاری ہڈیاں نکل آئی ہیں۔"

"سولہ دن ہوئے ہیں؟"

"ہاں۔" یاسمین کا ہاتھ اس کی پسلیوں پر رکھا رکھا کپکپا رہا تھا۔ "پچھلے سے پچھلے منگل کو تم گئے تھے۔

آج بدھ ہے۔"

ایک۔ دو۔ تین۔ چار۔ پانچ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اسد دنوں کا حساب کرنے لگا۔

"کیا گن رہے ہو؟"

"دِن۔" اسد نے کہا، "ساتویں دن تک مجھے یاد ہے۔ مَیں نے دنوں کا حساب رکھنے کی کوشش کی تھی۔

"پہلے دن کیا ہوا تھا؟"

"پُوچھ گچھ۔" وہ بولا۔

"کیسی پُوچھ گچھ؟" یاسمین کے لہجے میں تجسّس تھا، "تمہیں یاد ہے؟"

"ہاں۔"

کچھ دیر وہ اسد کے بولنے کا انتظار کرتی رہی۔ "کیسی پُوچھ گچھ؟" اُس نے دُہرا کر پُوچھا۔

اسد خاموش رہا۔

"بتاؤ۔" وہ بولی۔ پھر اچانک وہ اپنے سوال پر پریشان ہو گئی۔ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر اپنا بازو اسد کے سینے پر ڈال دیا اور اُس کے کندھے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

"مَیں ہر وقت سوچا کرتی تھی تم اب کیا کر رہے ہو گے، کیا سوچ رہے ہو گے۔ بس اس لیے پُوچھتی ہُوں۔ اور کوئی بات نہیں۔"

اسد لیٹا لیٹا کسمایا۔ "پھر بتاؤں گا۔" اُس نے کہا، "مجھے یاد ہے۔"

"نہیں نہیں۔" وہ جلدی سے بولی، "میرا پوچھنے کا مطلب نہیں۔ مَیں نے تو صرف پُوچھا ہی ہے۔ پوچھنے میں کیا ہرج ہے۔"

"کوئی ہرج نہیں۔" وہ آہستہ سے ہنسا، "تم کیا سوچا کرتی تھیں؟"

"مَیں سوچ سوچ کر پاگل ہو گئی تھی۔ اسد جی، یہ سچ ہے۔ کبھی ایک بات سوچتی کبھی دُوسری۔ آخر میرے دماغ میں کچھ بھی نہ رہتا۔ ایسے لگتا جیسے خالی ہو گیا ہے۔ تمہارا دماغ کبھی خالی ہوا ہے؟"

"ہاں۔"

"جب دِل سے کوئی بات بھی نہیں نکلتی؟ ہر وقت دماغ میں ہوا کا گولہ بھرا رہتا ہے؟" اُس نے پُوچھا۔

"ہاں۔" اسد نے کہا۔

"ایسے لگتا تھا جیسے ہر چیز ملتوی ہو گئی ہے۔ یا پیچھے رہ گئی ہے۔ وقت تھم گیا ہے۔"

اسد اُس کی بات پہچان کر چونکا۔ اُس کی آنکھیں نیم تاریکی میں چمکیں۔

"اچھا؟" اُس نے خوشی سے پوچھا، مگر دھیمے سپاٹ لہجے میں، گرم جوشی کے بغیر، "تمہارے لیے بھی؟"

"میرے لیے بھی؟" یاسمین نے بے خیالی سے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ بولا، "وقت۔"

"وقت کیا؟"

"تھم گیا تھا؟"

"ہاں۔" یاسمین نے کہا، "جیسے وقت رُک جاتا ہے۔ نہ آگے چلتا ہے نہ پیچھے۔ نہ کچھ آتا ہے نہ جاتا ہے۔ جیسے سوچ کا تار ٹوٹ جائے۔"

"ہاں۔" اسد نے کہا۔

"میرا دل کرتا تھا دیوار سے ٹکر مار کر اِس ہوا کے گرلے کو پاش پاش کر دوں۔ تاکہ کچھ یاد آئے۔ کوئی خبر ملے نہ ملے، کوئی خیال تو آئے۔"

"ہوں۔" اسد نے اثبات میں سر ہلایا۔

"اِسی لیے پوچھتی ہوں۔" یاسمین نے کہا۔

"پھر بتاؤں گا۔" اسد نے کہا۔ یاسمین نے ہاتھ رکھ کر اُس کا مُنہ بند کر دیا۔ اسد نے اُس کا ہاتھ اپنے ہاتھ سے ڈھانپ لیا۔ اسد آرام سے لیٹا چھت کو، اور یاسمین اسد کو دیکھتی رہی۔ دن کی روشنی دیکھتے دیکھتے بڑھ رہی تھی اور چھت کی سایہ دار جگہیں ایک ایک کر کے اُجالے میں آتی جا رہی تھیں۔ چند گھنٹے کی گہری نیند نے اُس کے اعضاء کو آسودہ کر دیا تھا۔ اُس کے بدن میں اس وقت مکمل ضبط کا احساس تھا۔

"دُوسرے دن،" اسد نے اُسی دھیمے سپاٹ لہجے میں بات کی، "مَیں نے تمہارا بیان دیکھا۔"

"میرا بیان؟"

"جو تم نے دیا تھا۔"

"کیا تھا؟" وہ بولی۔

"تم بتاؤ۔" اسد نے کہا، "تم نے کیا بیان دیا تھا؟"

یاسمین چند لمحوں تک غور سے اسد کو دیکھتی رہی۔ پھر جلد جلد بولنے لگی: "تمہارے جانے کے اگلے دن

تھانیدار اور ایک سپاہی آئے صبح سویرے۔ کہنے لگے کچھ پوچھ گچھ کرنی ہے۔ مَیں نے اُن کو بٹھایا۔ تمہارا مَیں نے پُوچھا۔ کہنے لگے تم وہاں بڑے آرام سے ہو، ابھی بیان مکمل نہیں ہوا، کچھ ڈاکٹری رپورٹوں کا انتظار ہے، ایک آدھ روز میں فارغ ہو جاؤ گے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ جب کئی روز تک تم نہ آئے تو پھر اُس وقت میرے دل میں خیال آنے بند ہو گئے......"

"تمہارا بیان؟" اسد نے بے صبری سے پُوچھا۔

"جب مَیں تمہارے متعلق پُوچھ چکی تو انہوں نے اپنے سوال شروع کیے۔ ابا کے بارے میں باتیں، کہاں سے آئے، کہاں رہتے تھے، کیسے کام کرتے تھے، کِس کِس سے میل جول تھا، لین دین وغیرہ وغیرہ۔ بہت سی باتوں کا مجھے پتا ہی نہ تھا، کوئی زیادہ جرح ورح نہیں کی، جو مَیں بتاتی گئی لکھتے گئے۔ قتل کی رات کے،" وہ رُکی، "واقعات تمہارے بارے میں بڑی تفصیل سے دریافت کیا۔ تمہارا عارضہ، دوا وغیرہ۔ پہلی بار کتنا عرصہ ہوا، کب گئے، کیوں گئے، کب واپس آئے۔ میرے اور تمہارے بارے میں...." وہ رُک کر خاموشی سے اسد کو دیکھنے لگی۔

"تم نے کیا کہا؟"

"جو بات تھی مَیں نے بتا دی۔ جو بات انہوں نے پُوچھی مَیں نے اُس کا جواب دے دیا۔"

"تم نے اپنا بیان پڑھا تھا؟"

"نہیں۔ تھانیدار نے میرے آگے کیا تھا، مگر مَیں نے نہیں پڑھا۔"

"کیوں نہیں پڑھا؟" وہ غصہ دبا کر بولا، "تمہارا فرض تھا اپنا بیان لے کر پڑھتیں۔"

"میرے سامنے تو وہ لکھ رہا تھا،" یاسمین ٹھٹک کر بولی، "جیسے جیسے مَیں بولتی جاتی تھی وہ لکھتا جاتا تھا۔ میرے خیال میں بھی نہیں تھا کہ وہ اس میں کوئی ردّ و بدل کرے گا۔ اُن کا مقصد مجرم پکڑنا تھا۔ مَیں اور تم دونوں گواہ ہیں۔"

"تم نے انہیں بتایا تھا کہ جب مَیں اُس رات کو مطب میں گیا تو تم میرے ساتھ نہیں تھیں بلکہ مَیں اکیلا تھا؟"

"نہیں۔ مَیں نے اپنے بیان میں وُہی لکھوایا جو پہلے دن کہا تھا، کہ جب تم نے مطب میں روشنی دیکھی تو مَیں تمہارے ساتھ تھی۔ انہوں نے اِس بات کو کھینچا نہیں، مَیں نے اور کچھ کہا نہیں۔"

"پھر کِس نے انہیں اس بات کی خبر دی ہے؟"

"پتا نہیں۔ مگر سارے گاؤں میں تفتیش کرتے پھرے ہیں۔"

"میر حسن گاؤں میں ہے؟"

"نہیں۔ بھاگا ہوا ہے۔ سُنا ہے اُس کے باپ نے اس ڈر سے کہ اُس پر شبہ ہوگا اپنے بھائی کے پاس بھیج دیا ہے۔ یہ بھی افواہ ہے کہ سرحد پار کرکے نکل گیا ہے۔"

"پولیس والوں کو علم ہے؟"

"ضرور ہوگا۔ سارے گاؤں کو علم ہے۔ تھانیدار مجھے بار بار مجبور کرتا رہا کہ میں اپنے ذہن پر زور دے کر سوچوں اور جہاں تک ممکن ہو کسی پر شبہ ظاہر کروں۔ میرے آگے اُس نے کتنے ہی نام رکھے۔ ولی۔ غیاث۔ میر حسن۔ خوشی محمد۔ مگر میں نے کسی کو ......"

"خوشی محمد؟" اسد چونکا۔

"وہی کتا تھا۔" وہ جوش سے بولی، "مگر اُس وقت میں نے ...."

"خوشی محمد کا نام تم نے تجویز کیا تھا؟"

"نہیں۔ خوشی محمد پہ اُس وقت بھی اُن کا شُبہ تھا۔ اُنہوں نے بہت کوشش کی کہ میں کسی نہ کسی طرح اُس پہ اُنگلی رکھوں۔ ہائے اسد، میں نے کتنی بیوقوفی کی۔ اُس وقت اگر میں ......" وہ باتیں کرتے کرتے رونے لگی۔

اسد کے ذہن کی فضا صاف اور پرسکوت تھی۔ اُس کے تجسس کی شدت اس ڈھب کی تھی جیسے اُس کے نہیں کسی اور کے بارے میں بات ہو رہی ہو۔ اُس نے اپنا ہاتھ یاسمین کے کندھے سے اٹھا کر اُس کی پشت پر رکھ دیا۔

"چپ کرو۔ روؤ نہیں۔" اُس نے نرمی سے کہا، "سوچ کر بتاؤ۔ خوشی محمد کے اوپر اُن کا شبہ کس بنا پر تھا؟"

"یہی کہ وہ عادی چور تھا۔" یاسمین نے چادر سے آنکھیں خشک کیں، "پہلے بھی سزا یافتہ ہے۔"

"تمہیں پتا ہے کہ اُس کے کچھ پیسے تمہارے ابا کی طرف نکلتے تھے؟"

"نہیں۔" یاسمین نے کہا، "نکلتے تھے؟"

"سُنا یہی ہے۔"

"کس سے؟"

"شاہ رُخ سے۔"

"نکلتے ہوں گے۔" یاسمین نے کہا، "اِس سے کیا ہوتا ہے۔ ابّا سے اُس کا لین دین رہتا ہی تھا۔ کبھی اُس کے پیسے رہ جاتے تھے، کبھی وہ پیشگی بھی لے جاتا تھا۔ اس سے کیا ہوتا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" اسد نے کہا، "یہ بتاؤ، تمہیں اچھی طرح سے یاد ہے کہ خوشی محمد پر پولیس نے اپنا شبہ ظاہر کیا تھا؟ یعنی اُس وقت، تمہارا بیان لینے کے وقت؟"

"ہاں۔ اُس کے بعد وہ آئے ہی نہیں۔ گاؤں میں آتے رہے ہیں، مگر میرا اُن سے سامنا اُس کے بعد نہیں ہوا۔"

"میرے جانے سے اگلے روز؟"

"ہاں۔ تمہارے جانے سے اگلے روز۔" اُس نے پہلی بار حیرت سے اسد کو دیکھا، "کیوں۔ کیا بات ہے؟"

"کچھ نہیں۔" اسد نے سکون سے کہا، "آگے بتاؤ۔"

"پھر ——" یاسمین اپنی یاد کو سمیٹتے ہوئے ایک لمحے کو رُکی، "بس پھر میرا بیان ختم کرنے کے بعد اُس نے پُوچھا کہ کوئی اور بات رہ گئی ہے جو مَیں کہنا چاہتی ہوں۔ مَیں نے کہا نہیں۔ پھر مَیں نے دوبارہ اُن سے تمہارا پوچھا۔ تھانیدار نے مجھے تسلی دی۔ حرامزادہ۔ کتّا۔" وہ بلک پڑی۔ اسد نے اُس کی پُشت پر اپنا ہاتھ دبا کر اُس کی آواز کو سہارا دیا۔ "کہنے لگا تفتیش مکمل کرنے میں تمہاری مدد کی اُن کو اشد ضرورت ہے، ایک دو روز میں تم واپس آ جاؤ گے۔ ہاں، بیان ختم کرنے کے بعد اُس نے کہا کہ ممکن ہے عدالت میں میری گواہی کی ضرورت پڑے۔ مَیں گواہی دینے کے لیے تیار ہوں؟ مَیں نے کہا تیار ہوں۔ بس پھر وہ چلے گئے۔"

تڑاخ۔ اسد کے دماغ میں بلاوجہ ایک پٹاخے دار آواز اُبھری۔ اُس کے دل میں غصّہ ایک بار پھر سر اُٹھا رہا تھا۔

"بس؟" اُس نے پوچھا۔

"بس۔ اس کے بعد وہ نہیں آئے۔ مَیں کئی روز تک تمہارا انتظار کرتی رہی۔ ہر روز مَیں سوچتی —"

"بندوق اُن کے ہاتھ کیسے لگی؟"

یاسمین کا ہاتھ تیزی سے اپنے لبوں تک گیا۔ اُس نے ایک ہلکا سا سانس کھینچا۔ چھوٹی سی ہائے کی آواز اُس کے مُنہ سے نکلی۔ "وہ مجھے یاد ہی نہیں رہا۔ سب سے پہلے اندر آتے ہی تھانیدار نے کہا وہ کمرہ

میں گھوم پھر کر جائے رہائش کا ملاحظہ کرنا چاہتا ہے۔ جائے رہائش، یہی اُس کے لفظ تھے، مجھے یاد ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض ہے؟ میں نے کہا نہیں۔ میں نے سمجھا سرسری نظر ڈالے گا۔ مگر اُنھوں نے ایک ایک چیز کو الٹ پلٹ کرنا شروع کر دیا۔ تینوں کمروں میں، باورچی خانے میں، غسل خانے میں صحن میں، ہر جگہ پر پہنچ کر ایک ایک چیز کو اتھل پتھل کیا۔ بندوق تک پہنچے تو اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے، کھول کر اسے جوڑا، کندھے سے لگا کر سیدھی کی، باری باری دونوں نے اسے ہاتھ میں اٹھا کر نالی کے اندر نظر ڈال کر دیکھا۔ پھر کھول کر ڈبے میں بند کر دیا۔ پوچھنے لگا کب سے یہاں پڑی ہے، میں نے کہا مجھے علم نہیں، شاید شروع سے یہیں رکھی ہے۔ اسدی، میں نے اُن کے ساتھ ایک ہی جھوٹ بولا ہے، مگر مجھے اس کا کوئی غم نہیں۔ لائسنس کے بارے میں پوچھنے لگا۔ میں نے کہا مجھے کچھ خبر نہیں۔ ابا کے بکس میں ڈھونڈا، صندوقچی میں دیکھا پھر باہر جا کر مطب کی الماری میں تلاش کرنے لگے تو ایک مرتبان کے اندر سے ملا۔ کہنے لگا اس کی میعاد مدت ہوئی پوری ہو چکی ہے۔ بندوق بہر حال واپس مال خانے میں جائے گی۔"

"کہیں چھپائی نہیں جا سکتی تھی؟" اسد نے پوچھا۔

"ایک ایک چیز گھر کی تو انھوں نے کھنگال دی تھی۔ اتنی بڑی چیز کو کہاں چھپاتی؟"

"اناج کی بوریاں تو اٹھا کر نہیں دیکھی ہوں گی۔"

"اُٹھا کے نہیں دیکھیں، مگر آگے پیچھے سب جگہ نظر ڈالی۔ پھر مجھ کو کیا خبر تھی کہ وہ گھر کی تلاشی لیں گے۔" پھر وہ بولی، "اچھا ہوا جو لے گئے۔ مجھے کسی سے کیا خطرہ ہے۔"

"مزارعوں سے کیا جھگڑا ہوا تھا؟"

"کوئی جھگڑا وگڑا نہیں تھا۔ گائے کا دودھ دو دن میں سات سیر سے چار سیر رہ گیا تھا۔ میں نے جمیلہ سے کہا کہ وہ دودھ رکھ رہے ہیں، اگر بے ایمانی کریں گے تو میں گائے کسی اور کے حوالے کر دوں گی۔ تھوڑی دیر کے بعد رحیم آیا۔ کہنے لگا: میں نے اُن پر بے ایمانی کا الزام لگایا ہے۔ میں نے کہا اگر تم حرام کا دودھ پیتے ہو تو بے ایمان ہو۔ الزام کی کیا بات ہے۔ میں نے ڈانٹ کر واپس بھیج دیا۔ اگلے روز شاہ رخ آیا تو کہنے لگا اُس نے رحیم کو بلا کر دھمکایا ہے۔ میں نے تو اس سے بھی کہا کہ بیچ میں آنے کی ضرورت نہیں۔ میں ان لوگوں سے ڈرتی نہیں۔ میرے کوئی ناواقف لوگ تو نہیں۔ ساری عمر سے ان کو جانتی ہوں۔"

"پھر بھی،" کچھ دیر بعد اسد نے دھندلائی ہوئی آواز میں کہا، "ہتھیار گھر میں رہتا تو اچھا تھا۔"

یاسمین اُس کے کندھے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ "اسدی۔" وہ رو کر بولی، "چھوڑو اس بات کو۔"

★ ★ ★ ★ ★

"یہ کیا ہے؟" یاسمین چونک کر بولی، "ہائے اسدی! یہ دیکھو۔" اُس نے اسد کا سر پکڑ کر روشنی کی جانب موڑا۔

"کیا ہے؟"

"سفید بال۔ یہ دیکھو۔" وہ اُس کا سر پکڑ کر اُسے دکھانے کی کوشش کر رہی تھی، یوں جیسے اس کا سر نہ ہو بلکہ گھٹنا ہو۔ "تمہارے سر میں سفید بال۔" وہ چلائی، "ایک۔ دو۔ تمہارے سر میں کتنے ہی سفید بال ہیں۔ یہ کہاں سے آئے ہیں؟"

"کوئی نہیں ہیں۔" وہ کسمسایا۔

"ہیں۔ ہیں۔ یہ دیکھو۔"

"میں کیسے دیکھ سکتا ہوں؟"

یاسمین اُس کے بالوں کو اُنگلیوں سے تیز تیز اُلٹتی پلٹتی رہی۔ پھر اُس نے چادر کے نیچے ہاتھ لے جا کر لباس درست کیا اور کُود کر بستر سے اُٹھی۔

"دیکھو۔" وہ ہاتھ والا شیشہ لیے اسد کے اُوپر جُھکی تھی، "ہائے اسدی!"

اسد ماتھے پر تیوری ڈالے، ایک ہاتھ میں شیشہ پکڑے، دُوسرے کی اُنگلیاں بالوں میں پھیر کر اُنہیں دیکھ رہا تھا۔ اُس کے سر میں جگہ جگہ پر سفید بال نکل آئے تھے۔ تکیے کے اُوپر رکھا ہوا اُس کا چہرہ اُسے عجیب سا دکھائی دے رہا تھا۔ تین روز پہلے اُس نے ذوالفقار کے گھر پہ داڑھی مونڈی تھی۔ اُس کی آنکھوں کے کنارے ذرا ذرا سُوجے ہوئے تھے۔ چند منٹ پہلے وہ دونوں اُس رات میں دُوسری بار سو کر جاگے تھے۔ اب سُورج نکل آیا تھا۔

"شاید پہلے سے ہوں۔" اسد نے کہا۔

"میں نے کبھی نہیں دیکھے۔"

"تم میرے ساتھ کبھی سوئیں بھی تو نہیں۔"

یاسمین کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ "میں نے کبھی نہیں دیکھے۔" وہ بولی "میں تمہارے بال گِنا کرتی ہوں۔"

"شاید ابھی نکلے ہیں۔" وہ ہنسا، "کل رات کو ایک بھی نہ تھا۔"

یاسمین فیصلہ نہ کر پائی کہ وہ ہنسے یا رو دے۔ اُس نے اسد کے ماتھے پر زخم کے نشان کو چھُوا۔ اسد اُس کا ہاتھ پکڑ کر انگلیوں سے کھیلنے لگا۔ وہ اُس کے پاس چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"میرے بس میں ہو تو اُن کی جان مار دوں۔ بے انصاف۔ ظالم۔" یاسمین نے کہنیوں کے بل جھک کر اپنی آنکھیں اُس کے بالوں میں چھپا دیں۔

بند کمرے کے باہر حسین بی بی کے چلنے پھرنے، کواڑوں کے بجنے اور برتنوں کے کھنکنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کھڑکی میں، آسمان پر دھوپ کی چمک تھی۔ اسد نے اُس کے بالوں کو گدگدایا۔

"اب باہر کیسے جاؤ گی؟"

"کیوں؟" وہ سر اُٹھا کر بولی، "کیوں کیسے جاؤں گی؟"

"حسین بی بی کیا کہے گی؟"

"کیا کہے گی؟" وہ سر جھٹک کر بولی۔

"جاؤ۔ پھر جا کر دکھاؤ۔"

"لو ابھی جاتی ہوں۔" وہ بولی، جیسے اُٹھ کر جا رہی ہو، مگر اُسی طرح کہنیاں اسد کے بازو پر رکھے جھکی رہی۔ اُس کی آنکھوں کے گرد آنسوؤں کی نمی تھی، مگر ہونٹ مُتبسم تھے۔

"ابھی جا کر دکھاتی ہوں۔"

"جاؤ۔"

وہ آہستہ آہستہ قدم رکھتی ہوئی دروازے پر جا کر رُک گئی۔ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر کنڈی پر رکھا اور کان لگا کر باہر کی آواز سُننے لگی۔ پھر اُس نے سر کے ایک جھٹکے سے ایک شوخ، متبسم نظر اسد پر ڈالی اور بھاگتی ہوئی آ کر بستر پر گر پڑی۔ اُس نے چادر اُٹھا کر اُوپر اوڑھ لی اور اُس کے اندر گیند سی بن کر ساکت ہو گئی۔ اسد نے اُسے گدگدانا شروع کر دیا۔ چادر میں لپٹی ہوئی وہ گیند سی چارپائی پر لوٹنے لگی۔

"نہ۔ نہ۔ نہ کرو، اسد۔"

"جاؤ۔ اب جاتی کیوں نہیں۔ جاؤ۔"

"ابھی میرا دل نہیں کر رہا۔ اسد، خدا کے لیے نہ کرو۔"

"ہاں۔ خدا کے واسطے ٹھیک ہے۔ اب نہیں کرتا۔"

کچھ دیر تک وہ بے دم ہوئے ساتھ ساتھ لیٹے رہے۔ دھوپ کی رنگت نیلی ہو گئی ہے، اسد نے سوچا۔ چیڑ کے جنگلوں کی زمین پر دھوپ کی دھاریاں پڑی ہوتی ہیں۔

یاسمین نے سر اس کی طرف موڑا۔

"اسدی، کیا سوچ رہے ہو؟"

"کچھ نہیں۔" اسد نے کہا۔

"کچھ تو سوچ رہے ہو۔"

"میں نے ذوالفقار سے وعدہ کیا ہے کہ دو دن سے زیادہ یہاں نہیں رہوں گا۔"

"اوہ —" یاسمین اس طرح اچھلی جیسے کسی نے اس کے خنجر گھونپ دیا ہو۔ "وعدہ! تم نے کیوں ایسا وعدہ کیا ہے اس کے ساتھ؟ تمہیں کوئی وعدہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم نے کیوں وعدہ کیا ہے؟ اسے کیا حق ہے تمہیں یہاں آنے سے روکے؟"

"اس نے کہاں روکا ہے۔ اس نے تو بلکہ یہاں آنے کی اجازت لے کر دی ہے۔"

"اجازت لینے کی کیا ضرورت ہے؟ تم سیدھے یہاں آجاتے۔ دیکھا جاتا پولیس کیا کرتی ہے۔"

"پولیس کے ساتھ جھگڑنے میں کوئی فائدہ نہیں۔" اسد نے کہا۔

"فائدہ! فائدہ کس بات میں ہوتا ہے؟ ایک بار انہوں نے زیادتی کر لی ہے تو یہ مطلب نہیں کہ اب انہیں کھلی چھٹی ہے۔ تمہیں یہاں آنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ کسی قانون سے تمہارے اوپر پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔ قاتل پکڑا جا چکا ہے۔ تم ایک گواہ ہو۔ تمہاری موجودگی یہاں پر ضروری ہے۔ پہلی بار تو مجھے کچھ خبر نہیں ہوئی، گھبراہٹ میں میرا دل بند ہو گیا تھا۔ اب کچھ کر کے دیکھیں۔ مظفر آباد کے سب سے بڑے وکیل کی بیٹی میرے ساتھ سکول میں پڑھتی رہی ہے۔ اس کو یہاں نہ لے کر آؤں تو میرا نام نہیں۔ ایک گھنٹہ بھی تو تمہیں رکھ کر دیکھیں۔"

اسد کی متوازن نظریں اس کے چہرے پر ٹھہری تھیں۔ تمہارا یہی روپ، اسد نے دل میں کہا، سرکشی کا روپ میرے دل کی حرارت کا ضامن ہے۔

"ہم یہاں سے جا بھی تو سکتے ہیں۔" اسد نے کہا۔

جواب میں یاسمین کی نظریں دُھندلا سی گئیں۔" ہاں ۔ مگر بھاگ کر نہیں ۔ یہ ہمارا گھر ہے۔"

"تمہارا گھر ہے۔"

" تمہارا بھی ہے۔" وہ بولی۔" اسد ی ؟"

" ہاں ۔"

" تمہارا بھی ہے ۔"

" مَیں ہمیشہ تو نہیں رہ سکتا ۔ کبھی نہ کبھی مجھے یہاں سے جانا ہی ہوگا ۔ جتنی جلدی چلا جاؤں اچھا ہے ۔ تم میرے ساتھ کیوں نہیں جا سکتیں ؟"

" جا سکتی ہوں ۔" یاسمین نے ہولے سے کہا ۔" مگر یہ میرا گھر ہے ۔"

" گھر کیا ہوتا ہے ۔ جہاں پر تم خوش رہو وہی تمہارا گھر ہوتا ہے ۔ یہاں پر کیا تم خوش رہو گی ؟" یاسمین دیر تک نظریں جمائے چھت کو دیکھتی رہی ۔

" پتا نہیں ۔" پھر وہ بولی ۔" مگر یہ کسے علم ہے کہ مَیں یہاں ناخوش رہوں گی ؟"

" تمہیں ۔"

" اونہوں ۔" اُس نے آہستہ سے نفی میں سر ہلایا ۔" مجھے یہ علم ہے کہ تمہارے بغیر مَیں زندہ نہیں رہوں گی ۔"

" پھر ۔"

" مگر یہ کون کہہ سکتا ہے کہ تمہارے ساتھ مَیں خُوش رہوں گی ؟"

" عجیب منطق ہے ۔ اگر میرے بغیر تم ناخوش رہو گی تو میرے ساتھ خوش رہو گی ۔ سیدھی بات ہے ۔"

" یہ سیدھی بات ہے ؟"

" ہاں ۔" اسد نے بے یقینی سے کہا ۔

" اسدی ، یہ مجھے معلوم ہے کہ تمہارے بغیر مَیں مر جاؤں گی ۔ یہ سیدھی سی بات ہے ۔ مگر تمہارے ساتھ مَیں کس طرح رہوں گی ، اِس کی مجھے خبر نہیں ۔"

" کیوں ؟"

یاسمین کھڑکی کے باہر آسمان پر نظر ڈال کر بولی :" گھر چھوڑ کر تمہارے ساتھ کہیں چلی جاؤں تو خوشی کی

تلاش میں پھرتی رہوں گی، تمہارے ہاتھوں کی طرف دیکھتی رہوں گی۔ تم ہر وقت میرے پاس تو نہیں بیٹھے رہو گے۔ مجھے خوف آتا ہے۔"

"کس سے؟"

"قسمت سے۔ بے گھری سے۔" اُس نے کھلی کھلی بے راز آنکھوں سے اسد کی آنکھوں میں دیکھا، جیسے کہہ رہی ہو، خوشی کی تلاش سے۔ تم سے۔

"اِن سولہ دنوں میں تم بھی بدل گئی ہو۔" اسد نے کہا۔

اپنی زمین پہ کھڑی کھڑی کچھ اُکھڑ گئی ہو، اُس نے سوچا۔ اب تم کیا چاہتی ہو؟ کیا کرو گی؟ اُس کے دل میں کسی چیز کے تلف ہو جانے کا درد پیدا ہوا۔ اُس کو پہلی بار — عجیب طور پہ — اس بات کا احساس ہوا کہ یاسمین عمر میں اُس سے چند سال بڑی ہے کہ اُس کو شاید کچھ ایسی باتوں کا علم بھی ہے جن سے وہ خود ابھی نابلد ہے۔ اُس کا جذبہ، اُس کی حاجت، جتنی شدید ہے اتنی خود کفیل بھی ہو سکتی ہے۔ اُس وقت انجانے طور پر، اسد کو حکیم کا خیال آیا۔

اسد کو کھانسی کا ہلکا سا دورہ اُٹھا۔ یاسمین اُس کے سینے پہ ہاتھ رکھ کر سہلانے لگی۔ اُس کی آنکھوں میں راز کے ہلکے ہلکے سایے سرائت کر آئے تھے اور لب متبسم تھے۔ اُس کی ٹھوڑی کی پرانی، مانوس اُٹھان سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ اپنی سوچ سے نکل آئی ہے اور اب بے اندازہ سرکشی، معصومیت اور شرارت کی اہل ہے۔ اُس کا چہرہ یکسر بدل چکا تھا۔

"تم مجھے کہاں لے کر جاؤ گے؟" اُس نے پوچھا۔

"جہاں تم چاہو۔ گاؤں میں چچا کا گھر ہے۔ شہر میں میرا اپنا گھر بھی ہے جو بند پڑا ہے۔ اُس میں رہ سکتے ہیں۔ یا اُسے بیچ کر کہیں اور جا سکتے ہیں۔"

"بیچ دو گے؟"

"ہاں۔ میں اُس کا مالک ہوں۔"

"نہیں۔ میرا مطلب ہے تمہارا دل چاہتا ہے اُسے بیچنے کو؟"

"کیوں نہیں۔ بیچا جا سکتا ہے۔"

یاسمین حیرت سے اُسے دیکھتی رہی۔ "تمہارا دل نہیں کرتا وہاں جا کر رہنے کو؟"

"کوئی خاص نہیں کرتا۔" اسد نے کہا۔ "اگر تم چاہو تو اسے بیچ کر کہیں اور چلے جائیں گے، کسی بڑے

شہر میں ۔ مجھے ملازمت مِل سکتی ہے ۔"

"کہاں پر ؟"

"کہیں پر بھی ۔"

"تم ملازمت کرنا چاہتے ہو ؟"

اسد نے کندھے اُچکائے ۔

"اسد ،" یاسمین نے پُوچھا ، "تم کیا کرنا چاہتے ہو ؟"

"کیا مطلب کیا کرنا چاہتا ہُوں ؟"

"کوئی ایسا کام جو تمہارا جی چاہتا ہے کرنے کو ۔"

"ہاں ۔" اسد نے سوچ کر جواب دیا ، "اخبار میں کام کرنا چاہتا ہُوں ۔ یا کسی رسالے میں ۔ کسی رسالے کے دفتر میں ۔"

"تمہیں ایسا کام مِل جائے گا ؟"

"کوشش کروں تو مِل سکتا ہے ۔"

اسد کو پھر کھانسی کا دورہ اُٹھا ۔ وہ کھانستے کھانستے اُٹھ کر بیٹھ گیا ۔ یاسمین اُس کی پُشت پر ہتھیلی مارتے ہُوئے کان لگا کر اُس کی چھاتی کی آواز سُننے لگی ۔ کھانسی کے اندر بھاری رینگتے ہُوئے سانس کی آواز تھی ۔ سانس برابر کر کے اسد پھر پُشت پر لیٹ گیا ۔

"قمیض پہن لو ۔" یاسمین نے کہا ، "سردی لگ جائے گی ۔"

اسد نے کندھوں کو ایک اڑیل سی جنبش دی ۔

"پہن لو ، اسد جی ۔ ہر بات پہ ضد کرتے ہو ۔"

اُس نے قمیض یاسمین سے لے کر پہن لی ۔

"سانس کیسا رہا تھا ؟" یاسمین نے پُوچھا ۔

"ٹھیک ہی رہا ۔ صرف ایک بار دورہ ہوا ۔" اسد نے کہا ، "حالانکہ دوا کی ایک خوراک بھی نہیں کھائی ۔"

"اچھا ؟" یاسمین مسرت سے بولی ۔

"آگے کیا ہوگا ، اِس کا کچھ پتا نہیں ۔"

" آگے بھی ٹھیک رہے گا۔"

"کیسے ؟"

یاسمین ٹھٹک کر اُسے دیکھنے لگی۔ بات اُس نے خیال کیے بغیر، اپنی مسرت کے ریلے میں کر دی تھی۔

"کیسے ٹھیک رہے گا ؟" اسد نے پُوچھا، "دوا ہے ؟"

یاسمین کئی لحظے تک اُسے کھُلی کھُلی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔ پھر بولی، "بیس پُڑیاں نکلی ہیں۔"

"مطب سے ؟"

" ہاں۔ مَیں نے ساری الماری چھان ماری ہے۔ گھر میں تلاش کیا ہے۔ صرف بیس ملی ہیں۔"

تین ہفتے کی خوراک، اسد نے سوچا۔ "تمہیں کچھ پتا ہے اس کے بارے میں ؟" اُس نے پُوچھا۔

"بُوٹی کا پتہ ہے۔"

"کیا نام ہے ؟"

"نام کا مجھے علم نہیں۔ مگر پہچان ہے۔"

"پہچان !" وہ بولا، "پہچان سے کیا ہوتا ہے۔"

"کاغذ پہ بنا سکتی ہوں، صاف۔" یاسمین نے کہا۔

" اور بھی کچھ پڑتا ہے ؟"

"ایک دو چیزیں اور پڑتی ہیں۔ مگر جہاں تک میرا خیال ہے ویسے ہی ڈال دی جاتی ہیں۔"

" ویسے ہی کیسے ڈال دی جاتی ہیں ؟"

"کچھ بے ضرر سی چیزیں یعنی نمک، سوڈا، مصری، نوشادر وغیرہ ہر ایک دوا میں تھوڑی بہت ملائی جاتی ہیں۔ مگر ابا کی دواؤں میں صرف ایک ہی جُز ہوتا ہے جو اصل چیز ہوتی ہے۔"

" دُوسری چیزیں کیوں ملائی جاتی ہیں ؟"

یاسمین ایک لمحے تک سوچتی رہی۔ "پتا نہیں، اسد۔ مجھے ان باتوں کا پُورا علم نہیں۔ ہو سکتا ہے کچھ دواؤں پہ پیسائی کا اثر پڑتا ہو، کچھ میں نہ پڑتا ہو۔ مگر ایک بُوٹی کا مجھے علم ہے جو اس کا شفائی جُز ہے۔"

" بُوٹی ہے ؟"

یاسمین نے خاموشی سے نفی میں سر ہلایا۔

" نئی کب آئے گی ؟"

یاسمین پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُس کی طرف دیکھتی رہی ۔ "خوشی محمد لاتا تھا ۔" وہ بولی ۔

"کہاں سے ؟"

"سرحد پار سے ۔"

"اِدھر نہیں ہوتی ؟"

"نہیں ۔"

"کہاں پر ہوتی ہے ؟" اُس نے پُوچھا ، "کیسے منگواتا تھا ؟"

"پتا نہیں ۔ شاید خود جایا کرتا تھا ۔ اُدھر اُس کا تعلق تھا ۔"

"کس سے پتا چلے گا ؟ کوئی اور بھی لا کر دیا کرتا تھا ؟"

"پہلے ایک دو اور لوگ تھے ابّا کے جاننے والے وہ بھی لایا کرتے تھے ۔ اب ایک عرصے سے یہی تھا ۔" اُسے درد کا اچھو لگا ، "جس سے ابّا کا کام چلتا تھا ۔"

"اب کیا ہو ؟" اسد نے پُوچھا ۔

یاسمین پھٹی پھٹی نظروں سے اسد کو دیکھ رہی تھی ۔ یکلخت اُس نے آنکھوں کو ہاتھ سے ڈھانپ لیا اور اسد کے سینے پر ماتھا رکھ کر رونے لگی ۔

★ ★ ★ ★ ★

جب شاہ رُخ آیا تو خوشی محمد کی گرفتاری کا معمّہ اسد کے دِل سے اُتر چکا تھا ۔ اب مسئلہ دوا کا تھا ۔

"خوشی محمد سے تمہاری واقفیت تھی ؟" اُس نے پُوچھا ۔

"اسی حد تک کہ کچھ دیر اُس نے میرے پاس کام کیا تھا ۔"

"سرحد پار سے اُس کا تعلق کس سے تھا ؟"

"سُنا تھا اُس کی رشتہ داری ہے ۔ اُس وقت بھی جب میرے پاس کام کرتا تھا جاتا آتا رہتا تھا ۔ کیوں ؟"

"میری دوا کی بوٹی اُدھر سے آتی تھی۔" اسد نے کہا۔

"خوشی محمد لایا کرتا تھا؟"

"ہاں۔ حکیم کی ساری بوٹیاں وغیرہ اب وہی سپلائی کرتا تھا۔"

دونوں کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے۔

"اُس سے بات کرنے کی کوئی صورت ہو سکتی ہے؟"

شاہ رُخ اُوپر کا ہونٹ دانتوں پر کھینچ کر اپنی چھوٹی چھوٹی سنہری مونچھیں چبانے لگا۔

"مشکل ہے۔" وہ سوچتے ہوئے بولا۔

"کوئی صورت تو نکالنی پڑے گی۔" کچھ دیر بعد اسد نے کہا، "اِن دنوں تو میری قسمت کام کر رہی ہے۔ مگر کب تک۔"

"یاسمین کو کچھ علم ہے؟"

"صرف پہچان ہے۔ نام سے واقفیت نہیں۔"

جب یاسمین قہوے کے پیالے اُٹھائے کمرے میں داخل ہوئی تو شاہ رُخ نے اُس سے مخاطب ہو کر پوچھا: "کچھ خبر ہے یہ بوٹی کس علاقے سے آتی ہے؟"

"خاص علاقے کا مجھے علم نہیں۔ مگر کہیں قریب ہی اُگتی ہے۔"

"کیسے؟"

"جب یہاں پہنچتی ہے تو ادھ گیلی سی ہوتی ہے۔ دو چار روز پھیلا کر سکھانی پڑتی ہے۔"

"وہ تو خیر تین روز بھی لے کر چلتے رہو تو گیلی ہی رہے گی۔" شاہ رُخ نے کہا۔

"مگر لینے والے لوٹی ہی لینے تو نہیں جاتے۔" یاسمین بولی، "آرام سے آتے جاتے ہیں۔ نہیں پتا ہی ہے۔"

شاہ رُخ سوچ میں پڑ گیا۔ یاسمین نے اسد کو دیکھا۔ اسد قہوہ پیتے ہوئے ہلکی ہلکی آواز پیدا کر رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ میں بے معلوم سا ارتعاش تھا جسے صرف یاسمین نے محسوس کیا۔ تینوں خاموش بیٹھے الائچی دار گرم قہوہ پیتے رہے۔ خوشی محمد، اسد نے سوچا۔ خوشی محمد تک رسائی کیسے ہو؟ یہ بوٹی کہاں اُگتی ہے — — — — وہ جگہیں جو آنکھوں نے نہیں دیکھیں!

"اچھا۔" شاہ رُخ کچھ دیر اور باتیں کرنے کے بعد اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کھانا کھا کر جانا۔" یاسمین نے کہا۔

"نہیں، اب مَیں چلتا ہُوں۔" شاہ رُخ ہاتھ بڑھاتے ہُوئے بولا، "کوشش کرتا ہُوں، دیکھو شاید کچھ کام بن جائے۔"

اُس نے اسد سے ہاتھ ملا کر چارپائی کی پائنتی سے اپنی رائفل اُٹھائی اور باہر نکل گیا۔ چھوٹی سی نیچی تپائی پر قہوے کے تین خالی پیالے پڑے تھے۔ سفید چینی کے پیالوں میں لیمپ کی بتیاں جھلملا رہی تھیں۔ باہر اندھیری رات میں... اسد نے سر کو ہلکے ہلکے جھٹکے دیے، جیسے اُس کی آنکھوں کے آگے کوئی جالا آ گیا ہو۔ جب سے وہ واپس آیا تھا اُس کا دماغ رہ کے نہیں رُکتا تھا۔ تڑاخ تڑاخ کرتی ہُوئی آوازیں، کوئی نہ کوئی بات، آدھے پَونے جملے، گڈمڈ مناظر، اُوپر نیچے اپنی بول چال میں مصروف، رواں دواں رہتے تھے۔ جب سے اُسے وقت کے گرفت سے نکل جانے کا احساس ہوا تھا، اُس کا دماغ اپنے کناروں سے باہر آکر بہنے لگا تھا۔ کبھی کبھی وسوسے جب پیٹ میں گہرے بھنور ڈالنے لگتے تو وہ ذہن کی اِس مُنہ زوری پہ جھنجلا اُٹھتا۔ مگر اسے روکنا اُس کے بس کا کام نہ تھا۔

"شاہ رُخ کے کئی آدمی اُدھر جاتے ہوں گے۔ کسی نہ کسی سے کام نکل آئے گا۔" یاسمین نے کہا۔

وقت کا مسئلہ ہے، اُس نے کہنا چاہا، اِتنا وقت کہاں سے آئے؟ مگر کہتے کہتے رُک گیا۔ یاسمین کی خود سری ایک بات تھی، گُنبد میں رُکنا ایک دُوسرا معاملہ تھا۔ معاملہ کیا تھا؟ خود اپنے سوال کے اوپر اس نے ذہن کو مرکوز کرنا چاہا، مگر اس کی سوچ کا تار ٹوٹ رہا تھا۔ پولیس کا خوف؟ اگر صرف اپنی حد تک اسے پولیس کی دست اندازی کا خدشہ ہوتا تو کوئی بات نہ تھی۔ پولیس کا وجود گو ایک مبہم سے بے شکل ہیولے کی مانند اس کے دماغ پہ قائم تھا مگر اس کا ڈر اس کے دل سے اتر چکا تھا۔ مگر یاسمین؟ یاسمین کو وہ اس دہشت کی شکل کیسے دکھائے؟

وقت کی تنگی کا دباؤ ہر جانب سے بڑھتا آ رہا تھا۔ جیسے کوئی چیز چھٹتی جا رہی ہو۔ کوئی کنارا، کوئی حدِ فاصل۔ ذوالفقار نے کہا تھا: "زیادہ سے زیادہ دن بھر کے پھیرے کی اجازت مل رہی تھی۔ مَیں نے اپنی ذاتی ضمانت پہ تین روز کی مہلت حاصل کی ہے۔ گاؤں میں یا اِدھر اُدھر مطب وغیرہ میں آنے جانے کی ضرورت نہیں۔ گھر پہ آرام کرنا۔ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔ مجھے لیٹ ڈاؤن مت کرنا۔" اس کے آخری الفاظ گو درخواست کی صورت تھے مگر لہجہ مختلف تھا۔ ان کا مطلب اسد پہ واضح ہو گیا تھا۔ ذوالفقار کی طاقت سے وہ ناواقف تھا مگر اسے ایک احساس تھا کہ ذوالفقار کا اختیار سمندر میں تیرتے ہُوئے برفانی تودے کی مانند ہے جس کا ایک حصّہ دکھائی دیتا ہے اور نَو حصّے نظر سے اوجھل ہوتے ہیں۔ یاسمین کو کیسے بتاؤں؟ اس نے سوچا۔

یاسمین خالی پیالے اُٹھاتے اُٹھاتے رُک گئی۔ اس نے پیالے جلدی سے رکھ دیے اور لالٹین اُٹھا کر

کمرے کے اس کونے کی جانب بڑھی جہاں پر فرش شیشے کی طرح صاف رہتا تھا اور موٹی ململ بچھا کر اور مختلف قسم کی بوٹیاں سوکھنے کے واسطے پھیلا دی جاتی تھیں۔ ململ کا ٹکڑا اب وہاں سے اُٹھ چکا تھا مگر فرش اسی طرح بے گرد تھا اور چند ایک ننھے ننھے خشک پتے اِدھر اُدھر بکھرے پڑے تھے۔ یاسمین نے پاؤں کے بل بیٹھ کر احتیاط سے سارے پتوں کو ایک ہاتھ سے سمیٹ کر اُٹھا لیا، پھر دیواروں کے ساتھ ساتھ اور کونے میں لالٹین گھما کر فرش پر دو ایک مزید پتے چنے اور ہتھیلی پھیلا کر لالٹین کی روشنی میں ان کا معائنہ کرنے لگی۔

اسد اس کے پاس جا کھڑا ہوا۔ "کچھ ملا؟" اس نے پوچھا۔

یاسمین چہرہ ہاتھ کے قریب لے جا کر، پتوں کو کرید کرید کر دیکھتی رہی۔ پھر اس نے منہ اُوپر اٹھایا اور کچھ بولے بغیر، نفی میں سر ہلا کر، اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اسد آ کر چارپائی پر بیٹھ گیا۔

"مجھے اس کی شکل یاد ہے۔" یاسمین اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولی، "اس وقت بھی میری آنکھوں کے سامنے گھوم رہی ہے۔ آنکھیں بند کر کے اسے ٹریس کر سکتی ہوں۔ اسے حاصل کرنے میں کوئی وقت نہیں ہو گی۔ کئی لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ شاہ رُخ ——"

یہ بات بھی نہیں، اسد نے سوچا۔ بوٹی مل گئی تو پھر؟ پھر کیا ہو گا؟ فقط افاقے کی ایک صورت —— ایک مہلت کچھ طویل ہو جائے گی۔ پھر؟

جس چیز کو وہ عام فہم زندگی سمجھ کر دن گزارنے کا عادی ہو چلا تھا، ان سولہ دنوں نے اسے بدل کر رکھ دیا تھا۔ اس نے زندگی کی ایک ایسی شکل دیکھ لی تھی کہ اب اس کی اوپری اوپری صورتیں قابلِ قبول نہیں رہی تھیں۔ ہاں، اس نے دوبارہ سوچا، افاقے کی ایک صورت —— مگر اس کے پیچھے، اس کے عقب میں، اس کا پھیلاؤ ہے، اس کی جڑیں ہیں، جہاں سے وقت کی تنگی پھوٹتی ہے۔ اس روزمرہ کی تنگی کو میں نے اتنی عمر تک سہارا دیے رکھا ہے، اس لیے کہ اس کے پیچھے جو نامعلوم حقیقت تھی اس کی دہشت مجھ پر سوار رہی ہے۔ اب دہشت کی شکل میں نے دیکھ لی ہے۔

"ہفتے دس دن کی بات ہے۔" یاسمین اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے کہے جا رہی تھی، "کوئی نہ کوئی لے آئے گا۔ دیکھیں شاہ رُخ کل کیا خبر لاتا ہے۔ تم کہیں مت جانا، اسد، کسی سے پوچھنے پاچھنے کی ضرورت نہیں۔ تمہیں یہاں رہنے سے کوئی روک نہیں سکتا۔ میں اس گاؤں کی اولاد ہوں ——"

"مگر میں کیا ہوں؟" اسد نے اچانک پوچھا، "میری یہاں پر کیا حیثیت ہے؟"

یاسمین اس کا منہ تکنے لگی۔ "تم ——" وہ کچھ کہنے لگی، پھر چپ ہو کر اسے دیکھتی رہی۔ اس کا چہرہ

سُرخ ہو گیا۔

"ایسے کام نہیں بنے گا۔" اسد نے آہستہ سے کہا، "کچھ نہ کچھ سوچنا ہی پڑے گا۔"

مگر سوچ کا تار ٹوٹتا جا رہا تھا۔ وہ رات بھر وقفے وقفے سے جاگتا رہا۔ جب اس کی نیند کھلتی تو بیداری کے ساتھ ہی اسے یہ بات یاد آجاتی، جیسے اس کے پہرے پر کھڑی ہوئی ہو اور دھک سے اس کا دل خالی ہو جاتا، جیسے کوئی نقصان یاد آجائے۔ جب اسد کو تین دن کی اجازت ملی تھی تو اسے محسوس ہوا تھا جیسے دُنیا بھر کی آزادی مل گئی ہو۔ اس وقت اپنے دل میں صرف ایک ہی راستہ اسے دکھائی دیتا تھا: گمشد! اس سے آگے گویا سوچ کا وجود ہی نہ تھا، کہ جیسے وہاں پہنچ کر زندگی ختم ہو جائے گی یا پھر شروع سے رواں ہوگی۔ گمشد آکر زندگی نہ تو ختم ہوئی نہ شروع مگر اس کی شکل کچھ ایسی بدل گئی کہ پہلی شکل یاد میں بھی نہ آنے لگی، جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔ یاسمین کی ہلکی پھلکی تصویر جو اتنے عرصے تک اس کے اندر ایک ایک نقطے کو چھوتی ہوئی پرواز کرتی رہی تھی، جس نے ایک بے نام سے نیم روشن جذبے کی صورت اس کی جان کو مشکل ترین وقت میں سنبھالے رکھا تھا، وہ تصویر اب زندہ ہو گئی تھی۔ اس تصویر نے ایک حجم، ایک جُثہ اور ایک جنبش اختیار کر لی تھی۔ اب وہ ایک ہاتھ میں نہ آنے والی شبیہ نہ رہی تھی بلکہ ایک بدن تھا، اور وہ بدن اس کے بدن میں شامل تھا۔ اب جب کہ دو روز گزر چکے تھے اور وہ یاسمین کے ساتھ لیٹا اس رات کے ایک ایک لمحے پر ہاتھ رکھ رہا تھا تو اس پہ اس آزادی کی حقیقت کھُل چکی تھی —— کہ یہ آزادی محض ایک اور مہلت تھی۔ وقت روکے نہیں رُکتا تھا اور اس کا جسم بوٹی بوٹی کر کے سرد ہوتا جا رہا تھا، جیسے جان نکل رہی ہو۔ اسد پہ اب پہلی بار بدن کی حیثیت کا انکشاف ہو رہا تھا۔

صبح سویرے جب وہ اُٹھا تو اس کا دل اسی طرح بے چین تھا۔ وقت تیزی سے گزرتا جا رہا تھا اور اب تک اس کے سامنے کوئی راستہ نہ آیا تھا۔ جُوں جُوں دن ڈھلتا جا رہا تھا گمشد میں رہنے کا خیال اس کے دل کے قریب اور دماغ سے دُور ہوتا جا رہا تھا۔ دوپہر ڈھلتے ڈھلتے گمشد سے چلے جانے کا امکان اس کے خیال میں جنم لینے لگا۔ یاسمین اُٹھتی بیٹھتی بے صبری سے، بے خیالی سے اور بے جگری سے اس کے وہیں جمے رہنے پر اصرار کرتی رہی۔ مگر بہت آہستہ آہستہ، جیسے جیسے دھوپ سرکتی گئی، اسد کے دل میں یہ احساس پکا ہوتا گیا کہ جلد یا بدیر بالآخر اسے گمشد کو چھوڑنا پڑے گا۔ شام سے ذرا پہلے شاہ رُخ آپہنچا۔ اس نے اطلاع دی کہ خوشی محمد کے سرحد پار کے تعلق کا پتا نہیں چل سکا۔ "اس کے بھائی برادری کے لوگ میرے پاس کام کرتے ہیں۔ اس کا چچا زاد میرا گارڈ ہے۔ مَیں نے اس سے کہا ہے کہ آج کل ہی خوشی کے گھر جا کر پتا کرے۔ پہلے میرا خیال تھا مَیں خود جاؤں۔ پھر

سوچا کہ میرا جانا ٹھیک نہیں۔ خاص طور پہ آج کل ــــ"

"اس کے بیوی بچے ہیں؟" اسد نے پوچھا۔

"ہاں۔ سنا ہے سو برس سے اوپر اس کے باپ کی عمر ہے۔"

"یہ اس کے بھائی بند وہی ہیں جنہوں نے اس کی مخبری کی تھی؟" اسد نے پوچھا۔

شاہ رُخ نے چونک کر اسے دیکھا۔ اسے اِس وقت اسد سے اس سوال کی توقع نہ تھی۔ "ہاں۔" اس نے کہا۔

کچھ دیر تک وہ بیٹھے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ جب شاہ رُخ رخصت ہونے لگا تو اسد اس کے ساتھ چل پڑا۔ "شاہ رُخ کو چھوڑ کے ابھی آتا ہوں۔" وہ بولا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" یاسمین نے دہل کر پوچھا۔

"یہیں تک۔" اسد نے ہاتھ سے باہر کی جانب اشارہ کیا اور شاہ رُخ کے ہمراہ دروازے سے نکل گیا۔

وہ پہلی بار گھر سے نکلا تھا۔ اس نے ایک سرسری نظر مطب پہ ڈالی۔ مطب سنسان پڑا تھا۔ راستے میں انہیں گھر لوٹتے ہوئے چند کسان ملے جنہوں نے شاہ رُخ سے سلام دعا لی۔ ان میں سے صرف ایک نے نظر بھر کر اسد کو دیکھا، باقیوں نے آنکھ بھی نہ ملائی۔ انہیں اسد کے گاؤں میں وارد ہونے کا علم ہو چکا تھا۔ اسد نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلی دی کہ اس کی ان چاروں سے کوئی خاص واقفیت نہیں تھی، گو وہ جانتا تھا کہ گاؤں میں ہر کسی سے مخاطب ہو کر حال احوال پوچھنا معمول کی بات ہے۔ اسے خیال آیا کہ اس کا کوئی خاص جاننے والا، احمد یا ولی، مطب کا کوئی پرانا ساتھی (میر حسن؟)، سامنے سے آتا ہوا مل گیا تو اس کا ردّیہ کیا ہوگا؟ دیوار کے ساتھ خاموشی سے کھیلتے ہوئے چند بچے اپنا کھیل روک کر بغور اسے دیکھنے لگے، جیسے وہ کوئی عجوبہ شے ہو، اور اس وقت تک دیکھتے رہے جب تک کہ وہ ان کے پاس سے گزر نہ گیا۔

"ایک لڑکا ہمارے ساتھ مطب میں ہوا کرتا تھا،" اسد نے بات کی۔ "میر حسن۔"

"ہاں، تپ دق کا مریض۔" شاہ رُخ نے کہا۔ "میں جانتا ہوں اسے۔"

"آج کل اِدھر ہی ہے؟" اسد نے سرسری آواز میں پوچھا۔

"خبر نہیں۔ اس کا چچا میرے پاس کام کرتا ہے۔ کیوں، کوئی کام ہے؟"

"نہیں۔ ویسے ہی پوچھا ہے۔"

درختوں کے ذخیرے کے کنارے پہ اسد نے شاہ رُخ کو الوداع کہا۔ جب شاہ رُخ راستے کی ڈھلان

پر اُتر کر نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اسد نے مڑ کر گاؤں پہ ایک نظر ڈالی۔ شام گہری ہوتی جا رہی تھی۔ آسمان سے رات کا سایہ گاؤں کی دیواروں پہ اُترنے لگا تھا۔ گاؤں بھر میں روشنی کی رمق دکھائی نہ دیتی تھی۔ نہ کوئی آواز تھی نہ حرکت۔ ستارے نہایت خاموشی سے ایک ایک کر کے نکلتے آ رہے تھے۔ یہ شام کا وہ یکساں وقت تھا جب فضا کا وجود ایک لمحے کو ٹھہر جاتا ہے اور اس کے عنصر بے اصل ہو جاتے ہیں۔ اس وقت وہاں کھڑے، اس سنسان اور ساکت منظر کو دیکھتے ہوئے دفعتہً اسد کے ذہن کا نقشہ بدلنے لگا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ اب اس گاؤں سے چل دیا ہے، جیسے اب واپس جانے کا کوئی راستہ نہیں۔ اپنے دل میں کہیں اسے یہ شک تھا کہ یہ احساس صحیح نہیں ہے، مگر وہ جانتا تھا کہ اس کے مقابل وہ لامدد ہے۔ یہ احساس ایک ایسی خبر کے مانند تھا جس کی آمد کا وہ ایک عرصے سے متوقع رہا ہو۔ جھٹپٹے کے اس بے عنصر وقت نے یہ خبر جادو کی طرح اس کے وجود میں پھیلا دی اور اس کے قدم لوٹ کر جانے کے بجائے وہیں کے وہیں جمے رہے۔ کچھ دیر تک وہ اپنے جسم کے خلا میں لپٹا لپٹایا وہیں پہ کھڑا اس تاریک گاؤں کو دیکھتا رہا۔ اس کا دل مرجھا گیا۔ اس نے ہاتھ اپنی بھاری سویٹر کی جیبوں میں ڈالے اور سر جھکا کر ایک طرف کو چل پڑا۔

وہ اس راستے پر چل رہا تھا جو گاؤں کی حد کے ساتھ ساتھ اُوپر کو جاتا تھا۔ تھوڑی دیر میں ہا ہر باہر چلتا ہوا، وہ گاؤں سے دُور نکل گیا۔ یہ راستہ ایک ڈیڑھ کوس تک چڑھائی کا تھا، پھر ڈھلان پہ جاتا تھا۔ اب اندھیرا ہو چکا تھا اور اس کی سانس پھول گئی تھی۔ پہاڑ کی سرد ہوا اس کے بالوں میں سے گزر رہی تھی۔ وہ ایک موٹی سی کوٹ نما سویٹر پہنے ہوئے تھا جس کے بٹن کھلے تھے۔ اس کا بدن چڑھائی پر چلنے کی وجہ سے گرم ہو گیا تھا مگر پچھلے چند منٹ سے اس کو سینے میں گرانی محسوس ہونے لگی تھی۔ وہ انگلیوں سے سینے کے بالائی حصے کو آہستہ آہستہ ملنے لگا۔ گرانی کم نہ ہوئی۔ ایک جگہ پہ رُک کر اس نے اپنے آگے نظر دوڑائی۔ اب وہ اس راستے پر آ نکلا تھا جو گاؤں کی عقبی پہاڑی کو کاٹتا ہوا چڑھتا تھا۔ وہ جا کر راستے کے کنارے پڑے ہوئے ایک پتھر پہ بیٹھ گیا۔

وقت اب اس کے حلق میں تھا اور تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ اس کے اندر چھوٹی بڑی چیزوں کی بھگدڑ مچی تھی، اندھوں کی طرح دل پہ عود کر آنے والی دہشت، جیسے کوئی پیچھے لگا ہے، کوڑا ہاتھ میں اُٹھائے یلغار کیے آتا ہے۔ تڑاخ تڑاخ۔ جیسے پیٹھ کے پیچھے اور نظر کے باہر وحشت کا پڑاؤ ہے۔ وہ انگلیوں کے پوروں سے ہولے ہولے اپنے حلق کے دامن کو کھودتا رہا، جیسے سانس کی جڑوں تک پہنچنا چاہتا ہو۔ ستارے اب پوری چمک سے نکل آئے تھے۔ ایک لڑکا گدھے پر لکڑیاں اور پانی کا ایک مٹکا لادے سائے کی مانند راستے سے گزر گیا۔ یہ لڑکا کہاں جا رہا ہے؟ اسد نے حیرت سے سوچا۔ رات کے اندھیرے میں راستہ چلتے ہوئے لوگ بے گھر سے کیوں لگتے ہیں؟ رات سرد ہوتی جا رہی تھی۔ آسمان پر اب بادلوں کے

اِکّا دُکا ٹکڑے مُنودار ہو کر ستاروں کو ڈھکنے لگے تھے۔ دیر تک وہ وہاں بیٹھا چاروں طرف سے اندھیرے کی یلغار کو دیکھتا رہا۔ آہستہ آہستہ، اس کے اندر کی آگ دھیمی پڑنے لگی۔

آخر اس تاریک چٹان پر، سڑک کے کنارے بیٹھے بیٹھے، دفعتہً اسد پر اپنی صورت حال کی حقیقت کھلی۔ اُس وقت گویا رات کا ایک لمحہ ہیرے کی مانند منجمد ہو کر چمک اٹھا، اور اس لمحے کی چکا چوند میں اسد نے دیکھا کہ یاسمین اس کے ساتھ لگ کر کھڑی اس کے کندھے پر ہاتھ رکھے کہہ رہی ہے: "تم کہیں مت جانا، اسدی۔ کوئی تمہیں کچھ نہیں کہہ سکتا۔" یاسمین کی آنکھوں میں سرکشی اور معصومیت تھی۔ یہ ایسی آنکھیں تھیں جنہوں نے وحشت کی شکل نہیں دیکھی تھی۔ اس وقت اسد کو علم ہوا کہ اور کہیں کچھ بھی نہیں ہے، نہ وقت ہے، نہ وقت کی یلغار، نہ ہی سانس ہے اور نہ کوئی دوا۔ دُنیا میں بس یاسمین کا چہرہ ہے، اور کسی شے کی حقیقت نہیں۔ سب چھوٹی بڑی باتوں کے لشکر اس ایک بات سے پھوٹتے ہیں۔ وہ لشکر اب غائب ہو چکے تھے۔ اب اس کے دل پر صرف ایک خوف کا سایہ تھا، کہ ایک بار اگر وہ یہاں سے اس طرح بے نام چلا گیا تو پھر کبھی یاسمین کو نہ دیکھ پائے گا —— اس خیال سے کہ وہ یاسمین سے جدا کر دیا جائے گا اس کے بدن کی طاقت زائل ہونے لگی۔ اسے محسوس ہوا کہ اس کی ہڈیاں پانی ہو رہی ہیں۔ سردی اس کے پاؤں کو چڑھنے لگی۔ ہمت کر کے وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے سوئیٹر کے گول گول سیاہ بٹن بند کیے اور ہاتھ بغلوں میں دے کر چلا۔ اب اس کے سامنے ایک ہی راستہ تھا —— ذوالفقار کا گھر۔

واپسی پر اسے گنبد سے ہو کر گزرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ راستہ گاؤں سے چار سو گز کے فاصلے پر گزرتا ہوا سیدھا پیچھے کو جاتا تھا۔ اسد کے سر میں اُڑان تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے زمین اس کے قدموں کے استقبال کے واسطے اُٹھ اُٹھ کر آ رہی ہے۔ اسد کو وقت کا احساس نہ ہوا، گو اسے چلتے چلتے گھنٹہ بھر ہونے کو آیا تھا۔ ذوالفقار رات کے اس وقت اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

کچھ دیر بعد اسد اسی بستر پر، جہاں اس نے استراحت کے چند روز گزارے تھے، بیٹھا تھا۔ ذوالفقار نے اس کی آمد سے ذرا ہی پہلے کھانا کھایا تھا۔ اس نے اسد سے کھانے کو پوچھا۔ اسد کو بھوک لگ رہی تھی۔ چند منٹ میں ذوالفقار کا ملازم اس کے لیے روٹی اور شوربہ لے آیا۔ جب اسد نے کھانا شروع کیا تو ذوالفقار نے سگریٹ سلگائی اور کرسی کی پُشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ گو اسد وعدے کے مطابق گنبد سے پلٹ آیا تھا مگر ذوالفقار کے چہرے سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسد کو دیکھ کر اسے کوئی خوشی نہیں ہوئی، جیسے کہ وہ اسد کو اب اپنے ہاں دیکھنا نہ چاہتا ہو۔ وہ کرسی پہ بیٹھا مسلسل اسد کو کھانا کھاتے، نوالہ چباتے، نگلتے اور دوسرا نوالہ منہ میں ڈالتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظروں میں عدم اعتماد کا تاثر تھا۔

"واپس جا رہے ہو؟" کچھ دیر بعد ذوالفقار نے پوچھا۔

اسد نے احتیاط سے اپنے مُنہ کا نوالہ چبا چبا کر نگلا۔ پھر اس نے پانی کے ایک گھونٹ سے حلق صاف کیا اور بولا: "ایک بات کرنے آیا ہوں۔" ذوالفقار نے مختصراً "ہوں" کی آواز نکالی جیسے کہہ رہا ہو: "کرو۔ میں سُن رہا ہوں۔"

اسد آہستہ آہستہ اگلا نوالہ چبانے لگا، جیسے بات کو تلاش کر رہا ہو۔ آخر نوالہ ختم کر کے وہ بولا: "آپ نے مجھ سے ایک بات کی تھی۔" ذوالفقار خاموشی سے اس کی طرف متوجہ رہا۔

"اگر میں،" اسد نے جھجکتے ہوئے بات شروع کی، "آپ کی پیش کش قبول کروں ——— تو گمشدہ میں رہ سکتا ہوں؟"

"وہاں کیا کرو گے؟"

"یاسمین کے کام،" اسد نے جواب دیا۔ "ختم ہونے میں کچھ وقت لگے گا۔"

ذوالفقار نے اس طرح اسد کو دیکھا جیسے پُوچھ رہا ہو: "کون سے کام؟" اسد خاموش رہا۔

"میری پیش کش قبول کر کے تم گمشدہ میں کیسے رہ سکتے ہو؟" ذوالفقار نے پوچھا۔

اسد نے نوالہ چباتے چباتے نفی میں سر ہلایا: "ابھی نہیں،" وہ بولا، "واپس آ کر۔"

ذوالفقار چند لمحوں تک سوچ بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا، جیسے اسد کی بات کو ذہن نشین کر رہا ہو۔ "میں کسی قسم کا وعدہ نہیں کر سکتا،" پھر وہ بولا، "پولیس کی کارروائی میں براہِ راست مداخلت کرنا ہماری پالیسی نہیں۔ میں نے تم سے بات خلوصِ نیّت سے کی تھی۔ اتنا بتا سکتا ہوں کہ اگر تم رضامند ہو جاؤ تو اس میں تمہارا فائدہ ہی ہو گا۔ میں صرف یہی وعدہ کر سکتا ہوں کہ حتیٰ المقدور تمہاری مدد کروں گا۔"

اسد آہستہ آہستہ روٹی کے نوالے شوربے میں ڈبو ڈبو کر کھاتا رہا۔ "واپسی کب تک ہو گی؟" اس نے پُوچھا۔

"چار چھ ہفتے تو ٹریننگ میں لگیں گے۔ پھر سیدھے اس طرف! آگے تمہارے کام پر منحصر ہے۔"

"ایک دو مہینے میں واپس آ سکتا ہوں؟"

ذوالفقار ہنسا جیسے اس کی سادگی پر ہنس رہا ہو۔ "اس کام کا کوئی فکسڈ شیڈول نہیں۔ ٹریننگ کے دوران تمہیں پتا چل جائے گا۔ بہت ساری چیزوں کا انحصار حالات کے اُوپر ہے۔ ہو سکتا ہے حالات ایسا رُخ اختیار کریں کہ پندرہ دن کے اندر تمہیں بلا لیا جائے۔ ہو سکتا ہے دو تین چار مہینے لگ جائیں۔ مگر ایک بات میں تمہیں کھُل کر بتا دینا چاہتا ہوں۔ یہ کام گمشدہ کے پرمٹ کے طور پر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اگر میرا ارادہ تمہیں گردن سے پکڑ کر

اِن لِسٹ کرنے کا ہوتا تو اتنی لمبی چوڑی بات کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ پہلے ہی ہمارے پاس ڈبل ایجنٹ کیا کم ہیں۔ یہ سب لوکل حرام زادے دونوں طرف سے کھاتے ہیں۔ ان کی کسی بات کا یقین نہیں کیا جا سکتا۔ اصل انفارمیشن ڈھونڈتے ڈھونڈتے اتنا وقت لگ جاتا ہے کہ وہ انفارمیشن ہی بیکار ہو چکی ہوتی ہے۔ کراس چیک کرنے کے ذرائع بہت کم ہیں۔ سب ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔ ان کو بس اپنے مال سے غرض ہے۔ ان حالات میں ایمان اور یقین سے کام کرنے والا ایک آدمی بھی ہمارے لیے نعمت سے کم نہیں۔" وہ رُکا۔ "مگر ان سب باتوں کے باوجود اس کام کا ایک مقصد ہے۔ جب تک وہ مقصد حاصل نہیں ہو جاتا ہمارا کام جاری رہے گا۔ تم جب آنا چاہو، میسیج بھیج دو۔ تمہاری واپسی کا بندوبست ہو جائے گا۔ پھر موقع پڑے، پھر چلے جاؤ۔ پنجاب کا چکر لگانا چاہو تو جا کر لگا آؤ۔ کسی پوائنٹ پر پہنچ کر فرض کیا کہ فارغ ہونا چاہتے ہو تو اس کا انتظام بھی ہو سکتا ہے۔ ویسے بھی اس کام میں ہر آدمی کا میکسیمم یوٹیلائزیشن پوائنٹ ہوتا ہے۔ ایسی کوئی پرابلم نہیں۔ مگر ایک بات میں تم پر واضح کر دینا چاہتا ہوں، کہ یہ ایک ٹرسٹ ہے، کوئی سروس وغیرہ نہیں۔ اس میں رضامندی اور کومٹ منٹ اشد ضروری ہے۔ تم جو کوئی قدم اُٹھاؤ سوچ سمجھ کر اُٹھاؤ، کسی دباؤ یا لالچ میں آ کر مت اُٹھاؤ۔"

ذوالفقار کی بات سُنتے سُنتے اچانک اسد کے دل کے گرد وہی پُرانا، مانوس حلقہ تنگ ہونے لگا۔ قدم! یہ لفظ اس کے دماغ میں گونج رہا تھا۔ قدم! جیسے ذوالفقار کی اور سب باتیں بیکار ہوں، صرف یہ ایک بات اس کے مُنہ سے حکماً خارج ہوئی ہو: "قدم اُٹھاؤ۔"

پہلی بار اسد کو اس بات کا احساس ہوا کہ ہمیشہ ہمیشہ سے وہ حالات کی یلغار کے آگے اِدھر سے اُدھر لامدد بھاگتا رہا ہے، کہ اپنے ارادے سے، اپنے عمد سے اس نے آج تک کبھی کوئی قدم نہیں اُٹھایا، حالات کے اس دھارے کو روکنے کی، اس کا رُخ موڑنے کی سعی نہیں کی، کہ جس وقت، جس طور اور جس طرف بھی اس کی زندگی کے حالات نے رُخ کیا ہے، اس نے اسی رُخ پر اپنا مُنہ موڑ لیا ہے اور بے اختیار و جنبش اس طرف کو چل دیا ہے۔ اس نے زندگی سے، اسد نے سوچا، کبھی مہلت حاصل نہیں کی، ہمیشہ وصُول کی ہے۔ ایک سے دُوسری، دُوسری سے تیسری۔ مہلت، مہلت، مہلت۔ اس نے محسوس کیا کہ عمر بھر سے اس کے دل کے اُوپر بے عملی کے اس بار کا مینار چُنا جاتا رہا ہے۔ اس کے سینے کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا مگر ساتھ ہی ساتھ اب یہ خیال اس کے اندر جنم لے رہا تھا کہ وہ جب چاہے اس حلقے کو توڑ سکتا ہے —— ہاتھ کی ایک جھٹک سے اس دھارے کی روک کر سکتا ہے۔ کہ یہ اب اس کے ہاتھ میں ہے۔ اس کا دل ہلکا ہونے لگا۔

اسد نے دسترخوان سے انگلیاں پُونچھیں اور خاموشی سے پانی کا گلاس اُٹھا کر مُنہ سے لگا لیا۔ گلاس خالی

کر کے اس نے دسترخوان سے ہونٹ خشک کیے۔ پھر اس نے سر اُٹھا کر ذوالفقار کی طرف دیکھا۔ ذوالفقار نے ایک تازہ سگریٹ نکال کر پہلے سگریٹ کے ٹکڑے سے سلگایا اور ٹکڑے کو ٹین کی ایش ٹرے میں مسل کر بجھا دیا۔ پھر وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا اور اندر سگریٹ کا دھواں پھیل رہا تھا۔ اس وقت ذوالفقار کو اپنے سامنے کرسی پر بیٹھے، اطمینان سے سگریٹ کے کش لیتے ہوئے دیکھ کر اسد کے دل میں شکر اور خلوص کے جذبات اُمڈ آئے۔ اسے یقین تھا کہ اس کی رہائی ذوالفقار کی کوششوں کی وجہ سے ہوئی تھی۔ اسے علم نہیں تھا کہ کیوں، مگر اس کو پورا اعتماد تھا کہ ذوالفقار اس کی ہر ممکن مدد کرے گا۔ آخر اسد نے سیدھی نظروں سے ذوالفقار کی آنکھوں میں دیکھ کر، منہ سے کچھ کہے بغیر، مگر گہرے عزم کے ساتھ، دوبار آہستہ آہستہ اثبات میں سر کو ہلا کر رضامندی کا اظہار کیا۔

کچھ دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ ذوالفقار کی آنکھوں میں ابھی تک ہلکی سی بے یقینی کا عنصر تھا۔ سگریٹ کا ایک گہرا کش لے کر وہ آگے جھکا اور میز پر کہنیاں رکھ کر بولا:

"ایک بات بتاؤ۔ تم صرف حکیم کی لڑکی کے پاس رہنے کی خاطر کام کرنے پر رضامند ہوئے ہو؟"

ایک لمحے کو اسد کے خیال میں نہ آیا کہ کیا جواب دے۔ پھر اس نے اپنے کندھوں کو خفیف سی حرکت دی۔ "میری دوا کی بوٹی اُدھر سے آتی ہے۔" وہ بولا۔

"صرف دوا کی خاطر اُدھر جا رہے ہو؟"

اسد نے دوبارہ لاعلمی کے انداز میں کندھے اچکائے۔ ذوالفقار چند لمحوں تک گہری نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ پھر بولا: "تم خدا اور رسول پر یقین رکھتے ہو؟"

اسد نے "ہاں" کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ بند کر لیا۔ وہ ان سوالوں کو ایسی سہل پسندی سے حل کرنے کا خواہاں نہ تھا۔

"ایک بار پہلے بھی آپ نے پوچھا تھا۔" اس نے کہا۔

"ہاں۔ دوبارہ اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ خدا اور اس کا رسولؐ انسانوں کو انصاف اور آزادی کا حق عطا کرتے ہیں۔"

"خدا اور رسولؐ پر تو وہ لوگ بھی یقین رکھتے ہیں جن کا ذکر ابھی آپ نے کیا ہے۔"

"ہاں۔ مگر ان کی اور تمہاری سطح میں بہت فرق ہے۔ تمہارے دل میں انصاف اور آزادی کا جذبہ ہے۔ یہ جذبہ ایک فطری عقیدے کی حیثیت رکھتا ہے۔ صرف یہ جذبہ رکھنے والے لوگ ہی نوعِ انسانی کی صحیح معنوں میں خدمت

کر سکتے ہیں۔ ٹھیک ہے، اس کے بعد اپنا مفاد بھی کسی حد تک مدِ نظر رہتا ہے۔ اس کا حق بھی" وہ دوسرا سگریٹ زمین پر پھینک کر اسے پاؤں سے مسلتے ہوئے بولا، "خدا نے ہمیں دیا ہے۔"

اسد نے دوبارہ کچھ کہنے کے لیے مُنہ کھولا مگر پھر بند کر لیا۔ آخر کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اچانک اسد کی آنکھوں میں اشتیاق کی چمک پیدا ہوئی، جیسے کسی خیال نے اسے جگا دیا ہو۔ اس نے کہنیاں اپنے گھٹنوں پر رکھیں اور آگے جھک کر بیٹھ گیا۔

"آپ کو" اس نے پوچھا، "میری بے گناہی کا یقین ہے؟"

ذوالفقار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا، جیسے اس سے کوئی غیر مناسب سوال پوچھ لیا گیا ہو۔

"قصور اور بے قصوری کا معاملہ خدا کی ملکیت میں ہے۔" پھر وہ بولا، "ایسے ہی جیسے سزا اور جزا کا اختیار اس کے پاس ہے۔ پھر ان باتوں پر سوال اُٹھانے کا کیا فائدہ؟ ہمارا معاملہ اپنے قانون سے ہے۔ قانون کی نظر میں تم بے گناہ ہو تو بے گناہ ہو۔ اس سے آگے ہم نہیں جان سکتے نہ اس سے آگے جاننے کا ہمیں کوئی حق ہے۔ چنانچہ اس سوال پر مزید سوچ کا صرف بے سُود ہے۔"

اسد کی نظروں کے سامنے شک و شبہ کے بھوت نے اپنا بڑا سا سیاہ گنجلک سر اُٹھانا شروع کیا اور اس کے دل میں ایک قدیم، سلگتی ہوئی، بے اطمینانی پیدا ہوئی۔ مگر یہ باتیں اب اس کے رستے میں حائل نہ ہو سکتی تھیں۔ اب وہ ایک نشے کی بے خیالی میں تھا۔ وہ ایک قلانچ بھر کر ان چھوٹی بڑی مہلتوں کے حلقے سے نکل گیا تھا۔ اس وقت جس کام کا ذمہ اس نے لیا تھا وہ کام بھی اس کے خیال میں نہ تھا۔ اس وقت اس کی نظروں کے سامنے مستقبل کا ایک منظر تھا — گُنبد کے اندر وہ یاسمین کے پاس بیٹھا ہے، لیٹا ہے، چل پھر رہا ہے، اور ہر کام سے فارغ ہے۔

★ ★ ★ ★ ★

سب سے مشکل کام جو اسے درپیش تھا یاسمین سے نبٹنے کا تھا۔ "آدھی رات تک تم غائب ہو گئے کچھ بتائے بغیر، کوئی بات کیے بغیر۔ میں یہاں رو رو کر بے حال ہو گئی۔ تمہیں میرا کچھ خیال نہیں؟" وہ بار بار

اسد سے استفسار کرتی، "ذوالفقار کے پاس تم کیا کرنے گئے تھے؟ مجھے تو اُس کی شکل سے نفرت ہے۔ آدھی رات کے وقت کیا کرنے گئے تھے؟ بتاتے کیوں نہیں؟"

دو دن تک وُہ اُسے ٹالتا رہا۔ حیلے بہانے سے، خوش مذاقی سے، سُنی اَن سُنی کر کے ——— اُس کو دو روز کی مُہلت مِل گئی تھی، مگر وقت اب اُس کے قابو میں تھا۔ اِس مشکل نوبت کے زیر زبر اسد کو احساس تھا کہ وہ جو چاہے اپنے ساتھ، یاسمین کے ساتھ، اپنے مشترکہ حالات کے ساتھ کر سکتا ہے، کہ اب یہ اُس کے اختیار میں ہے۔ واقعات کی رَو کو اُس نے پنجے میں جکڑ لیا تھا۔

اپنی مشکل کا احساس اُسے اُس وقت ہُوا تھا جب اُس رات کو گھر لَوٹ کر اُس نے دفعتہً دروازے پر نظر ڈالی تھی۔ آدھی رات کا وقت تھا اور اُس مقبرے کے سے بے نظر وصوت گاؤں میں صرف ایک ذرا اچنبھے کی صُورت وا تھا، اور اُس کے درمیان یاسمین کا اُڑے اُڑے بالوں والا پاگل چہرہ معلق تھا، جیسے جسم سے کٹ چکا ہو۔ وہ بتی نیچی کیے، لالٹین ہاتھ میں لٹکائے دروازے کے اندر، ہلکی سی شاخ کی مانند، سنبھل کر کھڑی تھی۔ اُس کا اُوپر کا دھڑ نسبتاً اندھیرے میں تھا، اور اُس اندھیرے میں اُس کا چہرہ ڈولتا ہُوا دکھائی دے رہا تھا۔ اسد نے قریب آ کر دیکھا کہ وہ بے حرکت کھڑی تھی اور اُس کی آنکھوں میں طویل جُدائی کی خشکی اور سوزش تھی۔

دو روز تک وہ غصّے سے، صبر سے، غم سے اور جوش سے جواب طلب کرتی رہی اور دو روز تک اسد اپنے درد کے کونوں اور کناروں پر ہاتھ رکھ کر اُنہیں گولائیوں میں ڈھالتا، اُن کی کاٹ کو گنوانے کی سعی کرتا رہا۔ اب ایک رات بیچ میں تھی اور یاسمین کے درد سے معاملہ طے کرنا ابھی باقی تھا۔ اِس کی ہمت وہ اپنے میں نہ پا رہا تھا۔

اُس نے دبے لفظوں میں، سرسری لہجے میں یاسمین کو اپنے فیصلے کے بارے میں بتانا چاہا۔ یاسمین کی آواز وحشت سے گُونج اُٹھی:

"کہاں۔ کب۔ کس جگہ؟ کتنی دیر کے لیے جا رہے ہو۔ ذوالفقار کے ساتھ جا رہے ہو؟"

"ذوالفقار کے ساتھ نہیں جا رہا۔" اسد نے کہا، "اُس نے انتظام کیا ہے۔"

"کیسا انتظام کیا ہے؟ ذوالفقار کی شکل سے مجھے نفرت ہے۔ اُس کی نیولے کی طرح آنکھیں ہیں۔ دیکھتے ہی مجھے خوف آنے لگا تھا۔ مجھے علم تھا یہ کوئی شر پیدا کرے گا۔ وہ تمہارے جانے کا انتظام کر سکتا ہے، لَوٹ آنے کا انتظام نہیں کر سکتا؟ تمہیں جانے کی کیا ضرورت ہے؟"

"مَیں نے خود اُس سے کہا ہے۔ مَیں خود دیکھ بھال کر ـــ ـــ ـــ"

"دیکھنے بھالنے کی کیا ضرورت ہے۔ مجھے معلوم ہے یہ کیا چیز ہے، مَیں نے برسوں تک استعمال کی ہے۔

اُس آدمی سے جا کر تم نے کیوں پوچھا ہے ؟ میں تمہیں منگوا دوں گی ۔"

"خوشی محمد جیل میں ہے ۔ تم کیسے منگوا دو گی ؟"

"جیسے بھی منگواؤں ، تمہیں اس سے کیا غرض ۔ تمہیں دوا سے غرض ہے ۔ دوا تمہیں مل جائے گی ۔"

اسد خاموش ہو رہا ۔

"تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو ، اسد ۔ کیا بات ہے ؟ ٹھیک ٹھیک کیوں نہیں بتاتے ۔ کہاں جا رہے ہو ؟"

"میں سرحد پار جا رہا ہوں ۔" اسد نے صبر سے کہا ۔ "صرف ایک مہینے کے لیے ۔ کوئی زیادہ عرصے کے لیے نہیں ۔ ایک ماہ کے لیے ۔ واپس آجاؤں گا ۔"

"ذوالفقار نے کیسے انتظام کیا ہے ؟ پولیس کے ذریعے ؟"

"پولیس سے ذوالفقار کا کوئی تعلق نہیں ۔"

"پھر کس سے ہے ؟"

"شاید فوج سے ہے ۔"

یاسمین نے دہل کر پوچھا : "فوج میں بھرتی ہو کر جا رہے ہو ؟"

اسد ہنسا : "فوج میں تو بھرتی نہیں ہو سکتا ۔ سانس ٹھیک نہیں ۔"

"پھر ؟ پھر کیسے جا رہے ہو ؟"

"پرائیویٹ طور سے جا رہا ہوں ۔ آزادی سے ۔ جب چاہوں واپس آسکتا ہوں ۔ کوئی بندش نہیں ۔ ذوالفقار کی اس معاملے میں پہنچ ہے ۔ میں نے خود اُس سے کہا ہے ۔"

"تم نے خود ؟" یاسمین نے آنکھیں پھیلا کر پوچھا ۔ "ایسے ہی بیٹھے بیٹھے ؟ مجھ سے بات کیے بغیر اُٹھ کر ایک دوسرے ملک کو جا رہے ہو ؟ واہ ۔"

"کوئی دوسرا ملک تو نہیں ۔"

"اور کیا ہے ۔ دوسری حکومت تو ہے ۔"

"حکومت سے کیا ہوتا ہے ؟"

"ذرا جا کر دکھاؤ ۔ پتا چل جائے گا حکومت سے کیا ہوتا ہے ۔"

"تمہارے سب لوگ اِدھر سے اُدھر آتے جاتے رہتے ہیں ۔ کیا فرق پڑتا ہے ۔"

"ہمیں نہیں پڑتا۔ ہماری بولی، بات چیت، رشتے داریاں سب ایک ہیں۔ تمہیں پڑتا ہے۔"

"میرے لیے تو پھر یہ بھی غیر ملک ہے۔"

"تم اِدھر سے بچ گئے تو اُدھر پکڑے جاؤ گے۔ اُدھر سے بچ گئے تو اِدھر والے ——"

"ادھر نہیں پکڑا جاؤں گا۔"

یاسمین نے جیسے اُس کی بات سُننا چھوڑ دی تھی۔ وہ اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گئی۔ اُس کی پُشت پر رونگٹے کھڑے تھے، اور اُس کے کندھوں میں خفیف سی کپکپاہٹ تھی۔

"میرا دل ڈوب رہا ہے۔" وہ لرزتی ہوئی کمزور آواز میں بولی۔

اسد نے اُس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کھینچا۔ وہ اپنی جگہ پہ بیٹھی رہی۔ "تمہارے پکڑے جانے کا خیال کرکے میرا دل ڈوبنے لگتا ہے۔"

اسد نے دونوں ہاتھ اُس کے کندھوں پر رکھ کر اُسے لٹا دیا۔ "پاگلوں کی سی باتیں مت کرو۔ مَیں کوئی پکڑا وکڑا نہیں جاؤں گا۔ تم لوگوں کی طرح دکھائی دیتا ہوں، بول لیتا ہوں، کوئی پہچان نہیں سکتا۔ پھر ذوالفقار کے جاننے والے اُدھر ہیں۔ مَیں اُن کی حفاظت میں رہوں گا۔ کسی خطرے کا امکان نہیں۔ تھوڑے سے وقت کی بات ہے۔ تم خواہ مخواہ گھبرا رہی ہو۔"

"خواہ مخواہ! تم جا کیوں رہے ہو مجھے چھوڑ کر؟ کیا ضرورت ہے؟"

اسد کے جواب دینے سے پہلے وہ پھر بولی: "ذوالفقار کا کیا مطلب ہے اِس میں؟"

"ضروری ہے کہ اُس کا مطلب ہو؟"

"ہاں۔ ایسی شکل والا آدمی اپنے مطلب کا آدمی ہوتا ہے۔"

"معمولی سا کام میرے ذمّے اُس نے لگایا ہے۔"

"کیسا کام؟"

"کچھ خبر رسانی وغیرہ کا کام۔"

"خبر رسانی؟ یعنی جاسوسی کا کام؟ جاسوس بن کر جا رہے ہو؟"

"جاسوسی تو بہت لمبا چوڑا کام ہے۔ چونکہ مَیں جا ہی رہا ہوں اُس نے کہا ہے کہ اپنا کام ختم کرکے جب واپس آؤں تو اُسے وہاں کے عام حالات سے باخبر کر دوں۔ رائے عامہ وغیرہ وغیرہ۔ وہ بھی کوئی پابندی نہیں۔ جب چاہوں واپس آ سکتا ہوں۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔ تم خواہ مخواہ گھبرا رہی ہو۔"

یاسمین نے کسما کر اُٹھنے کی کوشش کی مگر اسد کے ہاتھوں کے دباؤ تلے لیٹی رہی۔ اسد کا ایک ہاتھ اُس کے پیٹ پہ رکھا سانس کی حرکت کے ساتھ لرز رہا تھا۔ یاسمین کی جلد سے آگ نکل رہی تھی۔ اِس کے درد کے کنارے، اسد نے سوچا، میرے ہاتھوں سے باہر ہیں۔

"تمہاری بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔" یاسمین کا لہجہ دفعتاً دھیما پڑ گیا، جیسے اسد کی بات کو بکھیرنے کی بجائے سمیٹنا چاہ رہی ہو۔

"کیوں؟ سیدھی سی بات ہے۔"

"تمہاری کوئی بات،" وہ بولی، "میری سمجھ میں نہیں آتی۔"

اسد خاموش لیٹا، ہاتھ یاسمین کے پیٹ کے تلاطم پہ رکھے، آخر اُس کے سوال کی تہہ کو پہنچ گیا۔

"اِسی لیے جا رہا ہوں۔" وہ بولا۔

"کیوں؟" یاسمین نے ہولے سے پوچھا۔

"کہ تمہارے پاس رہ سکوں۔ تمہارے ساتھ بات کر سکوں۔"

"جانے سے کیا ہوگا؟"

"تمہارے پاس رہنے کی آزادی مِل جائے گی۔"

"اسد ہی!" وہ بپھر کر اُٹھی۔ "تم آزاد ہو۔ تم اب ——"

مگر اسد نے ہاتھ اُٹھا کر اسے خاموش کر دیا۔ "میری زندگی،" وہ بولا، "ایک طویل قید بنتی جا رہی ہے۔ کوئی قدم اُٹھاؤں تو آزادی حاصل ہو۔ پھر تمہیں بھی میری بات کی کوئی سمجھ آئے ——"

"اگر چھوڑ کر جانے سے ہی آزادی ملتی ہے تو ایسی آزادی کا کیا فائدہ؟ کوئی بات اتنی اہم نہیں کہ اس کے لیے تم مجھے چھوڑ کر ہی چلے جاؤ۔" اس کی آواز میں آنسوؤں کی نے سرایت کر آئی تھی مگر اس کی آنکھیں صحراؤں کی طرح پھیلی ہوئی اور خشک تھیں۔

"ایک بار تو جانا ہی پڑے گا۔" اسد نے کہا۔

"کیوں؟"

"اس کے بغیر چارہ نہیں۔" وہ بولا، "میرے اپنے لیے بھی یہ بات اہم ہے۔"

"یہ جانتے ہوئے بھی کہ تمہارے جانے سے میری کمر ہی چلی جائے گی؟ پھر بھی تمہارے لیے یہ بات اہم ہے ——؟" اس نے بات ختم کر دی۔

"ہاں ۔" کچھ دیر کے بعد اسد نے جواب دیا ۔

"پھر تم عورتوں کو کہاں جانتے ہو ۔" یاسمین بولی ، "مردوں والی بات کرتے ہو ۔"

"کیسے ؟"

"اپنی اہمیتوں کو اصل جان کر سمجھتے ہو کہ میرے کام بھی سیدھے ہو جائیں گے مگر اپنی بات کو میری بات سے کبھی نہیں ملاتے ۔ اپنی سوچ سوچتے ہو اور مجھے دلاسا دیتے ہو ۔ یہی بات تو میری سمجھ میں نہیں آتی ۔ تمہیں پتا ہے کہ تمہارے بعد میرا دل فنا ہو جاتا ہے ؟ جب تم پولیس کی قید میں تھے تو میری آنکھیں اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئی تھیں ، چمگادڑوں کی طرح ۔ میں رات بھر آنکھیں کھولے دیکھتی رہتی تھی اور میرے دل میں کوئی خیال بھی نہ آیا تھا ۔ میں کوشش کرتی تھی کہ مجھے اپنے بچپن کی کوئی بات یاد آئے ، پتا چلے کہ میں زندہ ہوں ۔ مگر ایک بات بھی یاد نہ آتی تھی ۔ میرا حافظہ ٹھہر گیا تھا ۔ ایسی حیران کر دینے والی بات تمہاری سمجھ میں کیسے آئے گی —— میرا پیٹ ،" اس نے ایک خشک سسکی بھری ، "سوکھ گیا تھا ۔"

اسد نے دونوں ہاتھوں سے اُس کا چہرہ تھاما ، جیسے کانچ کے گلدان کو اٹھا رہا ہو ، اور آہستہ سے اپنے سینے پر رکھ لیا ۔ ایک کھیت میں ایک جھاڑی ہے ، اُس جھاڑی پہ ایک سُرخ پھول ہے ، اسد کے ذہن سے گزرا ، اور ہوا زور سے چل رہی ہے ۔ وہ دیر تک ایک گال اسد کے سینے پر رکھے اپنی بے جھپک آنکھوں سے دیوار کے اندھیرے کو دیکھتی رہی ۔ اُس کا طوفان آہستہ آہستہ سرد پڑتا گیا ۔ اُس کی دھیمی ہوتی ہوئی سانس کی رفتار سے اسد کو اُس کی ٹوٹ پھوٹ اور پھر اُس کی قوّت کا اندازہ ہوا ۔ رات کی ہوا کھڑکی کے راستے کمرے میں آ رہی تھی ۔ اسد نے چادر سے اپنے آپ کو اور یاسمین کو ڈھانپ لیا ۔ چادر کے اندر بھی یاسمین کی آنکھیں کھلی رہیں ۔ اُس چہرے کو ہاتھوں میں لیے اُس بے آواز رات میں اسد کو ایک ایسے درد کا احساس ہوا جس سے اُس کا دل آشنا نہ تھا ۔ حیرت سے اُس نے سوچا کہ وہ اِس درد سے آشنا ہونے کا خواہاں بھی نہ تھا ، کیونکہ اُسی لمحے اُس کو ایک عجیب سی سرخوشی اور توانائی کا احساس بھی تھا ۔ دل کے اِس درجہ متضاد رنگوں نے اُس کے فہم کو پچھاڑ کے رکھ دیا تھا ۔ وہ وقت کو مٹھی میں لیے ، پھر اپنے آپ کو اسی وقت کے حوالے کیے ، چت پڑا چھت کو دیکھتا رہا ۔ اندھیرا کئی برس پہ محیط تھا ۔

دیر کے بعد یاسمین نے سر ذرا سا اٹھایا ۔ "تم بیس سال کے ہو گئے ہو ۔" اُس نے کہا ۔

اسد نے چونک کر یاد کیا کہ کل اُس کی بیسویں سالگرہ تھی ۔ "تمہیں کیسے پتا ہے ؟" اُس نے پوچھا ۔

"تم نے ایک بار بتایا تھا ۔"

طویل خاموشی میں یاسمین کی سانس کی آواز آرہی تھی۔ "میں تم سے چھ سال بڑی ہوں۔" وہ بولی۔

اسد نے اُس کے گال پر رکھا ہوا ہاتھ آہستہ سے دبایا، اور دیر تک دبائے رکھا، حتیٰ کہ کلائی کے پٹھوں میں لرزش پیدا ہونے لگی۔

"تم،" یاسمین نے کہا، "اس لیے تو مجھے چھوڑ کر نہیں جا رہے؟"

ایک لحظے کو اسد نے سوچا کہ شاید وہ ہنس رہی ہے۔ اُس نے نیم اندھیرے میں نظر پہ زور دے کر دیکھا۔ یاسمین کے ہونٹ پتلے پتلے سوکھے ہوئے پھلوں کی مانند ایک دوسرے کے اوپر رکھے تھے اور اُس کی آنکھوں میں اپنے سوال کی سوزش تھی۔ اسد کی سانس بوجھل ہونے لگی۔ وہ اُٹھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔ اُس نے دو تین لمبے لمبے سانس کھینچ کر سینے کو صاف کیا۔ پھر اُس نے پہلو کے بل پڑی یاسمین کو بچے کی طرح بازوؤں کے حلقے میں لے کر سینے کے ساتھ لگا لیا اور اُسی طرح بیٹھا بیٹھا ہلنے لگا، جیسے وظیفہ کر رہا ہو۔ یاسمین کا بوجھل بدن اُس کے بازوؤں میں بے مزاحمت ہلتا رہا۔

جب وہ رکا تو اُسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ کئی گھنٹوں تک لگاتار ہلتا رہا ہے۔ اُس کی کمر میں درد کے شرارے چھوٹ رہے تھے اور اُس کی سانس مشکل سے آرہی تھی۔ وہ یاسمین کو بازوؤں میں لیے لیے بستر پہ گر پڑا۔ لیٹتے ہی وہ تھوڑی دیر کے لیے سو گیا۔ جب وہ جاگا تو اُس کی سانس ہموار ہو چلی تھی۔ یاسمین اُسی رُخ پہ اُس کی چھاتی پہ گال رکھے پڑی ہوئی بے معلوم سانس لے رہی تھی۔ کبھی کبھی وہ اپنی ایک ہتھیلی اسد کی پسلیوں پر ہلاتی، انگلیوں کے پوروں کو ہولے سے پسلیوں کے درمیان والی نرم جلد پر دباتی، پھر ساکت ہو جاتی، جیسے ٹھہر ٹھہر کر بے زبانی سے انگلیوں کے تار جوڑنے کی کوشش کر رہی ہو۔ جنگلوں میں اُس رات درختوں کے چٹخنے کی آواز بھی نہ تھی۔

رات کا پچھلا پہر تھا جب اچانک بجلی کی کڑک کی مانند، سکوت کو چیرتی ہوئی ایک لمبی، اکلوتی چنگھاڑ کی آواز اُن کے کانوں سے آکر ٹکرائی —— ہمیشہ کی طرح لامقام، بے سمت، اور بہت قریب۔ اسد نے مُڑ کر کھڑکی کی جانب دیکھا، جیسے کھڑکی میں شیر کا سر دکھنے کا متوقع ہو۔ کھڑکی میں صرف ستاروں بھرے آسمان کا نیم روشن چوکھٹا تھا۔ وہ دونوں کان لگا کر اُس آواز کی شکل کو ہوا میں بنتے بگڑتے ہوئے دیکھتے رہے، پھر دیر تک دم سادھے اُس سے اگلی آواز کے منتظر رہے۔ مگر اُس آواز کا سلسلہ پیدا نہ ہوا، نہ کوئی دوسری آواز آئی۔ دھوئیں کی لاٹ کی مانند اُس ایک آواز کی لہر ہوا میں اُٹھی اور منجمد ہو گئی، اور خاموش کھڑی اُن کے کانوں میں سنسناتی رہی۔ آہستہ آہستہ اسد نے منہ موڑا اور بستر پر سیدھا لیٹ گیا۔ رات کے عناصر پہ اُس آواز کا

سناٹا طاری تھا۔

دفعتاً یاسمین کا ڈھیلا بے جان جسم تڑپ کر بیدار ہوا۔ وہ کئی لمحوں تک گھٹنوں پہ کھڑی، ہوا میں اُٹھی ہُوئی اسد کو دیکھتی رہی، پھر وہ ہوا بھری چھتری کی مانند آہستہ سے اُس کے اُوپر آ گری۔ اسد کے بدن کو اُس نے چاروں ہاتھوں پاؤں سے ڈھانپ لیا اور اُسے چُومنے لگی۔ اُس کے سر کو، ماتھے کو، آنکھوں کو، ہونٹوں کو اور ٹھوڑی کو، اُس کے گردن کے خم میں، سینے پہ، پسلیوں کی باریک جلد کے اُوپر، ناف کے اندر، گھٹنوں اور ٹخنوں کو چُومتی ہُوئی وہ پاؤں کے تلووں پر چلی گئی۔

"میرے پاس رہو۔" وہ رو کر بولی، "اسد!"

اسد نے اُسے تھامنا چاہا مگر وہ اُس کے ہاتھوں سے نکل گئی۔ اُس کے جسم میں غرّاتے ہُوئے جانور کی سی تُندی اور تیزی تھی۔

"اچھا۔ تمہارے پاس رہوں گا۔" وہ اُسے سنبھالنے کی کوشش کرتے ہُوئے بولا، "چند روز کی بات ہے۔"

"چند روز میں آ جاؤ گے؟" وہ اسد کے کندھے پہ دانت رگڑتی ہُوئی بولی، "پھر یہیں رہو گے؟"

آنسوؤں کے دو قطرے اسد کے گال پر گرے۔

"ہاں۔" وہ برابر اُسے بازوؤں میں قابو کرنے کی کوشش کرتا رہا، مگر وہ تلملاتی ہُوئی اسد کے سارے بدن پر رینگتی رہی، جیسے پانی پہ تیر رہی ہو۔

"اچھا۔" وہ بولی، اور اُس کی گردن پہ ہونٹ رکھ کر رونے لگی۔ اپنی ٹانگوں اور بازوؤں کے حلقے میں اُس نے اسد کا سارا جسم اس طرح کس لیا تھا جیسے اُسے اپنے بدن کا حصّہ بنا لینا چاہتی ہو۔

صبح کی خُنک ہوا کھڑکی کے راستے اندر داخل ہو رہی تھی۔ پہاڑ کے پہلو میں، گھاس کے اُوپر، سوتے جاگتے میں اسد نے دیکھا، ایک ہنستا ہُوا چہرہ پڑا ہے، جس کی آنکھیں بے تاب ہیں۔ اور کھڑکی کے اندر ایک بندوق لٹکی ہے۔

• • •

(۲)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ
عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ

یہ تھوڑے احوال ہیں بستیوں کے کہ ہم سناتے ہیں تجھ کو
کوئی ان میں قائم ہے اور کوئی کٹ گیا۔ (ہود: ۱۰۰)

القرآن الحکیم

(۷)

سبزی مائل رنگت کے فوجی خیمے گھنا ٹوپ درختوں میں چھپے ہوئے تھے، مگر اس وسیع گھنے جنگل میں داخل ہوں تو جہاں تک نظر جاتی ان خیموں کا ایک شہر بسا تھا۔ ساری زمین پر سے جھاڑ جھنکاڑ کو صاف کر دیا گیا تھا اور اُونچے نیچے پتھروں کو کُوٹ کاٹ کر سیدھی سیدھی پگڈنڈی نما سڑکیں بنائی گئی تھیں۔ اِن سڑکوں پر جگہ جگہ چونے سے مختلف قسم کے علامتی نشان لگے تھے، کہیں گول دائرہ، کہیں ضرب کا کراس، کہیں جمع کا، وغیرہ۔ اِکا دُکا درختوں کو کاٹ کر گاڑیوں کے لیے جگہ صاف کی گئی تھی۔ زیادہ تر جیپ اور ڈاج گاڑیاں تھیں جن میں سے کئی کے اوپر درمیانے سائز کی توپیں نصب تھیں۔ دو توپوں کے اوپر خاکی کینوس کے خول چڑھے تھے، باقی ننگی اپنی سُونڈیں اٹھائے کھڑی تھیں۔ اُن کی گہرے سبز رنگ کی نالیوں پر کہیں کہیں دھوپ کی شعاعیں پڑ رہی تھیں۔ مگر اُن کا روغن بے چمک تھا اور دھوپ اُن پہ اُٹھتی نہ تھی، جہاں پڑتی وہیں جذب ہو جاتی تھی۔ چند ایک جیپ گاڑیوں پر وائرلیس کا ساز و سامان فٹ کیا ہوا تھا، اور اُن کے اُوپر پتلے پتلے لچک دار ایریل سیدھی سیاہ ٹہنیوں کی مانند اُٹھے تھے۔ زیادہ تر فوجی جنگل کے جنگی لباس میں ملبوس، جالی سے ڈھکے ہوئے خود پہنے، بُولی گنے بکے منہ والے سیاہ فُل بُوٹ ٹھنٹھناتے ہوئے اِدھر

اُدھر آجا رہے تھے، خیموں اور توپ گاڑیوں کے پاس کھڑے تھے یا وائرلیس کی بیٹریوں کے اُوپر جُھکے ہُوئے تھے۔ کسی کسی جگہ پر بھاری پتھروں سے عارضی قسم کے کمرے بھی بنائے گئے تھے، جن کے آگے ایک سپاہی چھوٹی مشین گن کندھے سے لٹکائے کھڑا تھا یا پہرے داروں کے دستے چوکس انداز میں چل پھر رہا تھا۔ کئی ہزار فٹ بلند پہاڑ کی اِس ہموار چوٹی پر پائن اور دیودار کا بظاہر بے ضرر جنگل اِس بھاری سامانِ حرب کو ڈھانپتے ہُوئے ایک حصار کی شکل بنا تھا۔

ایک خیمہ جس کا پردہ گرا تھا، پتھر کی پگڈنڈی سے ذرا دُور ایک مہیب درخت کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ خیمے کے اندر بتی جل رہی تھی۔ ایک طرف کو میز اور اُس کے اطراف دو کرسیاں پڑی تھیں جن پر اسد اور ذوالفقار آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ خیمے کی دُوسری دیوار پر ایک بڑا سا نقشہ لٹکا تھا۔ سامنے خیمے کی تکون میں ایک فوجی کھاٹ رکھی ہُوئی تھی جس کے اُوپر کمبلوں کا بستر بچھا تھا۔ کھاٹ کے پاس ایک چھوٹی سی میز رکھی تھی۔ میز پر ایک سُرخ جلد والی ڈائری نما کتاب، ایک ماچس اور شیو بنانے کا سامان پڑا تھا۔

خیمے کی دہنی دیوار پر، نقشے کے پاس، ایک چھوٹا سا شیشہ لٹکا تھا۔ کچھ دیر پہلے اسد جب خیمے میں داخل ہوا تھا تو کرسی پر بیٹھتے ہی شیشے میں اپنا عکس دیکھ کر چونک پڑا تھا، جیسے یکایک ایک موڑ مڑنے پر کوئی مدھم سا مانُوس چہرہ سامنے آجائے۔ اب ذوالفقار باتیں کرتے کرتے رُک کر بے خیالی سے جیبی چاقو کے ساتھ پنسل کا سکہ باریک کر رہا تھا کہ اسد کو دوبارہ شیشے میں وہ شکل نظر پڑی۔ اُس کے بال دیہاتی کشمیریوں کے انداز میں کٹے تھے اور چار ہفتے کی ڈاڑھی بے ترتیبی سے بڑھ چکی تھی۔ اِس دوران میں اگرچہ وہ چار بار نہا چکا تھا، مگر سر کے بال دھونے کی ممانعت تھی، چنانچہ اُس کے بال گدلی سی چکناہٹ لیے ہُوئے چھوٹی چھوٹی رسیوں میں بٹنا شروع ہو گئے تھے۔ اُس کے سر پہ گندی سی سفید کپڑے کی ٹوپی تھی جو بمشکل آدھے سر کو ڈھانپ رہی تھی۔ شیشے سے نظر ہٹا کر اسد نے اپنے اُوپر ایک نگاہ ڈالی۔ وہ ایک لمبے سے مَیلے چغہ نما کرتے اور بھاری شلوار میں ملبوس تھا اور اُس کے بے جراب پاؤں میں کشمیری چپل تھی۔

"چار ہفتے میں تمہاری صحت تو ٹھیک ہو گئی ہے۔" ذوالفقار نے کہا، "سانس کیسی ہے؟"

"ایک دورہ ہُوا ہے۔ ڈھائی دِن کا۔" اسد نے جواب دیا، "سخت نہیں تھا۔"

"کوئی دو رات کا پیدل سفر ہے۔ پانچ بسر تک لے کر۔" ذوالفقار نے کہا، "ٹھیک ہے؟"

"ہاں۔"

"اگر کچھ دن اور رُکنا چاہتے ہو تو . . . . . ."

"نہیں۔" اسد نے کہا، "ٹھیک ہے۔"

ذوالفقار نے اچانک ہاتھ روک لیا۔ اُس نے چاقو میز پر رکھا اور ہاتھ بڑھا کر اسد کی بائیں کلائی کو اپنے سامنے کھینچ کر اُسے دیکھنے لگا۔

"یہ نہیں چلے گا۔" وہ کلائی کو اُنگلی سے ٹھونک کر بولا، جہاں گھڑی باندھنے کی وجہ سے جلد پر ہلکے رنگ کا مستقل فیتے کا نشان بن گیا تھا۔

"آستین کے نیچے آجائے گا۔" اسد نے کہا۔

"اونہوں۔" ذوالفقار نے فیصلہ کن انداز میں سر ہلایا، "رسک ہے۔" پھر اُس نے منہ اُٹھا کر آواز لگائی: "علی!"

خیمے کا پردہ اُٹھا اور ایک سپاہی نے اندر داخل ہو کر سلوٹ مارا۔

"گل شیر کو بھیجو۔"

سپاہی دوبارہ سلوٹ کر کے باہر نکل گیا۔ ذوالفقار نے اسد کی کلائی پر سے ہاتھ اُٹھا کر کڑی نظروں سے اُسے دیکھا۔

"تم نے جواب نہیں دیا۔"

"ہنہہ؟"

"اپنے نام کی آواز پہ کوئی جوابی حرکت تمہاری طرف سے نہیں ہوئی۔"

"آواز سپاہی کو پڑی تھی۔"

"میں نے جب آواز دی تھی تو تمہاری طرف دیکھ رہا تھا۔" ذوالفقار تیزی سے بولا۔

"مجھے علم تھا کہ مخاطب میں نہیں ہوں۔"

"ریفلیکس، مائی فرینڈ۔ ریفلیکس۔ چار ہفتے تک تمہیں ٹریننگ کیمپ میں کیوں رکھا گیا ہے؟ صرف اس لیے کہ تمہارے ریفلیکس ڈویلپ ہوں۔ ریفلیکس۔" وہ زور دے کر بولا، "ایک آنکھ کی جھپک سے تم اپنا رزلٹ فاش کر سکتے ہو۔ انٹیلی جنس سب ریفلیکسز کا کھیل ہے، اور رانسٹنکٹ کا۔ اس میں کوئی قانون نہیں، یا یہ کہ اس کے اپنے قانون ہیں۔ جنگل کے جانور کو پیچھے مُڑ کر دیکھے بغیر خبر ہو جاتی ہے کہ اُس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ تم نے کبھی دیکھا ہے وہ ایک پتا گرنے کی آواز سے بدک اُٹھتا ہے، حالانکہ اُسے علم ہوتا ہے کہ محض ایک پتا گرا ہے۔ مگر وہ جانتا ہے کہ اگر سو بار میں ایک بار بھی چُوک گیا تو جان گنوا بیٹھے گا۔ اس کام میں کوئی رسک کوز نہیں ہوتا۔ موقع محل کے مطابق خود اپنا عمل وضع کرنا پڑتا ہے۔ کوئی حیلہ بہانہ کام نہیں دیتا۔"

"مَیں نے کوئی حیلہ بہانہ نہیں کیا"۔

ذوالفقار نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے صبر کی تلقین کی۔ "میری بات کو غلط مت سمجھو، مَیں تمہیں الزام نہیں دے رہا محض انٹیلی جنس کا فلسفہ بتا رہا ہوں۔ اب تم دنیا کے واسطے ایک شخص بنام علی ہو۔ آج سے تمہارے اُوپر علی مراد ولد شہباز قوم اجاڑ سکنہ نو بہاڑ پیشہ مزدور کی ذاتی ذمہ داری ہی نہیں، بلکہ تمام تر اخلاقی ذمہ داری بھی عاید ہوتی ہے۔ آج سے تم نے عمداً اپنی ذات کی ایک شکل تخلیق کی ہے اور اس فیصلے کے ذمہ دار ہو۔ ٹوڈے،" وہ میز پہ آگے جھکا اور اسد کے دونوں کندھوں پر ہاتھ رکھ کر جذبے سے بولا، "یو آر اے مَین"۔

اُس کا جذبہ اور جوش اسد کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ خالی خالی آنکھیں کھولے ذوالفقار کو دیکھتا رہا۔ اسی اثناء میں خیمے کا پردہ اُٹھا کر ایک حوالدار اندر آیا اور سلوٹ کر کے انتظار کرنے لگا۔ ذوالفقار نے اُس کی طرف دیکھے بغیر ہاتھ اُٹھا کر سلوٹ کا جواب دیا اور اسد سے مخاطب رہا۔

"کیمپ کی ٹریننگ سے پوری طرح مطمئن ہو؟"

"ہاں"۔

"پاتھ فائنڈنگ۔ اَن آرمڈ کامبیٹ۔ میپ ریڈنگ۔ ماسٹر؟"

"ہاں سب"۔

"یہ سب چیزیں حفظِ ماتقدم کے طور پر سیکھنی ضروری ہیں۔ مگر کامیاب انٹیلی جنس آپریشن وہ ہوتا ہے جس میں کامبیٹ وغیرہ کی ضرورت ہی نہ پڑے۔ بھوت کی طرح چاروں کونوں میں پھر جاؤ اور دشمن کی ہوا کو خبر نہ ہو"۔

ذوالفقار نے حوالدار گُل شیر کی طرف دیکھ کر اسد کی کلائی کی جانب اشارہ کیا۔ حوالدار نے آگے بڑھ کر اسد کی کلائی ہاتھ میں لی، اور جلد کی اُجلی پٹی پر اُنگلی پھیر کر بولا:

"یہ تو لیپ سے ہی ہو گی، سر"۔

"ٹھیک ٹھاک ہو جائے گی؟"

"بالکل، سر"۔

"آج ہی ہو جانی چاہیے"۔

"آج ہی ہو جائے گی، صاحب"۔

"زیادہ نہ جل جائے۔ خیال رکھنا"۔

"پتا بھی نہیں چلے گا، صاب۔"

"ٹھیک ہے، گل شیر۔"

"یس سر۔"

حوالدار سلوٹ کر کے باہر نکل گیا۔ ذوالفقار اُٹھ کر سامنے لگے ہوئے نقشے کے آگے جا کھڑا ہوا جس کے اُوپر جگہ جگہ رنگ دار گتے کے مختلف شکلوں کے ٹکڑے چسپاں تھے۔

"میپ سائن۔" وہ اُنگلی اُٹھا اُٹھا کر نقشے پر رکھتا ہوا بولا۔ "آرمر۔ ایک ایک آرٹلری۔ سپلائز۔ انفنٹری۔ سائز۔ سٹرینگتھ ...... آج کل" اُس نے دو متوازی سبز لکیروں کے اوپر اُوپر اُنگلی دوڑاتے ہوئے کہا، "یہ سلیپ کاریڈور ہمارے استعمال میں ہے۔ اِسی سے تم جاؤ گے۔ اس بارے میں انٹیلی جنس ہماری اپنی یعنی آرمی کی ہے اور اپ ٹو ڈیٹ ہے۔ ہمارے کاریڈور کو وہ مانٹر کرتے رہتے ہیں، مگر ہمیں چوبیس گھنٹے کے اندر خبر ہو جاتی ہے۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ کل رات کو تمہاری روانگی ہے۔ جانے سے پہلے بہرحال ایک بار ......"

کوشش کے باوجود اسد اُس کی باتوں پہ اپنا ذہن مرکوز نہ رکھ سکا۔ کچی سبز سیاہی کی شکستہ متوازی لکیریں لمبی ہوتی ہوئی دُور تک چلی گئیں، اور ان کے بیچ بیچ نمک کے بڑے بڑے گلابی تودے اُبھرنا شروع ہوئے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ تودے پگھلنا شروع ہو گئے، جیسے برف کے تودے ہوں۔ ایک بار اُس کے ذہن میں ایک شعلہ سا بھڑکا تھا، اسد نے یاد کیا، جس کی لَو میں ایک لمحے کے لیے ذوالفقار کا چہرہ بے راز ہو کر سامنے آ گیا تھا، پھر کھو گیا۔ یہ راز کیا ہے؟ اُس نے سوچا۔ نمک کے تودے میں ایک گہرا باریک سوراخ ہے جس میں کوئی آگ بھری ہے ......

★ ★ ★ ★ ★

"بانڑچد۔" اسد نے کشمیریوں کے انداز میں گالی دی۔ اندھیرے میں اُس کا پاؤں کنکریوں کی ڈھلان پر پھسل گیا تھا۔ بمشکل توازن قائم رکھتے ہوئے وہ دو گز نیچے جا کر پاؤں کے بل بیٹھ گیا۔ چند نوک دار کنکریاں اُس کے

چوتڑوں میں گھس گئی تھیں۔ اس نے احتیاط سے ہاتھ لگا کر دیکھا۔ شلوار کے اندر نرم چربی دار گوشت میں جہاں کنکریاں چبھی تھیں ننھے ننھے گڑھے پڑ گئے تھے، جو ہاتھ سے ملنے پر رفع ہو گئے۔ اس نے دبا دبا کر دیکھا۔ چوتڑ خشک تھے، خون نہیں نکلا تھا۔

نمک کا ڈلا اس کے کندھے سے گود میں آ گرا تھا۔ اسد نے پھر زیرِ لب گالی دی۔

"یہ بھی ایک مصیبت ہے۔" وہ نیچی آواز میں بولا۔ "اسے پھینک دو۔"

"اونہوں۔" امیر خاں نے بڑا سا سر ہلایا۔

"اب اس کی کیا ضرورت ہے؟"

"اب ہی تو ضرورت ہے۔ ابھی ہم نے کاریڈور بھی پاس نہیں کیا۔ ہر جگہ چیکنگ کا خطرہ ہے۔ اِدھر کوئی آنے والا نمک کے بغیر نہیں آتا۔ اس طرف تو یہ سونا ہے سونا۔ اسے منزل تک لے جانا ہے۔"

اسد نمک کو بازوؤں میں لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "سر پہ نہیں اٹھا سکتا؟"

"اونہوں۔" امیر خاں نے دوبارہ بڑا سا سر نفی میں ہلایا۔ "کوئی کشمیری سر پہ بوجھ نہیں اٹھاتا۔ جو سر پہ گٹھا اٹھائے دکھائی دے سمجھو جموں یا پونچھ کا ڈوگری ہے۔ یا توی کا ہے۔ اصل کشمیری پیٹھ پر بوجھ اٹھاتا ہے اور کمر کے زور پہ چڑھائی چڑھتا ہے۔"

"کیوں؟"

"کشمیریوں کا قول ہے کہ سر پہ بوجھ اٹھانا عورتوں کا کام ہے۔ مرد کا سر آزاد ہوتا ہے اور اس کے کندھوں پہ دنیا کا بوجھ ہوتا ہے۔"

"عجیب بیہودہ رواج ہے۔" اسد نے کہا۔

"ہنسی مت اڑاؤ۔ ٹھیک ہے، بڑے بڑے بختاور قسمت کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ اس وقت ہماری حالت اچھی نہیں، مگر کبھی نہ کبھی ٹھیک ہو کر رہے گی۔ عقیدے میں بڑی طاقت ہے۔ اس کے زور پہ ہم نے اپنا سر آزاد رکھا ہے۔"

اسد کو بے اختیار ہنسی آئی، مگر وہ رک گیا۔ عین وقت پہ اسے احساس ہوا کہ امیر خاں پوری سنجیدگی سے بات کر رہا ہے۔ اس نے دل میں شکر ادا کیا کہ اندھیرے میں امیر خاں نے اس کی ہنسی نہیں دیکھی۔ امیر خاں مانا ہوا سرحد پار کرانے والا تھا۔ چھ فٹ کے نقشے میں پنسل سے ایک نقطہ لگا دو، روانہ ہونے سے قبل اس نے ڈینگ ماری تھی، میں چل کر تمہیں اس نقطے پہ لے جاؤں گا۔ اسد کو اس پہ مکمل اعتماد تھا۔ آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پہ اس درے کو متبادل راستے سے

اُنھوں نے یوں عبور کیا تھا جیسے جرنیلی سڑک ہو۔ اُن کو چلتے ہوئے سات آٹھ گھنٹے ہو چلے تھے۔

"میری ہڈی ہڈی میں چبھ رہا ہے۔" اسد نے چادر کی پگڑی بنا کر سر پر جمائی اور ٹرنک کا ڈھیلا اُس پہ رکھ لیا۔ "جب کوئی آیا تو کندھے پر رکھ لوں گا۔"

"تمہارا خیال ہے نہیں بتا کر آئے گا؟" امیر خاں نے کہا۔

"تم کشمیری ہو؟"

"اصل کشمیری۔ ہم لوگ صحابیوں کی اولاد میں سے ہیں۔"

"اصل کشمیری تو براہمن ہیں۔" اسد شرارت سے بولا۔

"ہمارے ہی بھائی بند تھے۔" وہ حقارت سے بولا۔ "آریہ سماجیوں نے پکڑ کر براہمن بنا دیے۔"

"ہم درے سے تو نکل آئے ہوں گے؟"

"ہاں۔" امیر خاں نے کہا۔

"دم لینے کے لیے ٹھہر نہیں سکتے؟"

"اونہوں۔ اب تو اصل مائنوں کے علاقے میں داخل ہوئے ہیں۔"

"میرا خیال تھا ہم مائنوں کے علاقے سے بچ کر چل رہے ہیں۔"

"ہاں آں!" امیر خاں نے طنز بھری آواز نکالی۔ "بچ کر چلنا تھا تو گھر میں بیٹھے رہتے، باہر نکلنے کی کیا ضرورت تھی۔ اب اللہ مالک ہے۔ میرے پیچھے پیچھے چلتے آؤ۔"

راستے کے کنارے پر ایک بار پھر اسد کا پاؤں پھسلتے پھسلتے بچا۔ جب سے وہ چلے تھے وہ دو مرتبہ بُری طرح پھسل چکا تھا۔ تاریکی کی وجہ سے وہ گہرائی کو بخوبی دیکھ نہ سکتا تھا، مگر اُسے علم تھا کہ وہ کئی سو فٹ گہری کھائی کے کنارے پہ جا کر رُکا ہے۔ اب وہ جس علاقے میں جا رہے تھے وہاں دو طرفہ پہاڑ، جو رات بھر مہیب ہاتھیوں کی مانند جھومتے رہے تھے، کھُلنے شروع ہو گئے تھے۔ دُور ہٹتے ہٹتے وہ مدھم سی سیاہ دیواروں کی شکل اختیار کر گئے اور آسمان کو کاٹتی ہوئی اُن کی چوٹیوں کی تند لکیر تاریکی میں تحلیل ہونے لگی تھی۔ اب اس جگہ کھُلے آسمان کے ستاروں کی لَو تھی اور زمین کی ایک شکل اُبھر رہی تھی۔ مگر ابھی تک وہ دونوں آدمی پہاڑ کے پیٹ پر کاٹے ہوئے ہموار رستے کی بجائے اس کے پہلو میں، چٹانوں کے آگے اور پیچھے، بھیڑوں بکریوں اور چرواہوں کی بنائی ہوئی تنگ، بے نشان پگڈنڈیوں پہ سفر کر رہے تھے۔ پچھلے ایک گھنٹے سے وہ مسلسل اُترائی میں چلے جا رہے تھے۔

"اب ہم اُوپر نہیں جا سکتے؟" اسد نے راستے کی طرف اشارہ کرکے پوچھا۔

" اونہوں ۔ وہ چیڑ کا چانٹھ دیکھ رہے ہو؟" امیر خاں نے سرگوشی میں جواب دیا، " وہاں سے وہاں تک ۔ پیچھے وہاں اُوپر تک —— ایک برگیڈ فوج پڑی ہے اس میں ۔"

اسد کا بدن لمحے بھر میں جم گیا۔ خطرے کو اس قدر قریب پاکر اُس کی چال میں خود بخود ایک واضح تبدیلی آگئی۔ اُس نے نمک کا ڈھیلا سر سے اُتار کر کندھے پر رکھ لیا اور پیر جما جما کر، ہلکے پھلکے، بے آواز انداز میں قدم رکھنے لگا۔ خطرے کا یہ احساس نیا تھا۔ اس سے وہ پہلی بار آشنا سا ہوا تھا۔ پولیس کی سپردگی میں، حوالات کے اندر جس خطرے سے اُس کا سامنا ہوا تھا اُس خطرے میں دہشت تھی، اور گلا گھونٹنے والی کثافت کا احساس تھا۔ اِن خطرے میں دہشت نہ تھی، یہ خطرہ اصل اور سنگین تھا، اس میں جرم کا قبول تھا اور سرکشی تھی اور کوئی ہیر پھیر نہ تھا، جان داؤ پر تھی۔

" تھک گئے ہو؟" امیر خاں نے سرگوشی کی۔

اسد جواب دیے بغیر تیز تیز اُس کے پیچھے چلتا رہا۔

" اُترائی مشکل ہوتی ہے۔" امیر خاں نے کہا، " چڑھائی میں پٹھے کام کرتے ہیں۔ دم لے لو تو سہل جاتے ہیں۔ اُترائی میں رگوں پر زور پڑتا ہے، اکڑ جاتی ہیں۔ اُترائی مُرکری ہڈیوں کا کام ہے، زور نہیں کھاتیں۔ حکیم سے تم نے کچھ حکمت سیکھی ہے؟"

" نہیں۔ تم حکیم کو جانتے ہو؟"

" واہ۔ اِس علاقے میں کون حکیم کو نہیں جانتا۔ اُس کے لوگوں پر بڑے احسان ہیں۔ یہ علاقہ ہی احسان فراموش ہے۔ ورنہ یہ لوگ اُس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے؟"

دفعتاً اسد لرز کر اپنے پیروں پر رُک گیا۔ امیر خاں نے اُسے رُکتے ہوئے محسوس کرکے پیچھے دیکھا۔

" کیا ہے؟"

" وہ دیکھو۔" اسد نے سرگوشی کی، " وہ!"

" کہاں؟"

" وہ سامنے۔ درختوں میں۔"

امیر خاں نے ایک نظر اُدھر ڈالی اور چپکے سے ہنسا: " آنکھیں ہیں۔"

" آنکھیں؟"

"جانور کی۔"

"کس کی؟ شیر کی؟" اسد نے بے سوچے سمجھے پوچھا۔

"گیدڑ ہوگا۔ شیر اِدھر کہاں۔ اُدھر ہماری طرف ایک بھولا ہوا آگیا ہے۔ کوئی باگھ ہے۔ کبھی نہ کبھی مارا جائے گا۔ یہ علاقہ شیروں کا نہیں۔ چلو۔"

اسد کے دل میں خوف کا اندھیرا گہرا ہو گیا۔ اُس نے نمک کا ڈھیلا پھر اُٹھا کر سر پر رکھا اور کچی کچی ٹانگوں سے امیر خاں کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

"تمہاری قسمت اچھی ہے۔ اِس کاریڈور کے اندر سے یہ چھوٹا رستہ جاتا ہے۔ پچھلے مہینے جس طرف سے جانا پڑتا تھا اُدھر پیر رکھنے کو جگہ نہیں ملتی تھی۔ اب باوردی سرنگیں بھی بدل گئی ہیں۔ پہلے کیل والی ہوتی تھیں، پاؤں گھسیٹ کر چلنے سے بچ جاتے تھے۔ اب نئی آگئی ہیں، پتّوں اور ڈھیلوں کی شکل والی۔ پتا بھی نہیں چلتا۔"

"چپ رہو۔" اسد نے کہا۔ "کوئی سن لے گا۔" خدا کے لیے چپ رہو، اُس نے دل میں کہا۔

"میری آواز؟ میری آواز ایک فٹ سے آگے نہیں جاتی۔ مجھے بولنے کا تجربہ ہے۔ تم نہ بولو۔ تمہاری آواز دُور جاتی ہے۔ میری فکر نہ کرو۔ میں باتیں نہ کروں تو میرا سفر نہیں کٹتا ——"

میری ٹانگیں کانپ رہی ہیں، اسد نے سوچا۔ اِس نے بولنا بند نہ کیا تو میں نمک کا ڈھیلا اِس کے سر پہ دے ماروں گا۔ آزاد سر کا بچہ۔ پوری رات نکل گئی ہے، بک بک بک بک۔ تھوڑی دیر اور چلتے رہے تو میری ٹانگیں جواب دے جائیں گی۔ یہ رات کب ختم ہوگی؟

"...... آج تک اللہ کے فضل سے میرے راستے میں کوئی ایکسیڈنٹ نہیں ہوا۔ سب دوسروں کے ہوئے ہیں، کسی کا ایک، کسی کے دو، نِکلتے اُڑ جاتے ہیں، یا پکڑے جاتے ہیں۔ میرا ریکارڈ ہے۔ مکھن میں سے بال کی طرح نکل جاتا ہوں۔ تم تھک گئے ہو؟ میں سمجھتا ہوں تمہارا قصور نہیں۔ تمہارا سانس بھی خراب ہے۔ کوئی بات نہیں، رات رات کا سفر بس آج کا ہے، آگے کھلا علاقہ آجائے گا، خطرہ بھی کم ہوجائے گا۔ کل دِن دِن میں چلیں گے۔ کل دوپہر کو نکل پڑے تو شام تک پہنچ جائیں گے۔ تم نے اپنی بُوٹی بھی تلاش کرنی ہے؟ تمہیں کچھ خبر ہے کہاں ملتی ہے؟ خیر یہ تمہاری اپنی مصیبت ہے، مجھے کوئی مطلب نہیں۔ تمہیں کافی وقت مل جائے گا۔ مخبری میں ہو؟ مخبری میں وقت ہی وقت ہوتا ہے، خطرہ بھی کوئی نہیں۔ حکیم سے میں نے ایک بار دوا لی تھی، میری ایڑیوں میں درد اُٹھتا تھا۔ مجھے تو افاقہ ہوگیا تھا۔ خیر ......"

اُس کی مدھم، (مختصر قطر والی!) باتونی آواز اسد کے کانوں میں آتی رہی حتیٰ کہ اُس نے سُننا چھوڑ دیا اور

شدید تھکان کے باعث خطرے میں گھرے ہونے کا اندیشہ اس کے دل سے اُتر گیا۔ مگر جب صبح کاذب کی لَو لگی اور امیر خاں بات کرتے کرتے مُڑا تو اسد یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ اُس کی آنکھوں میں وحشت کا خلاء تھا اور طویل خوف کے مارے اُس کا چہرہ نچڑ چکا تھا۔

کھُلے علاقے میں داخل ہوتے ہی امیر خاں چُپ ہو گیا اور اُس کے چہرے پہ خون کی رمق ظاہر ہوئی۔ اُجالا ہوتے ہوتے وہ اپنے پہلے پڑاؤ پہ جا پہنچے۔ یہ ایک جنگل سے پھیلے ہوئے ٹیلے کی ڈھلانوں پر بنا ہوا پچاس ساٹھ گھروں کا گاؤں تھا۔ صبح سویرے انہوں نے ایک دروازے پہ جا کر دستک دی۔ بڑی بڑی ڈھلکی ہوئی مونچھوں اور مُنڈے ہوئے سر والے ایک شخص نے دروازہ کھولا۔ امیر خاں کو پہچان کر اُس نے خاموشی سے سر ہلایا اور راستہ چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ جب وہ دونوں اندر داخل ہو گئے تو اُس آدمی نے ایک لمحے کو سر باہر نکال کر دائیں اور بائیں نظر ڈالی اور دروازہ بھیڑ دیا۔

ان دونوں مسافروں کا کام یہاں صرف سستانے اور کچھ کھانے پینے کا سامان کرنے کا تھا۔ اسد کو معلوم ہوا کہ جیسے گھر کے مالک کو اُن کی آمد کے مقصد کی عین نوعیت کا علم تھا اور وہ اسے وہیں تک محدود رکھنا چاہتا تھا۔ (بعد میں اُسے پتا چلا کہ اِس کام میں ہر شخص کو دوسروں کے کام کے علاوہ خود اپنے کام کی نوعیت کا بھی علم ہوتا ہے اور ہر کوئی، کہ ضرورتاً اس میں ملوث ہوتا ہے نہ کہ شوقیہ، اُسے وہیں تک محدود رکھنا چاہتا ہے۔) کمرے میں داخل ہو کر فرش پہ بیٹھتے ہی اسد نے پہلی مرتبہ بدن کو ڈھیلا چھوڑا، اور گویا پہلی ہی بار پیچھے مُڑ مُڑ کر دیکھنا ترک کیا۔ بیٹھنے سے پہلے امیر خاں نے ہاتھ سے اسد کی جانب اشارہ کر کے مونچھوں والے سے کہا: "علی۔" مونچھوں والے نے اسد کی طرف دیکھے بغیر رضامندی سے سر ہلا دیا۔

گھر صرف ایک کمرے پر مشتمل تھا۔ ایک دیوار میں مٹی کا راکھ بھرا چولہا سرد پڑا تھا۔ چولہے کے آگے نصف دائرے میں زمین پر تین بچے پڑے تھے۔ دو چھوٹے بچے ابھی محوِ خواب تھے جب کہ نو دس سال کی ایک بچی آنکھیں کھولے چت لیٹی تھی۔ ایک طرف ادھیڑ عمر کی ایک عورت بیٹھی بھاری ڈنڈے کے ساتھ پتھر کی دوری میں آہستہ آہستہ کچھ کوٹ رہی تھی۔ دیوار کے ساتھ ایک کھاٹ پڑی تھی جس کی ادوائن ٹوٹ کر نیچے لٹک رہی تھی۔ کھاٹ پر میلے میلے پھٹے ہوئے لحاف اور کئی دوسرے کپڑے ڈھیر کی شکل میں پڑے تھے۔ نو دس سال کی بچی اُٹھ کر بیٹھ گئی اور ٹکٹکی لگا کر اسد کو دیکھنے لگی۔ بچے کی طرح عورت بھی ٹکٹکی باندھے نمک کے ڈھیلوں کو تکتے ہوئے ہاتھ سے دوری میں ڈنڈا چلائے جا رہی تھی۔

"دوائی سے تمہیں آرام آ گیا تھا؟" اسد نے گفتگو کرنے کی سعی کی۔ بدن ڈھیلا چھوڑ کر اسے آرام محسوس ہو

رہا تھا ۔

"بہت افاقہ ہوا تھا ۔ کئی مہینوں کے بعد ایک ایڑی میں دوبارہ درد اُٹھ کھڑا ہوا تھا ۔ مگر دُوسری میں اُس کے بعد نہیں ہوا ، بالکل جاتا رہا ۔ حکیم کی دوا کارآمد ہوتی تھی ۔ یہ پرانی ہوئی بات ہے ۔"

"اب بھی ہوتا ہے ؟"

"ہُنہہ ؟"

"دُوسری ایڑی میں ؟"

"ہاں ۔"

"ہر وقت ؟"

"نہیں ۔ ہر وقت تو پہلے بھی نہیں ہوتا تھا ۔ سردی کے دِنوں میں ہوتا ہے ۔"

"دوبارہ درد اُٹھا تو تم نے دوا لی تھی ؟"

"اونہوں ۔ فرصت ہی نہیں ملی ۔ کچھ سُستی بھی کر گیا ۔" امیر خاں ہنسا ۔ "اصل میں جب درد بالکل جاتا رہا تو مجھے کچھ عجیب سا معلوم ہونے لگا ۔"

"کیسے ؟"

"چلنے میں تکلیف ہونے لگی ۔ اتنی دیر سے میری ایڑیوں میں درد تھا کہ مَیں ایڑیاں اُٹھا کر چلنے کا عادی ہو گیا تھا ۔ جب درد جاتا رہا تو مَیں پُورا پاؤں دبا کر چلنے لگا ۔ اس سے پاؤں اُلٹا پڑنے لگا ۔ میرے ٹخنے بھی درد کرنے لگے ۔ جب ایک ایڑی میں درد اُٹھا تو مَیں نے شکر کیا ۔ یہ جب درد کا اور میرا ساتھ ہی ہوا تو کیا فرق پڑتا ہے ۔ میری قسمت ہی ایسی ہے ۔" وہ پھر خشک سی ہنسی ہنسا ۔

گھر کے مالک نے لمبی سی قمیض کے اُوپر رُوئی بھری ہُوئی بغیر بٹن کی واسکٹ پہن لی تھی ۔ اُس نے دونوں مہمانوں کے آگے مکّی کی روٹی ، میوے والا گڑ اور تھوڑا سا ترش دہی لا کر رکھا اور خود جا کر اپنی بیوی کے پاس بیٹھ گیا ۔ سب سے چھوٹا بچہ جاگ کر رونے لگا تھا ۔ اسد اور امیر خاں نے خاموشی سے کھانا ختم کیا ۔ کھانے کے بعد دونوں نے اپنے اپنے نمک کے ڈھیلوں پر چادروں کی پگڑیاں بنا کر رکھیں اور سونے کے لیے زمین پر لیٹ گئے ۔

اسد کے دل میں کُھد بُد لگی تھی ۔ یہ شخص میرے بارے میں کیا کچھ جانتا ہے ؟ اِس علاقے کا ہے ۔ انٹیلی جنس کا آدمی ہے ۔ سب کچھ جانتا ہوگا ۔ پھر یہ مجھ سے بات کیوں نہیں کرتا ؟ اِدھر اُدھر کی مارتا ہے ۔ حکیم کی طرف داری کیوں کر رہا ہے ؟

"تم خوشی محمد کو جانتے ہو؟" اسد نے پوچھا۔

"ہاں۔ ہمارے ساتھ رہا ہے۔"

"کہاں؟"

"یہیں۔ اِدھر کام کرتا تھا۔ پہلے پہل بہت اچھا رہا۔ پھر دغا دے گیا۔ بدبخت۔"

"کیسے؟"

"ڈبل ہو گیا۔"

اسد کی آنکھیں بند ہوتے ہوتے کھل گئیں۔

"اس بات کا پتا کب چلا تھا؟"

"کس بات کا؟"

"کہ ڈبل ہو گیا ہے۔"

"پچھلے دنوں۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟"

"ہُنہہ؟"

"اُس نے حکیم کو قتل کیا ہے؟"

امیر خاں کی آنکھیں اب بند ہو چکی تھیں۔ "سچ پوچھتے ہو تو قتل وتل کرنے کی اُس کی جان نہیں تھی۔ چڑی کی پھڑک سے کانپ جاتا تھا۔ جنگل مزدور تھا، مَیں اُسے اچھی طرح سے جانتا ہُوں۔ علاقے کا واقف تھا، روٹی کمانے کی خاطر اس کام میں آ گیا۔ مگر بدبخت تھا۔ زیادہ لالچ میں پڑ گیا۔"

"تمہارا کیا خیال ہے؟" اسد نے اِصرار کیا۔

"خیال کیا ہو گا۔ تمہارے اُوپر بھی تنگ کیا گیا تھا، مجھے علم ہے۔ مگر سچ پوچھو تو ایک آدمی کی جان لینا نمہارے بھی بس کی بات نہیں۔ مجھے آدمیوں کا تجربہ ہے۔ مَیں دیکھ کر آدمی کی خصلت بتا دیتا ہوں۔"

"پھر خوشی محمد پکڑا کیوں گیا ہے؟"

"واللہ اعلم۔ کوئی نہ کوئی ثبوت ہو گا پولیس کے پاس۔"

"ثبوت کا کیا ہے۔" اسد نے کہا، "مہیا کیا جا سکتا ہے۔"

"بس۔ اور کیا چاہیے؟"

"کیوں۔ اور کچھ نہیں چاہیے ؟"

"بھائی ۔" امیر خاں نے آنکھیں کھول کر صبر سے کہا، "اس طرح بحث کرنے لگے تو کہو گے کہ جُرم بھی مہیا کیا جا سکتا ہے۔ ٹھیک ہے، اِس دُنیا میں کیا کچھ نہیں مہیا کیا جا سکتا۔ حقیقت کا علم صرف خدا کی ذات کو ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں پھر بھی خوشی اچھا رہا ہے، قید میں جاکر محفوظ ہو گیا ہے۔ ورنہ دِل کو ٹھکانے لگانا کوئی مشکل بات نہیں۔ اب آرام کرو۔ زیادہ سوچ والی باتیں کرو گے تو نیند اُڑ جائے گی۔ میری نیند بھی خراب کرو گے۔ دو چار گھنٹے آرام کر لو۔ جتنی دیر سے چلے اُتنی دیر میں پہنچیں گے۔ رات ہو جائے گی۔"

اسد چت لیٹا آنکھیں کھولے چھت کو تکتا رہا۔ ایک ہی منٹ کے اندر امیر خاں کا مُنہ کُھل گیا اور اس کا اَدھ گنجا سر نیند میں نمک کے ڈھیلے سے آہستہ آہستہ لڑھکنا شروع ہوا۔ اُس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں، سر کو ہوا میں اُٹھائے خالی خالی نظروں سے اسد کو دیکھا، جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہا ہو، پھر کروٹ لے کر، سر کو اچھی طرح سے چادر کی پگڑی پر جما کر سو گیا۔

اسد نے بھی کروٹ لی اور بازو کو سر اور چادر کے تکیے کے درمیان رکھ کر آنکھیں بند کر لیں۔ حرامزادے، اُس نے دِل میں کہا۔

شام تک وہ پہنچ جائیں گے، اسد نے سوچا۔ پھر شلوار اُتروا کر اُس کی شناخت کی جائے گی۔ اِس بارے میں ذوالفقار اُسے پہلے ہی بتا چکا تھا۔ جو چند باتیں اسد کو مستقل پریشان کیے ہوئے تھیں اُن میں ایک یہ بات بھی تھی۔ جب سے ذوالفقار نے اس کا ذکر کیا تھا، بار بار اسد کو اس کا خیال آتا رہا تھا۔ اکثر اس کو رات کے وقت اندھیرے میں یہ خیال آیا کرتا تھا، اور متعدد بار اُس نے اپنے ذہن کی آنکھ میں اسے ہوتے ہوئے دیکھنے کی کوشش بھی کی تھی، مگر بے سُود۔ زیادہ سے زیادہ اُسے حوالات میں اپنے ننگے بدن کی یاد آجاتی۔ مگر اُس میں وہ بات نہ تھی۔ حوالات والی شکل میں سارے بدن کا وجود اور اُس بدن کی وحشت شامل تھی۔ مگر اِس بات میں کوئی وحشت نہ تھی۔ اِس میں بدن محفوظ تھا، صرف بدن کی دریافت کا ایک نہایت سنجیدہ اور کسی قدر مضحکہ خیز کھیل تھا جو اسد میں جھجک پیدا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ جھجک بڑھ کر اُس کے ذہن میں ایک تردد کی شکل اختیار کر گئی۔ ایک بار ہمت کر کے اُس نے ذوالفقار سے اِس کا ذکر بھی کیا:

"اور تو سب ٹھیک ہے۔" اُس نے کوشش کر کے عام سے لہجے میں بات شروع کی، "صرف یہ شناخت ...."

"شناخت کیا ؟"

"اسے کسی طریقے سے ٹالا نہیں جا سکتا ؟"

ذوالفقار نے اپنے ہونٹ ذرا سے سکیڑے ، جیسے ایک عجیب سی مسکراہٹ کو ختم کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ "نہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا ، "یہ بات تمہیں غیر معمولی سی معلوم ہوگی۔ مگر آج کل کون سی بات غیر معمولی نہیں۔ ان مخصوص حالات میں ہمارے پاس یہی ایک طریقہ اپنی آئیڈنٹٹی ثابت کرنے کا رہ گیا ہے۔ حالانکہ یہ کوئی فول پروف طریقہ نہیں ، مگر آئیڈنٹٹی ثابت کرنے کا آج تک کوئی فول پروف طریقہ ایجاد نہیں ہوا۔ عام حالات میں گواہیوں سے کام چل جاتا ہے۔ مگر آج کل گواہوں کا کیا اعتبار ؟ ان حالات میں اپنے آپ کو ننگا کرنے سے کم کام نہیں چلتا۔" وہ اچانک نیم شرارت سے اسد کو دیکھ کر مسکرایا ، "شرم کی کیا بات ہے۔ جوان آدمی ہو۔ مردوں کے سب کھیل ننگے بدن ہی ہوا کرتے ہیں۔"

اس کے بعد اسد نے اِسے ذہنی طور پر قبول کرنے کی کوشش کی ، مگر اس کے تردد کا بوجھ اُس کے دِل سے نہ گیا۔ آخر یہ بوجھ اتنا بڑھا کہ اُس نے سوتے میں اس کی شکلیں دیکھنا شروع کر دیں۔ پچھلے چند روز میں وہ دو تین بار خواب دیکھ چکا تھا۔ کبھی وہ سرحد کے اُوپر کھڑا ہوتا (سرحد ، زمین پر ایک سیدھی لکیر کی شکل میں کھنچی ہوتی ، اور وہ ایک پاؤں لکیر کے اِدھر اور دُوسرا اُدھر رکھے کھڑا ہوتا) اور اُس کی ٹانگیں اور پیر ننگے ہوتے ، شلوار کہیں غائب ہوتی ، اور متعدد مسلح سپاہی اُس کا کُرتہ اٹھا کر جھانک رہے ہوتے۔ ایک بار اُس نے دیکھا کہ وہ اسی طرح ٹانگیں چوڑی کیے سرحد کی لکیر کے آر پار کھڑا ہے اور ایک مونچھوں والا سپاہی جُھک کر بغور اُس کے آلۂ تناسل کا ملاحظہ کر رہا ہے۔ سپاہی کی مونچھیں اچانک لمبی ہونی شروع ہو جاتی ہیں حتیٰ کہ آ کر اُس کی رانوں سے ٹکرانے لگتی ہیں جس سے اُسے جلد پر کھجلی محسوس ہونے لگتی ہے۔ سپاہی ہاتھ بڑھا کر اُس سرد گوشت کے لوتھڑے کو اپنی موٹی موٹی انگلیوں میں پکڑ لیتا ہے اور دبا دبا کر دیکھتا ہے ، پھر چھوڑ دیتا ہے اور کھڑے ہو کر اطمینان سے سر ہلاتا ہے۔ پھر یکایک آلۂ تناسل بدن سے جُدا ہو کر زمین پر گر پڑتا ہے ، جسے سپاہی اپنی بنیٹ میں پرو کر اُوپر اُٹھا لیتا ہے۔ اُن کے گرد چند لوگوں کا مجمع ہو گیا ہے اور سپاہی باری باری ملاحظے کے لیے ہر ایک کے آگے بنیٹ لگی رائفل گُھما رہا ہے۔ مجمعے میں چند مانوس چہرے ہیں۔ اُس کے باپ کا چہرہ ہے ، یاسمین کا چہرہ ہے ، اُس کے چچا کا اور حکیم کا چہرہ ہے پھر عینکوں والے خاکسار کا چہرہ ہے جو بنیٹ پر لٹکتے ہُوئے گوشت کے ٹکڑے کو دیکھتے ہی اُونچی آواز میں نعرہ لگاتا ہے :

"چور اُچکے چودھری تے لُنڈی رن پردھان۔" مجمعے میں سب لوگ اپنے غمناک چہرے سنجیدگی سے ہلا ہلا کر اطمینان کا اظہار کرتے ہیں . . . . وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ وہ بازو پر سر رکھے رکھے سو گیا۔

جب اسد نے آنکھیں کھولیں تو امیر خاں اُس کے اُوپر جُھکا اُسے جگا رہا تھا: "دوپہر ہو گئی ہے۔ چلو، کمرے

کا نقشہ ہو بہو وہی تھا، صرف تینوں بچے اُٹھ کر اپنی ماں کے گرد زمین پر پاؤں کے بل بیٹھے تھے۔ کپڑے چیتھڑوں کی شکل میں اُن کے مَیل سے اَٹے ہوئے جسموں پر لٹک رہے تھے اور وہ ہاتھوں میں مکئی کی روٹی کے ٹکڑے تھامے انہیں بے خیال کے انداز میں چبا رہے تھے اور دونوں اجنبیوں کو دیکھے جا رہے تھے۔ دروازہ اسی طرح اندر سے بند تھا۔ کمرے میں روشنی ایک کھڑکی کے راستے داخل ہو رہی تھی جس کا صرف ایک پٹ کھلا تھا۔ چھوٹے بچے کے ہاتھ سے روٹی کا ٹکڑا چھوٹ کر زمین پر آ رہا، جسے اس کی ماں نے اٹھا کر سختی سے دوبارہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

”خیال سے کھا۔“ وہ پہلے مہمانوں پر، پھر اپنے خاوند پر اُچٹتی ہوئی نظر ڈال کر بچے کے سر کے اُوپر خلا میں دیکھتی ہوئی بولی، ”جب سے ہوا ہے ایک دن اس نے خیال سے روٹی نہیں کھائی۔“

بچہ روٹی کا ٹکڑا پکڑ کر پھر بے خیالی سے اُس کا کنارا چبانے لگا۔ اسد نے کمرے کے کونے میں جا کر تھوکا جہاں فرش میں پانی کے انخلا کے لیے موری نکلی تھی۔ اُن کے میزبان نے مکئی کی ایک ایک روٹی اور گڑ کا ڈھیلا اُن کے حوالے کیا جو انہوں نے آدھا آدھا کھایا، باقی اپنی اپنی چادروں کے کونوں میں باندھ لیا۔ پھر عورت نے کیتلی میں سے گرم چائے کا ایک ایک پیالہ بھر کر انہیں دیا۔ جب وہ جانے کے لیے تیار ہوئے تو اُس وقت مونچھوں والے آدمی نے پہلی، اور آخری بار (غالباً اپنی بیوی کے اُکسانے پر) بات کی۔ یہ بات اُس نے چند الفاظ اور ہاتھ کے مختصر اشاروں کی مدد سے ادا کی اور اس کا مدعا نمک کا ایک ٹکڑا حاصل کرنے کی درخواست تھی۔

امیر خاں نے چند لمحے تک سوچ کی نظروں سے اُس کی طرف دیکھنے کے بعد اپنا نمک کا ڈھیلا کندھے سے اُتارا، اُسے کونے میں پڑی دَوری کے کنارے پر رکھا، اور ڈنڈا اُٹھا کر احتیاط سے اُس کے ایک کونے پر مارا۔ صاف گلابی نمک پر جہاں ڈنڈے کی چوٹ پڑی وہاں سے دب کر سفید ہو گیا اور اُس نشان میں سے چھوٹی بڑی سفید دھاریاں نکل کر نمک کی سطح پر پھیل گئیں۔ امیر خاں نے ہاتھ روک کر سفید پسی ہوئی سطح کا معائنہ کیا، جیسے اُس داغ کا افسوس کر رہا ہو۔ پھر اس نے ڈنڈا اُٹھا کر ذرا زور سے ڈھیلے پہ مارا تو نمک کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ٹوٹ کر دَوری میں جا گرا۔ امیر خاں نے کُرتے کے دامن سے اپنے ڈھیلے کو اچھی طرح سے صاف کیا اور اُٹھا کر کندھے پر رکھ لیا۔ وہ دونوں خاموشی سے باہر نکل آئے۔ گھر کے مالک نے دروازے سے سر نکال کر دائیں اور بائیں نظر ڈالی، پھر دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ سورج سر پر تھا اور میلے میلے بچے، عورتیں اور مرد اپنے راستوں پر آ جا رہے تھے۔

اندر اندھیرا ہو گیا ہو گا، اسد نے خیال کیا۔ اندھیرے کمرے کے اندر بے خیالی میں روٹی کے

کنارے چباتے ہوئے بچوں کا منظر اسد کی نظروں کے سامنے بڑی دیر تک پھرتا رہا۔

پہاڑوں کی اُونچی اُونچی دو طرفہ دیواریں اب پیچھے رہ گئی تھیں۔ یہ علاقہ اب کم و بیش ہموار زمین اور چھوٹی بڑی پہاڑیوں کا تھا جن کے بیچ ایک تنگ سا دریا بہتا تھا۔ اب وُہ دونوں باقاعدہ بنے ہُوئے رستے پر سفر کر رہے تھے۔ امیر خاں کو آگے چلنے کی ضرورت بھی نہ رہی تھی۔ کبھی وہ اور کبھی اسد چلتا چلتا آگے نکل جاتا۔ یہاں زمین زرخیز تھی۔ چھوٹی بڑی چٹانوں کے عقب میں مٹی کے ذخیروں پر اُگے ہُوئے خودرو پھُولوں کے جھُنڈ چھلاووں کی طرح مُنہ نکال کر ہنستے ہُوئے نمودار ہوتے اور دو قدم چلنے پر غائب ہو جاتے۔ دُھوپ میں چلنے سے اسد کو پسینہ آنے لگا تھا۔

"یہ علی کون تھا؟" اسد نے پُوچھا۔

"ہمارا آدمی تھا۔ مر گیا ہے۔"

"ڈبل تو نہیں تھا؟"

"نہیں۔ بڑا سچا آدمی تھا۔ کیوں؟"

"ایسے ہی پُوچھا ہے۔ مَیں کسی ایسے چکر میں نہیں پھنسنا چاہتا کہ نہ اِدھر کا رہوں نہ اُدھر کا، دونوں طرف کے آدمی میرے پیچھے لگے ہوں۔"

امیر خاں اپنی خشک ہنسی ہنسا۔ "اِدھر کا تھا۔ بڑا سچا اور دلیر آدمی تھا۔ قضا آگئی، مر گیا۔"

دھُوپ ڈھلی تو ہوا میں خنکی لَوٹ آئی۔ ایک لمبی پہاڑی کے سایے میں چلتے چلتے اسد نے چادر کا ایک پلو نکال کر کندھوں کے گرد لپیٹ لیا۔

★ ★ ★ ★ ★

سُلطان شاہ کا کدو کی شکل کا اُسترے سے مُنڈا ہوا سر تھا جو نیل سے چمک رہا تھا۔ وہ درمیانے قد اور گٹھے ہُوئے بدن والا آدمی تھا جس کی سب سے نمایاں شے اُس کی گردن تھی۔ پلے ہُوئے بیل کی سی چوڑی

اور اُبھری ہوئی گردن کو دیکھ کر احساس ہوتا تھا کہ اگر یہ شخص (مینڈھے کی طرح) اپنا نوک دار سر سیدھا کر کے دوڑتا ہوا آئے تو دیوار پھاڑ کر نکل جائے گا۔

غروبِ آفتاب سے کوئی دو گھنٹے بعد امیر خاں اور اسد اس قصبے میں داخل ہوئے تھے۔ قصبہ چھوٹے موٹے شہر کے سائز کا تھا اور سلطان شاہ کا مکان قصبے کے سب سے گنجان آباد علاقے میں واقع تھا۔ سلطان شاہ نے دروازہ کھول کر خاموشی سے امیر خاں کے ساتھ معانقہ کیا اور اسد کے ساتھ ہاتھ ملایا۔ کمرے کے درمیان کچے فرش میں ایک چھوٹا سا گڑھا کھدا تھا جس میں چند لکڑیاں پڑی دہک رہی تھیں۔ گڑھے کے گرد زمین پر دو دریاں بچھی تھیں۔

مکان تک آنے کے لیے طویل پتھریلی گلی کی چڑھائی چڑھتے چڑھتے اسد کی سانس پھول گئی تھی۔ اُس نے سلطان شاہ سے ہاتھ ملانے کے بعد اپنا نمک کا ڈھیلا ایک دری پر رکھا اور اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ دہکتی ہوئی لکڑیوں کی حرارت اُس کے تکان سے اکڑے ہوئے جسم کو بھلی معلوم ہوئی۔ دروازے کے پاس امیر خاں اپنے میزبان کے پاس کھڑا نیچی آواز میں بات کر رہا تھا۔ چند سیکنڈ کے بعد دونوں نے اسد کی جانب نگاہ پھینکی، پھر بات ختم کر کے سلطان شاہ نے اندر سے دروازے کی کنڈی چڑھائی اور دونوں آکر دری پر بیٹھ گئے۔ امیر خاں نے نمک کے ڈھیلے پر سر رکھا اور آگ کے پاس لیٹ گیا۔ سلطان شاہ پر ارتھنا کرتے ہوئے سادھوؤں کی مانند ٹانگیں سمیٹے، گھٹنے دائیں بائیں پھیلائے بیٹھا تھا۔ اس بھاری، ساکت انداز میں بیٹھا وہ پہلے سے بھی زیادہ طاقتور دکھائی دے رہا تھا۔ اُس کا چہرہ لمبا اور نقش تیکھے تھے۔ اُس کے مُنہ پر کوئی بال نہ تھا۔ یُوں لگتا تھا کہ اُس کا سر، مونچھیں اور داڑھی ایک ہی اُسترے سے ایک ہی وقت بلکہ ایک ہی وار میں صفاچٹ کر دیے گئے تھے۔ وہ امیر خاں سے آہستہ آہستہ کشمیری میں باتیں کر رہا تھا۔ باتیں زیادہ تر سرحد پار کی اور غیر اہم تھیں جن سے اسد کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔

دو دو چار چار منٹ کے وقفے پر زیادہ افراد دروازہ کھٹکھٹا کر اندر داخل ہوئے۔ ہر بار سلطان شاہ کا مہیب جثہ سُرعت کے ساتھ اُچک کر اٹھتا، اور اِس سے پیشتر کہ پاؤں پر جم کر کھڑا ہو، دروازے تک پہنچ چکا ہوتا۔ تاہم اُس کی چال ڈھال سے کسی نامناسب عجلت کا احساس نہ ہوتا تھا۔ اُس کے اطوار میں جنگل کے آزاد جانوروں کا سا قدرتی وقار تھا۔ اُسے کمرے میں اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے اور باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر لحظہ بہ لحظہ اسد کے دل میں یہ احساس مضبوط ہوتا جا رہا تھا کہ اُس کے سفر کے دوران کہیں پر ذوالفقار کا اور امیر خاں کا علاقہ ختم ہو چکا ہے۔ اِس جنگل میں اب اِس کشمیری کا اختیار چلتا تھا۔ اسد نے وہیں بیٹھے بیٹھے

ایک ملیں سالہ عورت کو اندر داخل ہوتے اور متانت و اختصار کے ساتھ کوئی بات کر کے، دری پر بیٹھے ہوئے دو اجنبیوں کی جانب دیکھے بغیر، مکان کے پچھلے کمرے میں جاتے ہوئے، اور پھر دو تُند شکل کشمیریوں کو سلطان شاہ سے بات کرتے کرتے، ایک غیر مرئی اطاعت کے سانچے میں ڈھلتے ہوئے دیکھا۔

اُن میں سے ایک ادھیڑ عمر کا، گھنی سیاہ ڈاڑھی اور مونچھوں والا شخص تھا۔ بالوں کی بے ترتیب اگاس کے نیچے اس کے چہرے کے نقوش قریب قریب اوجھل ہو چکے تھے۔ لالٹین کی اس مدھم روشنی میں بھی، دو گز کے فاصلے سے، اسد نے دیکھا کہ اس کی ناک کے نیچے کھڑے ہوئے مونچھوں کے دو بال اس کی سانس کے ساتھ ساتھ اندر اور باہر ہل رہے تھے۔ اُلجھی ہوئی دراز بھنوؤں کے نیچے اس کی آنکھیں کرخت اور چمک دار تھیں۔ باتیں کرتے کرتے وہ بار بار اپنے ڈھیلے کُرتے کے گریبان میں ہاتھ ڈال کر پیٹ کھجا رہا تھا۔ سلطان شاہ نے اسد کی طرف اشارہ کر کے اُسے متعارف کرایا۔

ادھیڑ عمر شخص جس کا نام غلام تھا، کھُردری آواز میں بولا: "علی۔" ساتھ ہی اس نے سر کے ایک جھٹکے سے اسد کو اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ ایک ہاتھ وہ اسد کے کندھے پر رکھ کر، دوسرے ہاتھ سے پیٹ کھجاتا ہوا، اُسے دیوار کے پاس اس جگہ تک لے گیا جہاں لالٹین ٹنگی تھی۔ وہاں پر اس نے اسد کو دیوار کی طرف رُخ کر کے کھڑا کیا، اور ایک اُچٹتی ہوئی نظر پچھلے کمرے کی جانب ڈالی جہاں سے عورت کے چلنے پھرنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ پھر اس نے ایک لحظے کو سختی سے اسد کی آنکھوں میں دیکھا اور سر کے مختصر سے جھٹکے سے اس کی ٹانگوں کی جانب اشارہ کیا۔ اسد نے جلدی سے پیٹ پر سے کپڑا اُٹھا کر ٹھوڑی کے نیچے دابا اور ازار بند کھول کر شلوار نیچے ڈھلکا دی۔ غلام نے جھک کر معائنہ کیا، پھر سر ہلا کر اُسے ڈھانپنے کا اشارہ کر کے عجلت سے سیدھا ہو گیا۔ اسد نے ٹھوڑی کو ڈھیل دی تو کُرتہ نیچے گر پڑا۔ وہ دیوار کے ساتھ کھسک کر ازار بند باندھنے لگا۔ شلوار سیدھی کرنے کے بعد اسد واپس دری کے اُوپر اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔ یہ ساری کارروائی چند ساعتوں کے اندر تمام پا گئی۔

دُوسرا اندر داخل ہونے والا شخص ایک نوجوان تھا جس کے گول چہرے پر صفائی سے کتری ہوئی مونچھیں تھیں جو لبوں کے گرد ڈھلک کر ٹھوڑی تک چلی گئی تھیں۔ اس کی بڑی بڑی ملائم نظر والی آنکھیں تھیں جو اس کی تُند مونچھوں سے مطابقت نہ رکھتی تھیں۔ اس چیز نے، اور اس کے خفیف سے پھولے ہوئے نتھنوں نے اس کے چہرے کو ایک عجیب سی بے قاعدگی عطا کی تھی جو دیکھنے والے کو پہلی نظر میں اس سے کسی قدر خائف کر دیتی تھی۔ اسد کی "شناخت" کے دوران وہ نوجوان دروازے کے پاس دیوار سے ٹیک لگائے خاموش کھڑا ان دونوں کی طرف دیکھتا اور ہولے ہولے جبڑے ہلاتا رہا، جیسے کچھ چبا رہا ہو۔ کچھ دیر کے بعد وہ دیوار کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا پچھلے کمرے

ہیں چلا گیا۔

"شناخت ضروری ہے۔" سلطان شاہ نے اپنی دھیمی آواز میں اسد سے کہا، "اب تو ایسا بھی ہونے لگا ہے کہ ان کے جاسوس بُرا بھلا ماس کٹوا کر ہمارے اندر آ شامل ہوتے ہیں۔ مگر دھیان سے دیکھنے پر سُنّت کا اور جھٹکے کا فرق معلوم ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے شناخت اور بھی ضروری ہو گئی ہے۔"

اسد نے اس کی تائید میں سر ہلایا۔ چوڑی سی ننگی ٹھڈی والی عورت سپاٹ قدموں سے چلتی ہوئی پچھلے کمرے سے نمودار ہوئی۔ وہ ایک ہاتھ میں چائے دانی اور دوسرے میں مٹی کے پانچ پیالے، جو ایک دوسرے کے اندر جمے تھے، اٹھائے ہوئے تھی۔ سلطان شاہ نے پیالوں کا چھوٹا سا مینارہ عورت کے ہاتھ سے لے کر اسی طرح زمین پر کھڑا کر دیا۔ پھر اس نے ایک ایک پیالہ اٹھا کر چائے سے بھرنا شروع کر دیا۔ جب چاروں کے ہاتھوں میں بھرے ہوئے پیالے جا چکے اور دری پر رکھا ہوا پانچواں پیالہ بھی بھر گیا تو عورت خالی چائے دانی لے کر واپس پچھلے کمرے میں چلی گئی۔ چند سیکنڈ کے بعد نوجوان لڑکے نے لکڑی کا ایک گول سا برتن لا کر دری پر رکھ دیا۔ تھال کشمش، بادام، اخروٹ کی گری اور خشک خوبانیوں سے بھرا ہوا تھا۔ لڑکے نے پانچواں پیالہ اٹھایا اور دری کے کنارے پر بیٹھ کر چائے پینے لگا۔

"ریاض میرا بھتیجا ہے۔" سلطان شاہ نے مختصراً اسد سے نوجوان کا تعارف کرایا۔ ریاض اس کی طرف دیکھے بغیر چائے پیتا رہا۔ کچھ دیر کے لیے کمرے میں مکمل خاموشی ہو گئی۔ پانچ بھوکے جبڑے مضبوطی سے خشک میوے کو چبا رہے تھے۔ کھانے والوں کے چہروں پہ ایک عجیب مستی کا عالم تھا۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ زندگی کی قوت سے پُر وہ پھل اور میوے، دانتوں کے بیچ پس پس کر اور زیرِ زبان اُبل اُبل کر نکلتے ہوئے لعاب میں یک جان ہو کر حلق سے ڈھلتے اور حیاتین کی شکل میں سیدھے خون کی شریانوں میں اترتے جا رہے ہیں۔ بیچ بیچ میں امیر خاں اور غلام پیالہ منہ سے لگا کر اونچی اونچی سُرکیوں میں الائچی والی نمک دار سبز چائے پی رہے تھے۔ اسد نے اوپر تلے چھ سات خشک خوبانیاں چبا چبا کر کھائیں اور گرم مزے دار چائے کا گھونٹ بھرا۔ خوبانیوں کی ترش شیرینی نے اس کے تھکاوٹ اور اشتہا سے چور بدن میں ایک لہر دوڑا دی۔ ریاض نے دری پر پڑی ہوئی خوبانی کی چند گٹھلیوں میں سے ایک اٹھا کر اپنی داڑھوں میں رکھی اور اسے توڑ کر اس کی گری چبانے لگا۔ گٹھلی کا چھلکا اس نے ہتھیلی میں تھوک کر سلگتی ہوئی لکڑیوں پر پھینک دیا، جہاں پہ وہ کچھ دیر تک دھواں دینے کے بعد بھڑک کر جل اٹھا۔ دو تین ننھے ننھے نیلے اور سبز رنگ شعلے چند سیکنڈ تک لَو دینے کے بعد بجھ گئے۔ سلطان شاہ اور غلام نے دوبارہ دھیمے لہجے میں باتیں شروع کر دیں۔ اسد نے کچھ دیر تک کان لگا کر سننے کی کوشش کی، مگر ان کی باتیں بیشتر ذاتی

اور مقامی نوعیت کی تھیں۔ اسد کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ دری پر ٹانگیں پھیلا کر، ٹنک کے ڈھیلے پر سر رکھ کر سو جائے۔ اُس کا ذہن وقتی طور پر خالی ہو چکا تھا۔ وہاں پر بیٹھے بیٹھے، وقفے وقفے پر اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ جیسے کوئی چیز چھوٹ گئی ہے، پیچھے رہ گئی ہے۔ مگر اُسے پتا نہیں چل رہا تھا۔ لکڑیاں جل چکی تھیں اور دہکتے ہوئے کوئلے آہستہ آہستہ راکھ میں تبدیل ہونے لگے تھے۔ ریاض برابر خوبانیوں کی گٹھلیوں کو دانتوں میں توڑ توڑ کر اُن کی گریاں کھا رہا تھا۔ گٹھلیوں کے چھلکے اب وہ ہتھیلی میں جمع کرتا، پھر جھک کر بجھتی ہوئی لکڑیوں پر پھونک مار کر راکھ کی موٹی جلد اُڑاتا اور ننگے کوئلے پر آہستہ سے چھلکوں کی ڈھیری لگا دیتا، جہاں پر وہ دیر تک دھواں دیتے رہتے۔ کمرے میں اُن کا دھواں پھیلتا جا رہا تھا۔ دو ایک بار سُلطان شاہ نے باتیں کرتے کرتے ہاتھ اُٹھا کر ریاض کو ایسا کرنے سے باز رکھنے کی کوشش کی، مگر وہ اپنے چچا کی بات پر دھیان دیے بغیر اپنے شغل میں مصروف رہا۔ بادام چھوڑ کر، اسد نے بے خیالی سے سوچا، یہ خوبانی کی گریاں کیوں کھا رہا ہے؟

جب چائے کا دُوسرا پیالہ بھی ختم ہو چکا تو وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"علی،" سُلطان شاہ بولا۔ "ریاض کے ساتھ چلے جاؤ۔"

"کہاں؟"

"گھر۔"

رات آدھی گزر چکی تھی اور اُن کے پاس لالٹین تک نہ تھی۔ قصبے کی اُونچی نیچی گھُپ اندھیری گلیوں میں وہ دونوں آگے پیچھے چلے جا رہے تھے۔ اسد اگرچہ ریاض سے ایک قدم پیچھے تھا اور ریاض نے ایک مرتبہ بھی مُڑ کر نہ دیکھا تھا، مگر اسد کا یہ احساس دم بدم بڑھتا جا رہا تھا کہ نوجوان لڑکے کی آنکھیں اُس پر لگی ہیں — کہ وہ ایک لحظے کے لیے بھی اُن کے احاطے سے باہر نہیں گیا ہے۔ ملائم نظر والی اُن آنکھوں نے اندھیرے میں ایک چمک دار تندی اختیار کر لی تھی جو اُس کو چھیدے جا رہی تھی۔ یہ کون ہے؟ میرا ساتھی ہے؟ یا میرا دشمن ہے؟ مجھے کہاں لے جا رہا ہے؟ گھر؟ اُس نے ذہن پر زور دے کر اس قصبے کے نام کو یاد کرنے کی کوشش کی، مگر اُس وقت نام اُس کے ذہن میں نہ آیا، حالانکہ ذوالفقار کے کیمپ سے روانہ ہونے سے پیشتر ہی اسد کو اس اَن دیکھے قصبے کا نام معلوم ہو چکا تھا۔ اسد کی آنکھیں ایک تار اپنے تاریک رہبر کی پُشت پر لگی تھیں اور وہ ناہموار زمین پر اُلٹے سیدھے پاؤں رکھتا چلا جا رہا تھا۔ ہُو کے اِس عالم میں یکایک اُسے محسوس ہوا جیسے وہ گُم شُدہ میں چلا جا رہا ہے کہ جیسے یہ کوئی دُوسرا ملک اور دُوسرا قصبہ نہیں بلکہ گمشدہ کی گلیاں اور ڈُوبی اندھیرے خاموش مکان ہیں۔ اسد نے بے خیالی کے اس احساس کو گزرانے کی خاطر سر کو ایک بار آہستہ سے جھٹکا۔ ریاض کے سر کی پُشت پر آنکھیں لگی تھیں جو اُسے تاڑ رہی تھیں۔ اِس

کیفیت نے اُس کے اندر بے دخلی کے احساس کو تیز کر دیا، جیسے دُنیا کے واقعات اپنے محور سے ذرا سا ہٹ گئے ہیں اور چیزیں ذرا سی بے اصل ہو گئی ہیں۔ جیسے کوئی اہم شئے شاید چھوٹ گئی ہے۔

"علی۔" ریاض مُنہ موڑ کر بولا۔

اُس کی آواز پر اسد اِس طرح اُچھلا جیسے بجلی کی تار سے چھو گیا ہو۔ ایک بھونچالی لمحے میں دُنیا کھٹ سے گویا اپنے محور پر واپس آ گئی، اور باتوں کی پہچان وہاں سے نکل کر آئی......

سب سے پہلی بات یہ کہ رات بھر میں پہلی بار ریاض نے مُنہ کھولا تھا۔ اُسے اُڑتی ہُوئی سی حیرت ہُوئی کہ پہلے اُسے اِس بات کا خیال کیوں نہیں آیا۔

آواز لڑکے کی آنکھوں کی مانند ملائم اور دوستانہ تھی: "تمہارے پاس موٹی چادر ہے؟"

"نہیں۔"

"رات کو سردی ہو جاتی ہے۔"

"کوئی بات نہیں،" وہ جلدی سے بولا، "مَیں سو جاؤں گا۔" وہ لڑکھڑاتا ہُوا اگلی کا موڑ مُڑ گیا۔

دُوسری بات یہ کہ اب وُہ بلاشک علی تھا۔ ذوالفقار نے اور امیر خاں نے اور سُلطان شاہ نے مختلف اوقات میں متعدد بار اُس کو پکارا تھا، مگر ریاض کی ملائم اور سرسری آواز نے جب اُس کا نام لیا: "علی" تو وہ چونک اُٹھا۔ کیونکہ ریاض پہلا آدمی تھا جس کی نظر میں وہ، اسد کریم، اوّل و آخر علی مراد تھا۔ وہ جگہ بھی لامقام تھی۔ وہاں رات کے اندھیرے میں اُلٹے سیدھے پاؤں رکھتے ہُوئے وہ اُس آواز پر بالآخر اپنی شخصیت کی حد پار کر گیا۔ اب وہ اپنے وجُود کے اُس گمنام خطّے میں داخل ہوا تھا جو کسی کی ملکیت نہ تھا۔ ساری شام وہ ایک بے سمجھ مگر چانی و چوبند جانور کی مانند اِس آنے والے خطرے کو محسوس کر کے پھڑکتا رہا تھا جب اُس کی زمین، جس نے یہاں تک اس کا ساتھ دیا تھا، اُس کے نیچے سے سرک جائے گی اور وہ شناسائی کے دائرے سے نکل جائے گا۔ اُس کے نام کی بے دخلی مکمل ہو چکی تھی۔

تاریکی میں لاشعوری طور پر اُس کی چال بدل گئی۔ اُس کے کندھوں کا جھکاؤ، اُس کی گردن کی اُٹھان، اُس کی کمر، اُس کے بازو ہوا میں اپنی جگہ سے بے معلوم طور پر گویا بال برابر سرک گئے۔ اس نامعلوم سرزمین پر اِس نئے طور نے اُس کے دل میں اعتماد اور آزادی کا عجیب سا احساس پیدا کیا۔ اُس نے ریاض کے سر کی پُشت پہ دیکھا۔ آنکھیں وہاں تھیں، مگر اب اُن سے اُسے خوف محسوس نہ ہُوا۔ اِس عجیب و غریب خطّے پر سب نوپید اور سبھی کچھ نومعلوم تھا۔ اب وہ نئے سرے سے چوکس ہو رہا تھا......

تیسری بات یہ کہ اس قصبے کا نام بارڑہ تھا۔ اسے یاد آگیا۔ بارڑہ سے باہر نکل کر وہ کوئی پون میل تک چلتے رہے۔ اس راستے میں اُترائی کم اور چڑھائی زیادہ پڑی۔ آخر وہ ایک چھوٹی سی پہاڑی پہ اُگے ہوئے جنگل میں پہنچ گئے۔ یہاں پہ گھُپ اندھیرا تھا اور درختوں میں ہوا چل رہی تھی۔ زمین پہ اُگی ہوئی جھاڑیوں کے بیچ ایک پتلا سا رستہ جاتا تھا جس پہ ریاض آسانی سے چلا جا رہا تھا۔ اپنے اس مختصر سے سفر کے دَوران ریاض نے اُسے بتایا کہ سُلطان اُس کا چچا ہے اور خشک میوہ جات کی ایک دکان کا مالک ہے جو بارڑہ کی منڈی میں واقع ہے۔

"چچا کانفرنس کا آدمی تھا ساری عمر سے۔" اُس ملائم آواز نے بتایا "جب کانگریس کی حکومت نے کانفرنس کو دبا دیا تو چچا بد دل ہو گیا۔ تین مرتبہ چھ چھ مہینے کی جیل کاٹ چکا ہے، مگر کوئی جرم ثابت نہیں ہو سکا۔ پکا آدمی ہے۔"

درختوں کا ذخیرہ پتلا ہوتے ہی اندھیرے میں سے ایک لمبی سی، ٹوٹی پھوٹی شکل کی دیوار اُبھری۔ اسد کی آنکھیں اندھیرے سے آشنا سا ہو چکی تھیں، مگر پھر بھی اُسے اِس دیوار کی صحیح نوعیت کا تعین کرنے میں دقّت ہوئی۔ دیوار کہیں سے اُونچی اور کہیں سے نیچی تھی، جیسے کہ کسی بے ہنر شخص نے یا بہت سے بچّوں نے مل کر تعمیر کی ہو۔ جہاں پہ دیوار ختم ہوتی تھی وہاں چوٹی کا یہ مختصر سا میدان بھی ختم ہوتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ قریب پہنچ کر ریاض مڑا اور دیوار کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ اسد نے اُچک کر دُوسری طرف دیکھا۔ دیوار فی الواقع چوٹی کے کنارے پر بنی تھی۔ تاریکی کی وجہ سے وہ گہرائی کا اندازہ لگانے سے قاصر رہا، بس اِتنا اُسے نظر آیا کہ دیوار کے ساتھ ہی ڈھلان شروع ہوتی تھی۔ کونے پر پہنچ کر وہ دونوں بیٹھ بیٹھ کر پہاڑ کی سیڑھیاں اُترنے لگے۔ دیوار ساتھ ساتھ نیچے کو جا رہی تھی۔ چند سیڑھیاں اُترنے کے بعد دیوار میں ایک شگاف نظر آیا۔ یہ شگاف ایک ڈھلوان صحن کا دروازہ تھا دیوار جس کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ دونوں اُس شگاف سے گزر کر احاطے میں داخل ہوئے۔ احاطہ پہاڑ کے پہلو میں بنی ہوئی قدرتی سیڑھیوں کی شکل میں اُوپر سے نیچے کو جاتا تھا۔ احاطے کے ایک کونے میں ایک کمرہ بنا تھا۔ ریاض اور اسد اُچک اُچک کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے کمرے کے دروازے تک پہنچے۔ کواڑ کے پاس ایک گائے بندھی تھی جو اُنہیں دیکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"یہ تمہارا گھر ہے؟" اسد نے پوچھا۔

"ہاں۔" ریاض نے کہا۔

ریاض نے کواڑ کھولا اور دونوں اندر داخل ہوئے۔ نچلی دیوار پر ایک لالٹین ٹنگی تھی جس کی بتی بہت نیچی کر دی گئی تھی۔ مگر تاریکی سے آئی ہوئی آنکھیں اس دھندلکے میں بھی کمرے کی دیواروں اور بیشتر چیزوں کو دیکھنے

کے قابل تھیں۔

کمرے کا فرش پہاڑ میں بنی ہوئی تین چوڑی چوڑی پتھریلی سیڑھیوں پر مشتمل تھا جس سے کمرے کی قدرتی حد بندی ہو گئی تھی اور وہ ایک کی بجائے تین کمروں کا کام دے رہا تھا۔ ہر ایک سیڑھی چھ سے آٹھ فٹ چوڑے زینے والی اور تین فٹ کے قریب اونچی تھی۔ لمبائی کے رخ پر سیڑھیاں اسی زینے کی شکل میں چلتی، دیوار میں سے نکل کر باہر دور تک چلی گئی تھیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا کہ کسی ایک مقام پر بے تدبیر دیوار چن دی گئی تھی جس سے کمرہ کھڑا ہو گیا تھا۔ ایک سیڑھی سے دوسری پر اترنے کی آسانی کے لیے بڑے بڑے مکعب پتھر رکھے ہوئے تھے، چنانچہ کمرے کے اندر ایک سرے سے دوسرے تک جانے کے لیے چھلانگیں لگانے کی ضرورت نہ تھی۔ پہلی سیڑھی پر دو آدمی سرخ چھینٹ کے پتلے لحاف اوڑھے سو رہے تھے۔ ریاض اور اسد کے اندر داخل ہونے پر دونوں سونے والوں نے سر اٹھا کر انہیں دیکھا اور پھر لحاف اوڑھ کر سو گئے۔ دوسرے زینے پر چند چیزیں بکھری پڑی تھیں، جن میں کپڑوں کی ایک گٹھڑی، دو پھاوڑے، ایک کدال، موٹے رسے کا بنا ہوا جال جو اس علاقے میں لکڑیوں کا لدا اٹھانے کے کام آتا تھا، ایک مٹی کا لوٹا وغیرہ تھا۔ وہیں پر ایک چمڑے کی پیٹی جو عموماً پتلون پر باندھنے کے کام آتی ہے دیوار پر لٹکی ہوئی ان دوسری چیزوں کے درمیان عجیب سی دکھائی دے رہی تھی۔

تیسری سیڑھی پر دیکھنے سے آخر معلوم ہوتا تھا کہ یہ کمرہ ایک گھر ہے۔ دیوار کے ساتھ ایک چولھا تھا جس پر پتیلی رکھی تھی۔ پر چند مٹی کی رکابیاں پاس زمین پر پڑی تھیں۔ لوہے کی ایک گاگر، پانی پینے کا گلاس، اور متعدد گھریلو اشیا تھیں۔ ایک طرف مٹی کی دو بہت بڑی بڑی مرتبان نما چاٹیاں رکھی تھیں۔ دوسری طرف کونے میں کوئی لحاف میں لپٹا ہوا سو رہا تھا۔ ان دونوں کے آنے سے لحاف میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ اسد پہلی سیڑھی پر کھڑا رہا۔ ریاض نے نیچے جا کر لالٹین کی بتی اونچی کی اور پتیلی میں نظر ڈالی۔ "چاول ہیں۔" وہ سرسری لہجے میں بولا۔ اس نے مٹی کی دو رکابیاں اٹھا کر انہیں پانی سے دھویا، اور پتیلی سے گیلی گیلی رکابیوں میں چاول انڈیل کر پتھروں پر پاؤں رکھتا ہوا اوپر چڑھ آیا۔ اس نے ایک رکابی اسد کے حوالے کی اور زمین پر بیٹھ گیا۔

سفید چاول سرد ہو کر ایک دوسرے سے جڑ گئے تھے اور دو تودوں کی شکل میں ان کی رکابیوں میں پڑے تھے۔ اسد اسے ہاتھ سے توڑ کر کھا رہا تھا جب کہ ریاض پورے کے پورے تودے کو اٹھا کر اسے دانتوں سے کاٹ کاٹ کر چبا رہا تھا۔ کھچڑی ہلکی نمکین اور بدمزہ تھی، مگر اسد اسے اشتہا سے کھا رہا تھا۔ تاہم چند نوالوں کے بعد خشک چاول اس کے حلق میں پھنسنے لگے۔ اس نے رکابی زمین پر رکھی اور نیچے جا کر پانی کا ایک گلاس پیا۔ پانی ٹھنڈا اور مزے دار تھا۔ خالی گلاس کو اس نے دوبارہ گاگر سے بھرا اور لے کر اپنی جگہ پر آ بیٹھا۔

"یہ کون ہیں؟" اسد نے سر کے اشارے سے پوچھا۔

"اپنے لوگ ہیں۔"

ریاض کی ملائم آواز اور ہر بات میں اُس کا انتہائی سرسری لہجہ اب اسد کے دل میں کھٹکنے لگا تھا۔ پہلے پہل جس آواز اور جس لہجے نے اُس کے دل میں ہلکا پن اور آزادی کا احساس پیدا کیا تھا، اب اُسی آواز اور لہجے کی یکسانیت اُسے خوف زدہ کرنے لگی تھی۔ وہ اب کھچڑی کے اُس حصے کو کھا رہا تھا جس میں نمک بالکل نہ تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے، اُس نے جھنجھلا کر سوچا، کہ کھچڑی کے ایک حصے میں نمک موجود ہو اور دوسرے میں نہ ہو۔ بے مزہ خشک چاولوں کو چبا چبا کر انہیں لعاب سے تر کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اچانک اسد کو فضا میں ایک عجیب سی بے ترتیبی کا احساس ہوا۔ اُس کے بیٹھنے کا انداز اور تھا، اُس کے جبڑوں کی حرکت غیر مانوس سی تھی۔ کھانے کی چپ چپ آواز بہت اونچی تھی، یا اونچی اور نیچی تھی۔ اُس کے وجود کا پرانا، مانوس توازن بدل رہا تھا۔ یہ کیا ہو رہا ہے، وہ یہاں پر کیسے آن پہنچا ہے؟ اُس نے ریاض کی طرف دیکھا، پھر سوئے ہوئے لوگوں پہ نظر ڈالی۔ یہ کون لوگ ہیں، اُس نے سوچا، میں یہاں پر کیا کر رہا ہوں؟ میرا طور، میرا طریقہ۔ اُس نے چاروں طرف نظر ڈالی۔ کمرہ چار کونہ تھا، مگر نہ چوکور تھا نہ مستطیل۔ دیواریں فرش کے زینوں کے ساتھ بتدریج نیچے کو چلی جاتی تھیں اور ایک دوسری کے ساتھ مختلف زاویے بناتی ہوئی مڑتی تھیں، جس سے کمرے کی شکل مڑے تڑے گتے کے ڈبے کی مانند ہو گئی تھی۔ یہ میرا گھر ہے، اسد نے مایوسی سے سوچا۔ اب کب تک یہ میرا گھر رہے گا؟ جب ریاض نے گٹھڑی میں سے ایک موٹی چادر نکال کر اُسے دی اور خود بتی بجھا کر اپنی ماں کے قریب لیٹ کر سو گیا، تو پہلی سیڑھی پر لیٹے لیٹے اسد نے قریب سوئے ہوئے دو آدمیوں کی بھاری سانس کی آواز سنی۔ یہ اپنے لوگ ہیں، اُس نے مایوسی سے دل میں دہرایا۔ اُس کا بدن تھکن سے چور تھا۔ نیند سے اُس کی آنکھیں جب بند ہوئیں تو چند لمحے کو اُس نے ایک عجیب منظر دیکھا، جیسے لپٹے تازہ تازہ چھوڑے ہوئے محور کا شگاف اُس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا ہو۔ میں کون ہوں؟ اُس کے اندر سے ایک گہری مُبتلا آواز آئی — میں کیا ہوں؟

پھر تھکن اُس پہ غالب آ گئی۔

(۸)

صُبح سویرے اسد اُٹھا تو تر و تازہ تھا ۔ رات جو دو آدمی اُس کے قریب سوئے ہُوئے تھے جا چکے تھے ۔ ریاض کی ماں چُولھے کے گرد کھٹ پٹ کر رہی تھی ۔

"علی ۔" اُسے جاگتے دیکھ کر بوڑھی عورت تیز بار یک آواز میں بولی ، "میرا بیٹا ابھی آتا ہے ۔ کچھ کھا پی لو ۔ تم بیمار تو نہیں ؟"

" نہیں ۔" اسد نے کہا ۔

" نیند میں تمہارا سانس رُک رہا تھا ۔"

" ہاں ۔"

" مَیں پہلے سُنتی رہی کہ کس کا ہے ۔ پھر مَیں اپنے بیٹے کے مُنہ پر ہاتھ پھیر کر اُوپر آئی ۔ پھر مُجھے پتا چلا ۔ مَیں نے کہا تھکاوٹ تمہارے سینے پر بیٹھ گئی ہے ۔ مَیں نے تمہارے مُنہ پر بھی ہاتھ پھیرا تھا ۔" وہ رُکی ، " تمہیں پتا چلا تھا ؟"

" نہیں ۔" وہ بولا ، " میرے سانس میں خرابی ہے ۔"

"تم سیدھے پڑے تھے۔ سیدھے سونے سے گلا بند ہو جاتا ہے۔ کیا خرابی ہے؟ تمہیں دورہ تو نہیں پڑتا؟"

"ہاں۔"

وہ کبڑی سی پستہ قد، قدیم چہرے والی بڑھیا ایک لمحے کو اس کے سامنے رک کر اپنی چھوٹی چھوٹی تیز آنکھوں سے اُسے دیکھنے لگی۔ بڑھیا کی نظروں میں تشویش تھی۔ ریاض کے چہرے پر، اس نے بے خیالی سے سوچا، اپنی ماں کا کوئی نقش نہیں۔ بڑھیا اب کونے میں ایڑیاں اٹھائے، چائی کے منہ میں جھکی اس کے پیندے میں ہاتھ مار رہی تھی۔ تھوڑی دیر میں وہ وہاں سے ایک مٹی کا کوزہ تھامے برتن لیے نمودار ہوئی۔

"یہ لو۔" وہ کوزے کے منہ پہ بندھا ہوا کپڑا کھولتے ہوئے بولی، "شہد ہے سینہ صاف ہو جاتا ہے۔" اس نے سرعت سے کوزہ ذرا سا انڈیلا اور سیدھا کر لیا۔ شہد ایک بڑے سے بلبلے کی شکل میں اسد کے دودھ بھرے گلاس میں گرا اور اس کا باریک تار ہوا میں لٹکنے لگا۔ ریاض کی ماں نے اسی سرعت کے ساتھ شہد کا تار اپنی انگلی پہ لپیٹا اور انگلی اسد کے منہ کے آگے بڑھا دی۔ اسد نے ایک لمحے کو جھجک کر اس خشک لکڑی نما انگلی کو دیکھا، پھر اس نے منہ کھول کر شہد لگی انگلی چوس لی۔

"میں اس کو منہ نہیں لگاتی۔ مجھے تکلیف دیتی ہے۔ مگر سو بیماریوں کی دوا ہے۔ ریاض کے باپ کو بھی سانس کا مرض تھا۔ اُسے شہد سے افاقہ ہوتا تھا۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ اس مرض سے کوئی نہیں مرتا۔ بس لمبا مرض ہے، دکھ دیتا رہتا ہے۔ سانس چوہوا تمہیں دورہ پڑا ہوا ہے؟"

"ہاں۔" اسد نے کہا، "مگر سخت نہیں۔ گزر جائے گا۔"

وہ شہد ملے گرم گرم دودھ کو گھونٹ گھونٹ پی رہا تھا۔ بڑھیا نے مکئی کی بھربھری روٹی کا ایک ٹکڑا، جو اس نے توے پر ڈال کر ابھی ابھی گرم کیا تھا، اس کے ہاتھ میں لا تھمایا۔ وہ روٹی کو دانتوں سے کاٹ کر دودھ کے ساتھ کھانے لگا۔

"میرا بیٹا اپنے چچا کی طرف گیا ہے۔" ریاض کی ماں اس کے قریب زینے پر بیٹھ کر اسے بتانے لگی، "اندھیرے اندھیرے ان دو آدمیوں کو لے کر چل پڑا تھا۔ یہ سرینگر سے آئے ہیں۔ دن میں جانے سے بچتے ہیں۔ مگر سلطان کا گھر محفوظ جگہ پر ہے، بیسیوں آدمی ہر وقت پھرتے رہتے ہیں، شہر کے اندر کوئی خطرہ نہیں۔ ہمارا گھر اکیلی جگہ پر ہے، دور سے جاسوسی ہو سکتی ہے۔ مگر خیر۔ سلطان کہتا ہے وہ اب پکڑا گیا تو پھر باہر نہیں آئے گا، سارا کام خراب ہو جائے گا۔ میں کہتی ہوں خیر۔ میں ریاض کے باپ کو منع کیا کرتی تھی۔ ریاض کا باپ سلطان کا بڑا بھائی تھا۔ دونوں بھائی حکومت کے مخالف تھے۔ اصل آدمی تو ریاض کا باپ تھا، سلطان تو چھوٹے بھائی کی طرح اس کے پیچھے پیچھے لگا رہتا تھا۔

اب سردار بن گیا ہے۔ میں کہتی ہوں خیر، ریاض کا اپنا خون ہے۔ ان کے خاندان میں بغاوت کی رسم ہے۔ جب میرے باپ نے میری رضا دی تو ہمارے خاندان میں سوگ پڑ گیا تھا، لوگ کہتے تھے عبداللہ اپنی بیٹی باغیوں کو بیاہ کر دے رہا ہے۔ آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا، ایک دن ایسا غائب ہوا کہ پھر نہ آیا۔ کوئی کہے چھپ گیا ہے، کوئی کہے پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ میں نے بیس تیس کوس تک ایک ایک پتھر کو ڈھونڈ مارا، پولس کے پاس گئی، تحصیلدار کے پاس جاتی رہی۔ سُلطان چھ مہینے کاٹ کر واپس آ گیا، ریاض کا باپ نہیں آیا۔ دس برس ہو گئے ہیں، ایسا لگتا ہے ابھی اس دروازے سے داخل ہوگا اور یہاں آ کر میرے پاس بیٹھ جائے گا۔ یہ گھر اس نے اپنے ہاتھوں سے بنایا تھا۔" وہ سانس لینے کو رُکی۔ اسد نے گلاس خالی کر کے زمین پر رکھا اور بوڑھی عورت کے چہرے پر نظر ڈالی۔ اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کا نشان تک نہ تھا، صرف زندگی کی خفیف سی ہراسانی کے آثار تھے۔ "جب ریاض جوان ہوا تو اپنے چچا کے ساتھ لگ گیا۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔ مردوں کے ساتھ تو جھگڑا ہو سکتا ہے، بیٹوں کے ساتھ کیسے ہو سکتا ہے۔ مرد جائیں بھی تو نام چھوڑ جاتے ہیں۔ یہ گھر اس کے نام سے آباد ہے۔ بیٹے چلے جائیں تو کچھ بھی چھوڑ کر نہیں جاتے۔ پھر اب اتنی عمر کے ساتھ مجھے سمجھ آ گئی ہے۔ میرا بیٹا اپنے باپ کی طرح اور دادا کی طرح مزدوری کرے گا، اور ایک روز میری طرح بوڑھا ہو جائے گا۔" عورت نے ویران نظر سے گھر کی دیواروں کو دیکھا۔ "پھر کیا کرے گا؟" اس نے پوچھا۔

اسد نے سر ہلا کر اس کے سوال کا جواب دیا۔

"پھر کیا کرے گا؟" بڑھیا نے دہرا کر پوچھا۔ "میں کہتی ہوں خیر بغاوت اس کے خون میں ہے، مزدوری کرنے کے لیے تو ساری عمر پڑی ہے۔ تم بھی اسی کام کے لیے یہاں آئے ہو، دوسری طرف سے۔ مجھے معلوم ہے۔ میرے گھر میں بیٹے کی طرح رہو۔ فکر کی کوئی بات نہیں۔ تمہیں کتنی عمر سے سانس کا مرض ہے؟"

"دو تین سال سے ہے۔" اسد نے کہا۔ "میں ایک بوٹی کی تلاش میں ہوں جس سے مجھے افاقہ ہوتا ہے۔"

"کون سی بوٹی ہے؟"

"نام مجھے معلوم نہیں۔ مگر مجھے اس کی پہچان ہے۔ ہاتھ کی شکل کا۔" اس نے پانچوں انگلیاں پھیلا کر بڑھیا کو دکھائیں۔ "اس کا پتا ہوتا ہے۔ اس علاقے میں ملتی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔ یہ علاقہ جڑی بوٹیوں کے لیے مشہور ہے۔ ضرور مل جائے گی۔ فکر نہ کرو۔"

"میرے پاس ایک عورت کا پتا ہے۔ ادھر سے لے کر آیا ہوں۔"

"کہاں رہتی ہے؟"

"چار کوس۔"

"ہاں۔ یہی علاقہ ہے۔ ریاض تمہیں لے جائے گا۔ یا میں لے جاؤں گی۔"

وہ باتیں کرتے کرتے اوپر دروازے میں آکھڑے ہوئے تھے۔ سورج نکل آیا تھا۔

"یہاں سے چار کوس پر ہے؟" اسد نے ہنس کر پوچھا۔

"نہیں۔ دور ہے۔ مگر اس کے آس پاس جتنے گاؤں ہیں ان میں ہر ایک سے چار کوس پر واقع ہے۔ جیسے زمین ناپ کر بنایا ہو۔ کسی حکیم کی عورت ہے؟"

"نہیں۔ ایک شخص ادھر جڑی بوٹیوں کا کاروبار کیا کرتا تھا۔ اس کی عورت ہے۔"

اسد کے دل میں دور کہیں ایک کھٹکا سا ہوا، اور اسے حیرت ہوئی کہ قید میں اس کی جگہ لینے والے آدمی کا کھٹکا ابھی وہاں موجود تھا۔

سامنے والے پہاڑ سے سورج اونچا ہو گیا تھا اور صبح سویرے کی دھوپ ان کی اپنی پہاڑی کی پشت پر پڑ رہی تھی۔ جہاں پہ وہ کھڑے تھے وہاں سے ان کی روشن ڈھلان نیچے ایک تنگ گھاٹی میں جا کر ختم ہوتی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ روشنی اور رنگ کی ایک وسیع چادر تیزی سے منتی ہوئی جا کر سامنے والے پہاڑ کی سیاہ عمودی دیوار کے دامن میں کھپ گئی ہے۔ پہاڑی پہ دور دور کل پانچ یا چھ مکان تھے جن میں سے بیشتر کے گرد چھوٹے موٹے پتھروں کی ادھ بنی دیواریں تھیں اور ان کی حدود کے اندر اور باہر دو دو، ایک ایک ننھے ننھے کیاری نما کھیت تھے۔ یہ کھیت چوکور میدانی کھیتوں کے برعکس تکونے، پانچ کونے اور ایسی ہی مختلف بے قاعدہ شکلوں کے تھے۔

اس وقت دور سے انہیں دیکھ کر اسد کو اچانک خیال آیا کہ رات کو گھر کے اندر بیٹھے بیٹھے اسے فضا میں جس بے ترتیبی کا احساس ہوا تھا وہ اس زمین سے پیدا ہوئی تھی۔ اس زمین کی شکل تعمیر کرنا آدمی کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ یہاں اس کی جو شکل دستیاب ہوتی تھی، زندگی وہی صورت اختیار کر لیتی تھی۔ وہاں کھڑے کھڑے اسے وہ ٹیڑھا میڑھا گھر نما کمرہ، بوڑھی عورت کی کبڑی شکل، ٹوٹی پھوٹی ہڈیوں والے پہاڑ، تڑے مڑے کھیت اور کچلے ہوئے راستے، فطرت کے عین مطابق اور مناسب معلوم ہوئے۔ اس کی سانس اب آہستہ آہستہ درست ہو چلی تھی۔

ریاض اس کے لیے لکڑیاں کاٹنے کے اوزار لے آیا تھا۔ ایک کلہاڑا، اور رسّے کا ایک جال۔

"سوکھی لکڑیاں اِدھر اُدھر سے اکٹھی کرتے رہو۔ دس بارہ آنے تک لدا ایک جاتا ہے۔ بعد میں شاید کٹروں میں نوکری مل جائے۔ قسمت کی بات ہے۔ نوکری میں فائدے بھی ہیں، نقصان بھی ہیں۔ خیر، بعد میں جو فیصلہ ہو۔ ابھی یہ کام شروع کرو۔ سب سے اچھا کام ہے۔" ریاض اس کو ایک رسّی کی بنی ہوئی چپلی دیتے ہوئے بولا۔ "یہ چپلی اس علاقے کے واسطے اچھی ہے۔ وہ جوتا اتار دو۔ چپلی کا تلا گدّے دار ہے، پتھروں پر

چلنے کے کام آتا ہے۔ تھکاوٹ بھی نہیں ہوتی۔ پہلے ذرا ٹھنڈ لگے گی، پھر پیر پکے ہو جائیں گے۔"

ریاض نے اپنی ماں کو بتایا کہ وہ چچا کے گھر سے کھاپی آیا ہے۔

"وہ کھاپی آیا ہوں۔ کھاپی آیا ہوں۔ کیا کھاپی آئے ہو؟" وہ بولی، "وہاں کیا ملتا ہے۔ چا کے پیالے پر سارے بادام ترکھا جاتا ہے آپ، اور دُوسروں کو دیتا ہے چا کے پیالے۔ اپنی بیوی تک کو بھوکا مارتا ہے۔ میں کہتی ہوں خیر، تمہارا اچھا ہے اور تمہارا کون ہے۔ مگر تم جوان ہو رہے ہو۔ دُودھ کے بغیر کیا بنے گا تمہارا۔ گائے میں نے اپنے لیے تو نہیں رکھی۔ تمہارے باپ کی تھی، اب تمہاری ہے۔" وہ اسد کی جانب مڑ کر بولی، "اصیل گائے ہے۔ بوڑھی ہو گئی ہے مگر دودھ نہیں سکھایا۔ ہماری ضرورت کے لیے اب بھی دے دیتی ہے۔" وہ پھر ریاض سے مخاطب ہوئی، "علی نے بھی پیا ہے۔ میں نے شہد نکال کر دی ہے۔ اس کو سانس کا مرض ہے۔ میں نے بتایا ہے اس مرض سے کوئی نہیں مرتا۔ تمہارے باپ کو بھی تھا۔ لو پیو۔ بیٹھ جاؤ۔"

ریاض نے دودھ کا گلاس لے کر ایک طرف رکھ دیا اور اپنا جال اُٹھا کر اُس کی دو ٹوٹی ہوئی رسیوں کو گانٹھیں دینے لگا۔ اُس کی ماں چند لمحوں تک اپنے ہاتھ کمر پہ رکھے، سرزنش کے انداز میں کھڑی اُسے دیکھتی رہی، پھر مایوس ہو کر مصروفیت سے اِدھر اُدھر پھرنے لگی۔ اسد نے ریاض کو پہلی بار دن کی روشنی میں قریب سے دیکھا۔ پھولے ہوئے نتھنوں اور ملائم نظروں والا چہرہ، جسے دیکھ کر پچھلی رات کو اسد کو محسوس ہوا تھا کہ جیسے کسی نے دو ایک مختلف چہروں کے نقوش کو لے کر اس ایک چہرے میں جمع کر دیا ہو، اب اُسے ایک عام کشمیری مزدور کا چہرہ دکھائی دیا۔ اسد نے خیال کیا کہ اس سے پہلے، شاید اسی جگہ پہ بیٹھ کے، اسی طور، اس لڑکے کا باپ اپنی مشقت کا صلہ، مکّی کی ایک روٹی اور دودھ کا ایک گلاس وصول کرتا ہو گا۔ اُس کا چہرہ بھی اسی شکل کا ہو گا، بے قاعدہ، خائف کرنے والا، اور معمولی! اور اُس سے پہلے اُس کے باپ کا، اور اُس کے باپ کا۔ اسد نے سرور کر کرے میں نظر دوڑائی۔ اِس رواں دواں وراثت کے درمیان حیرت ناک طور پہ اپنا توازن قائم کیے، یہ لوگ مفلسی کے ایک ہی مقام پہ کھڑے تھے۔ یہ لڑکا، اُس نے سوچا، اس توازن کو توڑنا چاہتا ہے۔ اِس لڑکے کے اندر ایک خواہش حرکت کر رہی ہے اور اِس حرکت کو شاید یہ سمجھتا بھی نہیں، مگر اپنے خون میں اس کی ضرورت کو محسوس کرتا ہے۔ ذوالفقار کی طویل تقریروں کے باوجود جس بات کی سمجھ اسد کو نہ آئی تھی، اِس گھروندے میں بیٹھے بیٹھے خود بخود وہ بات اُس کے دل میں کھلنے لگی۔ اُس وقت پہلی بار اسد کو محسوس ہوا کہ اُس کے، اور اِس بے سمجھ اور پُرخطر لڑکے کے درمیان ایک بلا واسطہ رشتہ ہے۔ اُس نے اپنی چپل اُتار کر ریاض کی دی ہوئی رسّے کی چپل پہن لی اور ریاض کے ساتھ ہی اُٹھ کر باہر نکل آیا۔

پہاڑ کے سر پہ مہیب گھروندوں کی مانند ساتھ ساتھ رکھی گئی پہاڑیوں کی گرتی اور اُٹھتی ہوئی، ٹوٹی پھوٹی لکیر

دُور تک چلی گئی تھی۔ آہستہ آہستہ چلتے ہُوئے جب وُہ دو پہاڑیوں کو عبُور کر کے تیسری کے دامن میں پہنچے تو سُورج سر پر آ چکا تھا۔ وہ دونوں ایک چٹان کے سایے میں جا بیٹھے۔ وہاں سے اُنہیں اپنی گائے، جو اُن کے عقب میں چلی آ رہی تھی، پچھلی پہاڑی کی چوٹی کے قریب گھاس پر مُنہ مارتی ہُوئی دکھائی دے رہی تھی۔

"اُس ڈھیری کے پیچھے سڑک جاتی ہے۔" ریاض ہاتھ سے اشارہ کر کے بولا، "سڑک کے دونوں طرف کیمپ ہے۔ ایک کوس تک جاتا ہے۔ اس طرف باڈر ہے۔" اُس نے دُوسری جانب اشارہ کیا، "یہاں سے فوج آتی جاتی رہتی ہے۔ یہی بڑی سڑک ہے۔ تمہارے پاس نقشہ ہے؟"

اسد نے جلدی سے اپنی جیبیں ٹٹولیں، پھر معصُومیت سے بولا: "گھر رہ گیا ہے۔" ریاض اُس کا مذاق سمجھ کر ہنس پڑا۔ اسد کی نظریں اُس کے چہرے پر لگی تھیں۔ اُس نے پہلی بار ریاض کو ہنستے ہُوئے دیکھا تھا۔ اُس کے دیکھتے ہی دیکھتے ریاض کا چہرہ بدل گیا تھا۔ ایک لمحے کے تبسّم نے اُس چہرے کے بکھرے ہُوئے نقوش کو گویا یک جان کر دیا تھا، جیسے کہ اُن کے عقب میں کوئی پوشیدہ مقام ہو جس پر بس اسی قدر نازک دباؤ سے کھٹ کر کے چہرے کے نقش اپنی اپنی مناسب جگہ پر آ ٹھہرے ہوں اور اُن کا کھویا ہُوا ربط اُنہیں واپس مل گیا ہو۔ ریاض کے چہرے کو اِس طور بدلتے دیکھ کر اسد کے دل کو ایک بے نام سی آسودگی کا احساس ہُوا، جیسے اُس کے اپنے اندر کسی حصّے میں ربط کا فقدان پیدا ہو گیا ہو اور ریاض کے متبسّم چہرے نے اِس کے ایک چھوٹے سے کونے کو پکڑ کر اُسے سیدھا کر دیا ہو۔

"میرا مطلب ہے۔" ریاض بولا، "تمہیں یاد ہے؟"

"ہاں۔ مَیں اس علاقے کو جانتا ہُوں۔" اسد نے کہا، "نقشے کی ضرورت نہیں۔"

"کیسے؟"

"مجھے محسوس ہوتا ہے کہ مَیں پہلے یہاں آ چکا ہُوں۔"

"کب؟"

"ایک سَو برس پہلے۔" اسد بولا، "تمہیں پتا ہے کئی کئی پُشت پہلے کے واقعات ہمارے ذہن میں محفُوظ رہتے ہیں۔"

"نہیں۔" ریاض کے چہرے پر گومگو کے آثار تھے۔ "علی۔" اُس نے بات بدلی، "جیب میں دس بارہ آنے ہر وقت ہوتے چاہئیں۔ لڑکیاں نہ بھی ہوں کرایہ تو ضرورت موجود ہو۔ کبھی کبھی پکڑ کر خواہ مخواہ تلاشی لے لیتے ہیں۔"

اسد کا جی کر رہا تھا کہ وہ لڑکا ہنسے، یا کوئی اور بات کرے۔ اُس کے چہرے پر حیرت یا تبسّم یا پریشانی

کے آثار ہوں۔ وہ اُس کے ساتھ اپنے آپ کی، کھلنڈرے پن کی، دوستی کی، وقت گزاری کی باتیں کرے۔

"ہوسکتا ہے۔" اسد نے کہا، "کچودہ پُشت پہلے میرے آباء میں سے کوئی یہاں پر رہتا ہو۔ یا ادھر سے گزرا ہو۔"

ریاض ہنسا۔ "ہاں۔" اُس نے کہا، "خیر۔ گائے تمہارے ساتھ ہل جائے گی۔ اصیل ہے۔ دن ڈھلنے سے پہلے شہر آجانا۔"

"تم کیا کرتے ہو؟" آخر اسد نے پوچھا۔

"اِدھر اُدھر کے کام۔" ریاض وہاں سے اٹھتا ہوا بولا۔

وہ پہاڑی کے دامن کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا پتھروں میں غائب ہوگیا۔ اسد وہیں بیٹھا اُس پہاڑی کو دیکھتا رہا جس کے پیچھے سے سڑک جاتی تھی اور فوج کا پڑاؤ تھا۔ اُس کا دل پھر خالی ہونے لگا تھا۔ اُس نے سورج کے مقابل آنکھیں اُٹھا کر گائے کو دیکھا جو آہستہ آہستہ نیچے اُترتی آرہی تھی۔ ان پُرخطر پہاڑیوں کے بیچ، اسد نے ویرانی سے سوچا، اب اُسے ایک عرصہ بسر کرنا تھا۔ اس عرصے کا اختیار اُس نے اپنے ہاتھ سے کھسکتا ہوا محسوس کیا۔ یاسمین کا متبسم چہرہ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں کے سامنے سے گزرا جس کے سارے نقش یک جان تھے۔

★ ★ ★ ★ ★

"دیکھ کے چل موٹی، گر جائے گی، چل چل، اب کھڑی کیوں ہوگئی ہے؟ ساری عمر ان پہاڑوں میں دھکے کھاتی رہی ہے، اب چلنا بھی نہیں آتا؟ تجھ سے تو بکریاں اچھی ہیں۔ اب کیوں کھڑی ہو؟ گھر جانے کو دل نہیں کرتا؟ ڈیں ڈیں ڈیں ...."

گائے کا نام سمندری تھا اور وہ اپنا لمبوترا بے تاثر منہ اُٹھائے بے سمجھی سے اُسے دیکھتی، اور آنکھیں نیم وا کیے ہولے ہولے اڑنگتی جارہی تھی۔ سورج سر پہ آچکا تھا اور اب گھر لوٹنے کا وقت تھا۔ اسد سمندری کے گلے میں لپٹا ہوا رسہ پکڑے اُسے کھینچتا ہوا واپس لوٹ رہا تھا۔ وہ سڑک کے اُس حصے سے گزر رہے تھے جہاں دوسرے کنارے پر آہنی خاردار تار کی باڑ سڑک کے ساتھ ساتھ دور تک چلتی تھی۔ باڑ کے دوسری طرف ایک میدان میں جس کے ارد گرد بیسیوں فوجی

گاڑیاں سیدھی قطاروں میں کھڑی تھیں، چند فوجی جوان بنیانیں اور نیکریں پہنے والی بال کھیل رہے تھے۔

"علی علی علی!" اسد نے سرزنش کی۔ "سمندری! گوڑ مغز۔ روز بتاتا ہوں میرا نام اسد ہے۔ علی نہیں۔ اسد کریم۔ سنا؟ علی علی کرتی رہتی ہو۔ چلو چلو چلو۔"

گائے نے منہ کھولے بغیر مختصری ریں کر کے جواب دیا۔ دودھ، پنیر اور گوشت کے خالی ڈبوں، شراب کی خالی بوتلوں اور پھٹے ہوئے پرانے فلمی رسالوں سے اٹی ہوئی زمین پر وہ دونوں پھلانگتے ہوئے کچھ دور تک سڑک کے ساتھ ساتھ چلتے رہے، پھر وہاں سے ایک پہاڑی راستے پر اتر کر گھر کی جانب ہو لیے۔ روز مرہ کی طرح اسد نے چند معمولی ادھر ادھر کی باتیں ذہن نشین کر لی تھیں۔ اس کی پشت پر لٹکتا ہوا جھولا چھوٹی بڑی خشک لکڑیوں سے ایک چوتھائی بھر اٹھا۔ ان لکڑیوں میں سے ایک پر، جس کی چھال نرم اور ہموار تھی، چند الٹی سیدھی مہین لکیریں پڑی تھیں جو اسد نے یادداشت کے طور پر ناخن سے اس پر بنائی تھیں۔ اس کا صبح بھر کا کام ختم ہو چکا تھا۔

گھر کی پچھلی دیواروں میں سے بنے ہوئے گائے کے مخصوص ہموار راستے کی طرف سے اسد گھر میں داخل ہوا۔ گائے کو باندھ کر اس نے ریاض کی ماں سے روٹی لے کر کھائی، پھر جھولا اٹھا کر کندھے پر ڈالا اور "شہر" کی جانب چل پڑا۔ وہاں تک پہنچتے پہنچتے اس کا جھولا بھر گیا، مگر اس طرح کہ ناخن کی لکیروں والی لکڑی ہمیشہ اوپر رہی۔ سورج نے تین چوتھائی آسمان سر کر لیا تھا۔ قصبے میں داخل ہوتے ہوئے وہ جگہ جگہ پر متلاشی نظروں سے دیکھتا گیا۔ ریاض اسے کہیں پر نظر نہ آیا۔ تین چار مقام پر اس کو واقف چہرے نظر آئے، جن سے اس کی سرسری سلام علیک ہوئی۔ یہ وہ لوگ تھے جن سے وہ کسی نہ کسی وقت پر مل چکا تھا۔ کبھی ایک کے گھر، کبھی دوسرے کے گھر، دو دو تین تین کے گروہوں میں، کسی دکان پر یا طویلے میں، ہر دوسری یا تیسری سہ پہر کو یا شام میں، چائے کے پیالوں اور کڑوے کشمیری تمباکو کے دھوئیں کے غبار میں، لالٹینوں کی مدھم روشنی میں باتیں کرتے ہوئے اور سنتے ہوئے —— زیادہ تر سنتے ہوئے —— اسد نے بیسیوں اجنبی چہروں سے واقفیت حاصل کی تھی، ایسے چہرے جن میں سے بیشتر کی اس کو صرف آنکھ کی پہچان تھی، نام اس کے حافظے سے نکل چکے تھے۔ ہر روز یا دوسرے دن اپنے بوجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے کے بعد شہر میں کسی نہ کسی جگہ پر ریاض سے اس کی ملاقات ہو جاتی۔ وہاں سے وہ چلتے پھرتے ہوئے کسی جگہ پہ جا پہنچتے۔ اس آبادی میں ایسی چار پانچ جگہیں موجود تھیں جن کے مالک بظاہر یہ خطرہ مول لینے کو تیار تھے۔ وہاں پہ پھر ایک ایک دو دو کر کے لوگ آتے: نوجوان، ادھیڑ عمر، بوڑھے۔ کوئی کوئی بچوں کو ہمراہ لیے ہوتا۔ یہ لوگ وہاں گھنٹہ آدھ گھنٹہ رکتے، چائے پکی ہوتی تو پیالہ پیتے، حال احوال پوچھتے، ادھر ادھر کی باتیں کرتے، اور اٹھ کر چلے جاتے۔ باتیں عموماً روز مرہ کی، شادی و موت کی، بیماری و پیدائش کی، کمائی اور افلاس کی ہوتیں۔ ہر اچھی بری بات کا اختتام خدا کے

ٹنکہ پہ ہوتا ۔ بیچ بیچ میں ملکی حالات کی، سیاست اور جنگ کی بات بھی آجاتی ۔ اسد، علی کے رُوپ میں بیٹھا اُن کی باتیں سُنتا، بیشتر وقت اُن کے خیالات کی رَو جانچتا، معلومات حاصل کر کے انہیں دماغ کے کونوں میں ذخیرہ کرتا، اور کبھی کبھی بیچ بیچ میں گفتگو کو ایک خاص نہج پر لانے کی خاطر کوئی ایک آدھ بات ہُشیاری سے، احتیاط سے، کسی خاص زاویے سے کر دیتا ۔ اُس زمانے میں پہلی بار وہ دُوسرے لوگوں کے خیالات، اُن کے احساسات، اُن کے رویے کو کنٹرول کرنے کے اطوار سیکھ رہا تھا ۔ چند ہفتوں کی جسمانی محنت اور اِس خطّے کی مخصوص آب ہوا نے اُس کی صحت پہ اچھا اثر کیا تھا ۔ اُس کا سینہ صاف ہو گیا تھا اور کئی ہفتوں سے اُس کی سانس خراب نہ ہوئی تھی روزمرہ کے طویل پہاڑی سفر اور خشک پھلوں اور دُودھ کی خوراک نے اُس کی کمر اور ٹانگوں کو مضبوط بنا دیا تھا اور کچھ عرصہ پہلے اُس کے بدن نے جو بدسلوکی سہی تھی اُس کے اثرات غائب ہونے جا رہے تھے ۔ صرف اُس کی رُوح پہ کہیں کہیں اُس کے نشان ابھی باقی تھے ۔ ان گھروں کے چھوٹے چھوٹے مدھم کمروں میں سیدھے سادے، مفلوک الحال مزدوروں، مسجد کے درویشوں، طالب علموں، دکانداروں کے ساتھ جب وہ بیٹھتا، یہ جانتے ہوئے کہ ان میں سے کوئی ایک بھی مخبر ہو سکتا ہے، اِس کھیل کا ایک وار میں خاتمہ کر سکتا ہے، بس ایک بار کواڑ کھلنے کی دیر ہے اور تڑاخ ——— اِس جیتے جاگتے ہوئے ہردم حاضر خطرے کا احساس لیے جب وہ اُن کے ہمراہ بیٹھتا اور وقتاً فوقتاً کوئی مختصر سی بات کر کے گفتگو کے دھارے کو اپنی خواہش کے مطابق رواں کرتا، تو اُس کے اندر اُترے ہوئے بید کے اُن نشانوں پہ میٹھا میٹھا درد ہوتا اور اُس کے دل میں ایک عجیب نشّہ آور قوت کا احساس پیدا ہوتا ۔ یہ علاقہ اُس کی عُمر کے ایک دَور کی مانند تھا جس میں وہ نیم رضامندی سے نہیں بلکہ عمداً داخل ہوا تھا اور اس کی تنگ و دو سے کم و بیش لُطف اندوز ہو رہا تھا ۔

تاہم قدم قدم پہ اُس کے دِل کی قید کے آثار ابھی قائم تھے ۔ خوشی محمّد کے جُرم اور سزا کا تصور اُس کے ذہن کو، اور یاسمین کی یاد اُس کے دِل کو دھکیلے دیتی تھی اور اپنے کام کے عناصر سے اس قدر شناسائی حاصل کرنے کے باوجود وہ اِس علاقے کے سرد پا کو محض ریاض کی مانوس شبیہہ کے واسطے سے پہچانتا تھا ۔ اِس بے نشن سرزمین پر وہ اول د آخر ایک اجنبی مسافر تھا، چنانچہ اُس روز جب ریاض اُسے نظر نہ آیا تو وہ اپنی پُشت پہ لکڑیوں کا گٹھا اٹھائے اٹھائے بازار سے گزر گیا ۔ اُس کو کوئی گاہک نہ مِلا ۔ کوئی گاہک مِل جاتا تو چار چھ آنے زیادہ مِل جایا کرتے ۔ پھر وہ لکڑیاں گاہک کے گھر چھوڑنے کے لیے جاتا ۔ لکڑیاں پھینک کر وہ پینے کے لیے پانی مانگتا اور اِسی بہانے چند منٹ رُک کر دو چار باتیں کر لیتا ۔

گاہک سے مایوس ہو کر اسد نے لکڑیوں کے ٹال پر اپنا گٹھا جا گرایا ۔ وہاں سے اُسے جو اونے پونے دام ملے اُس نے جیب میں ڈالے اور ناخن کے نشان والی لکڑی گٹھے سے کھینچ کر چھڑی کے طور ہاتھ میں لٹکائے واپس ہو لیا ۔ واپس

آتے ہوئے راستے میں آخر ایک تمباکو والے کی دکان کے اندر ریاض اُس کو نظر پڑا۔ لمبی اور تنگ گلی نما دکان کے نیم اندھیرے میں چند لوگ دیوار کے ساتھ چٹائی پہ بیٹھے تمباکو پی رہے تھے۔ اسد جا کر اُن کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد دو آدمی اور ایک بچہ اُٹھ کر چلے گئے تو وہاں پہ ریاض اور اسد کے علاوہ صرف ایک اور شخص بیٹھا رہ گیا۔ دکاندار اُٹھا اور انہیں چھوڑ کر باہر دکان کے سامنے پڑے ہوئے سٹول پر جا بیٹھا۔ جب وہ سٹول پر بیٹھ کر حُقّے کے دو کش لگا چکا تو اس نے دکان کے اندر کی طرف مُنہ کر کے تمباکو کا دھُواں چھوڑا۔ ریاض کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے کُرتہ اُٹھا کر شلوار میں اُڑسا ہوا ایک اخبار نکالا۔ یہ اُس روز کا چھپا ہوا ایک کشمیری روزنامہ تھا۔ یہ تازہ اخبار اس بات کی علامت تھا کہ یہ شخص اُسی روز سرحد پار کے لیے روانہ ہونے والا تھا اور اخبار کو ثبوت کے طور ساتھ لے جا رہا تھا۔ اخبار کے پہلے صفحے پر نیلے اخباری رنگ میں چھپی ہوئی چند بڑی بڑی تصویریں تھیں۔ اسد نے جلد جلد اخبار کے ورق اُلٹے اور دوسرے ہاتھ کی انگلیوں سے نیفے کی موری کے اندر چھپائی ہوئی چھوٹی سی دو رنگی پنسل کو کھسکا کر باہر نکالنے لگا۔ اخبار کے ایک اندرونی صفحے پر اُسی نیلے رنگ میں ایک اشتہار چھپا تھا۔ اسد نے پنسل کا نیلا سکہ اشتہار کی ہلکی نیلی زمین پر جمایا اور مکڑی کے ٹکڑے پر سے دیکھ کر اُسی شکل کی لکیریں کھینچ دیں، اس طرح سے کہ پہلی نظر میں دیکھنے پر نظر نہ آئیں مگر غور سے دیکھنے پر اُن کا نقش صاف دکھائی دے جائے۔ یہ کام ختم کر کے اُس نے اخبار دوسرے شخص کے حوالے کیا اور اپنی پنسل دوبارہ نیفے کے سوراخ میں ڈال کر دُور تک کھسکا دی۔ دوسرے شخص نے اخبار کو تہہ کر کے اُسے شلوار میں اُڑسا اور کوئی بات کیے بغیر اُٹھ کر باہر نکل گیا۔ اسد نے لکڑی کو توڑ کر اُس کے کئی چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کیے اور اُن کو ہاتھوں میں بھر کر دکان کے باہر لے آیا۔ وہاں پر اُس نے انہیں زمین پر ایک چھوٹی سی ڈھیری کی شکل میں ترتیب دیا اور دکان والے سے ماچس لے کر اُسے آگ لگا دی۔ جب لکڑی جلنی ختم ہو گئی اور کوئلے دہکنے لگے تو دکاندار نے حُقّے کی ٹوپی اُٹھائی، اُس میں تازہ تمباکو دھرا اور اُس پہ کوئلے جما کر کش لگانے لگا۔ اِسی دوران میں غلام اُن سے آملا تھا۔ وہ اور ریاض باتیں کر رہے تھے۔ جب حُقّہ چالو ہو گیا تو چاروں نے باری باری اُس پہ کش لگانے شروع کیے۔ دو دو کش لگانے کے بعد اُن تینوں نے دکان والے کو الوداع کہی اور چل پڑے۔

"علی،" ریاض نے قصبے سے نکل کر کہا، "تم گھر چلے جاؤ۔ میں غلام کے ساتھ جا رہا ہوں۔"

"کہاں؟" اسد نے پوچھا۔

"کام ہے۔" ریاض بولا، "میں آجاؤں گا۔"

"میں بھی تمہارے ساتھ چلتا ہوں۔" اسد نے کہا۔

ریاض اور غلام نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر ریاض بولا، "آجاؤ۔"

وہ تینوں سڑک کی جانب ہولیے۔ راستے میں ریاض اور غلام نے لکڑیاں اُٹھا اُٹھا کر اپنے جھولوں میں ڈالنی شروع کر دیں۔ اسد اُن کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

"غلام کو لکڑیاں چاہئیں۔" ریاض نے کہا، "اس کے گھر بھیکنے جائیں گے۔"

غلام کا گھر سڑک سے ذرا ہٹ کے تھا۔ اسد بھی لکڑیاں توڑ توڑ کر جھولے میں بھرنے لگا۔

اب سورج غروب ہو رہا تھا۔ دھوپ دیر ہوئی سڑک سے جا چکی تھی مگر پہاڑوں کی چوٹیاں ابھی چمک رہی تھیں۔ تینوں آدمی لکڑیوں سے بھرے جھولے پشت پہ اُٹھائے کشمیری مزدوروں کے انداز میں جھکے جھکے ایک قطار میں سڑک کے کنارے چلے جا رہے تھے۔ ایک مقام پہ آکر اُن کی گفتگو کچھ چڑھائی، کچھ تھکاوٹ کی وجہ سے ختم ہو گئی تھی اور وہ کندھے سے کندھا لگائے چلتے چلتے بکھر کر ایک دوسرے کے پیچھے چلنے لگے تھے۔ کبھی کبھی کوئی فوجی جیپ یا بڑی گاڑی اُن کے پاس سے گزر جاتی تھی۔ ہر ایک گاڑی کی آواز کو قریب آتے سن کر وہ رک جاتے اور گاڑی کو منہ اُٹھا کر دیکھنے لگتے جب تک کہ وہ گزر نہ جاتی۔ پھر وہ چل پڑتے۔ آگے آگے غلام جا رہا تھا، اس کے پیچھے ریاض، اور سب سے پیچھے اسد تھا۔ سڑک پر دُور دُور تک کوئی اور دکھائی نہ دے رہا تھا۔ غلام اور ریاض نے سروں پر کشمیری کڑھائی کے کپڑے کی کھوپڑی نما ٹوپیاں پہن رکھی تھیں۔ اسد ننگے سر تھا۔ دن کی روشنی تیزی سے معدوم ہوتی جا رہی تھی، مگر ابھی اتنی باقی تھی کہ بیس تیس قدم تک بآسانی نظر جاتی تھی۔ سڑک کی ہلکی، طویل چڑھائی چڑھتے چڑھتے اسد کو ایک لمحے کے لیے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اس قطار سے نکل کر سامنے والے پہاڑ کی چوٹی پر جا کھڑا ہوا ہے اور دُور سے ان تینوں آدمیوں کو چلتے ہوئے دیکھ رہا ہے۔ بے دخلی کی اس کیفیت سے اب وہ مانوس ہوتا جا رہا تھا۔ اس کیفیت نے اُسے اس قابل بنا دیا تھا کہ وہ ایسے نظاروں کو یوں دیکھ سکے جیسے اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہے۔ پہاڑ کی بلند چوٹی پر کھڑے کھڑے اُسے دُور نیچے اس گہری اور خالی سرزمین پہ جھکی ہوئی یکساں چال سے چلتے ہوئے تین بوجھ بردار مزدوروں کا یہ قافلہ طویل اتھر اور مانوس معلوم ہوا۔

اب کچھ دیر سے اسد محسوس کرنے لگا تھا کہ اُس کے دونوں ساتھیوں کی چال میں کچھ تبدیلی آ چلی تھی۔ گاڑیوں کی آوازوں پر وہ بدک کر رک جاتے، پھر ایک دوسرے کو دیکھ کر چل پڑتے۔ اسد اُن کے ساتھ ساتھ رکتا اور چلتا رہا۔ ایک گاڑی کے انجن کی آواز آئی تو وہ تینوں دُور سے ہی رک گئے۔ قریب آنے پر انھوں نے دیکھا کہ وہ ایک درمیانے سائز کا کھلا فوجی ٹرک تھا جسے دو فوجی چلا رہے تھے۔ ٹرک میں اور کوئی نہ تھا۔ جب ٹرک پندرہ قدم کے فاصلے پر رہ گیا تو اچانک غلام نے ہاتھ اُٹھا کر اُسے رکنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے ایک سیکنڈ کے وقفے کے بعد بریک لگائی اور ٹرک رکتا رکتا اُن سے چند قدم آگے نکل کر جا ٹھہرا۔ فوجی نے کھڑکی سے سر نکال کر پیچھے دیکھا۔ چند

سیکنڈ تک کڑی نظروں سے تینوں کو دیکھنے کے بعد اس نے سر کے ایک جھٹکے سے انہیں پیچھے بیٹھنے کی اجازت دے دی اور سر اندر کر لیا۔ وہ تینوں تیز تیز چلتے ہوئے ٹرک کے پیچھے تک پہنچے۔ وہاں پر انہوں نے اپنے اپنے گٹھے پیٹھ پر سے زمین پر پھینکے۔ پھر دو دو نے مل کر ان کو اوپر اٹھایا اور دھڑام دھڑام انہیں ٹرک میں پھینکنے لگے۔ دو گٹھوں کو ٹرک میں لادنے کے بعد اب صرف اسد کا گٹھا زمین پہ رہ گیا تھا۔ اس کو اٹھا کر لادنے کی بجائے غلام اور ریاض نے کرتوں میں ہاتھ ڈال کر فوجی ساخت کی ہلکی سٹین گنیں نکالیں اور انہیں سنبھال کر اپنی اپنی طرف سے بھاگتے ہوئے ٹرک کے دونوں دروازوں تک پہنچے۔ اسد جو ریاض کے رخ پہ تھا دم بخود کھڑا دیکھتا رہا۔ ریاض نے ایک جھٹکے سے دروازہ کھولا اور اس کی سٹین گن سے، ہلکے ہلکے شعلوں کے ہمراہ گولیوں کی ایک بوچھاڑ نکلی۔ اسی لمحے دوسری طرف سے غلام کی گولیوں کی بوچھاڑ آئی جو ایک دو سیکنڈ ہی تک جاری رہی۔ ٹرک جس کا انجن گیئر میں تھا ڈرائیور کا پاؤں اٹھنے سے ایک دھچکے کے ساتھ اچھلا، پھر ایک دو ہلکے ہلکے دھچکے کھا کر رک گیا۔ اسد اب ریاض کے پاس کھڑا ٹرک کے اندر دیکھ رہا تھا۔ ٹرک کا ڈرائیور اپنی سیٹ پر بیٹھا اینٹھ رہا تھا، جیسے اس تنگ سی جگہ میں انگڑائی لینے کی کوشش کر رہا ہو۔ اس کی تازہ تازہ استری کی ہوئی وردی میں پیٹ سے ذرا اوپر دو سوراخ نظر آ رہے تھے۔ ایک ذرا بڑا تھا اور ایک چھوٹا۔ اس کے علاوہ اس کے کپڑوں پہ اور کوئی داغ نہ تھا۔ اس نے جمائی لینے کی طرز پہ منہ کھولا اور کھولے رہا۔ اس کے گلے سے ہلکی ہلکی خرخراہٹ کی آواز نکلنے لگی۔ اسد کو اس کا نرخرہ نظر آیا جو ہوا کی خاطر تیزی سے کانپ رہا تھا۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ باہر کی جانب مڑنا شروع کیا، جیسے خواب کی حالت میں کروٹ بدل رہا ہو۔ جیسے ہی وہ مڑا اس کی وردی کے بڑے سوراخ سے لہو کا دھارا ابل کر نکلا اور اس کے پیٹ پہ بہتا ہوا رانوں کے بیچ گرنے لگا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ اس سوراخ کے اوپر رکھ دیا، جیسے اسے بند کرنے کی کوشش کر رہا ہو، اور ٹانگیں گھسیٹ کر باہر کی جانب نکلنے لگا۔ ریاض مشین گن سیدھی کیے اس کے سامنے کھڑا تھا، اور سپاہی خالی خالی متعجب نظروں سے ریاض کو دیکھتا ہوا باہر آ رہا تھا۔ اسد خوف اور استعجاب سے اسے دیکھ رہا تھا۔ جھٹپٹے کی روشنی میں اس کا چہرہ کاغذ کی طرح سفید اور بے تاثر تھا، اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں، اور وہ پیٹ پر ہاتھ رکھے باہر ہی باہر نکلا آ رہا تھا۔ جب اس کا منہ مشین گن کی نالی سے چند انچ کے فاصلے پہ رہ گیا تو ریاض فطری طور پہ ایک قدم پیچھے کو سرکا۔ اسد نے ریاض کو دیکھا۔ ریاض نے تیزی سے ایک نظر اسد پہ ڈالی۔ ریاض کے چہرے پہ گومگو کے آثار تھے، جیسے پوچھ رہا ہو کہ یہ آدمی آخر چاہتا کیا ہے؟ اسد کا جی چاہا کہ وہ آگے بڑھ کر اس بے سود شخص کو تھام لے اور اسے آگے بڑھنے سے باز رکھے۔ پھر ریاض نے نالی اٹھا کر لبلبی دبا دی۔ کھٹاکھٹ کھٹاکھٹ! اسد کو یوں دکھائی دیا جیسے کسی نے اس سفید چہرے پہ کیچڑ کا چھینٹا مار دیا ہو۔ پھر اس نے دیکھا کہ یہ سوراخ تھے جہاں

گولیاں داخل ہوئی تھیں۔ رخسار پہ، ناک کی ہڈی پہ، آنکھ میں۔ اس کے چہرے کے ہونٹ کھنچ گئے اور دانت باہر نکل آئے۔ بوچھاڑ کے دھکے سے اس کا سر پیچھے کو جھٹک گیا اور اس کا دھڑ سیٹ پر جا گرا۔ اس کا سر دوسرے فوجی کی گود میں جا کر پڑا جو سیٹ کے اوپر آدھا بیٹھا اور آدھا لیٹا ہوا تھا اور جس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا تھا۔ ریاض اب دہشت سے آنکھیں پھاڑے اس فوجی کو دیکھ رہا تھا جو اس کی گولیوں سے گرا تھا۔ وہ زخمی اب آہستہ آہستہ کہنیوں کے بل اٹھ رہا تھا۔ اس کا خون اگلتا ہوا ٹوٹا پھوٹا چہرہ پیچھے کو ڈھلکا ہوا تھا، مگر اس کے کندھے اوپر اٹھتے آ رہے تھے، جیسے کسی بھوت نے اس کے بدن کو اپنے قبضے میں لے لیا ہو۔ ریاض نے ایک دو بار اپنے ہاتھوں کو ایسے حرکت دی جیسے پھر گولی چلانا چاہتا ہو۔ پھر اس کے منہ سے ایک گالی نکلی، اور اس نے ایک ہاتھ کی پوری قوت سے دروازے کو دھکا دے کر کھڑاک سے بند کر دیا۔

"جال نکالو۔" وہ چیخا۔

اسد گویا یکایک جاگ پڑا۔ اس نے ایک چھلانگ لگائی اور ٹرک کے اوپر جا کھڑا ہوا۔ ایک ایک وار میں اس نے جھولوں کے رستے ڈھیلے کیے اور انہیں اٹھا کر جال کھینچ لیے۔ وہ نیچے کود کر اپنا جال کھینچ رہا تھا کہ اسے غلام کی جانب سے ایک مختصری بوچھاڑ کی آواز سنائی دی، پھر کھڑاک سے دروازہ بند ہونے کی آواز۔ اب وہ تینوں ٹرک کو دھکا لگا رہے تھے۔ غلام نے ایک گالی دے کر دوبارہ دروازہ کھولا اور پائے دان پہ کھڑے ہو کر گاڑی کو گیئر سے نکالا۔ پھر اس نے پوری قوت سے سٹیئرنگ کو ایک چکر دیا اور چلا کر دھکا لگانے کو بولا۔ ریاض اور اسد نے کندھے ٹرک کی باڈی کے ساتھ لگا کر ٹانگوں کے زور سے اسے دھکانا شروع کیا۔ سڑک کے کنارے پہ پہنچ کر غلام باہر کود پڑا اور ٹرک سڑک سے اتر کر گہری ڈھلان پہ لڑھک گیا۔ چند لمحوں تک ٹرک حیرت انگیز طور پر سیدھا اپنے ٹائروں پر چلتا رہا، پھر یک دم الٹ گیا۔ اس جگہ پر کوئی گہری کھڈ نہ تھی، صرف پہاڑ کی اونچی ڈھلان تھی جو دور تک جاتی تھی۔ پتھروں کے اوپر قلابازیاں کھاتے ہوئے بھاری ٹرک کے گرنے سے ایک شور اٹھ رہا تھا، اور اندھیرے میں کہیں کہیں آگ کی چنگاریاں نکل رہی تھیں۔ انہوں نے ٹرک کے رکنے کا انتظار نہ کیا۔ اپنے اپنے جھولے اٹھا کر وہ تینوں بھاگتے ہوئے بکھر گئے۔ غلام سڑک سے ایک طرف اور اسد اور ریاض دوسری جانب، جدھر ان کا گھر تھا، پہاڑی رستوں پہ اتر کر رات کے اندھیرے میں غائب ہو گئے۔ سڑک سنسان رہ گئی۔ یہ ساری کارروائی ایک ڈیڑھ منٹ میں انجام پا گئی۔

ریاض کی ماں کو سگریٹ کے دھوئیں سے نفرت تھی۔ چنانچہ جب وہ سو گئی تو ریاض اٹھا۔ اس نے جیب سے سگریٹ نکال کر ایک سلگتی ہوئی لکڑی سے جلایا، اور اوپر والے زینے پر آ بیٹھا جہاں اسد لیٹا سونے کی کوشش

کر رہا تھا۔

"علی "۔ وہ سرگوشی میں بولا۔

"ہاں "۔

"یہ لو "۔ اس نے دوسرا سگریٹ نکال کر اسد کی طرف بڑھایا۔ اسد نے سگریٹ لے کر ریاض کے سگریٹ سے جلایا اور دونوں اندھیرے میں بیٹھ کر کش لگانے لگے۔ وہ سگریٹ پینے کے عادی نہ تھے، مگر کبھی کبھی ریاض کو کہیں سے سگریٹ مل جاتے تو وہ پی لیا کرتے۔ اس وقت اسد کے دل سے بے وجہ ایک خیال گزرا کہ یہ سگریٹ کہیں ان ٹرک والے فوجیوں کے تو نہ تھے؟ اگر تھے تو ریاض نے کس وقت اڑائے تھے؟ شاید جس وقت وہ جال نکال رہا تھا؟ اندھیرے میں اسے دکھائی نہ دیتا تھا ورنہ پہچان لیتا۔ سب فوجیوں کو ایک ہی قسم کے سگریٹ ملا کرتے تھے۔

"کیمپ ادھر سے دو میل ہوگا؟" ریاض بولا۔

"ہاں "۔ اسد نے جواب دیا، "آواز پہنچی ہوگی؟"

"اونہوں "۔ ریاض نے نفی میں سر ہلایا۔ "بیچ میں پہاڑ تھا۔ پہاڑ آگے آجائے تو آواز ایک فرلانگ نہیں جاتی "۔

"یہ بات تو ہے "۔

وہ بیٹھے سگریٹ پیتے رہے۔ اسد نے دو تین بار سر ہلا کر اس منظر کو جھٹکنے کی کوشش کی جو اس کی آنکھوں میں جم گیا تھا۔

"تم نے مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا؟" اسد نے پوچھا۔

"تمہارا کیا پتہ تھا؟"

"کیوں "۔

"کام خراب کر دیتے "۔

"پھر اب؟"

"ہُنہہ؟"

"کام خراب تو نہیں ہوا۔"

"نہیں۔ مگر پہلے کیا پتا تھا "۔

"ہاں ۔" اسد نے اشتیاق سے کہا، "پھر اب اگلی بار ؟"

"ہُنہہ !" ریاض ہنسا ۔ "اگلی بار کا کسے پتا ہے ۔ ہم نے تو آڈر کے بغیر کام کیا ہے ۔"

"اب کیا ہوگا ؟"

"ہوگا کیا ۔ بچ گئے تو بچ گئے ۔ پکڑے گئے تو بس ۔ ختم ۔"

اُس نے سگریٹ کا ایک لمبا کش لگایا ۔ اسد بکا بکا سگریٹ کی لَو میں اُس لڑکے کے چہرے کو دیکھتا رہا جو اپنی زندگی میں، نفع خور سوداگر کی طرح، بلاوجہ خطرے کی ذخیرہ اندوزی کر تا جا رہا تھا ۔

"آرڈر کے بغیر کیوں ؟" اسد نے پُوچھا ۔

"ہمیں اجازت نہیں ۔ اُدھر سے فوجی آتے ہیں ۔ کمانڈو ۔ ہم صرف رہبری کا کام کرتے ہیں یا مُخبری کا ۔"

"کسی کو بھی اجازت نہیں ؟"

"کسی کسی کو ہے ۔ غلام اُن کے ساتھ کبھی جاتا ہے، رستے کے لیے ۔ اُس کی شین گن بھی سرکاری ہے ۔"

"اور تمہاری ؟"

"غلام نے لاکر دی ہے ۔ میرے ساتھ اُس نے وعدہ کیا تھا ۔"

"اُن میں سے کسی کی اُٹھا کر لایا ہے ؟"

"ہاں ۔"

"اب تم بچ گئے تو پھر ؟"

"پھر کیا ۔"

"پھر تم بھی اُن کے ساتھ جا سکو گے ؟"

"شاید ۔" ریاض نے کہا ۔

"میں بھی ؟" اسد نے اشتیاق سے پُوچھا ۔

"تم تو اُن کے اپنے آدمی ہو، تمہیں کیا فکر ہے ۔ اپنی مرضی سے جو چاہو کرو ۔ مشکل تو ہماری ہے ۔"

سگریٹ آدھے سے زیادہ جل چکے تھے ۔ اسد کو علم ہوا کہ خود سری کے اِس مقام پر بھی پیشہ وری کے درجے ہیں، اور وہ اِس مقام پر ان لوگوں کے درمیان بھیس بدل کر بھی اجنبی ہے ۔ یہ سوچ کر اُس کا دل مُرجھا سا گیا ۔

انہوں نے اپنے اپنے سگریٹ زینے پر مسل کر بجھا دیے ۔ ریاض اُٹھ کھڑا ہوا ۔ اسد کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ باتیں کرتا جائے، تاکہ اُس کو سونے سے نجات مل جائے، مگر اُس کے دل میں کوئی بات نہ آ رہی تھی ۔

"تم مشین گن ساتھ لے کر سوتے ہو؟" اُس نے سرگوشی میں پوچھا۔

"نہیں۔ چاٹی میں رکھ دیتا ہوں۔"

"ماں کو پتا ہے؟"

"ہاں۔"

"تمہیں کچھ نہیں کہتی؟"

"نہیں۔"

وہ آنکھیں کھولے پتھر پہ چت لیٹا رہا۔ کبھی وہ آنکھیں بند کر لیتا، کبھی کھول دیتا۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کوئی بات کرے۔ اُس کا سانس بھاری ہو گیا تھا۔ ریاض نیچے والے زینے پہ اپنی ماں کے قریب لیٹ کر سو چکا تھا۔ وہ آنکھیں بند کرتا یا کھولتا، ایک منظر تھا جو چھوڑتا نہیں تھا، بے سر کے اُس دھڑ کا منظر جو کہنیوں کے زور پہ اُٹھتا ہی آ رہا تھا، جیسے کوئی بھوت ہو۔

(۹)

وہ پہاڑی کا موڑ مڑے تو سامنے گاؤں نظر آیا۔

"وہ ہے۔" ریاض سر کے اشارے سے بولا۔

"چار کوس!" اسد ہنسا۔ "عجیب نام ہے۔ اگر پانچ کوس پر ہوتا تو نام پانچ کوس رکھ دیتے؟"

"یہ تمہیں کس نے بتایا ہے؟"

"ماں نے۔"

"اونہوں۔" ریاض نے نفی میں سر ہلایا، "لنگری سے پانچ کوس پر ہے، اور ترمی سے تین کوس سے بھی کم۔ لوگوں نے کہانی بنالی ہے۔"

اسد حیران رہ گیا: "کیسے؟"

"بس۔ باتیں سن کر ایک خیال بنا لیتے ہیں، پھر اسی کو بتاتے جاتے ہیں۔ یہ نہیں دیکھتے کہ ٹھیک بھی ہے یا نہیں۔ ارد گرد کے گاؤں کا قصہ کچھ اور ہے۔"

"کیا ہے؟"

"ایک دفعہ ایک شخص کہیں سے اِدھر آ نکلا تھا۔ وہ چار کوس کی ایک عورت پر عاشق ہو گیا۔ وہ عورت بیاہتا تھی۔ بات باہر نکل گئی، اور عورت کے مالک اُس شخص کے پیچھے لگ گئے۔ آخر اُسے گاؤں چھوڑنا پڑا۔ مگر جانے سے پہلے اُس نے قسم کھائی کہ اگر اُس کا عشق سچا ہے تو وہ اِس گاؤں کے گرد اپنا نام لینے والوں کی ایک لکیر کھینچ دے گا۔ وہ گاؤں سے چند کوس کے فاصلے پر جا کر ایک جھونپڑی ڈال کر بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ خدا کے نام میں غرق ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ چند مہینے کے بعد جب وہ نکلا تو سوکھ کر کانٹا ہو چکا تھا، مگر اُس کا چہرہ چاند کی طرح چمک رہا تھا۔ جو بھی اُس کو ایک نظر دیکھ لیتا اُس کا مُرید ہو جاتا۔ آہستہ آہستہ اُس کے مُرید وہاں آ کر آباد ہونے شروع ہو گئے۔ دو تین برس میں وہاں آبادی پڑ گئی۔ پانچ برس کے بعد ننگے شاہ وہاں سے نکل کھڑا ہوا۔"

"ننگے شاہ اُس کا نام تھا؟"

"پتا نہیں اُس کا نام کیا تھا۔ کسی کو معلوم نہیں۔ مگر پہلے دن سے اُس نے کپڑے اُتار دیے تھے۔ اُس کے بعد کبھی کسی نے اُسے کپڑے پہنے نہیں دیکھا۔ گرمی ہو یا سردی، ایک لنگوٹی میں رہتا تھا۔ جب برف پڑتی تو ایک کمبل کی بُکل مار لیتا تھا۔ اس سے اُس کا نام ننگے شاہ پڑ گیا۔ خیر۔ اُس کے بڑے بڑے مُرید اُس کے ساتھ کُوچ کر کے اگلی جگہ پر پہنچ گئے، مگر زیادہ تر وہیں بیٹھے رہے۔ بستی ڈالنا آسان ہے، چھوڑ کر جانا آسان نہیں۔ نئی جگہ پر نئے لوگ اُس کی شہرت سُن کر آئے، اپنی اپنی غرضیں لے کر آئے اور کچھ وہیں رہ گئے۔ غریب لوگ روٹی کے نام پر آئیں یا نہ آئیں، خدا کے نام پر ضرور آتے ہیں۔ اور خُدا کا نام پیر فقیر کا نام ہی ہوتا ہے۔ خیر، یہاں بھی ہوتے ہوتے گاؤں پڑ گیا۔ پانچ سال کی مدّت پوری کر کے ننگے شاہ وہاں سے بھی چل پڑا۔ اسی طرح جگہ جگہ گاؤں آباد کرتا ہوا وہ چار کوس کے گرداگرد چلتا رہا۔ آخر چالیس سال کے عرصے میں اُس نے چکر ختم کر کے اپنی بات پوری کر دی۔"

"پھر کہاں گیا؟"

"وہ سامنے۔" ریاض نے ہاتھ سے اشارہ کر کے بتایا، "جہاں سبز جھنڈا لگا ہے۔"

"واپس چار کوس؟"

"ہاں۔ یہ اُس کا مزار ہے۔ چالیس سال میں چار کوس کے بہت سے لوگ اُس کے مُرید بن گئے تھے۔ جب اُس کا حصار ختم ہوا، ان گاؤں کو ننگے شاہ کا حصار کہتے ہیں، اور بھی اِدھر اُدھر کے بہت سے گاؤں حصاری گاؤں کہلاتے ہیں، جب حصار ختم ہوا تو چار کوس والے زور دے کر اُسے اپنے گاؤں لے آئے۔ کہتے ہیں سو سال سے اوپر اُس کی عمر ہوئی تھی۔ یہ اُس کا مزار ہے۔"

"اُس عورت کا کیا بنا ؟"

"کس عورت کا ؟"

"جس پر وہ عاشق تھا ۔"

"پتا نہیں ۔" ریاض لاپروائی سے بولا، "مر مرا گئی ہو گی ۔"

"عجیب بات ہے ۔" اسد حیرت سے بولا ۔ "اُس کی خاطر ایک علاقہ آباد ہوا ، اور اُس کا نام بھی کوئی نہیں جانتا ۔"

"یہ تو عشق کے کام ہیں ۔" ریاض نے کہا ۔ "بہانہ جو بھی بن جائے ۔"

"یہ بھی ایک کہانی ہی ہے ۔" کچھ دیر بعد اسد بولا ۔ "تمہارے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ کہانی سچی ہے ۔"

"ثبوت ؟" چلتے چلتے ریاض نے اُس کی طرف یوں دیکھا جیسے اُس کی کم عقلی پر حیران ہو رہا ہو ۔ "سارے ارد گرد کے گاؤں بعد میں بنے ہیں ۔ ثبوت کی کیا ضرورت ہے ؟"

"یہ تمہیں کیسے پتا ہے ؟"

"سب کو پتا ہے ۔ تحصیل کی کتابوں میں ، پٹواری کے کاغذوں میں ، سب جگہ لکھا ہے ۔ چار کوس سب سے پرانا ہے ۔ اُس وقت بھی یہ چار کوس تھا جب یہاں اور کوئی گاؤں نہیں تھا ۔"

اسد کھسیانا سا ہو کر چپ ہو رہا ۔ اُسے حیرت ہو رہی تھی کہ کیسے ان لوگوں نے اپنے زوردار مفروضوں میں اُلجھا کر اُس کی عقل کو کچھ دیر کے لیے معطل کر دیا تھا ۔ آخر اُس سے نہ رہا گیا :

"اگر لوگوں کو اِس بات کا علم ہے ۔" اُس نے پوچھا ، "تو پھر کیسے سب اس فرضی کہانی پہ یقین کر لیتے ہیں ؟"

"آسانی کے لیے ۔" ریاض نے جواب دیا ، "اِس کے نام سے ہی کہانی بنتی ہے ۔ آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے ۔ لوگوں کو فرضی باتوں پہ یقین کرنے کا کوئی شوق نہیں ہوتا ۔"

سورج سر پہ تھا اور گلیوں میں دھوپ سیدھی پڑ رہی تھی جب وہ گاؤں میں داخل ہوئے ۔ ریاض نے دو ایک جگہ رک کر عورت کا پتا دریافت کیا اور وہ اُس کے گھر پہنچے ۔ گھر اِس کے علاقے کے بیشتر گھروں کی طرح ایک کمرے پر مشتمل تھا ۔ عورت گھر کے آگے مختصر سی لیپی ہوئی زمین پر ، جو صحن کا کام دیتی تھی ، جھاڑو دے رہی تھی ۔ اُس نے کمر سیدھی کر کے لڑکوں کی بات سنی اور سادگی سے اُنہیں گھر کے اندر بیٹھنے کو کہا ۔ دروازے میں دس گیارہ برس کا ایک لڑکا بیٹھا تھا ۔ ریاض اور اسد اُس کے پاس سے گزر کر اندر داخل ہوئے اور ایک طرف زمین پر بیٹھ گئے ۔ کمرے

یہاں صرف چند چیزیں تھیں اور وہ بھی اپنی اپنی جگہ پر رکھی تھیں۔ اس کمرے میں صفائی کا احساس ہوتا تھا۔ اس کی دیواریں بھی، جو چھوٹے چھوٹے ٹیڑھے میڑھے پتھروں کو مہارت سے چُن کر کھڑی کی گئی تھیں، نسبتاً سیدھی اور صاف تھیں۔ عورت اندر آ کر اُن کے پاس زمین پر بیٹھی تو اسد کو اُس کی چال میں، اُس کے بیٹھنے کے انداز میں ایک ترتیب کا احساس ہوا۔ وہ ایسی عورتوں میں سے تھی جن کے چہرے سے اُن کی عمر کا اندازہ نہیں ہوتا۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے کم سے کم اجزا کے استعمال سے اس عورت کی تشبیہ تیار ہوئی تھی، اور اسی وجہ سے پائیدار تھی۔ س تشبیہ میں کوئی شے فالتو نہ تھی۔ اُس کی موجودگی میں اسد اور ریاض دونوں پر خاموشی چھا گئی۔

"خوشی کیوں نہیں آیا؟" عورت نے پوچھا۔

"خوشی کام پر ہے۔" اسد نے جواب دیا، "کچھ دن کے بعد آئے گا۔"

وہ چند لمحوں تک شیشے کی سی شفاف نظروں سے اسد کو دیکھتی رہی۔ آخر اسد کی نظر ٹوٹ گئی اور وہ آنکھیں جھکا کر انگلیوں سے کرتے کی جیب ٹٹولنے لگا۔

تھوڑی دیر میں اُس نے جیب سے کاغذ کا ایک پُرزہ برآمد کیا۔

"دکھاؤ۔" عورت اُس کی جانب سر جھکا کر بولی۔

اسد نے پُرزہ اُس کے ہاتھ میں پکڑا دیا۔ وہ کئی لمحے تک کاغذ پر بنی ہوئی اُس پتے کی شکل کو دیکھتی رہی، جیسے ذہن کو کھوج رہی ہو۔

"ہاں۔" پھر وہ سر اُٹھا کر بولی۔

"اس کا نام کیا ہے؟" اسد نے پوچھا۔

"نام معلوم نہیں۔ مگر میں جانتی ہوں۔"

"کہاں ملتی ہے؟"

"یہیں۔" وہ سر کے ہلکے سے اشارے سے بولی، "رجمار کے بیلے میں۔"

"اِس موسم میں ہوتی ہے؟"

"ہاں۔"

اسد نے ریاض کی طرف دیکھا۔

"اِس کا چُننا مشکل کام ہے۔" عورت بولی، "تمہارے بس کا نہیں۔ ہلکی بوٹی ہے۔ میں لے آؤں گی۔ کس مرض میں کام آتی ہے؟"

"سانس کے مرض میں۔" اسد نے کہا۔

"کس کو ہے؟"

"علی کو ہے۔" ریاض نے جواب دیا۔

"تھ تھ۔" وہ افسوس سے سر ہلا کر بولی، "لمبا مرض ہے۔ جان کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ مگر بوٹی میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ اللہ شفا دے گا۔ ہلکی بوٹی ہے، دو دو چار چار پتے چُننی پڑتی ہے۔ ایک دو دن میں جتنی ملی لے آؤں گی۔ تیسرے دن آ کر لے جانا۔ پتے اتار دوں؟"

"ساتھ ہی رہنے دینا۔" اسد نے کہا۔

"خوشی کہتا ہے کسی کسی بوٹی کے پتوں کی خاصیت اور ہوتی ہے، ڈنڈی کی خاصیت اور ہوتی ہے۔ اپنا اپنا علم ہے۔"

"میں پیسے دے دوں گا۔" اسد نے کہا، "میرے پاس پیسے ہیں۔"

"پیسوں کی مجھے ضرورت نہیں۔ میں محنت کرتی ہوں۔ تم خوشی کے جاننے والے ہو،" عورت بولی، "یہ بتاؤ وہ کیوں نہیں آیا؟ تین مہینے ہو گئے ہیں۔ کس کام پر گیا ہے۔"

"ضروری کام پر گیا ہے۔" اسد نے کہا۔ عورت کی نظریں اس پر لگی رہیں۔ اسد کو کوئی اور بات نہ ملی تو بولا: "میں نے سنا تھا کوئی اور آدمی ہے جو جڑی بوٹیوں کا کام کرتا ہے اور خوشی اس سے لے جایا کرتا ہے۔"

"تم خوشی سے مل کر نہیں آئے؟"

اسد کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ "وہ کام پر گیا ہوا ہے۔" اس نے دہرا کر کہا۔

"نہیں۔" وہ بولی، "اس علاقے میں کسی اور کو اس چیز کا علم نہیں۔ خوشی سارا سارا دن ان کے پیچھے جنگلوں میں پھرتا رہتا ہے، جیسے کوئی سودائی ہو۔ پھر لا کر ان لوگوں میں بانٹ دیتا ہے، کچھ باندھ کر اُدھر لے جاتا ہے۔ کہتا ہے اُدھر کوئی بڑا حکیم ہے اس سے تھوڑا بہت علم اسے ملا ہے۔ کوئی کچھ دے تو لے لیتا ہے، نہیں تو کہتا ہے یہ اللہ واسطے کی چیز ہے، وہی اس میں شفا ڈالتا ہے، وہی نکال لیتا ہے۔ اُدھر سے جب آتا ہے تو کچھ پیسے لاتا ہے۔ اُدھر اس کا کچھ کاروبار ہے۔ مگر پہلے اتنی دیر تک اُدھر نہیں رہا۔ تین مہینے ہو گئے ہیں۔ آج سورج میں بڑی تپش ہے۔ تمہیں پیاس لگی ہو گی۔ میں تمہارے لیے لسی لے کر آتی ہوں۔"

وہ اٹھی اور دیوار کے پاس رکھی ہوئی کھلے منہ کی مٹی کی ایک مٹکی اٹھا کر باہر نکل گئی۔ اسد نے اسے بے کاوش چلتے پھرتے، مڑتے اور باہر جاتے ہوئے دیکھا، جیسے ہوا چلتی ہو، اور اس کے دل میں بے معلوم سا افسوس پیدا ہوا۔

بچہ دہلیز پہ بیٹھا روٹی چباتا اور بھری بھری نظروں سے اُن دونوں کو دیکھتا رہا۔ چند منٹ کے بعد عورت دونوں ہاتھوں میں مٹکی تھامے اندر داخل ہوئی۔ اُس نے مٹکی زمین پہ رکھ کر چٹکی بھر پسی ہوئی سُرخ مرچیں اُس میں چھڑکیں۔ اُس کے بعد مٹی کے ایک برتن سے نمک کی چھوٹی سی ڈلی نکال کر مٹکی میں گرائی۔ پھر اُس نے المونیم کا ایک گلاس پانی سے دھویا اور ایک ہاتھ سے مٹکی اُٹھا کر لسی گلاس میں اُنڈیلی۔ نمک کی ڈلی لسی کے ساتھ کھٹاک سے گلاس میں گر پڑی۔ پھر گلاس کو اُونچا لے جا کر ایک دھار سے لسی واپس مٹکی میں گرائی۔ نمک کی ڈلی کھٹاک سے مٹکی میں آ گری، جس سے لسی کا ایک ہلکا سا چھینٹا مٹکی کے مُنہ سے اُڑ کر باہر زمین پر آ گرا۔ دو تین بار اسی طرح لسی کو پھینٹنے کے بعد اُس نے مٹکی اور گلاس اُن دونوں کے سامنے زمین پہ لا رکھے اور اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔

”تم چارکوس کی رہنے والی ہو؟“ ریاض نے لسی گلاس میں اُنڈیلتے ہوئے اُس سے پوچھا۔

”نہیں۔ مَیں جھنڈیاں کی ہوں۔ مَیں ویسراج صراف کے گھر کام کرتی تھی۔“ عورت نے دیہاتیوں کے آسان انداز میں اپنی کہانی بیان کرنی شروع کر دی۔ ”وہیں پر مَیں بڑی ہوئی۔ وہاں سے مَیں اسمٰعیل دکاندار کے ساتھ نکل کر رجبار چلی آئی۔ اُس نے مجھے مسلمان کر کے میرے ساتھ نکاح کر لیا۔ دو سال مَیں اُس کے ساتھ رہی۔ دو سال کے بعد وہ مجھے چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ عبداللہ“ اُس نے دروازے میں بیٹھے ہوئے لڑکے کی طرف دیکھا ”میرا بیٹا ہے۔ مَیں نے پھر گھروں میں محنت شروع کر دی۔ وہیں پر خوشی رجبار کے بیلے میں آیا کرتا تھا۔ وہ مجھے اور عبداللہ کو یہاں لے آیا۔ مجھے اُس نے بڑی آبرو سے رکھا ہے۔ یہ گھر“ اُس نے کوٹھے کی دیواروں پہ نظر ڈالی ”اُس نے اپنے ہاتھوں سے میرے لیے بنایا ہے۔ مگر اُس کے سر میں کوئی سودا ہے۔ کہیں ٹِک کر نہیں بیٹھتا، اِدھر سے اُدھر پھرتا رہتا ہے، ہاتھ میں جو کچھ ہوتا ہے دے دیتا ہے۔ اُس کے اندر کوئی ایسی چیز ہے۔۔۔“

عورت کے سفید چہرے پر پہلی بار رنگ کی ایک جھلک آئی، پھر دُوسری، پھر تیسری، جیسے تیزی سے خیال بدل رہے ہوں۔

”کیا چیز ہے؟“ اسد نے تجسّس سے پوچھا۔

وہ آنکھیں پھیلائے ایک تار اُسے دیکھتی رہی، جیسے کوئی خیال ڈھونڈ رہی ہو۔ پھر سادگی سے بولی: ”اُس کے دل میں لالچ نہیں۔“

اسد نے دروازے کے باہر نظر دوڑائی۔ باہر دھوپ میں چمکتی ہوئی مکانوں کی ننگی دیواروں کا اسرار پھیلا تھا۔ ریاض نے دو گلاس لسی کے چڑھا کر خالی گلاس اسد کے آگے رکھ دیا۔ اسد نے گلاس بھر کر لسی کا پیا۔ پھر وہ اُٹھ کھڑے ہوئے۔ اسد خاموش تھا۔ وہ پہاڑی راستوں پر آگے پیچھے چلے آ رہے تھے جہاں دھوپ تیز اور نیم سرد پتھروں پہ

چمک رہی تھی۔ انسانی زندگی کے اسرار میں تہہ در تہہ اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ اس آدمی کی حقیقت کیا تھی؟ خوشی محمد — ایجنٹ۔ ڈبل ایجنٹ۔ ملزم۔ اور اب؟ درویش!

اور میرا الجھن؟ کیا یہ میری قسمت میں لکھا ہے، اسد نے سوچا، کہ جس شخص سے مجھے فائدہ ملے وہ ہمیشہ میرے سامنے ایک معمہ بنا رہے؟ پہلے حکیم، اور اب خوشی۔ یہ کیسا راز ہے......... اسد کے دل میں شبہے کا تاریک اور حسیم پہلو، جس کو اس نے ایک مثبت عمل کا قدم اٹھا کر اپنے تئیں سلانے کی کوشش کی تھی اور یہ سمجھ رکھا تھا کہ اب راستے سے ہٹ چکا ہے، وہیں موجود تھا اور دوبارہ کروٹ لے رہا تھا۔ آدمی کے اسرار کی کون سی ایسی صورت پیدا ہو جس پہ وہ دو ٹوک یقین کر سکے؟ وہ ہاتھ پیچھے باندھے، سر جھکائے، ماتھے پہ فکر کا بوجھ لیے چلا جا رہا تھا اور ایسی کوئی ایک صورت ناپید تھی۔ ہر ایک تہہ کا ایک رُخ تھا، اور خوشی محمد کے اس رُخ نے اس کے فہم کو پچھاڑ دیا تھا۔ اس نے گھبرا کر اس خیال کو جھٹک دیا۔

ریاض باتیں کرتا چلا جا رہا تھا۔ عورت کی موجودگی میں خاموش بیٹھے رہنے کے بعد اب گویا اُسے زبان لگ گئی تھی۔ اسد نے دیکھا کہ باتیں کرتے کرتے ریاض اُس عورت کا ذکر بار بار کرتا، اور جب وہ اُس کا ذکر کرتا تو اُس کی باتوں میں ایک چمک پیدا ہوتی۔ عورت کا نام جنت تھا اور وہ عمر میں ریاض سے پندرہ سال بڑی ہوگی، مگر اس نے اس نوعمر لڑکے کو مسحور کر دیا تھا۔ ریاض کو اس حالت میں دیکھ کر اسد کو ایک انجانی سی مسرت ہوئی۔

"پرسوں آئیں گے۔" اسد نے کہا۔

"کل بتاؤں گا۔" ریاض نے جواب دیا۔

"کیوں؟"

"رات کو چچا کے گھر پہ پتا چلے گا۔"

"کس بات کا؟"

"اُدھر سے سپاہی آ رہے ہیں۔"

"اتنی جلدی؟"

"ہاں۔" ریاض نے کہا، "دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔"

جب سے انہوں نے ٹرک مارا تھا اُس دن سے اُن کی نقل و حرکت پہ مکمل پابندی لگ چکی تھی۔ فوج اور پولیس نے وسیع پیمانے پر چھاپے مارے تھے اور بیسیوں لوگوں کو پکڑ کر لے گئی تھی۔ گرفتار شدگان میں کئی ان کے آدمی بھی تھے۔ اب یہ لوگ اس دھڑکے میں دم سادھے بیٹھے تھے کہ ایذا کے زیر کس کس کی ہمت جواب دے

جاتی ہے اور کون کون کب اُٹھتا ہے، اور بکتا ہے تو کیا بکتا ہے۔ سلطان شاہ کے حلقے میں رائے دو دھڑوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ایک دھڑے کی رائے تھی کہ سرکار اس وقت گھبراہٹ کے عالم میں ہے، فوج اور پولیس پہ دباؤ بڑھانے کے لیے اپنی کارروائی تیز کر دینی چاہیے تاکہ بدامنی بڑھے، فوج کی دست اندازی میں اضافہ ہو، حکومتوں پر دباؤ پڑے اور جنگ کی کوئی صورت نکلے۔ دوسرا دھڑا، جس میں پرانے پرانے گھاگ قسم کے لوگ شامل تھے، کہتا تھا ابھی وقت نہیں، دبکے رہو اور یہ مرحلہ کاٹو، مناسب وقت کا انتظار کرو۔ ان دنوں بہر کیف تمام کارروائیوں میں ایک عارضی تعطل پیدا ہو چکا تھا۔ ریاض، غلام اور اسد کو سخت سرزنش کے بعد سلطان شاہ نے گھروں میں تقریباً مقید کر دیا تھا۔ اُن کا ابھی تک فوج یا پولیس کی گرفت سے بچے رہنا ایک معجزے سے کم نہیں تھا، گو وہ دن دن، رات رات بھر گھر میں بیٹھے چھوٹے سے چھوٹے کھٹکے پر چونک اُٹھا کرتے تھے۔ چند روز کے بعد تنگ آ کر ریاض نے باہر نکلنا شروع کر دیا۔ اُس کی ماں نے دو ایک بار اُسے منع کیا، پھر خاموش ہو رہی۔ ریاض سلطان شاہ کے پاس بھی ہو آیا تھا، اور گو سلطان شاہ نے اُسے دُور کہیں جانے سے سختی کے ساتھ منع کر رکھا تھا، مگر آج خود سری میں وہ اسد کو لے کر چار کوس کو نکل آیا تھا۔ اور اب اُس نے یہ خبر دی تھی۔

"اتنی جلدی کیوں آ رہے ہیں؟" اسد نے پھر پوچھا۔

"کچھ لوگوں نے پیسوں کے لیے تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ہمارے اپنے لوگ تو ٹھیک ہیں، مہینہ دو مہینے بھی نکل جائیں تو چپ رہتے ہیں۔ بیلے کی طرف کے لوگ لالچی ہیں، پیسے کے لیے اُن کا کرتہ اور بندوق کے لیے ہاتھ کھلا رہتا ہے۔ اُن کا پیٹ نہیں بھرتا پیسے کے بغیر ایک قدم نہیں چلتے۔"

"ہو سکتا ہے اُدھر سے بھی پیسہ لیتے ہوں۔"

"اُدھر سے اُن کو ملتا نہیں ورنہ لینے سے انکار نہ کریں۔"

"اسلحہ بھی ان کو دیتے ہو؟"

"پہلے دیتے تھے، اب نہیں۔ بیچنے لگ گئے تھے۔ کچھ بندوقیں فوج کے ہاتھ میں چلی گئی تھیں۔ اب پیسوں سے ان کا منہ بھرتے ہیں۔ مگر مانگنے سے باز نہیں آتے۔"

"ہو سکتا ہے"، اسد نے بات کی، "صرف پیسے دینے آ رہے ہوں۔"

"ہاں"، ریاض نے جواب دیا، "مگر افواہ ہے کچھ نہ کچھ ہوگا۔"

"تمہیں کہاں سے پتا چلا ہے؟"

"چچا سے۔ ایک نیا آدمی کل اِدھر آیا ہے۔ شہر چلو گے؟"

"ابھی؟"

"رات کو۔"

اسد نے غیر یقینی نظروں سے ریاض کو دیکھا۔

"چچا کچھ نہیں کہے گا۔" ریاض شرارت سے بولا، "مَیں تین بار ہو آیا ہوں۔"

"تم آج بھی بغیر اجازت کے مجھے اِدھر لے آئے ہو۔"

"ٹھیک ہے۔" ریاض ضدی لہجے میں بولا، "تمہارا کام ضروری تھا۔ کبھی نہ کبھی تو کرنا ہی تھا۔"

"تم ایسی مُنہ زوری کیوں کرتے ہو؟" اسد نے پوچھا۔

"تم تو آرام طلب ہو۔ باتیں کرنے میں ہُشیار ہو، ہاں ہاں کرتے رہتے ہو مگر تمہارے ہڈ نہیں ہلتے۔ مَیں اندر بیٹھا بیٹھا تنگ آ جاتا ہوں۔"

"ہماری حفاظت کے لیے ہی سُلطان کہتا ہے۔"

"چچا تو بے عقل ہے۔ تم اُس سے بھی بے خبر لے گئے ہو؟ نہیں پتا ہے کہ جتنے لوگ چھاپے میں پکڑے گئے ہیں سب گھروں میں بیٹھے ہوئے تھے، یا سوئے ہوئے تھے۔ چچا کے کہنے پر مَیں دو دن گھر پہ بیٹھا رہا۔ میرے ہاتھ میں ہوتا تو گھر آتا ہی نہ۔ تم لوگوں کی عقل میں اتنی سی بات نہیں آتی۔ آگے کیا کرو گے؟"

اسد حیرت سے اُسے دیکھتا رہا۔ اچانک اُس کو ایک خیال آیا، جو کئی بار اُس کے دل میں پیدا ہوا تھا۔

"ریاض،" کچھ دیر کے بعد وہ بولا، "تم یہ کام کیوں کرتے ہو؟"

"کون سا کام؟"

"یہ خون خرابے کا کام۔"

"سب کرتے ہیں۔"

"میرا مطلب ہے پیسوں کی تمہیں حِرص نہیں، اور کسی چیز کا لالچ نہیں۔ پھر کیوں اپنے آپ کو خطرے میں ڈالتے رہتے ہو؟"

"کیوں کا تو کوئی جواب نہیں۔"

"پھر بھی، کوئی وجہ تو ہوتی ہے۔"

"وجہ کیا ہو گی۔" ریاض لاپروائی سے بولا، "ہم غریب لوگ ہیں۔ دولت والے لوگ اپنے لیے قانون بناتے ہیں، ہم اُنہیں توڑتے ہیں۔ جب تک وہ اپنے قانون بناتے رہیں گے، غریب لوگ اُنہیں توڑتے رہیں گے۔"

وہ دھوپ میں آگے پیچھے چلتے رہے۔

"تمہارا مجھے پتا نہیں، میں پرسوں آؤں گا۔" کچھ دیر کے بعد اسد بولا۔

"اکیلے آؤ گے؟"

"ہاں۔ تمہارا کیا خیال ہے، جنت تمہارے بغیر مجھے بوٹی نہیں دے گی؟"

ریاض ہنس پڑا۔ "تم اکیلے نہیں آسکتے۔"

"کیوں؟"

"رستہ بھول جاؤ گے۔"

"پوچھ پوچھ کر آجاؤں گا۔ جنت کا پتا تو بہت آسان ہے۔"

دفعتہً چلتے چلتے اسد کو احساس ہوا کہ دس قدم پر جو موڑ آرہا ہے، وہ مڑنے کے بعد چار کوس نظروں سے اوجھل ہو جائے گا۔ غیر ارادی طور پر اس کے قدم رک گئے۔ اس نے مڑ کر نظر ڈالی۔ گاؤں آدھے سے زیادہ ایک پہاڑی کی اوٹ میں جا چکا تھا، مگر چند لمحے تلاش کرنے کے بعد اس کی نظروں کو جنت کا گھر مل گیا۔ وہ معمولی سا نیچی چھت والا گھروندا اس فاصلے سے بھی ان آلٹے سیدھے گھروں کے ہجوم میں الگ تھلگ دکھائی دے رہا تھا گو اس کی دیواریں ساتھ والے گھروں سے ملتی تھیں۔ اس کے طول و عرض میں اور اس کی بناوٹ میں ایک صاف ستھری ترتیب دکھائی دیتی تھی جو دیواروں کے اس جمگھٹ میں ایک محور کے مانند تھی، جس نے کہ معلوم ہوتا تھا اس بے ترکیب بنی ہوئی آبادی میں اپنی موجودگی سے ایک توازن پیدا کر رکھا تھا۔ اس گھر کو، اسد نے سوچا، کیوں میں یہاں رک کر دیکھ رہا ہوں؟ اس گھر سے میرا کیا تعلق ہے؟ وہ پلٹا اور تیز تیز چلتا ہوا راستے کا موڑ مڑ گیا۔ چار کوس اس کی نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ وہ جتنی بھی کوشش کرتا کہ خوشی محمد کا خیال اس کے دل میں نہ آئے، اتنا ہی وہ خیال اس کے دل میں بیٹھتا جا رہا تھا۔ آخر تنگ آ کر اس نے اس خیال کو دل سے نکالنے کی کوشش ترک کر دی اور پہلی بار عمداً خوشی محمد کی شکل کو یاد کرنے کی کوشش کی۔ اسے یہاں تک اچھی طرح یاد تھا کہ وہ اس آدمی سے واقف ہے، اسے دیکھ بھی چکا ہے، مگر کوشش کے باوجود اسے اس کا چہرہ یاد نہیں آرہا تھا، جیسے کوئی خیال ہر جو دل پہ پھر رہا ہو مگر ذہن میں نہ آتا ہو۔ اس کے منہ پر ڈاڑھی تھی، یا وہ ڈاڑھی منڈاتا تھا؟ اس کا چہرہ لمبا تھا یا چوڑا تھا، سر پہ بال تھے یا وہ سر سے گنجا تھا، یا کہ اس کے بال ٹوپی میں چھپے تھے؟ اس نے کئی مختلف شکلوں کو آنکھوں کے سامنے لانے کی کوشش کی، مگر اس کے ذہن میں اگر آتا تھا تو ایک ہی نقشہ آتا تھا، اور وہ نقشہ یہ تھا: حوالات کے دروازے کی سلاخیں ہیں اور ان کے پیچھے نیم اندھیرے میں ایک دھندلا سا چہرہ ہے جس کے نقش صاف نظر نہیں آرہے۔ اس نے ذہن

کی آنکھوں کو بار بار پھیلا کر اور سکیڑ کر دیکھا، مگر یہ نقشہ نہ بدلا۔ صرف کبھی کبھی، حیرت انگیز طور پر، وہ چہرہ اندھیرے میں سے اُبھرتا اور لمحے بھر کے لیے اُس کے نقش صاف ہو جاتے، اور وہ چہرہ اسد کا اپنا چہرہ ہوتا۔ پھر فوراً ہی وہ نقش پھیل کر دُھندلا جاتے اور خوشی محمد کے غیر معین چہرے میں تبدیل ہو جاتے۔ اسد نے کئی بار نظریں اُٹھا کر ریاض کی جانب دیکھا، جیسے مدد کے لیے پکار رہا ہو۔ مگر ریاض اب خاموش تھا اور آگے آگے چلا جا رہا تھا۔

باقی کا دن گھر پہ گزار کے وہ دونوں شام کے وقت باڑے کے لیے روانہ ہوئے۔ جس وقت وہ آبادی میں داخل ہوئے رات پڑ گئی تھی۔ سلطان شاہ کے گھر کا دروازہ اُس کی بیوی نے کھولا۔ ایک منٹ تک اُس نے ریاض سے بات کی اور دروازہ بند کر لیا۔ ریاض اسد کو لے کر واپس چل پڑا۔

"سلطان گھر پہ نہیں ہے" اسد نے پوچھا۔

"دین کے گھر ہے۔"

"کہاں ہے؟"

"اُدھر۔"

وہ اندھیری گلیوں میں دیر تک چلتے رہے حتیٰ کہ قصبے سے باہر نکل آئے۔ پھر وہ ایک مختصر سا چکر لگا کر ایک مقام پہ دوبارہ قصبے میں داخل ہوئے۔ اسد دین سے پہلے مل چکا تھا مگر اُس کے گھر کبھی نہیں آیا تھا۔ اس تاریک گلی کے وسط میں، بڑے گھروں کے درمیان پھنسا ہُوا تنگ سا دین کا گھر تھا۔ اُس کا دروازہ عام دروازوں کی نسبت چھوٹا تھا، جیسے ذرا بڑے سائز کی کھڑکی ہو۔ اسد اور ریاض ابھی چند قدم دُور ہی تھے کہ دروازہ کھلا، ایک سر اندر سے لمحے دو لمحے کو نمودار ہوا، پھر غائب ہو گیا۔ اُس کے بعد تین آدمی یکے بعد دیگرے دروازے سے جُھک جُھک کر باہر نکلے۔ ایک سیکنڈ کو تینوں نے رُک کر سامنے نظر ڈالی اور دُوسری طرف کو چل پڑے۔ دروازہ کھلا رہا۔ اندر جو شخص کھڑا تھا اُس نے ریاض کو پہچان لیا تھا اور وہاں رُکا ان دونوں کے داخل ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

اسد ٹھٹک کر رُک گیا۔ اُس کی نظریں اُن تین آدمیوں میں سے ایک پہ لگی ہُوئی تھیں۔ یہ کون ہے؟ اسد نے ذہن پہ زور دیتے ہوئے سوچا، میں اسے جانتا ہوں۔ اندھیرے کی وجہ سے وہ اُس کی شکل نہ دیکھ پایا تھا، مگر اُس کی شبیہہ دیکھی بھالی تھی اور اُس کی چال بے حد مانوس تھی۔ میں اس سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہ ہے کون؟ وہ تینوں آدمی تیزی سے اندھیرے میں غائب ہوتے جا رہے تھے۔ اسد آنکھیں پھیلائے پہچاننے کی کوشش کرتا ہوا اُن کے پیچھے چل پڑا اور دروازے سے آگے نکل گیا۔

"علی!" ریاض نے نیچی آواز میں اُسے پکارا۔

جیسے ہی ریاض کی آواز اُس کے کان میں پڑی اُسی لمحے گویا کسی نے اسد کے ذہن کا کوئی بٹن دبا دیا ہو۔ اُس نے زیرِلب ایک حیرت زدہ گالی دی اور اُس کے جسم پہ روئیں کھڑے ہونے لگے۔ میر حسن ! یہ میر حسن ہے۔ یہاں کیا کر رہا ہے ؟ اسد کی سمجھ میں نہ آرہا تھا کہ کیا کرے، میر حسن کے پیچھے بھاگے یا وہیں کھڑا رہے۔ ریاض کی آواز دوبارہ اُس کے کان میں پڑی۔ ریاض اب دروازے کے اندر کھڑا اشارے سے اُسے بُلا رہا تھا۔ اسد بھاگ کر دروازے پر پہنچا اور ریاض کو ایک بازو سے پکڑ کر کھینچتا ہوا بولا :

"وہ کون ہے ؟"

"کون ؟" ریاض نے جھک کر ایک قدم باہر رکھا اور اندھیرے میں آنکھیں پھیلا کر دیکھنے کی کوشش کی۔

"وہ جو بیچ میں جا رہا ہے۔"

"کیوں ؟" وہ بولا۔

"میں اسے جانتا ہوں۔"

"پھر مجھ سے کیوں پوچھتے ہو ؟"

"یہ یہاں کیا کر رہا ہے ؟"

"نہیں پتا ہوگا۔"

اسد اُس کا بازو چھوڑ کر میر حسن کے پیچھے بھاگنے لگا تو ریاض نے اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"یہ بیلے کے آدمی ہیں۔ پیسے ویسے لینے آئے ہوں گے۔ میں اسے جانتا نہیں، مگر پہلے میں نے دیکھا ہے۔ تم کہاں بھاگ رہے ہو ؟"

"میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔"

"کیا بات ؟"

"یہ گمشدہ کا لڑکا ہے۔ وہاں سے بھاگ کر آیا ہے۔"

"کیوں ؟"

اسد ٹھٹک کر اس کا منہ دیکھنے لگا۔ ایک لمحے کے لیے اُس کا ذہن مکمل طور پہ خالی ہو گیا۔ وہ کیا جواب دے ؟ کیا وہ اُس کو ساری بات بتا دے ؟ ساری نہیں تو کتنی بتائے ؟ اِتنی جلدی میں کیسے بتائے ؟ ریاض اُس کا ہاتھ اندر کھینچ رہا تھا۔

"چلو۔" ریاض بیتابی سے بولا، "دروازے میں نہیں رک سکتے۔"

اسد نے آخری بار بے اُمیدی سے اندھیرے میں غائب ہوتے ہُوئے اُن تین آدمیوں پر نظر ڈالی۔ میر حسن اپنے مخصوص انداز میں بازو ہوا میں لہرا کر اپنے ساتھی سے کوئی بات کر رہا تھا۔ پھر اسد جھک کر ریاض کے پیچھے دروازے میں داخل ہو گیا۔ اندر کھڑے ایک آدمی نے دروازہ بند کر لیا۔ اسد کا دل پھڑ پھڑا رہا تھا۔

دین کا گھر دو کمروں پر مشتمل تھا۔ پہلے کمرے میں سب جمع تھے۔ ایک کونے میں کھاٹ پر سلطان شاہ ایک اور شخص کے ساتھ بیٹھا ہاتھ اٹھا اٹھا کر نیچی آواز میں باتیں کر رہا تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھوں کی حرکت اور بات کی روانی توڑے بغیر گہری نظروں سے اسد اور ریاض کی جانب دیکھا۔ وہ دونوں جا کر ایک طرف بیٹھ گئے جہاں پہلے تین آدمی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ کمرہ تمباکو کے دھوئیں سے بھرا تھا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اسد نے سُونگھ لیا تھا کہ یہ دھواں عام کشمیری تمباکو کا دھواں نہ تھا۔ اس کا بھید چند منٹ کے بعد کھلا جب اُس شخص نے، جس سے سلطان باتیں کر رہا تھا، جیب سے ولایتی سگرٹوں کی ایک ڈبیا نکالی اور ایک سگریٹ خود نکال کر دوسرا سلطان کو پیش کیا۔ دونوں نے سگریٹ سلگائے۔ دوبارہ بات شروع کرتے کرتے سلطان نے آواز بہت نیچی کر لی۔ کچھ دیر تک اُسی خفیہ لہجے میں باتیں کرنے کے بعد اُس نے چاروں طرف ایک اور نظر دوڑائی، پھر بولنا بند کر کے سر کے ایک ہلکے سے اشارے کے ساتھ اپنے مخاطب کو پچھلے کمرے میں چلنے کے لیے کہا۔ اُس شخص نے ایک کاغذ، جو اُس نے کھاٹ پر پھیلا رکھا تھا، اُٹھا کر تہہ کیا، اور وہ دونوں اُٹھ کھڑے ہوئے۔

اُنہیں پچھلے کمرے میں گئے چند منٹ ہوئے تھے کہ ریاض کسمسا کر اسد کے قریب سے اُٹھا اور پچھلے کمرے کی جانب بڑھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اسد نے پوچھا۔

"پیچھے۔"

اسد اُس کی سینہ زوری پر حیران رہ گیا۔ ریاض ایک منٹ تک غیر یقینی انداز میں دروازے میں اٹکا کھڑا رہا، پھر قدم بڑھا کر اندر داخل ہو گیا۔ جہاں اسد بیٹھا تھا وہاں سے پچھلے کمرے کی کوئی شئے نظر نہ آ رہی تھی۔ خاموشی اتنی تھی جیسے اُس کمرے میں کوئی بشر موجود نہ ہو۔ یہ لوگ کیا باتیں کر رہے ہیں، اسد نے بے خیالی میں سوچا۔ دین کہاں ہے؟ کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ اُس نے ایک نظر پاس بیٹھے ہوئے تین آدمیوں پر ڈالی۔ وہ دیکھنے میں عام کشمیری مزدور لگ رہے تھے جو دیوار کے ساتھ چپ بیٹھے تھے۔ وہ آدمی جس کی ڈیوٹی دروازے پر تھی اب آ کر خالی کھاٹ پر بیٹھ گیا تھا۔ خاموشی اتنی تھی کہ پچھلے کمرے میں ماچس کی تیلی کے جلنے کی آواز آئی۔ پانچوں آدمیوں نے اُدھر دیکھا۔

تیل کی روشنی لمحے بھر کے لیے دروازے میں اُبھری، پھر غائب ہوگئی۔ تھوڑی دیر کے بعد دیوار کے ساتھ بیٹھے ہوئے تینوں آدمیوں نے سرگوشیوں میں باتیں شروع کردیں۔ اُن کی آواز اسد کے کان میں پڑی اور اُس نے سر موڑ کر اُن کی جانب دیکھا۔ مگر اُس کی آنکھوں نے دیکھنا اور کانوں نے سُننا بند کردیا تھا۔ صرف ایک نام ہتھوڑے کی طرح اُس کے دماغ پر پڑ رہا تھا۔ میر حسن! جہاں تک آس پاس کی چیزوں کا تعلق تھا، وہ محض اُن کی حرکات کو دیکھ بھال رہا تھا، اُن کی نوعیت سے بے خبر تھا۔ اُس کے اندر کی نظروں کے سامنے ایک ہی شکل تھی —— یا اُس شکل کے متعدد رُخ تھے: میر حسن کا نازک ہڈیوں والا پرندہ چہرہ، دھیمے قدیم بخار کی چمک لیے ہوئے تیز آنکھیں، اُس کے بدن کی جھٹکے دار حرکات، ڈری ڈری، مگر قوی اور پھرتیلی۔ جیسے کہ وہ حکیم کے مطب میں کھڑا ہے اور دہشت زدہ پُرسکوت آواز میں کہہ رہا ہے، "میں تو آیا ہی ہوں!" اور پھر، حرکت کا کوئی اشارہ دیے بغیر وہیں کھڑا کھڑا پاؤں سے اُٹھتا ہے اور ایک حیرت انگیز چھلانگ کے ساتھ کمرے کو پار کرکے بھوت کی مانند اندھیرے میں غائب ہوجاتا ہے، نہ پاؤں کی چاپ چھوڑتا ہے نہ نشان! اب یہاں کیسے پہنچ گیا ہے؟ کب سے یہاں پر ہے؟ اُسی وقت سے؟ مجھے اس کا پتا کیوں نہیں چلا؟ واپس گنبد جا کے آیا ہے یا یہیں پر رہا ہے؟ رُخ بدلتا ہے: اب کیسے اعتماد سے اپنے ساتھیوں کے ساتھ دروازے میں سے نکلتا ہے اور ایک طرف کو چل پڑتا ہے، جیسے اُسے پوری خبر ہے کہ کدھر کو جا رہا ہے، مگر اُسی چال سے، اُسی حرکت کے ساتھ، بازو کو جھٹکے سے ہوا میں اُٹھاتا اور گراتا ہوا، باتیں کرتا ہوا، بھوت کی طرح پھر اندھیرے میں غائب ہوجاتا ہے۔ کیا اسے بھی ذوالفقار نے بھرتی کیا ہوگا؟ ضرور کیا ہوگا۔ پھر ذوالفقار نے کیوں مجھ سے اِس کا ذکر نہیں کیا؟ مَیں اُس کا نام چھپائے پھرتا ہوں اور کوئی مجھ کو اُس کی خبر ہی نہیں دیتا۔ یہ کیسا انصاف ہے۔

اُس کے ذہن پر ایک ضرب اور پڑی۔ انصاف! یہ کیا چیز ہے؟ یہ قدیم آفت! شُبہے کے دُکھ کے ساتھ ساتھ اب انصاف کے تاریک عفریت نے اُس کے دل میں کروٹ لینی شروع کردی تھی۔ اسد کے اندر ایک شدید کرب کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ اس عفریت کو سر کرنے کے لیے اُس نے جان کی بازی لگا دی تھی —— اُس نے ایک لمحے کے لیے سر فخر سے اونچا کر کے سوچا —— مگر یہ بلا وہیں کی وہیں موجود تھی۔ کیا ہر قدم پر، ہر موڑ پر، ہر مرحلے پر جان کی بازی لگانا ضروری ہے؟ کیا یہ قصّہ کبھی طے نہیں ہوتا؟ یہ کیسا انصاف ہے، اُس نے سوال دل میں دہرایا، پھر اپنے سوال کی حماقت پر تلملا اُٹھا۔ اُس کے دل میں شدید مایوسی کی ایک لہر اُٹھی۔ اُس نے سمجھا تھا کہ اگر وہ خاموشی سے حالات کا شکار بنے رہنے کی بجائے اپنے ارادے کا، اپنے عہد کا ایک قدم اُٹھا کر حالات کا شکار کرنے کو نکلے تو اُس کا معاملہ طے ہوجائے گا۔ مگر معاملہ طے کہاں ہوا تھا؟ اُس کی آنکھوں کے سامنے سلاخوں

کے عقب میں خوشی کا بے نقش چہرہ تھا جو اس کے فہم میں نہیں آتا تھا، جو میر حسن کا چہرہ بھی ہو سکتا تھا اور جو اس کا اپنا چہرہ بھی تھا۔ انصاف کیا چیز ہے؟ کہاں ملتا ہے؟ حقیقت میں یہ چہرہ کس کا چہرہ ہے جسے وہ ڈھونڈ نہیں سکتا؟ وقت کا دباؤ، جس کو اس نے پوری قوت سے ایک دھکا دیا تھا، اب پھر اس کو گھیرے میں لے رہا تھا۔ وہ دیوار سے ٹیک لگائے، اس تنگ ہوتے ہوئے گھیرے میں محبوس بیٹھا تلملاتا رہا، اور آج کئی روز کے بعد اس کا سینہ بھاری ہونا شروع ہوا۔ اس کا پتا نکالنا کوئی مشکل بات نہیں، اس نے سوچا، ریاض کو علم ہے یہ کہاں رہتا ہے، اس کے ساتھیوں کو بھی ریاض جانتا ہوگا۔ میں اس تک پہنچ جاؤں گا۔ اس نے جرم اگر کیا نہیں تو اسے علم ضرور ہے، ورنہ اس طرف کیوں آتا۔ اسے کیا ضرورت تھی؟ سانس کی کاوش سے تھک کر اس نے کمر سیدھی کی اور دیوار کے ساتھ اونچا ہو کر بیٹھ گیا۔

میں اس کا سراغ لگا کے رہوں گا، وہ دل میں گرجا۔

اسد نے آنکھیں اٹھائیں تو ریاض سامنے کھڑا تھا۔ "چلو۔" ریاض نے کہا۔

وہ دونوں گھر سے باہر نکل آئے۔ قصبے سے نکل کر وہ پہاڑوں کی تاریکی میں داخل ہوئے تو ریاض بولا:

"میں نے کام نکال لیا ہے۔"

"کیا کام؟"

"سپاہیوں کے ساتھ۔"

"جا رہے ہو؟" اسد اشتیاق سے بولا۔

"ہاں۔"

"کب؟"

"کل۔"

"اتنی جلدی کام کیسے بن گیا۔"

"ایک گھنٹے کی بک بک کے بعد مانا ہے سور کا تخم۔"

"ایک گھنٹہ؟" اسد حیران رہ گیا۔

"اور کیا۔ تم سور ہے سمجھتے ہو؟"

"کیا کہتا تھا؟"

"کہتا تھا غلام ساتھ چلے۔ یا عمر۔"

"اور سلطان ؟"

"پہلے وہ بھی کہتا تھا عُمر جائے۔ جب اُس نے دیکھا کہ میں ہر صورت میں ساتھ چلا ہی جاؤں گا تو میری طرف داری کرنے لگا۔"

"تم نے کیا کہا ؟"

"میں نے کہا بیس بیس کوس تک میں علاقے کے ایک ایک پتھر کو جانتا ہوں۔ عُمر میرا مقابلہ کیا کرے گا۔ اصل میں عُمر پہلے جا چکا ہے۔ بس یہی بات ہے۔"

"اس قدر چپ چاپ کیا باتیں کر رہے تھے ؟" اسد نے پوچھا۔

"چچا نے کام خراب کیا ہے سارا۔ اُس نے حکم لگا دیا کہ یہاں پاس کے علاقے میں کارروائی نہیں ہو گی۔ بس۔ کہتا ہے پہلے ہی ہمارے بہت سے آدمی چھاپے میں چلے گئے ہیں۔ اگر پھر اتنی جلدی ادھر گڑبڑ ہوئی تو ہمارا کام سارا تباہ ہو جائے گا۔ لوگ مخالف ہو جائیں گے۔ یہی اُس کے ساتھ بحث کر رہا تھا۔"

"یہ اُن کا لیڈر تھا ؟" اسد نے پوچھا۔

"نہیں۔ یہ تو سپاہی ہے ہی نہیں۔ کوئی اور آدمی ہے۔ شاید تمہارے جیسا ہے۔ نیا ہے۔"

"پہلے بھی لایا ہے ؟"

"ہاں۔"

"سپاہی کہاں پر ہیں ؟"

"لنگری سے چار کوس اُدھر۔"

"اتنی دُور ؟"

"ہاں۔ چچا نے کام خراب کیا ہے۔ وہ علاقہ اچھا نہیں۔"

"کیوں ؟"

"کسیاں کم ہیں۔ جو ہیں چوڑی چوڑی ہیں جیسے سوکھے ہوئے دریا ہوں۔ سڑک کے اِدھر اُدھر میدان بہت ہے۔ خیر۔" وہ بولا، "ایک آدھ جگہ اچھی ہے۔"

"تم اُس علاقے کو جانتے ہو ؟"

"ہاں۔" ریاض نے کہا، "چلو گے ؟"

"میری بات تم نے کی ہے ؟"

"نہیں۔ مگر تمہیں کس کا ڈر ہے۔ چلے چلنا۔"

"اگر واپس کر دیا تو؟"

"تو میں کہہ دوں گا تمہارے بغیر میں نہیں جاتا۔"

اسد کی رگوں میں خون تیزی سے دوڑ رہا تھا اور اُس کے دل میں سنسناہٹ پھر رہی تھی۔ وقت کے دباؤ کو ایک اور دھکا لگا تھا اور اُس کا گھیرا ٹوٹ رہا تھا۔ اب اُس کا من ہلکا پھلکا تھا اور اُس کے قدموں میں اُڑان تھی۔

"ماں کو نہ بتانا۔" ریاض نے کہا۔

"اچھا۔"

رات کو جب وہ سونے کے لیے لیٹا اور اُس نے آنکھیں بند کیں تو سلاخوں والے چہرے کہیں دُور پیچھے جا چکے تھے۔ اب اُس کی آنکھوں کے آگے، ہمیشہ کی طرح، یاسمین کا متبسم چہرہ اور نیند کا آرام تھا۔

(۱۰)

سہ پہر کے وقت ریاض اور اسد گھر سے روانہ ہوئے۔ لنگڑی کا گاؤں چار کوس سے اُس طرف تھا۔ وہ دونوں چار کوس کے راستے سے جانے کی بجائے اوپر سے ایک لمبا چکر کاٹ کر لنگڑی پہنچے۔ وہاں وہ جبار کے گھر پر رُکے۔ جبار اُس علاقے میں اُن کا اپنا آدمی تھا۔ اسد کو اس کی شکل جانی پہچانی لگی۔ اُس نے خیال کیا تو اُسے یاد آیا کہ جبار اُن تین آدمیوں میں سے ایک تھا جو رات کو دین کے گھر پر دیوار کے ساتھ بیٹھے تھے۔ جبار نے کڑی مشکوک نظروں سے اسد کو دیکھا۔

"یہ علی ہے۔" ریاض نے اُس سے کہا۔

"عمر نہیں آیا؟" جبار نے پوچھا۔

"میں اور علی جا رہے ہیں۔"

جبار نے آہستہ آہستہ دو تین بار سر ہلایا۔

کچھ دیر کے بعد اسد نے ریاض سے پوچھا: "جبار میر حسن کو جانتا ہے؟" ریاض نے جبار سے ذکر کیا تو

اُس نے جواب دیا کہ وُہ بیلے کے تقریباً سب آدمیوں کو جانتا ہے، مگر اس نام کا اُن میں کوئی نہیں۔ اسد اُس کا حلیہ بیان کرنے لگا، پھر خاموش ہو رہا۔ اِس سوّر کا پتا نہیں کیا نام ہے ادھر، اس نے سوچا۔

جبار کے گھر پہ انہوں نے شام کا وقت گزارا اور کھانے پینے سے فارغ ہوئے۔ جب اندھیرا پڑ گیا تو وہ وہاں سے چل پڑے۔ رات اندھیری تھی۔ اِس علاقے میں اسد پہلے نہیں آیا تھا۔ لنگری سے نکل کر اُس نے دیکھا کہ پہاڑ کھلنے شروع ہو گئے ہیں اور ستاروں کی روشنی دُور تک جانے لگی ہے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ میدانی علاقہ جگہ جگہ نمودار ہو رہا ہے۔ اسد نے اندازہ لگایا کہ یہ علاقہ پہاڑوں کے بیچ ایک سرسبز وادی کی شکل میں تھا جہاں مکی اور مونجی کی کاشت ہوتی ہوگی۔ درختوں کی اگاس ایک جیسی نہ تھی بلکہ جگہ جگہ گھنے جھُنڈ تھے جو غالباً اِکّا دُکّا کاشت کاروں کے مکان تھے۔ وہ اُن جھُنڈوں اور کھیتوں سے بچتے بچاتے، پہاڑ کے ساتھ ساتھ سفر کرتے رہے۔ ریاض آگے آگے چلا جا رہا تھا۔

"وہ سامنے والی پہاڑی ہے نا؟" ریاض نے کہا۔

"ہاں۔"

"ایک چوکی ہے۔"

"پولیس کی؟"

"فوجیوں کی۔ سڑک کی حفاظت کے لیے بیٹھے ہیں۔ بتی نہیں جلاتے سُور۔ یہ رستہ وہاں سے جاتا ہے۔ جس کو پتا نہ ہو وہ سیدھا چوکی پہنچ جائے۔"

"اچھا!" اسد نے مرعوب ہو کر کہا۔

"اب کھیتیوں کے اندر سے چکر کاٹنا پڑے گا۔ چچا نے سارا کام خراب کر دیا۔ ہمارا فس کلاس علاقہ تھا۔ جہاں چاہو پکڑ کر مار لو۔"

"آہستہ بولو۔" اسد نے کہا، "آواز دُور جاتی ہے۔"

"مجھے آواز کا اندازہ ہے۔ چوکی تک نہیں جاتی۔"

"سُلطان ٹھیک ہی تو کہتا ہے۔" اسد نے بات کی، "سب لوگ پکڑے گئے تو پھر؟"

"ہُنہہ!" ریاض حقارت سے بولا، "سو چھاپے پڑ چکے ہیں، ابھی تک ہمارے زیادہ آدمی باہر ہیں۔ ڈرتا ہے۔ سیاسی ہو گیا ہے۔"

وہ اب ایسے آسمان کے نیچے سے گزر رہے تھے جہاں ہلکے ہلکے بادل تھے۔ تاریکی میں اضافہ ہو گیا تھا۔

وہ درختوں سے دُور دُور، کسانوں کے کُتّوں سے خبردار، راستہ چھوڑ کر پہاڑی کا چکر کاٹتے ہوئے دوسری طرف نکل گئے۔ یہاں آسمان پہ بادل نہ تھے اور رات صاف ہوتی جا رہی تھی۔ اُس ایک پہاڑی کو طے کرنے میں ایک گھنٹہ صرف ہو گیا تھا۔ اسد نے نظر دوڑائی تو دُور آگے تاریکی کا ایک جُھنڈ نظر آیا جو بلند ہوتا ہوا آسمان سے جا ملتا تھا، جیسے پہاڑ پہ بادل اُتر آئے ہوں۔ مگر آسمان صاف تھا۔

"وہ کیا ہے؟" اسد نے پُوچھا۔

"ست سِرا۔"

"اچھا!" اسد نے کہا، "جلدی ہی پہنچ گئے۔"

"ابھی کہاں۔" ریاض بولا۔ "سڑک پار کر کے نیچے اُترنا ہے۔ پھر تین ڈھیریوں کا چکر کاٹنا ہے۔"

"کیوں؟"

"پہلی ڈھیری پہ چوکی ہے۔"

یہ سات پہاڑیوں کا ایک سلسلہ تھا جن کے بیچ سے سڑک بل کھاتی ہوئی گزرتی تھی۔ اس کو پہاڑ بھی شمار کیا جاتا تو ایک نہیں بلکہ دو پہاڑ تھے، ایک سڑک کے اس طرف اور دُوسرا دُوسری طرف۔ مگر یہ لوگ اسے ست سرا پہاڑ کہتے تھے۔ غالباً کسی زمانے میں ایک ہی پہاڑ ہو گا جس کے بیچ سے سڑک کاٹ کر بنائی گئی تھی۔ تین چوٹیاں سڑک کے اس طرف تھیں اور چار اُس طرف۔ اسد حیران تھا کہ فوجی چوکی پہلی چوٹی پر کیوں واقع تھی جب کہ درمیان کی کسی چوٹی سے سڑک کی بہتر نگہداشت ہو سکتی تھی۔ مگر ریاض نے اُسے بتایا کہ پہلی چوٹی کے پاس سڑک سب سے زیادہ تنگ اور بل دار تھی اور گاڑیوں کو بہت دھیمی رفتار سے لے جانا پڑتا تھا۔ حملے کے لیے یہ بہترین جگہ تھی۔ آگے جا کر سڑک سیدھی ہو جاتی تھی اور پہاڑ کھل جاتا تھا۔

"یہ جگہ کس نے تجویز کی تھی؟" اسد نے پُوچھا۔

"میں نے۔" ریاض فخر سے بولا۔

"کوئی ایسی جگہ نہیں جہاں پر چوکی نہ ہو؟"

"آگے دس کوس پر ایک ہے، مگر اُس کے پاس ایک پُورا کیمپ پڑا ہے۔ اس علاقے میں اِس سے بہتر کوئی جگہ نہیں۔"

"چوکی کے قریب حملہ کرنے میں خطرہ نہیں؟"

"خطرہ تو ہر جگہ ہے۔ چوٹی پر بیٹھے بیٹھے پاؤں پھسل جائے تو تمہارا اپنا بھی نہ چلے۔" ریاض ہنس کر بولا، "مگر

ہم اُس طرف کی چوتھی ڈھیری سے کریں گے۔ چوکی سے ایک کوس پر ہے۔"

"آواز نہ آئے گی؟"

"اونہوں۔" ریاض نے نفی میں سر ہلایا۔ "بیچ میں دو اونچی ڈھیریاں پڑتی ہیں۔"

"اور آواز جو پہاڑیوں میں پلٹ پلٹ کر چلتی ہے؟"

"کہیں کہیں چلتی ہے۔ ان میں نہیں چلتی۔ جہاں ہم ماریں گے اُس کے سامنے کچھ بھی نہیں، نہ کٹی ہے نہ پہاڑ۔ کھیتیاں ہیں۔"

"دھماکے کی آواز بھی نہیں آتی؟"

"اونہوں۔"

"فوجیوں کو اس بات کا علم نہیں؟"

"ہوگا۔ مگر وہ سوچتے ہوں گے وہاں کوئی بیوقوف ہی حملہ کرے گا۔ اُن کا دماغ بھی زیادہ نہیں چلتا۔ ہتھیار چلتے ہیں۔"

اسد اُس کی ہشیاری سے مرعوب ہوگیا۔ اُس نے اندھیرے میں پیار سے اُس نوجوان لڑکے کی طرف دیکھا جو ایک عام کشمیری کسان تھا مگر اپنی جان سے بے خبر تھا، اور اسد کے دل میں اُس کی خاطر ایک وسوسہ پیدا ہوا۔ ساتھ ہی اُسے خیال آیا کہ اگر یہ شخص وقت کی زد سے بچ رہا تو چند سال میں ایک علاقے کو سنبھالنے کے قابل ہو جائے گا۔

انہوں نے اونچے نیچے کھیتوں میں سے رستہ نکال کر چھوٹے بڑے پتھروں کو پھاندتے ہوئے بے آواز قدموں سے سڑک پار کی اور دوسری طرف اُتر گئے۔ اندھیروں میں سایوں کی مانند مستقل متحرک، وہ پہاڑ کی پھیلی ہوئی جڑوں کے ساتھ ساتھ سفر کرتے رہے۔ آخر دوسری پہاڑی کے عقب میں پہنچ کر ریاض پہلی بار رکا۔ پہاڑ کی جانب پُشت کر کے وہ ایک منٹ تک دائیں طرف نظر دوڑاتا رہا۔ کچھ دُور پر درختوں کے چند جھنڈ تھے۔ اُس نے اُن میں سے دائیں طرف والے جھنڈ کی سیدھ لی اور چل پڑا۔

یہ جگہ جو دُور سے گھنا جھنڈ معلوم ہوتی تھی اصل میں درختوں کا ایک کھلا سا ذخیرہ تھی جس میں ایک طرف کو چند جھاڑیاں اُگی تھیں اور روشنی اندر زمین تک پہنچ رہی تھی۔ وہ دونوں چند سیکنڈ تک ذخیرے کے کنارے پہ رُکے چوکس جانوروں کی طرح اِدھر اُدھر دیکھتے رہے۔ پھر ریاض نے مُنہ کھولا اور دھیمی مگر صاف آواز میں بولا:

"فس کلاس۔"

اُس کے بولنے کی دیر تھی کہ پودوں میں حرکت شروع ہوئی۔ کلک۔ کلک۔ آہنی ہتھیاروں کی مخصوص آوازیں۔

اسد نے آنکھیں پھیلا کر دیکھا کہ جنہیں وہ جھاڑیاں سمجھا تھا وہ آدمی تھے۔ اسد اور ریاض درختوں میں چلتے ہوئے اُس جگہ پہنچے جہاں وہ سب اب کھڑے تھے۔

"ریاض ؟" اُن میں سے ایک بھاری سرگوشی میں بولا۔

"ہاں۔"

"فرسٹ کلاس۔ عمر نہیں آیا ؟"

"نہیں۔"

"یہ کون ہے ؟"

"علی عمر کی جگہ آیا ہے۔ سارے علاقے کا واقف ہے۔"

اسد اُس کی دیدہ دلیری پہ ششدر رہ گیا۔

"ہوں۔" اُس آدمی نے سر ہلاتے ہوئے، اندھیرے میں سخت نظروں سے اسد کو دیکھا۔ "علی۔" اُس نے زیرِ لب دہرایا۔ "مجھے بتایا گیا تھا یا تم آؤ گے یا عمر۔" وہ ریاض سے بولا۔ "ہمیں ایک کی ضرورت ہے۔ فالتو آدمی کو ساتھ نہیں لے جا سکتے۔"

"علی فالتو نہیں۔ میرا ساتھی ہے۔" ریاض جرأت سے بولا۔ "ہم دونوں ساتھ چلتے ہیں۔"

"باڑے کا ہے ؟"

"ہاں۔" ریاض نے برملا کہا۔

اسد کو اس پر غصہ آنے لگا۔ اُس کا ارادہ تھا کہ اگر بات زیادہ بڑھی تو وہ اپنا آئیڈنٹٹی کوڈ وغیرہ بتا دے گا اور یہ لوگ، جو غالباً سپیشل سروسز گروپ سے تعلق رکھتے تھے، اُسے سمجھ جائیں گے۔ اُس کے بعد بھی اگر وہ اِس مشن پر اُسے ساتھ لے جانے پہ راضی نہ ہوئے تو خیر ہے، وہ لوٹ آئے گا۔ مگر اب ریاض نے اُس کی اصلیت کو چھپا کر کام خراب کر دیا تھا۔ اب اگر وہ کچھ کہتا ہے تو ریاض کا کیا بنے گا، اسد نے سوچا۔ اسد کو اس کام کا تجربہ تو نہ تھا مگر اِس کے موٹے موٹے اصولوں سے وہ واقف تھا۔ چھوٹے سے چھوٹا شبہ بھی ہو تو سب کام کینسل اور آگے کی راہ لو، یہ اس کا پہلا اصول تھا۔

اسد یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ آدمی جو اِس گروپ کا لیڈر معلوم ہوتا تھا، اُس کی طرف متوجہ ہوا۔

"تم اس علاقے میں رہتے ہو ؟"

"ہاں۔"

"کہاں رہے ہو ؟ کیا کرتے رہے ہو ؟"

"بارہ سال کی عمر تک لنگری میں رہا ہوں ۔" اسد نے کشمیری لہجے میں جواب دیا ۔

وہ شخص ایک منٹ تک اسد کو دیکھتا رہا ۔ اسد کو وہ ایک ایسے جانور کی طرح معلوم ہُوا جو اچانک کُود کر اپنے شکار کو دبوچ لینے کی غرض سے بدن کو سنبھال رہا ہو ۔ پھر وہ آدمی مُڑا اور چار قدم دُور جاکھڑا ہُوا ۔ وہاں وہ اپنے گروپ کے دو اور آدمیوں سے آہستہ آہستہ باتیں کرنے لگا ۔ ایک مختصر سی بات کرکے وہ تینوں خاموش ہو جاتے ، پھر دوبارہ سرگوشیوں میں بولنے لگتے ۔ چند منٹ تک اسی طرح وہ باتیں کرتے رہے ۔ پھر اُن کا لیڈر ریاض اور اسد کی جانب بڑھا ۔

"مجھے بتایا کیوں نہیں گیا ۔" اس نے غصّے سے بات کی ، "مجھے پہلے اطلاع کیوں نہیں دی گئی ؟"

"مَیں نے رات کو کہا تھا عمر نہیں آسکتا ، مَیں آؤں گا ۔" ریاض نے ایک احمقانہ دلیل پیش کی ۔

"ٹھیک ہے ۔ ٹھیک ہے ۔" وہ شخص بے صبری سے بولا ، "آج کا کام ملتوی نہیں کیا جا سکتا ۔ مگر مَیں اس بات کی انکوائری ضرور کراؤں گا ۔ مَیں تمہیں پہلے وارن کر رہا ہوں ، مجھے انفارم کیوں نہیں کیا گیا ؟ چلو ۔"

وہ شخص غصّے میں تھا ۔ اب وہ درختوں سے نکل کر واپس پہاڑ کی جانب جا رہے تھے ۔ اسد نے دل میں فیصلہ کرلیا کہ اب وہ چپ چاپ رہے گا اور جہاں تک ممکن ہو سکا اس گروپ کے اندر اپنی موجودگی کو کم سے کم ظاہر کرنے کی کوشش کرے گا ، تاکہ یہ لوگ اطمینان سے اس مہم کو سر کرسکیں ۔ وہ اب پہاڑ تک پہنچ گئے تھے اور اُس کے دامن کے ساتھ ساتھ جا رہے تھے ۔ آگے آگے ریاض اور اُس کے ساتھ گروپ لیڈر جا رہا تھا ۔ کوئی بنا بنایا راستہ نہ تھا ، چنانچہ وہ سب ایک لائن میں چلنے کی بجائے بے ترتیبی سے پھیل کر چلتے ہُوئے اپنا اپنا رستہ نکالتے جا رہے تھے ۔ ریاض اور اسد سمیت وہ تعداد میں کل نو تھے ۔ اسد چوتھے نمبر پر چل رہا تھا ۔ کچھ دیر سے اسد محسوس کر رہا تھا کہ ایک آدمی جو اُس کے پیچھے پیچھے چلا آرہا تھا ، مُستقل اُس کے ساتھ لگا ہوا ہے ۔ اگر کوئی چٹان رستے میں آجاتی جس کے گرد سے ہو کر آگے جانا پڑتا تو جس طرف سے اسد جاتا اُسی طرف سے وہ آدمی بھی جاتا ۔ اسد اگر بائیں مُڑتا تو وہ شخص بھی بائیں کو مُڑ جاتا ۔ اگر دائیں کو جاتا تو وہ بھی دائیں کا رُخ کرتا ۔ چلتے چلتے جب راستے میں ایک رکاوٹ آئی تو اسد پہلے ایک طرف کو مُڑا ، پھر جیسے ارادہ بدل کر دُوسری طرف کو ہو لیا ۔ وہ شخص بھی عین اُس کی تقلید میں مُڑتا گیا ، جیسے اُس کی نقل کر رہا ہو ۔ کچھ دیر کے بعد اسد دل میں اِس کھیل سے تنگ ہونے لگا ۔ اُس نے سوچا کوئی ایسا طریقہ ہو جس سے وہ اِس آدمی پر واضح کرسکے کہ اُس کو اِس بات کا علم ہے کہ وہ اس شخص کی نگرانی میں چل رہا ہے ۔ دو ایک بار اسد نے مُڑ کر اُس کی طرف دیکھا ، مگر تاریکی کی وجہ سے اُن کی نظروں کا ٹکراؤ نہ ہو سکا ۔ بات کرنے کی اجازت نہ تھی ۔

وہ خاموشی سے چلتے رہے۔

آخر تنگ آ کر ایک جگہ پر اسد اچانک رکا اور رُخ بدل کر پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ دو تین قدم اوپر جا کر اس نے شلوار کھولی اور پاؤں کے بل بیٹھ گیا، جیسے پیشاب کر رہا ہو۔ اس کا نگران گھبرا کر اس کی طرف دیکھتا رہا، پھر وہ بھی شلوار کھول کر جہاں کھڑا تھا وہیں پر بیٹھ گیا۔ اسد کان لگائے بیٹھا انتظار کرتا رہا جیسے ہی اس آدمی کے پیشاب کی آواز اس کے کان میں پڑی، وہ تیزی سے اٹھا، شلوار باندھتا ہوا بھاگ کر نیچے اترا، اور تیز قدموں سے آگے بڑھنے لگا، جیسے اپنے ساتھیوں سے جا ملنا چاہتا ہو۔ پیشاب کرتے ہوئے آدمی نے یہ دیکھا تو اس نے اٹھنے کے لیے ایڑیاں اٹھائیں، اس کے حلق سے ایک بند سی آواز پیدا ہوئی، پھر اس کی ایڑیاں نیچی ہو گئیں، دوبارہ اٹھیں، نیچی ہوئیں، اس نے غصے اور خجالت کی ملی جلی کیفیت میں منہ کھولا مگر آواز روک لی۔ اب وہ اپنی ایڑیوں پر مستقل اٹھ اور بیٹھ رہا تھا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اندھیرے میں دیکھ رہا تھا۔ جب تاریکی اور آڑ کی وجہ سے اُسے کچھ نظر نہ آیا تو وہ اٹھ کھڑا ہوا اور دانتوں میں کرتے کا دامن دبائے، دونوں ہاتھوں میں شلوار اور پیشاب کی دھار کو سنبھالے جھکا جھکا ہانپتا ہوا اسد کے پیچھے چل نکلا۔ اسد پیٹ میں ہنسی دبائے آگے آگے چلا جا رہا تھا۔ چند لمحوں کے بعد وہ آدمی پتھروں پر کودتا پھاندتا اسد کے پاس پہنچا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر مضبوطی سے اسد کا بازو اپنی گرفت میں لیا اور رک گیا۔

اسد نے سر موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ کئی لمحوں تک وہ اسد کا بازو اپنے ہاتھ میں سختی سے دبائے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اسد کا خیال تھا کہ اب وہ منہ کھولے گا، گالی دے گا یا کچھ بولے گا، مگر وہ کھڑا اس کی طرف بس دیکھتا رہا، جیسے کہہ رہا ہو، خیر ہے بچے، اس دفعہ چھوڑ دیتا ہوں، مگر اگلی بار یاد رکھو گلا دبا دوں گا۔ پھر اس نے اچانک اسد کا بازو چھوڑ دیا اور سر کے اشارے سے اُسے چلنے کو کہا۔ اسد اطمینان کا سانس لے کر چل پڑا۔

اسد اور اس کا نگران اب اس قافلے کے آخر پر چل رہے تھے۔ وہ مختصر سا بے آواز قافلہ تیز روی سے چلتا ہوا اب آخری سے پہلی پہاڑی کے دامن میں پہنچ چکا تھا۔ اسد ایک چٹان کے عقب سے نکلا تو اس نے دیکھا کہ ان کا لیڈر اور ریاض چٹان کی آڑ میں رکے کھڑے تھے۔ اسد ان کے پاس ٹھہر گیا۔

"علی"۔ لیڈر کرختگی سے بولا۔

اسد نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا۔

"تم آگے چلو"

"کیوں ہے"

"ہاں، تم۔"

"وہ کہاں ہے" اسد نے بیوقوفوں کی طرح پوچھا۔

"اگلی پہاڑی پر۔"

اسد نے ایک لحظے کو ریاض کی طرف دیکھا۔ ریاض خاموش کھڑا رہا۔ اسد بے توقف چل پڑا۔ تیزی سے چلتا ہوا وہ گروہ کے دوسرے لوگوں کو ایک ایک کر کے پیچھے چھوڑنے لگا۔ چند ہی سیکنڈ میں وہ سب سے آگے پہنچ چکا تھا۔ گروپ لیڈر اس کے پیچھے، اور تیسرے نمبر پر ریاض آ رہا تھا۔ باقی چھ آدمی ان کے پیچھے چلے آ رہے تھے۔ اسد نے ایک بار پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کے ساتھ لگا ہوا آدمی کہیں پیچھے رہ گیا تھا۔ اس کی جگہ اب گروپ لیڈر نے لے لی تھی۔ اسد کے دماغ میں خیالات تیزی سے گھوم رہے تھے۔ اس کی ٹانگوں میں ہلکی سی کپکپاہٹ اٹھنے لگی تھی۔ ایک خیال جو دوسرے سب خیالوں پر حاوی ہوتا جا رہا تھا وہ تھا، اب کیا کروں؟ گھبراہٹ ظاہر نہ ہونے دوں، بے یقینی سے قدم نہ رکھوں، اعتماد سے چلتا جاؤں۔ ریاض کی باتوں سے وہ اتنا سمجھ چکا تھا کہ ان کا کام کیا ہے۔ اس پہاڑی سلسلے کے بارے میں بھی کچھ تفصیل اسے مل چکی تھی۔ مگر ان پہاڑیوں سے وہ واقف نہ تھا۔ اس وقت وہ آگے آگے جاتا ہوا محض اپنی حس کے بھروسے پر رستہ نکال رہا تھا۔ اس نے پاتھ فائنڈنگ کی تفصیلات کو یاد کرنے کی کوشش کی، مگر وہ ساری ٹریننگ اب بیکار ہو چکی تھی۔ اسد کی چال میں تبدیلی آ گئی تھی۔ پہلے وہ لاپروائی سے گروہ کے ساتھ چلا جا رہا تھا، اب ضرورت سے زیادہ تیزی کے ساتھ، خوفزدہ چوکنے جانور کی مانند جھٹکے دار چال سے چل رہا تھا۔ گروپ لیڈر کی نگاہیں اس پر لگی تھیں۔ اس کے پیچھے چھ اور آدمیوں کی نظریں اس پر تھیں جن میں سے ایک ایک منجھا ہوا قاتل تھا اور آنکھیں بند کر کے اسے موت کے گھاٹ اتار سکتا تھا۔ اسد کے دل میں ریاض کا خیال آیا۔ ریاض اکیلا کیا کرے گا؟

آخری پہاڑی کے دامن کے وسط میں پہنچ کر وہ رکا، پھر ایک لمحہ ضائع کیے بغیر بائیں طرف مڑ کر پہاڑ پر چڑھنے لگا۔ اس کی کسی حس نے اسے بتایا کہ ادھر چلو، ادھر سے چوٹی کو سیدھا رستہ جاتا ہے۔ اس کا دماغ معطل ہو چکا تھا۔ اس نے اپنے آپ کو جبلی قوتوں کے اشارے پر چھوڑ دیا تھا۔ اس جگہ پہاڑی میں ایک سلوٹ تھی۔ پہاڑوں کا اس کو اتنا تجربہ ہو چکا تھا کہ اس نے یہاں پر چڑھائی کا رستہ پہچان لیا۔ آٹھوں آدمی اس کے پیچھے پہاڑ پر چڑھ رہے تھے۔ دل میں اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ ستاروں کی روشنی تھی جس میں پہاڑ کی شکل نظر آ رہی تھی۔ اب یہ سطح اچھی جا رہی تھی۔ شاید اسی طرح چلتی جائے ــــــ

اگر نہ گئی تو؟ ممکن ہے آگے اتنا بڑا انشگاف آ جائے کہ واپس جانے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے۔ پھر؟ وہیں پول کھل جائے گا۔ پھر وہ کیا کہے گا؟ کہنے کا موقع ہی کہاں ملے گا؟ ریاض تیسرے نمبر پر تھا۔ اسد کے پیچھے پیچھے کمانڈو لیڈر چلا آ رہا تھا۔ اسد کو علم تھا کہ ایک لغزش ہوئی، اور ایک سیکنڈ نہیں لگے گا، ایک ہاتھ پیچھے سے آ کر اس کا

مُنہ بند کر دے گا اور دوسرے ہاتھ کا چھُرا اُس کی پُشت میں پیوست ہو جائے گا۔ اسد نے اپنی ٹریننگ کو یاد کیا۔
"تین سیکنڈ لگتے ہیں۔ ریاض یہاں کیا کرے گا؟"

اسد کا پاؤں ایک پتھر سے پھسلتے پھسلتے بچا۔ اُس کے کانوں میں اس وقت صرف اپنے قدموں کی اور اپنی سانس کی آواز آ رہی تھی، پیچھے بالکل خاموشی تھی، جیسے آٹھ آدمی نہ ہوں سایے ہوں۔ وہ پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھ سکتا تھا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ اِس وقت یہاں پر بالکل اکیلا ہے، اُس کے دائیں بائیں، آگے پیچھے کچھ بھی نہیں، صرف آگے ایک قدم زمین ہے اور پھر ایک بہت بڑا شگاف! اُس کی ٹانگوں میں پسینہ بہہ رہا تھا۔ اندھیرے میں وہ ایک قدم زمین پہ رکھتا تو پھر آگے ایک قدم زمین نظر آتی۔ خوف کی یہ کیفیت اُس نے کبھی نہ دیکھی تھی۔ جب اُس نے اِن تین سیکنڈ کی ہلاکت کی تربیت لی تھی تو اُس وقت اُسے اِس کی سُرعت کا اندازہ بھی نہ ہوا تھا۔ وہ ایک کھیل تھا۔ اب یہاں وہ موت کے آگے کھڑا تھا۔ مدافعت کی راہیں سوچتے سوچتے اُسے علم ہوا کہ یہ کتنی مہلک تھی۔ وہ مدافعت کے لیے تیار تھا۔ اُسے علم تھا کہ ایک ہاتھ اُس کے مُنہ پر دائیں طرف سے آئے گا، اور دوسرا چھُرے کی نوک والا اس کے بائیں کندھے کے نیچے آ کر لگے گا، اور ان دونوں میں آدھے سیکنڈ کا وقفہ ہو گا۔ اِس آدھے سیکنڈ میں اُس نے کیا کرنا ہے؟ اُس نے دایاں کندھا اندر کی طرف موڑ کر، بایاں کندھا باہر کی طرف پھینک کر پاؤں پہ گھوم جانا ہے اور ساتھ ہی دائیں ہتھیلی کی ضرب سے دشمن کا چھُرے والا ہاتھ ڈیفلیکٹ کرنا ہے۔ اب وہ دشمن کے روبرو ہے۔ اب اُسے سُرعت سے اپنی پیٹھ پر گر کر سیدھا لیٹ جانا ہے اور دونوں پاؤں اُٹھا کر پوری قوت سے دشمن کے پیٹ میں یا سینے پر ضرب لگانی ہے۔

وہ مدافعت کے لیے تیار تھا۔ ہر قدم پر، جیسے ہی اُس کا پاؤں ٹھوس زمین پر پڑتا وہ دائیں آنکھ کے کونے سے دیکھ لیتا کہ اندھیرے میں کوئی اُڑتا ہوا سایہ تو نہیں۔ اُسے خیال آیا کہ اگر وہ اِس شخص کے پنجے سے بچ کر، اُلٹا اِسے پاؤں کی ضرب سے ہلاک یا مجروح کر دیتا ہے، تو اُس کا اپنا کیا حشر ہو گا؟ یہ آدمی آخر اُس کی اپنی فوج کا ایک افسر تھا! اس خیال نے اُس کے ذہن کو اور بھی زنتر بتر کر دیا۔ کسی ایسے وقت کے لیے ہی اُس نے ایک ہنر سیکھا تھا، اور پہلی بار جو اِسے استعمال کرنے کا موقع آیا تھا تو اپنے ہی ایک آدمی پر وار کرنے کے لیے نہ کہ دشمن پر — اگر وہ وار کرتا ہے تو مجرم، نہیں کرتا تو مارا جاتا ہے۔ اِس عجیب و غریب صورتِ حال نے اُس کے دماغ کو ماؤف کر دیا۔ پھر اُس کو یہ خیال بھی آیا کہ مجرم بننے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر وہ ایک وار بھی کرتا ہے تو چھ دوسرے آدمی اُس کو ایک لمحے میں ختم کر دیں گے۔ بچنے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ خطرے اور موت کی یہ تیز تر کیفیت بالآخر اسد کے اندر ایک مہیب احساس بن کر پیدا ہوئی — کہ وہ اس پہاڑ پر یکہ و تنہا ہے۔ اُس کا کوئی مددگار نہیں۔ ایک مقام پہ پہنچ کر وہ تھکن سے چُور ہو گیا۔

یکبارگی اُس کا دل اُچھلا۔ اُس نے آنکھیں پھیلا کر دیکھا کہ چوٹی کی ٹوٹی پھوٹی لکیر آسمان کے مقابل متحرک تھی۔ ایک وقت میں یہ لکیر اُس کو نظر بھی نہ آ رہی تھی، پھر جب نظر آنے لگی تو اپنی جگہ پر جم کر کھڑی رہی جیسے آسمان میں گڑی ہو اور وہ برسوں تک بھی چلتا جائے تو انہیں ہلانے کی سکت نہیں رکھتا۔ اب —— اب ہر قدم پر وہ چوٹی آسمان پر پھسلتی جا رہی تھی۔ وہ ایک قدم اُوپر اُٹھتا تو چوٹی نیچے جاتی اور اُسی قدر آسمان سامنے آتا۔ آسمان وسیع ہوتا جا رہا تھا۔ اب یہ پہاڑ اُس کے قبضے میں تھا۔ اسد کا جی چاہا کہ وہ مڑ کر کھڑا ہو جائے اور بازو ہوا میں پھیلا کر پورے زور سے چیخے، یہ لو، میں تمہیں لے آیا ہوں۔ اُس کے بدن میں قوت کا ایک ریلا عود کر آیا اور اُس نے قدم تیز کر دیے۔ لیڈر، ریاض اور اسد ایک ساتھ بھاگتے ہوئے اُوپر پہنچے اور چوٹی کی دیوار کے ساتھ جا کھڑے ہوئے۔ سامنے سڑک تھی۔

اسد حیرت زدہ آنکھوں سے اُس منظر کو دیکھ رہا تھا۔ اُس کے پاؤں اُس کو عین اُس جگہ پہ لے آئے تھے جہاں اُن سب کو پہنچنا تھا۔ اس مقام سے سڑک تک کا پیدل رستہ مختصر ترین فاصلہ تھا۔ یہاں سے وہ سڑک کو کنٹرول کرتے تھے۔ اُس کے بدن کی سمت سچی تھی، اسد نے بازو چھاتی پہ باندھ کے دونوں ہاتھوں سے گردن اور کندھوں کو آہستہ آہستہ سہلانا شروع کیا۔ اُس کے بدن نے اُس کا ساتھ دیا تھا۔ اُس کے دماغ میں فتح کا احساس نشے کی طرح چڑھ رہا تھا۔ اُس کی جان یک جا اور معتبر تھی۔ فوجی افسر نے ایک لمحے کو اسد کی طرف دیکھا، پھر پلٹ کر کھڑا ہو گیا۔ اسد اور ریاض بھی اُس کے ساتھ ملے۔ وہاں پہ اُن تینوں کے علاوہ صرف ایک اور آدمی تھا۔ باقی پانچ اُس راستے کے طول پر، جس سے وہ اُوپر چڑھے تھے، فاصلے فاصلے پر کھڑے تھے۔ تین آدمی وہاں سے نظر آ رہے تھے۔ باقی دو تاریکی میں نظروں سے اوجھل تھے۔

"رِی ٹریٹ ٹائم کرو۔" افسر نے حکم دیا۔

حکم ملنے پر چوتھے آدمی نے کلائی پر بندھی ہوئی چمکتے حروف والی گھڑی ننگی کی، اُس کی ایک سوئی کو چابی دبا کر چلایا، پھر ایک لحظے کے لیے اپنے بدن کو سنبھال کر جیسے اُڑنے کی تیاری کر رہا ہو، پوری رفتار سے ڈھلان پر دوڑ پڑا۔ راستے میں کھڑے جس آدمی کے پاس سے وہ گزرتا، وہ آدمی رستے سے ہٹ جاتا۔ دوڑنے والے کے پیر گویا ہوا پہ پڑ رہے تھے، اُن سے کوئی آواز نہ نکل رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ چوٹی پر وہ تینوں ساتھ ساتھ کھڑے اندھیرے میں نظریں جمائے رہے۔ کچھ ہی دیر میں وہ شخص واپس آتا ہوا دکھائی دیا۔ اب وہ آرام سے پاؤں جما جما کر چڑھ رہا تھا۔ اُن کے پاس پہنچ کر اُس نے کلائی آگے بڑھائی۔

"چھیانوے سیکنڈ۔" وہ پھولی ہوئی سانس کے ساتھ بولا۔

"گڈ" افسر نے گھڑی دیکھ کر جواب دیا۔ پھر اس نے بازو ہوا میں اٹھا کر رستے پر پھیلے ہوئے آدمیوں کو اوپر آنے کا اشارہ کیا اور پلٹ کر سڑک کو دیکھنے لگا۔ ابھی تک وہ اسد پر ایک اُڑتی ہوئی نظر ڈالنے کے علاوہ کچھ نہ بولا تھا، چُپ چاپ اپنا کام کرتا جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں اس کے دُوسرے پانچ آدمی بھی اُن کے اردگرد آ کھڑے ہوئے۔ دو آدمیوں نے بھاری تھیلے، جو انہوں نے اپنے کشمیری کُرتوں کے اندر کندھوں سے لٹکا رکھے تھے، اُتار کر زمین پر رکھ دیے۔

جس مقام پر وہ کھڑے تھے وہ پہاڑ کی سب سے اُونچی چوٹی نہ تھی بلکہ ایک قدِ آدم قدرتی دیوار کی شکل میں بنی تھی۔ وہاں سے دائیں بازو پر کوئی دو سو فٹ کی بلندی پر پہاڑی کی سب سے اونچی چوٹی تھی۔ افسر نے ریاض سے مخاطب ہو کر چند لفظوں میں اُسے ہدایات دیں کہ وہ ایک آدمی کو لے جا کر اُوپر والی چوٹی پر چھوڑ دے، پھر واپس آ کر دو دُوسرے آدمیوں کو (جن کے نام اُس نے لیے) بائیں بازو پر پتھروں کی اُس دیوار کے پیچھے لے جائے جو ایک نیم دائرے کی شکل میں ذرا پیچھے ہٹ کر سڑک کی جانب واپس جاتی تھی۔ بائیں بازو کی یہ دیوار دراصل سڑک سے قریب ترین مقام تھا۔ مگر اس کے آگے راستہ نہیں تھا، دو سو فٹ کی عمودی دیوار کی شکل میں پہاڑ کٹا کھڑا تھا۔

"علی" ریاض سے فارغ ہو کر افسر بولا، "تم میرے ساتھ آؤ۔"

ایک بھاری تھیلے والے آدمی نے اپنا تھیلا اُٹھایا اور اُن کے ساتھ ہو لیا۔ ایک چوتھا آدمی بھی اُن کے پیچھے چل پڑا۔ چار آدمیوں کا یہ "قافلہ" اس پتھر کی دیوار کو پھاند کر دوسری طرف اُتر گیا۔ اسد آگے آگے چل رہا تھا۔ اب اُس کے دل میں خوف کی رمق تک نہ تھی۔ وہ اس پہاڑ سے پہلی بار اُتر رہا تھا مگر اس کے پاؤں کے آگے کوئی خدشہ تھا نہ کوئی ڈر۔ اُس کے قدم بے خوفی سے پتھریلی زمین کو خود بخود تلاش کرتے جا رہے تھے۔ چند منٹ کے اندر وہ سڑک پر کھڑے تھے۔ سڑک پر پہنچ کر افسر نے اس گروہ کی قیادت سنبھال لی۔ اُس نے سڑک کو پار کیا اور اُس کے ساتھ ساتھ اُوپر کو چلنے لگا۔ چند قدم جا کر وہ واپس مُڑا اور سڑک کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا کئی قدم دُوسری طرف نکل گیا۔ تینوں آدمی اُس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ ایک جگہ پر رُک کر اُس نے سڑک کے پار کی زمین پر نظر دوڑائی۔ اُس طرف دُور تک زمین ہموار تھی۔ آگے جا کر یوں دکھائی دیتا تھا کہ ایک کسّی پڑتی تھی۔ کئی منٹ تک وہ وہاں کھڑا اُس زمین کے ٹکڑے کا اور آس پاس کے علاقے کا معائنہ کرتا رہا۔ پھر وہ مڑا اور چلتا ہوا آ کر اُس مقام پر رُک گیا جہاں پر وہ پہاڑ سے اُتر کر سڑک پر چڑھے تھے۔ یہاں سے چوٹی کا وہ مقام، جہاں پر اُن کا اڈا تھا، قریب قریب سیدھی لائن میں تھا۔ اس جگہ پر کئی بار افسر نے چپل کی ایڑیوں سے دبا دبا کر سڑک کے دونوں طرف کی زمین کا معائنہ کیا۔ "سخت ہے۔" اُس نے اپنے

دونوں آدمیوں سے مخاطب ہو کر کہا۔ پھر وہ زمین کا خیال چھوڑ کر چوٹی کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایک ہاتھ ہوا میں اٹھا کر لہرایا۔ اوپر سے ایک بازو آسمان کے مقابل اٹھا، اور اس میں اس قسم کی حرکت ہوئی جیسے کرکٹ کی گیند پھینکی جاتی ہے۔ چند سیکنڈ کے بعد ایک پاؤ بھر کا پتھر ان سے کچھ فاصلے پر آ کر گرا اور لڑھکتا ہوا سڑک تک چلا گیا۔ افسر نے اب رخ بدلا اور پہاڑ کی عمودی دیوار کی جانب منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ اس نے دوبارہ اپنا ہاتھ ہوا میں اٹھایا۔ اس بار ادھر سے ایک بازو اٹھا اور ایک پتھر ان کے سروں کے اوپر سے گزر کر سڑک کے پار زمین پر جا گرا۔ افسر چند منٹ تک اندھیرے میں کان لگائے کھڑا رہا۔ چاروں طرف مکمل خاموشی تھی، معلوم ہوتا تھا کوئی کیڑا بھی زمین پر رینگا تو آواز نکلے گی۔ افسر نے چند بار پھر اپنی ایڑی زمین پر ماری، اور ذرا ہٹ کے کھڑا ہو گیا۔

" او کے، سر ؟" بھاری تھیلے والے آدمی نے پوچھا۔

" ہاں۔" افسر نے سر ہلا کر جواب دیا۔ " لگا دو۔" پھر وہ اسد کی طرف دیکھ کر سر کے اشارے سے بولا،

" چلو۔"

دونوں پہاڑ پر چڑھنے لگے۔ اب افسر آگے آگے تھا۔ اوپر پہنچ کر وہ دیوار پر چڑھے اور دوسری طرف پھلانگ گئے۔ افسر نے ہاتھ جھاڑ کر ادھر ادھر دیکھا۔ وہاں پر اب اس کا صرف ایک آدمی کھڑا تھا۔ اس آدمی نے بتایا کہ نذیر آبزرویشن پر اوپر بیٹھا ہے، اور گل محمد اور حق بائیں طرف کو چلے گئے ہیں، ریاض ان کو لے کر گیا ہے، ابھی واپس نہیں آیا۔ افسر نے اپنے بائیں بازو پر سے آستین اٹھائی۔ اس کی کلائی پر ایک بڑی سی گھڑی نما شے بندھی تھی۔ اس نے دائیں ہاتھ سے اس کا بٹن دبایا اور اسے منہ کے قریب لا کر بولا: " آبزرویشن کم اِن۔" پھر وہ بٹن چھوڑ کر سننے لگا۔ چند سیکنڈ کے بعد اس میں سے خرخراتی ہوئی آواز نکلی۔ " آبزرویشن ٹو لیڈر۔ او کے۔ اوور۔" افسر نے دوبارہ بٹن دبایا اور بولا: " او کے آبزرویشن۔ اوور اینڈ آؤٹ۔" پھر اس نے بٹن کو چھوڑ کر بازو کو آستین سے ڈھک دیا۔

ریاض ان کے پاس آ کھڑا ہوا۔ افسر نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور جدھر سے ریاض آیا تھا اس کو دوبارہ ادھر لے چلا۔ چلتے چلتے وہ پتھروں کے پیچھے غائب ہو گئے۔ اسد اور دوسرا آدمی وہاں کھڑے رہ گئے۔ اسد کو خیال ہوا کہ شاید یہ وہ آدمی ہے جو شروع میں اس کا نگران مقرر ہوا تھا۔ اس نے غور سے اسے دیکھ کر پہچاننے کی کوشش کی، مگر اس آدمی کا لباس اور وضع قطع بالکل دوسروں کی سی تھی اور اس کا چہرہ ڈھکا ہوا تھا۔ اسد منہ موڑ کر دیوار کے ساتھ کھڑا ہو گیا اور سڑک کو دیکھنے لگا۔ دو آدمی سایوں کی طرح کام کر رہے تھے۔ چند منٹ کے بعد ریاض واپس آ گیا۔ وہ اکیلا تھا۔ وہ آ کر اسد کے قریب دیوار سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ دونوں وہاں دیر تک خاموش کھڑے، پتھر

پہ ٹھوڑیاں رکھے، اُن دو آدمیوں کو نیچے سڑک پر کام کرتے اور چلتے پھرتے ہوئے دیکھتے رہے۔ رات آدھی سے اُوپر نکل گئی تھی۔ آسمان بہت صاف تھا اور ستاروں کی روشنی تیز ہو گئی تھی۔ تاریکی سے آشنا آنکھیں اب اِس پہاڑ کے ایک ایک پتھر کو دیکھ رہی تھیں۔ اسد نے سر موڑ کر ریاض کی طرف دیکھا۔ ریاض کے چہرے پر شرارت اور تحسین کی مِلی جُلی کیفیت تھی، جیسے کہہ رہا ہو، پھنسے تو بُرے تھے، مگر کام نکال ہی لیا تم نے۔ اسد کے دل میں اب کوئی غصہ نہ تھا۔ اس کے برعکس اُس نے پہلی بار، اتنے لمبے عرصے کی آشنائی کے بعد، ریاض کے لیے حقیقی رفاقت کے جذبات محسوس کیے۔ اُس نے ہاتھ اُٹھا کر پیار سے ریاض کی پیٹھ پر ہلکا سا ایک گھونسا جمایا۔ ریاض نے گھوم کر دو اُنگلیاں اُس کے پیٹ میں چبھوئیں۔ اسد دُہرا ہو گیا۔ کچھ دیر تک وہ اسی طرح چپ چاپ چھیڑ چھاڑ کرتے رہے، پھر ایک دم رُک کر چوکنے بچوں کی مانند، سڑک پر کام کرتے ہوئے آدمیوں کے سایوں کو دیکھنے لگے۔ اتنے میں افسر بائیں جانب سے واپس آگیا۔ وہ آ کر اُن دونوں کے پاس رُکا اور کئی لمحوں تک سڑک کو دیکھتا رہا۔ پھر اُس نے سر گھما کر پیچھے دیکھا، پھر دائیں اور بائیں، پھر اُس نے اسد کے کندھے پر ہلکی سی تھپکی دی اور بولا: "فرسٹ کلاس۔"

اسد اور ریاض کچھ دُور جا کر ایک پتھر پر بیٹھ گئے۔ افسر اُسی طرح کھڑا سڑک کی جانب دیکھتا رہا۔ اُس کا آدمی اب زمین پر بیٹھ کر اپنے بھاری تھیلے کو ٹٹول رہا تھا۔

"اب کس کا انتظار ہے؟" اسد نے بے صبری سے پُوچھا۔

"روشنی کا۔"

"ابھی کئی گھنٹے ہیں۔"

"ہاں۔" ریاض نے جواب دیا۔

"سڑک کے پار تو سیدھی زمین ہے۔" اسد نے کہا۔

"ہاں۔"

"اُدھر بھاگ کر جا سکتے ہیں۔"

"کیوں، مرنے کے لیے؟" ریاض بولا۔ "اُس میدان میں تو گرینیڈ پڑے گا، اور اُوپر سے ٹُش ٹُش ٹُش ٹُش۔" اُس نے ایک خیالی مشین گن دونوں ہاتھوں میں اُٹھا کر کندھے پہ جمائی اور لبلبی والی اُنگلی تیز تیز ہلانے لگا۔ "ٹُش ٹُش ٹُش ٹُش ٹُش۔" ریاض نے خیالی مشین گن ایک طرف رکھی اور سر نفی میں ہلایا۔ "اونہوں۔ وہ تو آڑ تلاش کریں گے، گاڑیوں کے نیچے چھپیں گے یا پتھروں کے پیچھے۔ یا زمین پر لیٹ جائیں گے۔ پھر ٹُش ٹُش۔" اُس نے اپنے ہاتھ دوبارہ پوزیشن میں اُٹھا کر لبلبی دبائی۔ پھر وہ ہاتھوں کو اُسی طرح اُٹھائے اُٹھائے یوں دائیں سے

بائیں ہلانے لگا جیسے گولیوں کی بوچھاڑ مار رہا ہو، "ٹشو ٹشو ٹشو ٹشو ——"

اسد آنکھیں پھاڑے اُسے دیکھتا رہا۔ ریاض ایک چھوٹے سے بچّے کی مانند دکھائی دے رہا تھا جو خوشی میں کوئی خیالی کھیل کھیل رہا ہو۔ اُس کی بلبلی کی انگلی برابر چل رہی تھی، اور اُس کے مُنہ سے آوازیں نکل رہی تھیں: "ٹشو ٹشو ——"

"انگلی کیوں چلائے جا رہے ہو؟" اسد نے کہا۔

"دو دو گولیاں مار رہا ہوں۔ یا تین تین برسٹ نہیں رہے؟"

اچانک اسد کا ماتھا ٹھنکا۔ اُس نے ریاض کی کمر پہ ہاتھ مارا۔ اُس کا شک صحیح نکلا۔ ریاض اپنی سٹین گن ساتھ لے کر آیا تھا۔ اسد کو علم تھا کہ اِن لوگوں کو ہتھیار ساتھ لانے کی اجازت نہیں۔ اِس بات پر سختی سے عمل کیا جاتا تھا۔ اگر فوجیوں میں سے کسی کو، خاص طور پہ افسر کو اس کا علم ہو گیا تو کیا ہوگا؟ اور کچھ نہیں تو گن تو ریاض سے چھن ہی جائے گی، یا چھیننے کی کوشش کی جائے گی اور ریاض تو اپنی گن کو ہاتھ نہیں لگانے دے گا۔ پھر؟ ریاض نے اسد کو تشویش سے اپنی طرف دیکھتے ہوئے پایا تو مُنہ پہ ہاتھ رکھ کر اُسے چُپ رہنے کا اشارہ کیا۔

"تم نے اِن کی گنیں دیکھی ہیں؟" اُس نے سرگوشی میں اسد سے پُوچھا۔

"اُدھر کیمپ میں دیکھ چکا ہوں۔"

"میری تو اِن کے پاس کو بھی نہیں۔ اتنی سی ہیں،" ریاض نے کہنی پہ ہاتھ رکھ کر اُن کی لمبائی بتائی، "کاغذ کی طرح ہلکی ہیں۔ مگر بڑی مشین گن کا مقابلہ کرتی ہیں، ٹانگوں والی مشین گن کا۔" وہ للچائی ہوئی نظروں سے اُس آدمی کی طرف دیکھنے لگا جو اُن سے ذرا دُور اپنے تھیلے میں سے چیزیں نکال نکال کر باہر رکھ رہا تھا۔ اسد کا دل دہل گیا۔ وہ اِس وقت ریاض کے خیالات صاف طور پہ پڑھ رہا تھا۔

"تمہاری گن ٹھیک ٹھاک ہے۔" اُس نے سرگوشی میں ریاض سے کہا، "تمہارے مطلب کے لیے اچھی ہے۔" چند سیکنڈ کے بعد وہ بولا، "ولایتی ہے۔"

"دُور مار نہیں کرتی۔" ریاض اُس آدمی کی طرف دیکھتا رہا۔ "اصلی گن تو اِن کی ہے۔"

چٹان پہ ایک آدمی کا سر نمودار ہوا، پھر اُس کا دھڑ دکھائی دیا، اور وہ بے آواز پاؤں پہ اِس طرف کود آیا۔ ریاض اور اسد اُس کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ اُس نے اُچک کر دیوار کے اُوپر سے دو تاروں کے سرے اپنی طرف کھینچے اور کھینچتا ہوا نیچے تک لے آیا۔ تھیلے والے نے اور اُس آدمی نے مِل کر جلدی جلدی

سے اندھیرے میں تاروں کے سِرے بیٹری میں فِٹ کیے۔ افسر اِس دوران گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے جھک کر کھڑا انہیں کام کرتے ہُوئے دیکھتا رہا۔

"اوکے؟" پھر وہ بولا۔

"اوکے، سر۔" بیٹری والے نے جواب دیا۔

افسر نے ہاتھ لمبا کر کے تاروں کو چھُو کر دیکھا اور اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اسد اور ریاض واپس آ کر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر وہاں کھڑا رہنے کے بعد افسر اور تاروں والا آدمی ایک دوسرے کے پیچھے اُچک کر دیوار پر چڑھے اور دُوسری طرف اُتر گئے۔ اسد نے اُٹھ کر نظر دوڑائی۔ وہ دونوں تاروں کے ساتھ ساتھ اُنہیں چیک کرتے ہُوئے نیچے جا رہے تھے۔ جگہ جگہ پر رُک کر افسر تاروں کی پوزیشن کو درُست کرتا جا رہا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اسد کی نظر دھُندلا گئی۔ وہ ریاض کے پاس بیٹھ گیا۔ اُس کے دل کی عجیب کیفیت تھی۔ اُس کے اندر خوشی اور غم کے مِلے جُلے جذبات تھے۔ اُس کے خیال میں نہیں آ رہا تھا کہ کس طور یہ کیفیت سنبھالے، اِسے محسوس کرے، اس کی حقیقت کو سمجھے۔ اُس کے اندر ایک کھُد بُد لگی تھی۔ ریاض اور غلام کے ہمراہ وہ ٹرک والا واقعہ اِس قدر ناگہانی طور پہ رُوپذیر ہُوا تھا کہ جذبات آناً فاناً میں، جھٹکے کی سی کیفیت سے آئے تھے اور گزر گئے تھے۔ اُس منظر نے اُس کے ذہن پر شوخ چھاپے کی طرح اپنی شکل بنائی تھی اور پھر جلد ہی مدھم پڑنا شروع ہو گیا تھا۔ اب اِس واقعے کی حقیقت کچھ اور تھی۔ یہ واقعہ ایسے رونما ہو رہا تھا جیسے کوئی بڑی محنت سے، باریک بینی سے اِس کے نقش اُس کے دل پہ کشید کر رہا ہو۔ ایک طویل اور خُنک اِنتظار کے دوران، جب کہ رات قطرہ قطرہ بھیگ کر رِستی جا رہی تھی اور اِس رات کی بے تابی اوس کی مانند اسد کی ہڈیوں میں ہلکا ہلکا لذیذ درد پیدا کر چکی تھی، جب کہ فوجی افسر واپس آ کر اُسی طرح اپنے پاؤں پہ کھڑا ہاتھ پیچھے باندھے اِدھر سے اُدھر چکّر لگا رہا تھا اور ریاض پتھر سے ٹیک لگائے اونگھنے لگا تھا، اسد نے سوچا کہ یہ واقعہ اب سکیم کے مطابق عمل میں آئے خواہ نہ آئے اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، اِس کا نشان اُس کے دل میں گہرا اور مُستقل ثبت ہو چکا تھا۔ اِس رات کے اندر، چند منٹ کے عرصے میں اُس نے اپنی داہیں آنکھ کے کونے کے اُوپر، سانپ کی زبان کی طرح موت کا سایہ لپکتا ہُوا دیکھا تھا یا اس کا انتظار کیا تھا، اور اُس کی زد سے بچ کر نکل آیا تھا۔ اور یہ سایہ اُس کے ساتھی کا تھا جو اُس کا دشمن بھی تھا۔ اور اب، اب وہ خود، کچھ اَن دیکھے لوگوں کی گھات میں، اسی موت کے سایے کی ایک شکل کو ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا۔ وہ اِس بات کو کس طرح محسوس کرے اور سمجھے! جب رات میں اُن لوگوں کی حرکت رُک گئی اور انتظار شروع ہُوا تو اُس

کا ذہن بٹ گیا تھا اور خیال اس محور کی جانب دوبارہ کھنچا جا رہا تھا جو زندگی کے اسرار کا مسکن ہے۔

کون سی صورت سچی ہے اور کون سی جھوٹی ؟ وہ کس پہ یقین کرے اور کس پہ نہ کرے ؟ یہ علت عمر بھر سے اُس کے ساتھ لگی تھی اور موقع بے موقع اُس کے راستے میں آ کھڑی ہوتی تھی۔ وہ اپنے تردد کے اِس بوجھ سے تھک چکا تھا۔ وہاں بیٹھے بیٹھے اُس نے اپنے ذہن کو صاف کرنے کی کوشش کی۔ اس کی ایک ہی صورت تھی، کہ بہت سے فالتو جھاڑ جھنکاڑ کو اکھاڑ پھینکا جائے۔ اُسے ہمیشہ سے یہ حسرت رہی تھی کہ کبھی ایسا ہو کہ اُس کے دل میں صرف ایک خیال، ایک تصور یا ایک جذبہ رہ جائے، اور کچھ بھی نہ رہے، اُس کی زندگی پاک صاف اور روشن اور بے تردد ہو جائے۔ اُس کی یہ خواہش کبھی پوری نہ ہوئی تھی۔ صرف کبھی کبھی یہ خواہش اپنی شدت سے اُس کے ذہن میں روشنی کا ایک جھپاکا پیدا کرتی، جس کے اندر کوئی خیال، کوئی ایک تصور ایک لحظے کے لیے اُس کے اُوپر روشن ہو جاتا۔ پھر وہی بوجھ، وہی تردد۔

اُس وقت وہاں بیٹھے بیٹھے ایک اُڑتے ہوئے لمحے کو اسد کا ذہن شیشے کی مانند صاف ہو گیا۔ اُس نے محسوس کیا کہ اس وقت دُنیا بھر میں اُسے صرف ایک بات کا یقین ہے۔ کہ ریاض اُس کا رفیق ہے۔ وہ جو آنے والے واقعات پہ کھلے دل سے خوشی کا اظہار کر کے اب آرام سے ٹیک لگائے اونگھ رہا ہے، وقت پڑنے پر اسی آرام سے اُس کی خاطر جان بھی دے دے گا۔ اس بات کا اسے یقین تھا۔ اِس بوجھل اور متضاد دنیا میں چند چیزیں تھیں جو اٹل تھیں۔ دوستی اُن میں سے ایک تھی۔ اسد نے بے اختیار ہاتھ بڑھا کر ریاض کے کندھے پر رکھ دیا۔ ریاض نے آنکھیں کھول دیں۔

"کیا ہے ؟"

"کچھ نہیں" اسد نے کہا۔

"تمہیں تو نیند نہیں آتی۔ سانس نے مصیبت ڈال رکھی ہے۔ کسی اور کو بھی سونے نہیں دیتے"

"میری سانس بالکل ٹھیک ہے۔"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے کہتے رہتے ہو اور ساری رات خرخراتے رہتے ہو۔ جنتی کے پاس کیا ٹنڈ لینے گئے تھے ؟"

"تمہارے بس میں ہو تو اُس سے ٹنڈ بھی لے آؤ۔"

"لے آؤں یا دے آؤں" ریاض نے مزا لے کر کہا۔

"بڑے بے حیا ہو۔"

"بے حیائی کی کیا بات ہے۔ دیکھا نہیں کیسے مٹک مٹک کر چلتی ہے؟"

"خواہ مخواہ، سیدھی سادی چلتی ہے۔"

"تمہیں ان عورتوں کی عقل نہیں۔ مجھ سے پوچھو۔ سات آسمانوں کی سیر بھی کرا دو تو خوش نہیں ہوتیں۔ منہ مانگتی ہیں ——"

اس مشکل مقام پہ بیٹھے، ایک مہلک رات کا طول کاٹتے ہوئے اسد کو ان ننگی باتوں میں لطف آنے لگا۔ ریاض کی باتیں سننے کے لیے وہ جان بوجھ کر اسے موقع مہیا کرتا رہا اور اس کے نیم سرد اعضاء میں حرارت کی لہر دوڑتی گئی —— بجلی اور آگ، اس کے دل سے اُڑتا ہوا خیال گزرا، خون اور خطرہ اور موت اور رانوں کی لذت ایک تار ہے۔ آخر جب ریاض اپنے عمر بھر کے قصے چند باتوں میں بیان کر کے، بدن کی پوشیدہ جگہوں کے نام لے لے کر اور ان کے رشتے جوڑ کر سیر ہو گیا تو خوشی سے ہار کر خاموش ہو رہا۔ اسد کے جوڑوں سے اوس کی نمی خارج ہو چکی تھی اور اس کا ذہن صاف ہو گیا تھا۔ اب اس کے اندر خون اور خطرے کی خالص لذت رواں تھی اور ذہن میں تیقن کی ایک اٹل صورت تھی۔

"ریاض" اس نے نرم آواز میں پکارا۔

"ہوں"

"ساری عمر میں میرے دو دوست بنے ہیں"

"اچھا؟"

"دونوں کا نام ریاض ہے"

"ریاض اچھے ہوتے ہیں"

"ہاں" اسد نے جذباتی لہجے میں کہا۔

ریاض ہنس پڑا۔ "دوسرا کون ہے؟"

"میرے ساتھ کالج میں پڑھتا تھا۔"

"اب کیا کرتا ہے؟"

"اب بھی پڑھتا ہے۔"

"اتنے سال سے پڑھ ہی رہا ہے؟"

"ہاں۔ وکیل بنے گا۔"

"وکیل؟" ریاض نے مرعوب ہو کر پوچھا۔

"پندرہ سولہ سال پڑھنا پڑتا ہے۔"

"کب بنے گا؟"

"تین چار سال میں۔"

"تم بھی وکیل بن سکتے ہو؟"

"ہاں۔ اگر پڑھتا جاؤں تو۔"

"تو کیوں نہیں بنتے؟" ریاض نے پوچھا، "یا اب افسر ہو گے اُدھر؟"

"میں تو عارضی ہوں۔" اسد نے کہا، "اپنی بُوٹی لے کر چلا جاؤں گا۔"

"کیا کرو گے وہاں؟" ریاض نے پوچھا، "بُوٹی کھاؤ گے؟" وہ ہنسنے لگا۔

"کچھ نہ کچھ کروں گا۔" اسد نے جواب دیا۔

"اِدھر کیوں نہیں رہ جاتے؟"

"اِدھر نہیں رہ سکتا۔"

"کیوں؟"

"کیا کروں گا۔ میں عارضی ہوں۔" اسد نے کہا، "اُدھر میرا گھر ہے۔"

"اُدھر کیا کرو گے؟" ریاض نے دہرا کر پوچھا۔

"اخبار میں کام کروں گا۔"

"خبریں لکھنے کا کام؟"

"ہاں۔"

"کسی بڑے شہر میں ہی کرو گے۔"

"ہاں۔" اسد نے کہا۔ "کسی بڑے شہر میں۔"

ریاض خاموش ہو گیا۔ اسد نے خیال کیا کہ شاید ریاض اپنے تصور میں اُسے کسی بڑے شہر کے اندر خبریں لکھتے ہوئے دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ کچھ دیر کے بعد ریاض نے جمائی لی اور دوبارہ ٹیک لگا کر اونگھنے لگا۔ اسد نے آسمان پر نظر ڈالی۔ یاسمین کے پھیرے آسمان میں گڑے تھے۔ اسد کا انگ انگ جھرجھرا اُٹھا۔ یہ اُجالا کیسا ہے؟

اُس نے آنکھوں پر زور دے کر دیکھا۔ صبح ہوگئی ہے یا میری آنکھوں کا فتور ہے؟ شاید صبح ہونے والی ہے۔

فوجی افسر جو تھوڑی دیر کے لیے ایک پتھر پہ بیٹھ گیا تھا، اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ سڑک کی جانب منہ کر کے کھڑا ہوگیا اور نیچے دیکھنے لگا۔ سڑک والے دو آدمیوں میں سے ایک تیزی سے بھاگتا ہوا اوپر چڑھتا آرہا تھا۔ اوپر پہنچ کر وہ کُودا اور اُن کے پاس آکھڑا ہوا۔ سنبھلتے ہی اُس نے کلائی پہ بندھی گھڑی افسر کے سامنے کردی۔

"پچاسی سیکنڈ" افسر گھڑی دیکھ کر بولا، "گڈ" پھر وہ اُس شخص سے مخاطب ہو کر بولا، "ٹھیک ہے۔ شاباش۔"

وہ آدمی اُچک کر دیوار پر چڑھا اور نیچے اُتر گیا۔ اِس کھٹ پٹ سے ریاض کی آنکھ کُھل گئی۔ اُس نے کمر پہ ہاتھ پھیر کر اپنی گن کو ٹٹولا اور سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ آسمان پہ اُجالا بڑھ رہا تھا۔ ستاروں کی روشنی لحظہ بہ لحظہ ماند پڑ رہی تھی۔ ریاض اُٹھ کھڑا ہوا۔ نیچے اُترتا ہوا آدمی ایک چھوٹی سی چٹان کی آڑ میں پہنچ کر رُک گیا۔ یہ عمودی چٹان سڑک سے کچھ فاصلے پر پہاڑ کے دامن میں واقع تھی۔ دوسرے آدمی کی جگہ ایک اسی قسم کے بھاری پتھر کی آڑ میں تھی جو پہلے پتھر سے پچاس قدم کے فاصلے پر تھا۔ اِن دونوں پتھروں کی اور افسر کی آپس میں مکمّل تکون بنتی تھی۔ سڑک کا وہ مقام جہاں بارود لگانے کی تیاری ہو چکی تھی ان دو پتھروں کے عین وسط میں اور افسر کی سیدھ میں تھا۔ جب پہلا آدمی پتھر کے پیچھے جا کر بیٹھ گیا تو افسر نے پھر اپنا ہاتھ ہوا میں بلند کیا۔ اب دُوسرا آدمی اپنے پتھر کے پیچھے سے نکلا اور سُرعت سے جا کر بارود کا آخری کنکشن لگانے کا عمل دہرانے لگا۔ عمل پُورا کر کے اُس نے ہاتھ اوپر اُٹھایا۔ جواب میں افسر نے ہاتھ بلند کر کے دُوسرے ہاتھ پر بندھی گھڑی دیکھی۔

"نانوے سیکنڈ" وہ بڑبڑایا۔

بارود والا آدمی چند سیکنڈ تک مزید وہاں کھٹ پٹ کرنے کے بعد واپس آکر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا۔ افسر نے جُھک کر بیٹری والے سے کچھ پُوچھا اور پھر بائیں بازو کے آدمیوں کی جانب چلا گیا۔ اسد نے پیچھے گھوم کر دیکھا تو دنگ رہ گیا۔ مشرق اُن کی پُشت پہ تھا، اور سارے مشرقی آسمان پر اُجالا تیزی سے پھیل رہا تھا۔ سڑک کی جانب ابھی گھپ اندھیرا تھا، مگر دُوسری طرف سفیدی کی ایک پٹی اُبھرتی آرہی تھی۔ اُس آسمان پر صرف چند بڑے بڑے شوخ ستارے باقی رہ گئے تھے۔ بیٹری والا آدمی چوکنّا ہو کر پتھر کی دیوار کے ساتھ کھڑا تھا۔ اُس کے پاس جو آلہ تھا وہ دراصل بھاری بیٹری کی شکل کی کوئی چیز نہ تھی بلکہ ایک جدید قسم کا ہلکا سا چوکھٹا تھا جس کا ایک بٹن دبانے سے برقی رَو رواں ہوتی تھی۔ مگر ریاض اسے 'بیٹری' کہتا تھا۔ بارود والی تاروں کے سِرے اُس چوکھٹے کی پُشت میں آکر لگے ہوئے تھے، اور آدمی چوکھٹے کو احتیاط سے اُٹھائے چوکس کھڑا تھا۔ آبزرویشن والا آدمی اب صاف نظر آرہا تھا۔ وہ چوٹی پر کھڑا

بازو کے اشارے سے غالباً افسر سے باتیں کر رہا تھا جو اسد کی نظروں سے اوجھل بائیں بازو کے آدمیوں کے ساتھ تھا۔ دفعتہً رات کے سناٹے کو توڑتی ہوئی دور سے کسی گاڑی کے انجن کی مدھم سی آواز آتی ہوئی سنائی دی۔ آواز تیزی سے قریب آ رہی تھی۔ اسد اور ریاض اور بیٹری والا سر دبا کر بیٹھ گئے۔ قریب آنے پر آواز ایک سے زیادہ گاڑیوں کی معلوم ہونے لگی۔ اچانک پہاڑوں میں بتیوں کی روشنی چمک اٹھی۔ روشنی کی ایک دیوار پتھروں کو چمکاتی، اندھیرے آسمان میں شعاعیں پھینکتی، شور مچاتی ہوئی گزر گئی۔ اسد کا دل بری طرح پھڑ پھڑا رہا تھا۔ شور سے اس کے کان پھٹے جا رہے تھے۔ اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے سڑک سے گاڑیاں نہیں ہوائی جہاز گزر رہے ہیں۔ سڑکوں کے انجنوں کی اتنی مہیب آواز اس نے پہلے کبھی نہیں سنی تھی۔ ان کے گزر جانے کے بعد افسر جھک کر چلتا ہوا بائیں طرف سے نمودار ہوا اور اپنی جگہ پر پہنچ کر پتھر پر بیٹھ گیا۔

"کون تھے؟" اسد نے بیوقوفوں کی طرح سوال کیا۔

"کوئی ہوں گے۔" ریاض نے سرگوشی میں جواب دیا، "اندھیرا ہے۔ اوپر سے کلیر بھی نہیں ملا۔"

افسر نے ہاتھ کے درشت اشارے سے انہیں چپ رہنے کو کہا۔ اس کی نظریں اوپر چوٹی پر لگی تھیں۔ اسے نیچے والوں کی فکر نہیں تھی، نہ بیٹری والے کی، نہ ادھر والوں کی۔ اب سب کام تیار تھا۔ سب تنے بیٹھے تھے، صرف ایک اشارے کی دیر تھی۔ اسد نے وہاں بیٹھے بیٹھے مشرق کی جانب دور دور تک ابھرتی ہوئی شکلوں کے اوپر ایک طویل نظر دوڑائی۔ درخت اور پہاڑ اور سپاٹ زمین کے ٹکڑے آہستہ آہستہ اجالے میں آ رہے تھے۔ اس تیز اور تنے ہوئے وقت کا ایک ایک لمحہ حیرت انگیز سست رفتاری سے گزر رہا تھا۔ آٹھ گاڑیاں اور گزر گئیں۔ ان میں پانچ کا ایک قافلہ فوجی گاڑیوں کا تھا۔ ان گاڑیوں کے انجن اور رفتار کی آواز سے اسد کو ان کی پہچان ہوئی اور دیکھے بغیر اسے پتا چل گیا کہ بتیوں کی روشنی پتھروں پہ نہیں پڑی، سڑک اجالے میں آ گئی ہے، مگر کانوائے بڑا ہے، یا اوپر سے کلیر نہیں ملا، گاڑیاں نکل گئی ہیں۔ اگر گاڑیاں دو ہوتیں، اسد نے سوچا، یا تین، اور اوپر سے کلیر کا سگنل مل جاتا، بازو کا ایک قطعی، عمودی اشارہ، تو گاڑیاں ادھر اڑ جاتیں۔ چیزوں کی ترکیب اور ترتیب کیا کام کرتی ہے۔ تاہم زندگی اور موت کا فرق محض اتفاق کی بات ہے۔ اسے علم تھا کہ صرف یہ مختصر سا وقفہ ان کے ہاتھ میں تھا، رات اور دن کا یکساں اور تیزی سے بدلتا ہوا وقت، جب وہ رات بھر کی تیاری کو عمل میں لا سکتے ہیں۔ یہ نکل گیا تو سڑک کا ٹریفک تیز ہو جائے گا اور انہیں اپنے منصوبے کو خیر باد کہنا پڑے گا، یا زیادہ سے زیادہ ایک آدھ ٹرک کو اڑا کر تتر بتر ہو جائیں گے۔ یہ خیال کر کے اس کے دل میں ان لوگوں کے لیے، ان کی محنت اور مہارت اور ان کی تندہی کے لیے ایک نامعلوم سا افسوس پیدا ہوا — جیسے کوئی رفاقت

ٹوٹ جائے ۔ یہ لوگ بھی آخر اُس کی اور ریاض کی طرح اور دُوسرے ہزاروں لوگوں کی طرح عام آدمی تھے جو اپنی روزی کماتے تھے ۔ ایک اتفاق کی بات ان کی کاوش کو ملیامیٹ کر سکتی تھی ۔ اسد کے بچپن کا ایک قدیم سوال اُس کے ذہن میں آیا ۔ یہ اتفاق کیا ہوتا ہے ؟ اُس کا باپ بھی ، جو دُنیا کی سب باتوں کا علم رکھتا تھا ، اِس کا جواب دینے سے قاصر رہا تھا ۔ اُس کے باپ نے یہ کہہ کر ٹال دیا تھا کہ تم بڑے ہو جاؤ گے تو خود ہی سمجھ جاؤ گے ۔ وہ بڑا ہو گیا تھا ، اور لوگوں کے تخیل کی کتنی ہی شکلیں اُس کے دیکھنے میں آئی تھیں ، مگر اُس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا تھا ۔ اتفاق کی بات اٹل رہی تھی ۔ اُس کے باپ نے اصل بات پہ آ کر کیسی چل دی تھی ۔ اِس اتفاق کا ایک عنصر اِس وقت بازو کا ایک مختصر سا اشارہ تھا ، ہوا میں ایک عمودی خط کھینچتا ہوا ، تیز اور مختصر اور تُند ! وہ اشارہ کب آئے گا ، کیسے آئے گا ، کیوں آئے گا ؟ اتفاق کی بات اٹل بھی تھی اور متحرک بھی ، کبھی یہاں کبھی وہاں ، اس کی کوئی جگہ نہ تھی ، کوئی وقت نہ تھا ، کوئی آسان ترکیب نہ تھی ۔ ایک گاڑی اور گزر گئی ۔ یہ ایک کار تھی ۔ افسر کی نظریں چوٹی پر لگی تھیں ۔ اب اجالا اتنا ہو چکا تھا کہ اسد کو اُس گندمی مضبوط چہرے پر آنکھوں کی پتلیاں نظر آ رہی تھیں ۔ اُن آنکھوں میں کوئی تاثر نہ تھا ، نہ خوف نہ جرأت ، صرف انتظار کی بیتابی تھی ، ایک عنصر اور ایک لمحہ ۔ الگ تھلگ ۔ اُس کا رنگ زرد تھا ۔

درخت اور پہاڑ اور سپاٹ زمین کے ٹکڑے —— اِس علاقے کا عام منظر ۔ مگر اُس وقت اسد کو محسوس ہو رہا تھا جیسے آج تک اِن چیزوں کو اُس نے آنکھیں کھول کر نہیں دیکھا ۔ اِس صبح کو اُن پر ذہانت کا اور رَوشنی کا ایک تیز جال تنا ہُوا تھا جو ایک طرف سے آہستہ آہستہ کھینچا جا رہا تھا ، اور جو جگہ ننگی ہو جاتی تھی ایک انوکھی شکل میں نمودار ہوتی تھی ، جیسے پہلی بار دکھائی دے رہی ہو ۔ تُندی سے آسمان کو اٹھتی ہوئی چٹانیں ، جنگلوں کے گھٹاٹوپ ریوڑ ، ان میں ایک ایسی مقناطیسی کشش تھی جو اُس کی نظر کو بار بار اپنی جانب کھینچ رہی تھی ۔ اُس کی آنکھوں میں شیشے کا سا ٹھہراؤ آ گیا تھا اور نظر اس وسیع و عریض منظر کی ایک ایک چیز پہ اٹک رہی تھی ۔ اُس کی نظر میں چاہت اور حسرت تھی ، جیسے وہ اس سرزمین کو آخری بار دیکھ رہا ہو ۔

جب چوٹی پر آبزرویشن والے کا بازو ہوا میں اُٹھا اور گرا تو اسد کو پتا بھی نہ چلا ۔ صرف آنکھ کے کونے سے اُسے نظر آیا کہ افسر اپنی جگہ سے اُچھل کر کھڑا ہو گیا ہے ۔ اُس کے ساتھ ہی ریاض ، اسد اور بیٹری والا آدمی بھی اچھل پڑے ، جیسے دبے ہُوئے سپرنگ ایک ساتھ چھوٹ جائیں ۔ افسر نے اپنا بازو ہوا میں بلند کیا ۔ بارود والا آدمی پتھر کی آڑ سے نکل کر بھاگا اور سڑک کے کنارے پہنچ کر بیٹھ گیا ۔ اُس کے ہاتھ تیزی سے ہل رہے تھے ۔ دُور سے اب موٹر کے انجن کی آواز آنی شروع ہو گئی تھی ۔ ایک دو تین چار —— اسد دل میں گن رہا تھا ۔ موٹر کی آواز قریب آتی جا رہی تھی ۔ لمحے تیزی سے گزر رہے تھے ۔ پانچ چھ سات آٹھ نو —— اسد نے افسر کی طرف دیکھا ۔ اُس فوجی افسر کی ساری جان گویا

اُس کی آنکھوں میں سمٹ آئی تھی۔ اُس نے اپنی مشین گن پر ایک مکا جمایا اور دانت پیس کر بولا، "ہری اپ، مین" "دس۔ گیارہ۔ بارہ۔ وہ آدمی اپنا کام ختم کرکے اب واپس بھاگ رہا تھا۔ افسر کے چہرے کا تناؤ کم ہوگیا۔ وہ تیزی سے اسد اور ریاض کی طرف مڑ کر چیخا: "بیٹھ جاؤ۔" وہ دونوں دبک کر بیٹھ گئے۔ افسر پھر اپنی جگہ پر کھڑا ہوکر سڑک کو دیکھنے لگا۔ وہ اپنا ایک ہاتھ آہستہ آہستہ اُٹھا کر کندھے کے برابر لایا اور وہاں روکے کھڑا رہا۔ گاڑیوں کی آواز اب بہت قریب آگئی تھی۔ بیٹری والا آدمی تاروں والا چوکھٹا گھٹنوں پر رکھے، بٹن دبانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ افسر نے تیزی سے ایک نظر اُس پر ڈالی اور پھر سڑک کو دیکھنے لگا۔ ریاض اور اسد افسر کے چہرے پر نظریں جمائے بیٹھے تھے، جیسے نیچے ہونے والے واقعات کا عکس اس کے چہرے پر نظر آئے گا۔ گاڑیاں دو ہیں یا تین ہیں، اسد نے اندازہ کیا، ایک سے زیادہ ہیں۔ اب سامنے آگئی ہیں۔ آواز بالکل سامنے سے آرہی ہے۔

افسر کا ہاتھ نیچے گرا تو بیٹری والے نے اپنے ہاتھ کا انگوٹھا بٹن پر رکھ کر سارا وزن اُس پر ڈال دیا۔ ریاض اور اسد اُچک کر کھڑے ہوگئے۔ پہلے ٹرک کے اگلے ٹائروں کے عین نیچے دھماکہ ہوا۔ دھواں، گرد اور بڑے چھوٹے پتھر پھوٹ کر سڑک سے نکلے۔ ایک لمحے کے لیے اسد کے اندر ہلکی سی مایوسی کی لہر دوڑ گئی۔ ٹرک اُس کے تخیل کے مطابق نہ پلٹ کر گرا نہ ہی اُس کے پرخچے دور تک ہوا میں اُڑتے ہوئے گئے۔ اس کے برعکس بھاری ٹرک کے اگلے پہیے ہوا میں ایک فٹ کے قریب اُٹھ گئے اور وہ نیچے آرہے تھے کہ دھماکے کی رو سے پچھلے پہیے بھی چند انچ اُچھل پڑے، جیسے کوئی چوپایہ اپنی جگہ پر کھڑا کھڑا ہوا میں کود جاتا ہے۔ بظاہر ٹرک کو کوئی اور نقصان نہ پہنچا تھا، مگر اُس کا انجن بند ہوگیا، اور وہ لڑھکتا ہوا چند گز کے فاصلے پر سڑک سے اُتر کر رک گیا۔ ٹرک کی باڈی میں بیٹھے ہوئے چار فوجی اور آگے ڈرائیور اور اُس کے ساتھ بیٹھا ہوا ایک فوجی چلا چلا کر آوازیں نکالتے ہوئے کودے اور ٹرک کے پیچھے دبک گئے۔ پچھلے ٹرک کے ڈرائیور نے ایک دم بریک لگائی، پھر اُس نے سٹیرنگ گھمایا اور سڑک سے اُتر کر پرلی طرف سے نکل جانے کی کوشش کی جہاں سڑک کے تازہ تازہ شگاف کے ساتھ کچھ ہموار جگہ تھی۔ ٹرک کا ایک پہیہ ایک گڑھے میں جا گرا، مگر ڈرائیور نے زور لگایا اور تین چار سیکنڈ کے اندر موڑ توڑ کر اُس نے ٹرک کو کامیابی کے ساتھ وہاں سے نکال لیا۔ آگے رستہ صاف تھا۔ ٹرک کے انجن سے ایک پھنکار بلند ہوئی، اور وہ ایک دھچکے کے ساتھ سڑک پر چڑھا ہی تھا کہ مشین گن کی ایک بوچھاڑ نے اُس کی ونڈ سکرین کے ٹکڑے اُڑا دیے۔ ٹرک گھوما اور سڑک کے کنارے پڑے ہوئے ایک بھاری پتھر سے ٹکرا کر جامد ہوگیا۔ اُس کے دروازوں میں کوئی حرکت نہ ہوئی۔ یہ کھلا ٹرک تھا جس کے پیچھے کوئی سوار نہ تھا۔ اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ ایک اور فوجی تھا۔ اُن دونوں کے جسم سیٹ پر اوندھے پڑے تھے۔

پہلے ٹرک کے عقب سے رائفل کے چند فائر ہوئے۔ ایک گولی پہاڑ کے پہلو میں پتھروں کو آکر لگی۔ اوپر سے

ایک گرینیڈ ٹرک سے چند قدم اِدھر جا کر گرا اور لڑھکتا ہوا ٹرک تلے چلا گیا۔ دوسرا گرینیڈ عین ٹرک کی باڈی پر پڑا اور اچھل کر دوسری طرف لڑھک گیا۔ دونوں گرینیڈ یکے بعد دیگرے چھوٹے۔ ڈھول اور دھماکوں کے ساتھ ہی فضا میں ٹوٹی پھوٹی چیخوں کی آواز بلند ہوئی اور ٹرک کے پیچھے سے چار آدمی بھاگتے ہوئے نکلے۔ ایک فوجی انجن کی طرف سے نکل کر آگے کو بھاگا اور تین ٹرک کے عقب سے پیچھے کو دوڑے۔ آگے کو بھاگنے والا ایک ٹانگ پر دوڑ رہا تھا۔ پیچھے کو بھاگنے والے اپنی رائفلوں کو سنبھالے جھک کر دوڑتے ہوئے دو بڑے پتھروں کی پناہ لینے جا رہے تھے جو اُن سے بیس قدم کے فاصلے پر تھے۔ اُن چاروں کے سروں پر آہنی خود تھے۔ چاروں طرف سے اُس سمت پانچ مشین گنیں اُن پر چل رہی تھیں۔ بیٹری والا آدمی کھڑا اطمینان اور سُرعت کے ساتھ بجلی کی دو تاریں کھینچ کھینچ کر انہیں گولے کی شکل میں لپیٹتا جا رہا تھا۔ اچانک اسد کی نظر ریاض پر پڑی۔ ریاض کی پیٹھ اُس کی طرف تھی اور دونوں پاؤں اُس چٹان پر تھے جس سے ٹیک لگائے وہ اونگھتا رہا تھا۔ اب وہ اُچک کر اوپر دو چھوٹے چھوٹے اُبھرے ہوئے پتھروں کے درمیان پیٹ کے بل لیٹا ہوا تھا اور اپنی چھوٹی سی سٹین گن کو کندھے سے لگائے گولیاں چلا رہا تھا۔ اسد دم بخود کھڑا اُسے دیکھتا رہا، جیسے اُس کے ہاتھ اور پاؤں ایک دم مفلوج ہو گئے ہوں۔ ایک خیال، جو اُس کے ذہن میں آیا وہ تھا، سڑک تو اُس کی رینج سے باہر ہے!

تین بھاگتے ہوئے فوجیوں میں سے ایک کو گولیوں کی باڑ نے آلیا تھا۔ اُس فوجی نے رائفل ہاتھ سے گرا کر دونوں ہاتھوں سے اپنی گردن کو دبوچ لیا، جیسے اپنی سانس بند کرنے کی کوشش کر رہا ہو۔ دو ایک قدم وہ اسی طرح دوڑتا گیا، پھر گھٹنوں پر گر پڑا اور اپنا گلا دبائے دُہرا ہو گیا۔ اُس کا خود گر پڑا اور اُس کا سر زمین پر لگ گیا۔ اِس سجدے کی حالت میں اُسے کئی اور گولیاں لگیں۔ اُس کے جسم نے ہلکے ہلکے چند تیز جھٹکے کھائے اور پھر اُلٹا ہو کر پُشت پر گر پڑا۔ اُس کے ہاتھ گردن سے الگ ہو گئے اور وہ سیدھا لیٹا لیٹا چاروں ہاتھ پاؤں تیزی سے اِدھر اُدھر مارنے لگا، جیسے کوئی باریک ٹانگوں والا بھاری کیڑا الٹا ہو کر بے بضاعتی سے ٹانگیں ہوا میں چلاتا ہے۔ اُس نے اگلا فوجی گولیوں کی بوچھاڑ کے آگے بے بس ہو کر وہیں پر گر پڑا اور ایک چھوٹے سے پتھر کے ساتھ چپک کر لیٹ گیا۔ وہاں اُس نے اندھا دھند اپنا سر پتھر کے نیچے زمین میں دھنسنے کی کوشش کی، پھر گولیوں کی زد سے پناہ نہ پا کر اُچھل کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ ابھی وہ ایک قدم بھی دوڑنے نہ پایا تھا کہ بازو پھیلا کر کسی بھاری کپڑے کی طرح اوندھے منہ زمین پر گر پڑا اور بے حرکت ہو گیا۔ تیسرا فوجی ہمت کر کے دوڑتا گیا اور آخر بھاری پتھر تک پہنچ گیا۔ دوسری طرف کو بھاگنے والا اکلوتا فوجی لنگڑاتا ہوا، حیرت انگیز طور پر گولیوں کی مار سے بچتا ہوا اُس پتھر تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جس کے ساتھ دوسرا ٹرک جا کر ٹکرایا تھا۔ وہ ٹرک اور پتھر کی آڑ میں پہنچ کر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ چند سیکنڈ کے وقفے کے بعد ان فوجیوں نے دونوں

جانب سے اپنی رائفلوں کے اِکّا دکّا جوابی فائر کرنے شروع کر دیے۔

پھر ایک دم خاموشی ہوگئی۔ چاروں پانچوں مشین گنیں ایک ساتھ رُک گئیں۔ جوابی فائر بھی تھم گیا۔ افسر نے ریاض کی طرف دیکھا اور چیخ کر بولا، "گیٹ ڈاؤن یُو فول۔"

ریاض وہیں بیٹھا بیٹھا خاموشی سے دانت نکال کر ہنسا۔ افسر نے اپنے ہاتھوں کو کچھ ایسے حرکت دی جیسے مشین گن کا رُخ اُس کی طرف پھیر رہا ہو اور دانت پیس کر بولا، "نیچے اُتر جیلن......"

ریاض پیٹ پر کھسک کر چٹان کے زینے پر آ رہا۔ نیچے سے دو فائر آئے۔ مشین گنوں کی بوچھاڑ پھر شروع ہو گئی۔ اُن کی آہنی، ٹھکتی ہوئی مسلسل آواز، کھٹاکھٹاکھٹاکھٹ چاروں طرف سے گونج رہی تھی۔ بیچ بیچ میں نیچے سے پُرانی طرز کی ایک ایک گولی والی رائفل کی تیز پٹاخے دار آواز آتی۔ ریاض سُرعت کے ساتھ اپنی گن میں نئی گولیاں ڈال کر پھر اُوپر جا لیٹا تھا۔ اُس وقت اسد جیسے ایک سکتے کی حالت سے جاگ اُٹھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے ریاض کی پُشت پر اُس کا کُرتہ نوچ کر اُسے نیچے کھینچنے لگا۔ ریاض کا جسم گرہ کی مانند پتھر سے چمٹا ہوا تھا۔ دفعتہً اسد کو محسوس ہُوا کہ ریاض کی طرف سے مدافعت ختم ہوگئی ہے۔ وہ اُس کے ہاتھوں میں کھسکتا آ رہا تھا، اور اسد اُسے کھینچنے کی بجائے سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

ریاض اُسی پتھر کے ساتھ بیٹھا تھا جس کے ساتھ وہ ٹیک لگائے رات بھر اُونگھتا رہا تھا۔ وہ اُسی طرح ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اُس کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا ہوا تھا اور اُس کی آنکھیں بے نُور تھیں۔ اسد اُس کے سامنے کھڑا بے یقینی سے اُسے دیکھ رہا تھا، جیسے ریاض جھوٹ موٹ وہاں بیٹھا اُس سے مذاق کر رہا ہو۔ اُس کی سوچ بند ہو چکی تھی۔ اُس کا دل بار بار ایک ہی بات دُہرائے جا رہا تھا: یہ کیا ہُوا ہے؟ گولی کان میں داخل ہو کر سر کے پچھلے حصّے کو پاش پاش کرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ مگر اُس کے چہرے کو کوئی نقصان نہ پہنچا تھا؛ اُس کے نقش اُسی طرح صاف سُتھرے، کھڑے کھڑے اور جان دار تھے۔ اسد نے ہاتھ بڑھا کر پیار سے اُس کے چہرے کو چھُوا۔ اس کی جلد ابھی گرم اور ملائم تھی۔ وہ پہلی بار ریاض کے چہرے کو چھُو رہا تھا، اور اُس لمس نے ایک لمحے میں اسد کو اُس مُردہ جسم کی حقیقت سے آشنا کر دیا۔ دفعتہً اس کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔

ابڑ دیشن والے آدمی کی مشین گن نے دائیں طرف کے پتھر کی آڑ لینے والے آدمی کو خاموش کر دیا تھا۔ چند سیکنڈ کے بعد ٹرک کے پنچر والے آدمی نے اپنی رائفل اچھال کر دُور پھینک دی۔ اب وہ ہاتھ سر سے اُوپر کیے لنگڑاتا ہُوا باہر چلا آ رہا تھا۔ جس وقت اسد ریاض کی سٹین گن اُٹھائے اچک کر اُوپر چڑھا، وہ فوجی ہاتھ اُوپر اٹھائے پہاڑ کے دامن میں پہنچ کر رُک گیا تھا اور ایک ٹانگ ٹیڑھی کیے، مُنہ اُوپر اُٹھائے دیکھ رہا تھا۔ اب ہر

طرف سے فائر بند ہو چکا تھا۔ چند لمحوں تک وہ شخص اسی طرح کھڑا پہاڑ کی چوٹی کی طرف دیکھتا رہا، پھر آہستہ آہستہ سر کو نفی کے انداز میں ہلانے لگا۔ کئی سیکنڈ تک وہ مُنہ سے کچھ بولے بغیر سر کو آہستہ آہستہ ہلاتا رہا، جیسے کسی بات سے منع کر رہا ہو، پھر روتی ہوئی آواز میں چلّا اٹھا: "نہ مارو۔ پرماتما کے لیے مجھے نہ مارو۔ میری ٹانگ،" وہ بلکنے لگا، "ٹوٹ گئی ہے۔ مجھے جان سے نہ مارو۔"

ایک لمحے کے لیے اسد نے صبح کی روشنی میں اس کا سانولے رنگ کا ڈھلکی ہوئی مونچھوں والا دہقان چہرہ صاف طور پر دیکھا، اور گن کندھے پر رکھ کر پورے زور سے لبلبی دبا دی۔ اسی لمحے دوسری طرف سے ایک اور مشین گن کی، ذرا بھاری آواز والی، دو مختصر سی باڑھیں آئیں۔ وہ آدمی اسی طرح ہاتھ اٹھائے، حیرانی سے آسمان کو دیکھتا ہوا پلٹ کر گرا اور آہستہ آہستہ لوٹنے لگا۔ اسد نے اس وقت تک لبلبی دبائے رکھی جب تک کہ اس کی گولیاں ختم نہ ہو گئیں۔

پھر عقب سے کسی نے اس کے سر پر کسی آہنی شے سے زوردار ضرب لگائی۔ اس کی آنکھوں کے اندر روشنی کا ایک سپاٹا چھوٹا اور وہ پلٹ کر گر پڑا۔

★ ★ ★ ★ ★

وہ چت لیٹا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں تو آسمان نظر آیا۔ آسمان پر دھوپ تھی۔ وہ بے حرکت لیٹا آسمان کو دیکھتا رہا۔ اسے کچھ یاد نہ تھا۔ پھر دور سے سائیں سائیں کرتی ہوئی اس کی یادداشت لوٹنے لگی۔ اس کے کانوں میں گھوں گھوں کرتی ہوئی انجن کے چلنے کی آواز آ رہی تھی۔ پھر دو آدمیوں کی خوفزدہ، اونچی آوازیں۔ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ پتھر کی دیوار کے نیچے پڑا تھا۔ اس کے سر میں درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ لگا کر دیکھا۔ سر کا پچھلا حصہ چھوٹے سے گیند کی شکل میں ابھر آیا تھا اور کچھ مقدار میں خون رس کر بالوں میں جما جا رہا تھا۔ نیچے سے گیئر لگانے کی آواز آئی اور گاڑی پیچھے کی طرف چلی، گیئر بدلا اور گاڑی آگے آئی، پھر پیچھے، پھر آگے۔ یہ ایک سویلین ٹرک تھا، اسد نے آواز سے پہچانا۔ ٹرک گھوم کر جدھر سے آیا تھا اُدھر واپس چلا گیا۔ اب اس کے چاروں طرف سناٹا تھا۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ نہ وہ لوگ، نہ ریاض کا جسم، نہ کسی شے کا نام و نشان، جیسے کچھ دیر پہلے کے واقعات ایک خواب تھے۔ اس کے چاروں طرف اب پتھر کی بے جنبش چٹانیں گڑی تھیں، جیسے آج تک کسی نے یہاں قدم نہ

دھرا ہو۔ اُسے اُبکائیاں آنے لگیں۔ اُس نے پاؤں کے بل بیٹھ کر قے کی۔ کچھ دیر تک وہ سر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے وہاں بیٹھا رہا۔ اُس کے کانوں میں دوبارہ دُور سے گاڑیوں کے انجنوں کی آوازیں آنی شروع ہوئیں۔ وہ اُٹھا اور آہستہ آہستہ پہاڑ سے اُترنے لگا۔

(۱۱)

"آج کچھ لے کر آئی ہوں۔ کچھ کل لے آؤں گی۔" جنّت نے کہا۔

"بہت ہے۔" اسد نے گٹھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا، "اور نہیں چاہیے۔"

"سوکھ کر تھوڑی رہ جاتی ہے۔"

"میرے لیے بہت ہے۔ زیادہ کی کیا ضرورت ہے؟"

"تمہاری سانس اب اچھی ہے؟"

"ہاں۔" اسد نے کہا، "اب اچھی ہے۔"

اس کی سانس کا توازن قائم تھا۔ دن بھر درختوں میں چھپے رہنے کے بعد وہ رات کو ادھر آیا تھا۔ جنّت نے اُسے تازہ روٹی پکا کر دی تھی۔ اب وہ بیٹھا ایک قسم کے ساگ کے سالن کے ساتھ روٹی کھا رہا تھا۔ بچہ ایک طرف زمین پر بچھی ہوئی گدڑی کے اوپر لیٹا ٹانگیں اٹھائے اپنے پیروں سے کھیل رہا تھا۔

"ریاض نہیں آیا۔" جنّت نے ذکر کیا۔

"کام پر ہے۔" اسد نے کہا "میں آج رات کو چلا جاؤں گا۔"

"کل چلے جانا۔" جنت بولی، "کہتے ہیں آج پلس پھر رہی ہے۔ اُوپر لنگری کے پار لڑائی ہوئی ہے۔ فوجی مارے گئے ہیں۔"

"تم نے پلس دیکھی ہے؟"

"نہیں۔ کہتے ہیں علاقے میں پھر رہی ہے۔ رات کو چلنا ٹھیک نہیں۔ کئی بے گناہ پکڑے جاتے ہیں۔"

"مجھے کام ہے۔" اسد نے کہا۔ "میں نکل جاؤں گا۔"

"تمہاری مرضی۔"

کھانے سے فارغ ہو کر جنت نے اُس کے برتن دھوئے۔ "تمہارے پاس کپڑا نہیں ہے؟" اُس نے پوچھا۔

"نہیں۔"

جنت نے کھاٹ پر سے ایک گدڑی اور کھیس لا کر اسد کو دیے۔ "یہ لو۔ تھوڑی دیر آرام کر لو۔ پچھلے پہر نکل جانا۔"

اسد نے خاموشی سے گدڑی پکڑ کر ایک طرف زمین پر بچھائی اور کھیس اوڑھ کر لیٹ گیا۔ عورت کچھ دیر تک اِدھر اُدھر کھٹ پٹ کرتی رہی۔ پھر اُس نے لالٹین کی بتی نیچی کی، مگر پھونک مار کر بجھائی نہیں۔ کھاٹ سے اُس نے ایک چوڑا سا لحاف اُٹھایا اور آ کر بچے کے پاس لیٹ گئی۔ لحاف نے اُن دونوں کو ڈھک لیا۔ لالٹین کی بتی بہت نیچی تھی۔ اسد نے لیٹے لیٹے کمرے میں نظر دوڑائی۔ اِس نیم اندھیرے میں بھی کمرے کے اندر صفائی کا احساس ہوتا تھا۔ دو چار چیزیں تھیں مگر کم معلوم نہیں ہوتی تھیں۔ ایسی ترتیب اُس نے حکیم کے کمرے کے بعد اِس کمرے میں دیکھی تھی۔ تھوڑی دیر کے لیے اُس کی آنکھ لگ گئی۔

جب اُس کی آنکھ کھلی تو وہ گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔ اُس نے کواڑ کھول کر آسمان پر نظر ڈالی۔ رات ابھی آدھی سے زیادہ نہیں گزری تھی۔ اُس نے کواڑ بند کر دیا۔ اُس نے ارادہ کیا کہ اب اُسے چل دینا چاہیے۔ کیا پتا کب اس کا کھرا یہاں آ نکلے۔ گھر کے باہر وہ زیادہ محفوظ رہے گا۔ اُس نے جا کر اپنی لوٹی کی ہلکی سی گٹھڑی اُٹھائی۔ اُسے ہاتھ میں لٹکائے وہ کئی لمحوں تک کھڑا جنت کے سوئے ہوئے چہرے کو دیکھتا رہا۔ دیکھتے دیکھتے وہ پاؤں کے بل اُس کے پاس بیٹھ گیا۔ آہستہ سے اُس نے لحاف کا ایک کونا اُٹھایا۔ سفید کرتے کے اندر بے معلوم سانس سے جنت کا سینہ چل رہا تھا۔ اسد نے آہستگی سے اُس کے سینے پر ہاتھ پھیرا، جیسے ہوا پر اپنا ہاتھ چلا رہا ہو۔ بسر ملائے بغیر عورت نے ہولے سے آنکھیں کھول دیں۔ اُس کی آنکھوں میں نیند کے ٹوٹنے کا کوئی استعجاب نہ تھا۔ اُس نے چھوٹی سی یکساں آواز میں اِتنا کہا

"علی۔"

اسد نے گٹھڑی زمین پر رکھی اور اس کے ساتھ لیٹ گیا۔ لحاف کے اندر اُس کے خواب آلود جسم سے ایک مانوس سی بُو آ رہی تھی، جیسے تازہ کھدی ہوئی زمین ہو۔

"میرا نام اسد ہے۔" اسد نے کہا۔

"اسد علی؟" وہ بولی۔

"ہاں۔" کچھ دیر بعد اسد نے کہا۔

رات کے پچھلے پہر وہ جانے کے لیے اُٹھا تو جنت نے ڈرے ڈرے ہاتھ سے اُس کے کندھے کو چھُوا۔ "کل چلے جانا۔" وہ بولی۔

اسد نے جھک کر اپنی گٹھڑی اُٹھائی اور جنت پر ایک نظر ڈال کر باہر نکل آیا۔

"خیال سے جانا۔" دروازے پر اُگی ہوئی جنت نے کہا۔

"اچھا۔" وہ بولا۔

گاؤں سے باہر نکل کر وہ ایک لمحے کے لیے رُکا۔ اُس نے پیچھے مڑ کر اُس مکان پر ایک آخری نظر ڈالی تو اُسے خوشی محمد کا خیال آیا۔ خوشی محمد اب کہاں ہوگا؟ خوشی محمد نے اپنی زندگی سے نکلنے کی خاطر یہاں آ کر ایک عورت کے لیے اپنے ہاتھوں سے یہ حیرت ناک مکان تعمیر کیا تھا، اسد نے سوچا۔ مگر زندگی کی زد سے بچ کر نکلنا کوئی آسان ہے۔

پھر وہ اندھیری رات میں چل پڑا۔

★ ★ ★ ★ ★

سب سے اوّل مسئلہ خوراک کا تھا۔ اُس نے بے آباد علاقوں سے خوراک حاصل کر کے زندہ رہنے کی تربیت حاصل کی تھی۔ مگر اب مسئلہ محض خوراک حاصل کرنے کا نہ تھا، بلکہ گمنامی میں خوراک حاصل کرنے کا تھا۔ جب وہ ادھر آیا تھا تو اُس کے آگے ٹھکانے تھے، اور اُس کے پاس ایک نام تھا اور ایک کوڈ تھا جس سے اُس کی شناخت ہوتی

تھی۔ اب نہ اُس کے پاس نام تھا نہ آگے کوئی ٹھکانا تھا۔ اُس پہلی رات کو کئی بار اُس نے ارادہ کیا کہ ریاض کی ماں کے پاس جائے، اُس سے اِدھر اُدھر کی کوئی بات کرے، اپنا ایک آدھ کپڑا وہاں سے اُٹھائے، اور نکل جائے۔ مگر اِدھر اُدھر کی کیا بات کرے؟ اُس کپڑے بدن اور قدیم چہرے والی بڑھیا کا، جس نے ماں کی طرح اتنی دیر تک اُسے اپنے پاس رکھا تھا، سامنا کرنے کی اُس کو ہمت نہ ہوئی۔ پھر اُس نے خیال کیا کہ سلطان کے پاس چلا جائے۔ مگر سلطان کو خبر پہنچ چکی ہو گی۔ لاش اُن لوگوں نے بہر صورت ٹھکانے لگا دی ہو گی اور اب سلطان اُس کا انتظار کر رہا ہو گا جو بے اجازت اُن کے ساتھ چلا گیا تھا۔ کمانڈو گروپ کو بھی اُس کی اصلیت کا پتا چل چکا ہو گا، رات کی رات میں وہ لوگ دوسری طرف نکل جائیں گے۔ کل تک بات اُوپر پہنچ جائے گی۔ اُس نے احکام کی خلاف ورزی کی تھی۔ اُسے اِن کے طور طریقوں کا اچھی طرح سے علم تھا۔۔۔ وہ رات بھر اُس علاقے کے اندر بے راہ روی سے چکر لگاتا رہا، آخر صبح ہوتے ہوتے باہر ہی باہر سے چل پڑا۔

چنانچہ اب وہ اِس عجیب و غریب صورتِ حال سے دوچار تھا: جہاں پہلے اُس کو شناخت کروانے کے لیے پیش قدمی کرنا پڑتی تھی، اب اسی شناخت کو صیغۂ راز میں رکھنے کا مسئلہ تھا۔ اِس نیم واقف دُنیا میں سفر کرنے کا جو ایک پاسپورٹ اُس کے ہاتھ میں تھا، چھن گیا تھا۔ اب وہ یہاں پہلے دن سے زیادہ اجنبی تھا۔ اُس کا ذہن اس خطرناک صورت کو بھانپ کر جاگ اٹھا تھا۔ اُسے پتا تھا کہ اب اُسے صرف اپنی عقل اور ہشیاری کے بل پر سفر کرنا ہے۔ اُس کی منزلِ مقصود صرف ایک تھی، گمشدہ۔ وہاں تک اُسے کسی نہ کسی صورت پہنچنا تھا۔

خطرے میں گھر کر اُس کا دماغ صاف ہو گیا تھا۔ اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی سوچ میں کوئی رکاوٹ نہیں آئی چاہیے، کوئی ایرا غیرا سوال نہ جواب۔ اُس کے دشمن محاذ اب ایک نہیں دو دو تھے، ایک اپنے، ایک پرائے۔ اور اُسے ان دونوں کے اندر سے نکل کر جانا تھا۔ وہ نہ ایک کے راستے کو کاٹ سکتا تھا نہ دوسرے کے راستے کو۔ اُسے اپنا ایک راستہ نکالنا تھا، اور یہ کوئی آسان کام نہ تھا۔ اِس میں اُسے عقل اور حس دونوں سے کام لینا پڑے گا۔

خوش قسمتی سے ان حالات نے اُس کی سانس پر کوئی بُرا اثر نہ ڈالا تھا۔ کافی عرصے سے اُس کا سینہ متوازن چل رہا تھا، اور جوں جوں خطرہ بڑھتا جاتا تھا اُس کا ذہن تتر بتر ہونے کی بجائے صاف اور تیز تر ہوتا جا رہا تھا۔ اُس نے چوبیس گھنٹے سے سوائے جو کی پرانی فصل کی چند گری پڑی بالیاں چبانے اور ایک چشمے سے مُنہ لگا کر پانی پینے کے اور کچھ کھایا نہ پیا تھا۔ اُس کے پیٹ میں بھوک کے پیچ پڑ رہے تھے، مگر اُس کی قوت برقرار تھی۔ دن بھر میں اُس نے بہت کم سفر کیا تھا۔ بیشتر وقت اُس نے حالات کو جانچنے اور فرار کی سکیم بنانے میں صرف کیا تھا۔ حالات بہت سے تھے اور صورتیں کم تھیں، اور انہیں آپس میں فٹ کرنے کا سوال تھا۔ وہ دن بھر ایک چھوٹے سے جنگل

میں چھپا رہا۔ اس نے اپنے چاقو سے، جو اس کا واحد ہتھیار تھا، ایک مضبوط سی شاخ کاٹی اور اسے چھیل چھیل کر ہموار کرتا رہا، حتیٰ کہ وہ ایک لاٹھی کی شکل میں تیار ہو گئی۔ اخروٹ کی ٹھوس لکڑی کو کاٹتے کاٹتے اس کے چاقو کا پھل اپنی دھار کھو بیٹھا، مگر اس مضبوط لاٹھی کو تیار کر کے اسد کو عجیب سی خوشی اور کفالت کا احساس ہوا۔ چاقو میں وہ چیز نہیں تھی جو اس لاٹھی میں تھی۔ اس لمبی اور گول لکڑی کے ٹکڑے کا اپنا ایک تازہ تازہ وجود تھا، جیسے ایک ساتھی ہو۔ لاٹھی تیار کر کے اس نے چاقو کو پتھر پر رگڑ رگڑ کر تیز کیا۔ جیسے جیسے اس چوڑے اور نوکدار پھل کی چمک اور کاٹ واپس آتی گئی، اسد کے لہو میں سرخوشی کی لہر اٹھتی گئی۔ آخر اس نے چاقو کے دستے کو مضبوطی سے اپنی گرفت میں لیا اور ایک بھرپور وار کے ساتھ اس کے پھل کو ایک پیڑ کے تنے میں گھونپ دیا۔ چیڑ کی نرم لکڑی کی کٹی تہوں کو چیر کر چاقو کا پھل دو اپنچ تک اس کے اندر اتر گیا۔ اسد نے دستہ ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ چاقو تنے میں تیر کی طرح کھبا رہا۔ اس کے دستے میں بے معلوم سا ارتعاش تھا، جیسے زمین کانپ رہی ہو۔ جب اسد نے اسے نکالنے کی کوشش کی تو اسے معلوم ہوا کہ چاقو جس آسانی سے تنے کے اندر اترا تھا اتنی آسانی سے باہر نہیں نکلے گا۔ ایسے لگتا تھا کہ لکڑی نے اسے اپنے جبڑوں میں مضبوطی سے پکڑ رکھا ہے، اور اگر اس نے الٹا سیدھا زور لگایا تو پھل ٹوٹ جائے گا۔

آخر کافی دیر کی تگ و دو کے بعد وہ مہارت سے چاقو کو تنے سے نکالنے میں کامیاب ہو گیا۔ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اس تنے کی نرم ہموار جلد پر کچھ لکھے، کوئی شکل بنائے، کوئی نشان چھوڑے۔ مگر اس درخت نے اسے ایک سبق سکھایا تھا، کہ اگر وہ اپنی چند چیزوں کو اور ان کی متاع کو بے دھیانی سے صرف کرے گا تو اس زمین کے چنگل سے نکلنا اس کے لیے محال ہو جائے گا۔ اس نے احتیاط سے چاقو کا پھل سمیٹ کر کرتے کی جیب میں ڈال لیا۔

راستہ طے کرنے کی ایک بڑی مشکل تھی۔ کون سا راستہ اختیار کیا جائے؟ دو راستے اس کے علم میں تھے۔ ایک راستہ سڑکوں اور دوسرے رستوں کا تھا جو عام استعمال میں آتا تھا۔ دوسرا راستہ ان کے اپنے آدمیوں کا تھا جو سرحد کے قریب تو بارودی سرنگوں کے باعث بدلتا رہتا تھا، مگر آگے نکل کر سڑکوں کے آس پاس چلتا تھا۔ یہ دونوں راستے اس پر بند تھے۔ تیسرا راستہ اس کے علم میں نہیں تھا۔ اور یہی نامعلوم راستہ اسے اختیار کرنا تھا۔ وہ راستہ کون سا تھا؟ اسے صرف اتنا پتا تھا کہ جہاں تک وہ ان دونوں راستوں سے دور دور رہ کر چلتا جائے گا، وہی تیسرا راستہ ہوگا۔ اسے یہ بھی پتا تھا کہ پہاڑی علاقوں میں میدانی سفر کا حساب نہیں چلتا۔ میدانوں میں اگر آپ کسی ایک راستے سے احتراز کرتے ہوئے چلنا چاہیں تو دو چار میل کا چکر کاٹ کر نکل سکتے ہیں۔ میدان کسی کا رستہ نہیں روکتے۔ پہاڑوں کی بات دوسری ہے۔ پہاڑوں کے رستے محدود ہوتے ہیں، اور ان سے اگر آپ ہٹ کر چلنا چاہیں تو سفر کی سمت غائب ہو جاتی ہے، جس کا مطلب ہے کہ سڑک سے اگر دو دن میں اور خفیہ راستے سے چار دن میں سفر کٹتا ہے،

تو نا معلوم رستے سے ہو سکتا ہے چھ دن میں کٹے، ہو سکتا ہے چھ ہفتے ہیں۔ اُس پہلے روز جنگل میں چھپ کر بیٹھے بیٹھے اسد نے اِن چیزوں کا حساب لگانا چاہا تو ممکنات کے اس بے انت سلسلے کو پہنچا۔ ہار کر وہ دُوسری باتوں کے بارے میں سوچنے لگا۔

نام کون سا اختیار کرے ؟ دونوں پہلے راستوں کی مانند، اُس کے دونوں ناموں میں خطرہ پوشیدہ تھا۔ ایک تیسرا نام چاہیے تھا۔ سب سے پہلا نام جو اُس کے ذہن میں آیا امیر تھا۔ امیر اچھا نام ہے، اُس نے سوچا، آسان ہے اور اِس علاقے کا عام نام ہے۔ اس نام سے وُہ بے خطر سفر کر سکتا ہے۔ اُس نے یہ بھی طے کیا کہ بیشتر سفر رات کے وقت کرنا بہتر رہے گا۔ گو ایک آدھ رات اندھیری آئے گی، مگر خطرہ کم ہو جائے گا۔ اُس کی آنکھیں اندھیرے میں سفر کرنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ تین راتوں کے بعد، اُس نے حساب لگایا، چاند کی روشنی اتنی نکل آئے گی کہ آدمی چل سکے۔ اب سب سے اوّل مسئلہ خوراک کا رہ گیا تھا۔ کئی طریقے اُس کے ذہن میں آئے، مگر آخر کار سب کو اُس نے وقت کے اوپر چھوڑ دیا۔ اُن میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جو وقت سے پہلے طے کیا جا سکتا تھا۔ آہستہ آہستہ اُس پر اِس بات کا انکشاف ہوا کہ راستے کا تعین ہو یا خوراک کا حصول، صرف موقع محل ہی اس کی راہ نکالے گا۔ اُس کا کام اتنا تھا کہ اپنی آنکھیں کھلی رکھے اور چوک سے بچا رہے۔ پہلے روز جب وہ چلا تو رات کے تیسرے پہر تک تھک کر رُک گیا۔ ایک مختصر سے گاؤں کے باہر، ایک مہیب درخت کے تنے سے لگ کر اُونگھتے ہُوئے اُس نے باقی رات گزاری۔ اِس سے اُسے دو باتوں کا سبق ملا۔ ایک یہ کہ پہاڑوں کو کاٹتے ہُوئے چلنا، جب کہ پیٹ بھی خالی ہو، نہایت تھکا دینے والا سفر ہے۔ دوسرے یہ کہ رات کے ساتھ ہی سفر شروع کر دینے کا مطلب ہے پچھلے پہر کو کہیں بیٹھ کر ٹھٹھرتے رہو۔ کوئی بھاری کپڑا ساتھ نہیں، چنانچہ ہر رات کو سفر کی ابتدا میں جتنی تاخیر ہو سکے بہتر ہے۔ اُس پہلے گاؤں میں وہ سردی کا مارا ہُوا ایک کسان کے دروازے پر جا کھڑا ہُوا۔ اندر سے ایک عورت متوجہ ہُوئی تو وہ بولا کہ مسافر ہوں، کچھ دیر آرام کرنا چاہتا ہوں۔ عورت نے مُڑ کر مرد سے بات کی۔ مرد دروازے پر آ کر مشکوک نظروں سے اُسے گھورنے لگا۔

"سویرے سویرے آرام کرنا چاہتے ہو؟"

"رات کو سفر کرتا ہوں۔"

"کہاں سے آئے ہو؟"

"چار کوس سے۔"

عورت کے کان کھڑے ہوئے۔ "تم ننگے شاہ کے فقیر تو نہیں؟" وہ بولی۔

"میری کیا مجال"، اسد نے کہا، "کہ شاہ کا فقیر بنوں۔ اللہ کا بندہ ہوں۔"

اِس پر عورت کو یقین ہو گیا کہ وہ نانگے شاہ کا فقیر ہے۔ اُس نے مرد کو بتایا کہ فقیروں کو رات کے وقت سفر کرنے کا حکم ہوتا ہے اور اُس کو مزید سوال جواب کرنے سے منع کر کے اسد کو اندر مدعو کیا۔ بے کواڑ کے دروازے میں قدم رکھ کر وہ ایک چھوٹی سی چار دیواری میں داخل ہوا جو مکان کا احاطہ تھا۔ احاطے میں ایک طرف ایک گائے اور ایک بکری بندھی تھی۔ وہ دُوسری طرف جا کر دیوار کے ساتھ دھوپ میں بیٹھ گیا۔ عورت اُس سے پُوچھے بغیر تھوڑی دیر میں تازہ روٹی پکا کر لے آئی۔ اسد نے ایک مدّت کے بعد انڈے کی شکل دیکھی تھی۔ "مَیں دربار حاضری دینے جاتی رہتی ہوں۔" عورت بکری کی طرف دیکھ کر بولی، "یہ جانور مَیں نے رکھا ہُوا ہے۔ میری مشکل حل ہو تو اِسے مَیں سرکار میں جا کر چھوڑ آؤں۔ آپ بزرگ میرے لیے دُعا کریں۔ آپ کی دُعا قبول ہو گی۔"

"اللہ مدد کرے گا۔" اسد نے کہا۔ عورت نے ایک گدڑی لا کر زمین پر بچھا دی تھی۔ دن بھر وہ اُس گدڑی پر دُھوپ میں سویا رہا۔ کئی روز کے بعد اُسے اِتنی زور کی نیند آئی تھی۔ شام کے وقت دوبارہ اُس نے گرم گرم کھانا کھایا۔ گو ہر قسم کی پوچھ گچھ بند ہو چکی تھی، مگر کسان، جو شام کے وقت گھر لَوٹا تھا، بار بار اسد کو شکی نظروں سے دیکھ رہا تھا، جیسے اُس کا یقین اُٹھتا جا رہا ہو۔ کھانے سے فارغ ہو کر اسد نے گدڑی زمین سے اُٹھائی اور اسے اوڑھ کر وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ بات چیت سے بچنے کے لیے اُس نے آنکھیں بھینچ لیں اور آہستہ آہستہ ہلنے لگا، جیسے مراقبے میں جا رہا ہو۔ یہ سارے اطوار اُس پر خود بخود وارد ہوتے جا رہے تھے۔ نہ دروازے پہ جا کر مانگنے میں نہ فقیر کا رُوپ دھارنے میں اُسے کوئی اچنبھا محسوس ہوا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد جب وہ کنبہ سونے کی تیاری کرنے لگا تو عورت نے اُسے رات بسر کرنے کے لیے اندر مدعو کیا۔ اسد نے نہ آنکھیں کھولیں نہ کوئی جواب دیا۔ اُسے کچھ کھُسر پھُسر کی آواز آئی۔ عورت اپنے مرد سے کہہ رہی تھی کہ فقیر کو چھیڑنا ٹھیک نہیں، جہاں بیٹھا ہے وہیں بیٹھا رہنے دو، قسمت اچھی ہُوئی تو یہیں ڈیرا لگائے گا۔ اسد نے دل میں شکر ادا کیا کہ قدرت اُس کی مدد کر رہی ہے، اُس نے ایسا انداز اختیار کیا تھا کہ اُس کے سفر کے بارے میں کوئی مزید بات چیت نہ ہُوئی تھی۔ کسان اور اُس کی بیوی واپس چلے گئے۔ اسد نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ گائے، اُس کے بچھڑے اور بکری کو چھپّر کے نیچے لے جا کر باندھ دیا گیا تھا۔ گھر غالباً دو کمروں پر مشتمل تھا۔ دروازہ اندر سے بند کر لیا گیا تھا، مگر ایک درز میں سے بتی کی روشنی آ رہی تھی۔ کچھ دیر کے بعد روشنی ختم ہو گئی۔ رات پڑ گئی تھی۔ آدھی رات کے قریب اسد اُٹھا۔ اُس نے گدڑی اُٹھا کر اپنے بدن پہ لپیٹی، روٹی کی گٹھڑی کو لاٹھی کے سرے پر باندھا اور وہاں سے چل پڑا۔ وہ صحن پار کر رہا تھا کہ بکری ایک بار منمنائی۔

اسد اس آواز پر بھاگ اُٹھا۔ اُس نے ایک چھلانگ سے دروازہ عبور کیا اور تیز تیز قدموں سے گاؤں سے نکل گیا۔

اب ایک گدڑی کم ازکم اُس کے پاس تھی۔ اُسے پہلی دفعہ اِس بات کا تجربہ ہوا کہ بے سروسامانی کی حالت میں ایک گدڑی کا ہونا کس قدر عمیق اطمینان کا باعث ہو سکتا ہے۔ چادر یا کھیس میں وہ بات نہیں تھی، شاید اس لیے کہ پتلے کپڑے اوڑھے لپیٹے جانے سے بدن کا لباس بن جاتے تھے، کونوں کناروں سے لپٹ کر بدن کی شکل اختیار کر لیتے اور جسم اُسی طرح ننگا اور غیر محفوظ رہ جاتا تھا۔ گدڑی کی عجیب بات تھی۔ اِس کو شکن نہیں آتی تھی اور اوڑھی جائے تو لپیٹنے کی بجائے جسم کے گرد ایک کھڑا کھڑا احصار بنا دیتی تھی جس کے اندر بدن آزاد بھی رہتا تھا اور پناہ گزین بھی، اور جسم کی گرمی محفوظ رہتی تھی۔ اِس وقت گو وہ سفر کاٹتا چلا جا رہا تھا مگر اُس کے دل میں اب پچھلی رات والا ڈر جاگزیں نہیں تھا۔ اب وہ گویا شوق سے اُس وقت کا انتظار کر رہا تھا جب وہ تھک کر، رات کو یا دن چڑھے، کسی درخت کے ساتھ یا دیوار سے ٹیک لگا کر، آنکھیں بند کر کے بیٹھ جائے گا یا سکڑ کر لیٹ جائے گا اور اپنے آپ کو گدڑی میں محفوظ کر لے گا، جیسے ایک گھروندے میں پڑا ہو۔ لاٹھی بنانے کے بعد اُس کو سب سے بڑی تسلی گدڑی حاصل کر کے ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اُسے ایک کارآمد گر بھی ہاتھ آ گیا تھا جس کو اُس نے اگلے دو روز تک کامیابی سے استعمال کیا۔ وہ بے خوفی سے کسی کھاتے پیتے کسان کے گھر پہ جا پہنچتا اور اپنے آپ کو کسی مزار کا فقیر ظاہر کر کے کھانا اور جائے آرام طلب کرتا۔ پیٹ بھر کھانا کھا کر وہ اپنی گدڑی میں دبک کر سو جاتا، جب اُٹھتا تو آنکھیں بند کر کے بیٹھ جاتا، اور سوائے بیچ بیچ میں اللہ کا نام پکارنے کے کسی بات کا جواب نہ دیتا۔ بدقسمتی سے یہ گُر زیادہ دیر تک نہ چل سکا۔ اِس کی دو وجہ تھیں۔ ایک تو یہ کہ وہ اب تیزی سے ناگے شاہ کے علاقۂ اثر سے نکلتا جا رہا تھا، اور نئے علاقے میں اثر رکھنے والے مزاروں سے اُس کی واقفیت نہ تھی۔ گر چاہے کتنا ہی سکہ بند کیوں نہ ہو، اُسے کامیابی سے استعمال میں لانے کے لیے چند شرطیں لازم تھیں۔ مثلاً پہلے چند الفاظ میں، ہشیاری سے، اپنے حلقۂ ارادت کا نام لینا اشد ضروری تھا، ورنہ دہقانوں کی سخت شکی طبیعت آسانی سے پھسلائی نہیں جاتی، اس بات کا اُسے علم ہوا تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ مختلف آبادیوں کی پیر پرستی کی نوعیت کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ تیسرے روز وہ ایک ایسے گاؤں میں پہنچا جو شدید قسم کا پیر پرست گاؤں تھا۔ چنانچہ تیسرے پہر جب وہ نیند پوری کرنے کے بعد جاگا تو اُس نے دیکھا کہ آدھا گاؤں اُس کے گرد بیٹھا ہے۔ یہاں سے وہ بدک گیا۔ آنکھیں بند کیے بیٹھے بیٹھے اُس نے سوچا کہ یہ تو اُلٹا اپنے اُوپر توجہ مرکوز کرنے کا ایک آسان طریقہ ہے۔ اگر وہ اسی پہ کاربند رہا تو شناخت راز میں رہنے کی بجائے کہیں نہ کہیں نکل آئے گی۔ چنانچہ وہ جگہ چھوڑنے سے پیشتر ہی اسد

نے اِس طریقۂ کار کو ترک کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ اب وہ کیا کرے؟

پھر اُوپر سے راستہ اُس کو چکر دے رہا تھا۔ پہلے دونوں راستوں سے دُور از دُور رہنے کی کوشش میں وہ کہیں کا کہیں نکل گیا تھا۔ اپنی تربیت کے دَوران اُس نے پہاڑوں میں اکیلے سفر کرنے کے چند اصول سیکھے تھے، جن کو وہ ممکن حد تک استعمال کر رہا تھا۔ مگر یہ اصول بھی چند باتوں سے مشروط تھے۔ مثلاً یہ کہ جس علاقے میں وہ جا نکلے کسی نہ کسی طریقے سے اپنے آدمیوں کا پتا لگانے کی کوشش کرے۔ اِس کی بھی چند شناختیں تھیں۔ وہاں سے پھر وہ مزید اطلاعات حاصل کرے اور ضرورت ہو تو اپنی سمت سیدھی کر لے۔ مگر اب وہ اِن اصولوں کی بنیادی شرائط پوری کرنے سے قاصر تھا۔ جس مکمّل بے سروسامانی کی مسافری سے وہ دوچار تھا اُس کے لیے کوئی اصول وضع نہ کیے گئے تھے۔ اس کے لیے گُر اُسے اپنے پاس سے ایجاد کرنا پڑ رہے تھے۔ رات کے وقت آسمان پہ نظر ڈال کر اُسے صرف اِتنا پتا چل جاتا تھا کہ وہ بالکل اُلٹی سمت میں نہیں چلا جا رہا۔ مگر یہ کہ وہ سرحد کی جانب بڑھ رہا ہے یا اُس کے متوازی چلا جا رہا ہے، اِس بات کا پتا چلانا دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ چوتھے روز پہلی بار ایک پہاڑ کی چوٹی سے اُسے دو ایک گاڑی کی بتیاں حرکت کرتی ہوئی نظر آئیں، مگر ہزار کوشش کے باوجود وہ رات کے اندھیرے میں یہ نہ جان سکا کہ سڑک کا یہ کون سا مقام تھا۔ اُس نے سوچا کہ چار راتیں ہو گئی ہیں، کم از کم یہ تو پتا چلنا چاہیے کہ میں نے کتنا فاصلہ طے کیا ہے۔ سفر کاٹنے کا صرف یہی ایک طریقہ ہے۔ اُس نے باقی رات وہیں پہ بسر کرنے کا ارادہ کر لیا، تاکہ دن چڑھے دیکھ کر معلوم کر سکے۔ اِس چوٹی پہ درخت نہ تھے، چٹانیں تھیں۔ اسد نے لاٹھی رانوں میں دبائی، گٹھڑی پاس رکھی اور گدڑی کا گھروندا سا بنا کر ایک چٹان کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اُس نے سوچا، یہ راستہ بھی کیسا عجیب ہے۔ جب تک چلتے جاؤ راستہ ہے، جب بیٹھ جاؤ تو راستہ ختم۔ ایک ایک قدم سے رستہ بنتا ہے اور اُسی کے ساتھ ختم بھی ہو جاتا ہے۔ اِس قطعی غیر یقینی صورتِ حال سے، جو ساتھ ہی ساتھ عین قدرتی بھی معلوم ہونے لگی تھی، اُس کا واسطہ پہلے کبھی نہیں پڑا تھا۔ اُس نے سوچنے کی کوشش کی۔ اُسے اپنی گزشتہ زندگی میں کوئی ایسا موقع یاد نہ آیا جس کا سامنا کرنے کی کوئی نہ کوئی تدبیر، اُس کے اپنے عناصر کے اندر یا باہر، پہلے سے موجود نہ رہی ہو۔ یہاں تک کہ جب وہ جیل میں تھا تو اُس وقت کے تاریک ترین دَور میں بھی آگے کی ایک نہ ایک راہ، ایک نہ ایک تدبیر ہمیشہ اُس کے ہاتھ میں رہتی تھی۔ اب یہ ایک ایسا موقع آیا تھا جو بے تدبیر تھا۔ وہاں لیٹے لیٹے اُس نے سونے کی کوشش میں خیال کیا کہ قدرت کی چیزیں بھی اسی نوعیت کی ہوتی ہیں، جیسے پہاڑ کا موڑ مُڑو تو سامنے ایک پھل دار پیڑ ہو، یا ایک مہیب چٹان ایک ذرا سے کنگرے پہ کھڑی ہو، اِس بات سے قطعی بے نیاز کہ کوئی انہیں دیکھے اور حیرت زدہ ہو یا کہ ہمیشہ کے لیے ہر آنکھ اُن سے اوجھل رہے، اگرچہ سینکڑوں برس وہ وہاں پہ موجود رہیں

اسد کا ذہن بھٹکنے لگا تھا۔ اُلٹی سیدھی باتوں سے گھبرا کر آخر اس کا خیال ایک صاف ستھری سمت کی تلاش میں نکل پڑا۔ اس جگہ، پہ ڈھلی ہوئی دھوپ کی فضا میں ہر چیز شیشے کی سی شفاف اور ٹھوس اپنی پر موجود تھی اور اس میں طویل چوکڑیاں بھرتے ہوئے ایک دھاری دار جانور کی شبیہہ تیزی سے حرکت کرتی تھی۔ پہلی بار شیر اس کو ایک جانور کے روپ میں نظر آیا۔ وہ اونگھ گیا۔

صبح کے وقت اُسے دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ جس مقام پہ وہ کھڑا تھا، سڑک کے راستے وہ جگہ چار کوس سے صرف چھ گھنٹے کے سفر پہ تھی۔ یعنی چھ گھنٹے کا سفر اس نے چار دن میں ختم کیا تھا۔ اس نے دوپہر تک سفر جاری رکھنے کا ارادہ کر لیا۔ وہ چلتا چلتا سڑک کے قریب آ نکلا تھا۔ اب اُسے پھر سڑک سے دور جانا تھا۔ مگر اس کا ایک فائدہ ہوا تھا کہ سڑک کو دیکھ کر اُسے اندازہ ہو گیا تھا وہ کہاں پر ہے۔ نیز یہ کہ اب اُسے کن کن جگہوں سے بچ کر نکلنا ہے۔ اس کے دل سے سفر کا خوف بھی کچھ کچھ اُترتا جا رہا تھا۔ اس نے ارادہ کیا کہ صرف رات کو ہی چلنے کی مصلحت غیر ضروری ہے۔ موقع دیکھ کر دن کو بھی سفر کیا جا سکتا ہے۔ دوسری طرف سے قدرت اس کی مدد کر رہی تھی۔ چلتے چلتے دُور سے اُسے ایک پہاڑی کے دامن میں چند جھونپڑیاں نظر آئیں۔ وہ راستہ بدل کر ان کے قریب سے گزرا تو اس نے دیکھا کہ وہ بے دخلوں کے گھر تھے۔

بے دخل! اسد کے ہاتھ گویا ایک خزانہ آ گیا۔ اس نے خوشی سے اپنے دل میں اس لفظ کو دہرایا۔ یہ ایک ایسا لفظ تھا جو سولہ سترہ سال پہلے وجود میں آیا تھا۔ یہ ایسے لوگ تھے جو پہلی جنگ کے موقعے پر اپنے گھروں سے اُکھڑ گئے تھے۔ اس ہلّے میں کچھ اِدھر سے اُدھر چلے گئے، کچھ اُدھر سے اِدھر آ گئے۔ کئی سال تک کسی طرف کی حکومت نے ان پر کوئی توجہ نہ دی۔ ہر نئی انتظامیہ نے اس مسئلے کو حل کرنے کی اپنی سی کوشش کی، مگر بات تھوڑی بہت کاغذی کارروائی سے آگے نہ بڑھ سکی۔ ہوتے ہوتے "گھر" واپس جانے کے خواب ان لوگوں کے دلوں سے اُتر گئے اور وہ ایک مستقل خانہ بدوش قبیلے کی صورت اور حیثیت اختیار کر گئے۔ "گھر" ایک خیالی جگہ کا نام بن گیا جس کی باتیں یہ لوگ اب بھی کیا کرتے تھے، مگر محض وقت کٹی کی خاطر۔ اب یہ لوگ اسی طرح جیسے ہمیشہ سے کرتے آئے تھے، مزدوری یا جنگلات کی نوکریاں کرنے لگے تھے، مگر رہتے عارضی جھونپڑیوں میں تھے اور کہیں ٹکتے نہ تھے، چند بھیڑیں اور بکریاں پال لیتے تھے اور کنبوں کی شکل میں، یا اکیلے دکیلے، ایک جگہ سے دوسری جگہ کو سفر کرتے رہتے تھے۔ گویا قدرتی طور پر یہ لوگ آہستہ آہستہ خانہ بدوشوں کی طبیعتیں اختیار کرتے جا رہے تھے، ایسی طبیعتیں جن کی اپنی اندرونی زندگی اور اس کی مجبوریاں ہوتی ہیں۔ اسد کو علم تھا کہ اس علاقے میں ایک آدھ جگہ پر حکومت نے کچھ کارروائی کرنے کی خاطر ان لوگوں کے لیے کیمپ بھی لگا رکھے تھے، جہاں لوگ آتے جاتے رہتے تھے۔ ان کیمپوں میں کھانا

مل جایا کرتا تھا، اور چند شرائط پوری کرنے پر کبھی کبھار حکومت کی طرف سے پیسے وغیرہ ملنے کی صورت بھی نکل آتی تھی۔ پڑھے لکھے لوگوں کی زبان میں انہیں ڈی۔پی یعنی "ڈسپلیسڈ پرسن" کہا جاتا تھا، عام لوگ ان کو محض "بے دخل" کے نام سے پکارتے تھے۔ اسد کو حیرت ہوئی کہ پہلے اُسے اِس کا خیال کیوں نہیں آیا، حالانکہ ان لوگوں کی حالت اُس کی اپنی صورتِ حال سے قریب ترین تھی۔ ان کی وفاداری کسی ایک طرف سے نہیں تھی، صرف اپنے ساتھ تھی لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ان کے اوپر واضح ہو چکا تھا کہ وہ دونوں طرف سے نکالے ہوئے ہیں۔ چنانچہ ایجنٹ، ڈبل ایجنٹ، سمگلر وغیرہ اس قبیلے میں کثرت سے پیدا ہوتے تھے۔ وہ ان کے کیمپ کے نزدیک نہیں جانا چاہتا تھا، کیمپ اپنے آدمیوں سے بھرا ہوگا، اور یقیناً کچھ لوگ ایسے ہوں گے جو اس کی شناخت کر لیں گے۔ مگر اس کے لیے "بے دخل" بن جانا ایک عین قدرتی بات تھی۔ چنانچہ فقیر کا روپ اُتار کر وہ بے دخل بن گیا۔

لوکل کشمیری لوگ انہیں کام چوری کا طعنہ دیتے تھے، اور عام رائے تھی کہ یہ لوگ اپنی حیثیت کا ناجائز فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ مگر اس کے باوجود ان کی مفلوک الحالی کو عام طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ اسد نے دیکھا کہ بے دخل کہہ کر اپنے آپ کو متعارف کرانے سے لوگ، بے دلی سے سہی، مگر کھانا دینے سے انکار نہیں کرتے تھے۔ زیادہ سوال جواب نہیں کیے جاتے تھے، اور دن کے وقت دھوپ میں یا شام کو کھلے آسمان کے نیچے لوگ اپنے صحنوں یا احاطوں میں اُسے پڑا رہنے دیتے تھے، مگر اس پہ کڑی نظر رکھی جاتی تھی۔ یہ واضح کر دیا جاتا تھا کہ ایک وقت سے زیادہ کا کھانا اُسے نہیں ملے گا، اور عموماً گھر باہر کے کام کاج پر اُسے لگا لیا جاتا تھا۔ سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا تھا کہ وہ ایک عام سوال "کہاں سے آئے ہو؟ کہاں جا رہے ہو؟" کا جواب گھڑنے سے بچ گیا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" عموماً کسان اُس سے یوں گویا ہوتا۔

"کیمپ کو۔" وہ کہتا۔

"مفت خوری کی زندگی اچھی نہیں ہوتی۔ محنت کر کے روٹی کمانا ہر آدمی کا فرض ہے۔ ادھر رہ جاؤ۔ کھیتوں پہ کام کرو۔ دو وقت کی روٹی مل جائے گی۔ کپڑا لتا سب کچھ ملے گا......"

"کیمپ میں اپنے رشتہ دار ہیں۔ اُن کی خبر ملی ہے۔" اسد جواب دیتا، "اُن سے مل کر آجاؤں گا۔"

سوال کرنے والے کو یقین ہو جاتا کہ بھڑوا کام چور ہے۔ کیمپ میں جا کر بیٹھ رہے گا یا اسی طرح مانگ تانگ کر گزارا کرتا رہے گا۔ وہ روٹی تو دے دیتا مگر اُس کا مزاج سخت ہو جاتا، جس وجہ سے اسد کے لیے وہاں دن بھر کا وقت کاٹنا مشکل ہو جاتا۔ چنانچہ دو تین روز کے بعد اُسے اپنی سکیم میں تبدیلی کرنا پڑی۔ کھاتے پیتے کسانوں اور دکان داروں کے گھروں کی بجائے اُس نے اب غریب غربا کے گھروں میں جانا شروع کر دیا، وہ لوگ جو عموماً جنگلوں کی لکڑیاں یا کھیت

مزدوری کرتے تھے۔ رُوکھی سُوکھی کھانے کو اُسے مل جاتی اور یہ لوگ اُسے دن بھر یا رات کا کچھ حصہ وہاں پڑا رہنے پر زیادہ ناک بھوں نہ چڑھاتے اور نہ زیادہ دِق کرتے۔ اسد نے اِن لوگوں کو نسبتاً زیادہ خدا ترس بھی پایا۔ اُس نے دیکھا کہ یہ لوگ اُس کی مخصوص حیثیت کو زیادہ آسانی اور سادگی سے قبول کر لیتے تھے۔ اگر باتیں کرتے تو ہمدردی کی کرتے اور غریب لوگوں کے انداز میں اُسے تسلّی بھی دیتے تھے۔ اُس کے سفر کا یہ آسان ترین دَور تھا۔ اُس نے تقریباً آدھا راستہ طے کر لیا تھا۔ اُس وقت اُس نے سوچا کہ اگر وہ کسی نہ کسی طریقے سے ہر دو تین روز کے بعد سڑک کا معائنہ کرتا رہے تو پانچ سات دِن میں وہ سرحد پار کر لے گا۔

مگر اُس کی اُمید ایک بار پھر اپنی انتہا کو پہنچ کر ٹوٹ گئی۔ یہ واقعہ ایک روز ایک جنگل مزدور کے گھر غیر متوقع طور پر پیش آیا۔ وہ دوپہر کے وقت وہاں پہنچا تھا۔ اِن غریب گھروں کے صحن یا احاطے نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ وہ پیٹ بھرنے کے بعد دروازے کے ساتھ ہی جو اکثر گلی میں نکلتا تھا، بیٹھ رہتا تھا۔ اُس روز اسد نے روٹی مانگ کر کھائی اور نیند پوری کرنے کی غرض سے بیٹھا ہی تھا کہ گھر کا مالک پھرتا پھراتا آنکلا اور کاہلی سے دروازے میں بیٹھ کر باتیں کرنے لگا۔ اسد بے خیالی سے اُس کی باتوں کا جواب دیتے دیتے اونگھ گیا۔ اچانک کسی نے اُسے پکارا:

"اسد!"

"ہنہہ!" اُس نے آنکھیں کھول کر جواب دیا۔ جواب دیتے ہی اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا۔ اسد اُس کو اپنا نام امیر بتا چکا تھا۔ ظاہراً اُس مزدور نے اپنے بچّے کو آواز دی تھی۔ اسد بات ٹالنے کی خاطر جھک کر گھر کے اندر بچّے کی طرف دیکھنے لگا۔ مگر اُس شخص کو شک پڑ چکا تھا۔

"تیرا نام اسد ہے؟" اُس نے شکّی لہجے میں پُوچھا۔

"نہیں!" اسد نے جواب دیا، "غلطی لگی ہے۔"

"نام کی غلطی لگی ہے؟"

"اپنا بھائی یاد آرہا تھا۔ اُس کا نام اسد ہے۔"

کشمیری عجیب نظروں سے اُسے گھورتا رہا۔ اسد کی نیند غائب ہو چکی تھی۔ کشمیری کی بیوی اور بچّے باہر نکل آئے تھے اور کھڑے تجسّس سے اُسے دیکھ رہے تھے۔

"یہ کیا ہے؟" کشمیری گٹھڑی کی طرف اشارہ کر کے بولا۔

"دوا کی بُوٹی ہے۔ مجھے سانس کا مرض ہے۔"

"تیرے پاس کاغذ ہے؟"

"نہیں۔ کیمپ سے بنواؤں گا۔"

"کوئی پیسا ہے؟"

"نہیں۔"

کشمیری کا شک رفع ہونے کی بجائے بڑھتا جا رہا تھا۔

"تو ہے کون؟ ہنہہ؟ تیرا اصلی نام کیا ہے؟"

اسد گھبرا گیا۔ "میں بے دخل ہوں۔" وہ بولا، "نام سے کیا ہوتا ہے۔ میرا نام امیر ہے۔ میرے بھائی کا نام اسد ہے۔"

"بے دخلوں کے پاس شناختی کاغذ ہوتا ہے۔ تیرے پاس نہ کاغذ ہے، نہ پیسا ہے، نہ کوئی چیز ہے۔ تو کیسا بے دخل ہے؟"

"میرے پاس کاغذ تھا۔ گم ہو گیا ہے۔ کیمپ سے نیا بنواؤں گا۔ اسی لیے جا رہا ہوں۔"

"تو تو کہتا تھا رشتے داروں کو دیکھنے جا رہا ہے؟"

"وہ کام بھی ہے۔" اسد نے کہا۔

اس وقت تک کشمیری کے بیوی بچوں کے علاوہ دو چار اور اِدھر اُدھر کے لوگ جمع ہو چکے تھے۔ وہ سب وہاں کھڑے شبہے والی نظروں سے اُسے گھور رہے تھے۔ بیچ بیچ میں "کون ہے، کون ہے؟" کے سوال اُٹھ رہے تھے۔ "بے چارہ بے دخل ہے۔" ایک بوڑھی عورت نے کہا۔ مگر اُس کی بات پر کسی نے دھیان نہ دیا، جیسے کہہ رہے ہوں، وہ تو ہے، مگر ہے کون؟ بے دخلوں سے ان لوگوں کی پوشیدہ نفرت کے آثار اب ظاہر ہونے لگے تھے۔

"کہاں کا ہے؟" ایک نوجوان بولا، "کوئی جاسوس تو نہیں؟"

فضا میں تشدد کا رنگ آچلا تھا۔ اسد خطرے کو بھانپ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ اور لوگ گلی میں چلے آ رہے تھے۔ اسد نے محسوس کیا کہ ایک لمحہ بھی اگر ضایع ہوا تو بات ہاتھ سے نکل جائے گی۔ ایک غلط قدم، اور یہ لوگ اندھوں کی طرح اُس پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اُس نے لاٹھی اور گدڑی سنبھالی، اور مصنوعی غصّے سے بولا: "غریب بے دخل ہوں، خدا کا خوف کرو، مصیبت کا مارا ہوں، ایک گھڑی آرام کرنے کو بھی جگہ نہیں ملتی۔" اور جواب کا انتظار کیے بغیر تیز تیز قدموں سے چل نکلا۔ مڑ مڑ کر اُس نے دو ایک بار پیچھے دیکھا تو اُس کو تسلی ہو گئی کہ کوئی اُس کا پیچھا نہیں کر رہا۔ وہ چلتا گیا حتیٰ کہ گاؤں سے نکل کر جنگلوں میں پہنچ گیا۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ اُس کا لبادہ

اُتر گیا ہے اور وہ ننگا ہو کر چلا جا رہا ہے، جیسے کبھی کبھی خواب کی حالت میں وہ اپنے آپ کو ننگے بدن لوگوں کے بیچ دیکھا کرتا تھا۔ اُس پہ وہی سہم طاری تھا جو خواب میں اُس کے اوپر چھایا ہوتا تھا۔ اُس کے سب اوڑھنے بچھونے اور پردے ایک ایک کر کے اُتر گئے تھے۔ وہ جنگل کی چھوٹی سے چھوٹی آواز پہ چونک رہا تھا۔ بعد میں جب کبھی ان واقعات کے اوپر دماغ دوڑانے کا موقع اُسے مِلا تو اُس نے یاد کیا کہ اُس کے فراری سفر میں شاید یہ وہ مقام تھا جہاں سے قسمت نے اُس کا ساتھ دینا چھوڑ دیا تھا۔ کئی سال کے بعد ان باتوں پر غور کرتے ہوئے ایک بار اُس نے سوچا کہ قسمت ایک طرح کی ہمّت ہوتی ہے۔ ہمّت ٹوٹ جائے تو قسمت ساتھ چھوڑ جاتی ہے۔ اِس جگہ پہ پہنچ کر اُس کی ہمّت جواب دے گئی تھی۔

ساتھ ساتھ اُسے اِن باتوں کا برابر علم بھی تھا۔ اُس کا ہر دم جیتا جاگتا دماغ سب چیزوں سے باخبر تھا۔ اُس کے اندر اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کی جنگ ابھی جاری تھی۔ مگر اس باخبری نے اُس کی حالت میں کوئی خاص فرق نہ ڈالا۔ اُس نے دوبارہ اپنا تمام تر سفر راتیں وقت کرنا شروع کر دیا تھا۔ دن کے وقت وہ آبادیوں کے قریب جانے سے ڈرنے لگا۔ اُس پچھلے گاؤں میں اگر کوئی اپنا آدمی تھا، اُس نے سوچا، تو خبر کہیں کی کہیں پہنچ چکی ہوگی۔ آرام کا سارا وقت وہ اب کسی پہاڑ کی کھوہ میں یا جنگلوں میں بسر کرتا۔ خوراک وہ زیادہ تر درختوں سے اور کھیتوں میں کھڑی یا گری پڑی فصلوں سے حاصل کرنے لگا تھا۔ کبھی کبھار وہ بھوک سے مجبور ہو کر شام کے وقت کسی گاؤں کے باہر کسی کھلے دروازے پر جا کھڑا ہوتا اور اُسے ایک وقت کی روٹی مل جاتی۔ مگر وہ وہاں ٹھہرتا نہیں، کھانا کھاتے ہی وہاں سے چل نکلتا۔ اب کبھی کبھی کمزوری کی لہریں اُسے کمر کے نچلے حصے میں اور پنڈلیوں میں اُترتی ہوئی معلوم ہوتیں۔ اُس کی ٹانگوں میں درد اُٹھنے لگتا۔ چڑھائی کا راستہ طے کرنے کے دوران اُسے سانس برابر کرنے کے لیے رُکنے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ اُس کی ایک چپلی ٹوٹ گئی تھی اور چلنے میں تکلیف دینے لگی تھی۔ اُس نے وہ چپلی اُتار کر لاٹھی کے ساتھ لٹکالی۔ اب اُس کے ایک پاؤں میں جوتا تھا اور دوسرا پاؤں ننگا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اُس کا ننگا پاؤں دُکھنے لگا۔ اُس نے بائیں سے چپلی اُتار کر دائیں پاؤں میں پہن لی۔ چپلی گو دوسرے پاؤں کی تھی مگر چلا جا سکتا تھا۔ تاہم تھوڑی ہی دیر میں اُس کا بایاں پاؤں درد کرنے لگا۔ اُس نے دوسرے پاؤں سے چپلی اُتار کر پھر اس پاؤں میں پہن لی۔ اسی طرح وہ وقفے وقفے پر ایک چپلی کو دونوں پاؤں میں بدلتا ہوا چلتا گیا۔ اِس سے صرف اتنا ہو سکا کہ وہ رات بھر چلتا رہا، مگر اب ایک کی بجائے دونوں پاؤں زخمی ہو گئے۔ صبح ہوتے ہوتے دُوسری چپلی بھی اُکھڑنے لگی۔ دن کے کسی وقت اُس نے دونوں ٹوٹی ہوئی چپلیاں ایک جگہ پہ چھوڑ دیں۔ ننگے پاؤں چلنے سے اُس کے سفر کی رفتار کم پڑ گئی تھی۔ ایک اور مجبوری اِس سے یہ پیدا ہوئی کہ اب اُسے دیکھ بھال کر چلنا پڑتا تھا۔ اندھیرے میں تیز پتھر اور خاردار جھاڑیاں نظر نہ

آتی تھیں جو اس کے پاؤں کو کاٹ دیتی تھیں۔ چنانچہ اب وہ اپنا سفر پَو پھٹنے پہ شروع کرتا اور دوپہر تک چلتا رہتا، پھر سورج ڈھلنے پہ چل پڑتا اور شام ہونے پر کسی جگہ جا رُکتا۔ سفر چونکہ اب اُجالے کا پڑ رہا تھا، چنانچہ آبادیوں میں اُس کا پھیرا کم سے کم ہوتا گیا۔ رات کو وہ کسی جنگل میں یا چٹان کے ساتھ لگ کر پڑ رہتا۔ جب سے اُس کا بے دخل کا رُوپ اُترا تھا اُس کی نیند خراب ہو گئی تھی۔ اوپر سے سوتے جاگتے خواب اُسے تنگ کرنے لگے تھے۔ عجیب پرانی پُرانی انجانی چیزوں کے اور جگہوں کے خواب مسلسل آتے رہتے۔ سارا دن اُسے تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد ایک ایک کر کے پچھلی رات کے خواب یاد آتے رہتے تھے۔ اُسے محسوس ہوتا کہ وہ ایک لمحہ بھی ایسی نیند نہیں سویا جب اُس نے خواب نہ دیکھا ہو۔ جیسے جیسے اُس کے خواب بڑھتے جا رہے تھے، ویسے ویسے اُس کا جاگتا ہوا ذہن یاسمین اور گمشُدہ کے شبیر کے اُوپر تکیہ کرتا جا رہا تھا، جیسے کہ یہ دو صورتیں کوئی ایسے اوزار ہوں جن سے اُس کے اندر کی ادھڑی ہوئی جگہیں ساتھ ساتھ رفو ہوتی چلی جاتی تھیں۔ وہ جس چیز کے بارے میں بھی سوچ رہا ہوتا یہ دو مستقل شکلیں اُس کے ذہن کے پس منظر میں منڈلاتی پھرتیں۔ اُس انوکھی صورتِ حال میں، جس سے اُس کا سابقہ تھا، کم از کم یہ دو شکلیں اُس کے ہاتھ میں ایسی آئی تھیں جو ایک مستقل راستے کی تدبیر تھیں۔ ان سے اسد کو ایک سمت کا اشارہ ملتا، آرام حاصل ہوتا۔ آرام کی ضرورت اب اُسے بھوک سے بھی زیادہ محسوس ہونے لگی تھی۔ درد اُس کے پاؤں کی ہڈیوں میں بیٹھ گیا تھا۔ ایڑیوں کے کنارے پھٹ گئے تھے اور مہین خار مُڑ لانے ہو کر اندر ہی اندر گوشت کی تہوں میں چل رہے تھے۔ وہ جہاں بھی رُکتا گھنٹہ گھنٹہ بھر پاؤں کسی اونچے پتھر کے ساتھ آسمان کی طرف اُٹھائے پڑا رہتا، تاکہ خون کا دباؤ اُن پر کم ہو۔ اِس سے درد کو آرام ملتا اور اُن کی سوجن میں کمی ہو جاتی۔ مگر جیسے ہی وہ چلنے کو ایک قدم رکھتا، اُن کا سارا درد لَوٹ آتا۔ کبھی کبھی وہ سوچتا کہ سفری آدمی کے لیے شاید پاؤں کا زخم سب زخموں سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ہر بیماری کی کاٹ اُس کے اپنے اندر پنہاں ہوتی ہے۔ اِس سے پیشتر کہ اسد کی تکلیف ناقابلِ برداشت ہو جاتی، درد خود بخود گھٹنے لگا۔ مٹی اور ہوا نے مل کر زخموں کے مُنہ بند کر دیے۔ اُس کے تلووں کی جلد سخت اور بے حس ہو گئی۔ وزن پڑنے پر ہڈی کے درد کی جو ٹیس اُٹھتی تھی وہ رُک گئی اور گوشت کے اندر زخموں کے چھوٹے بڑے گڑوں میں لذیذ سے درد کی حد بندی ہو گئی۔ اُس کا درد اب اُس کا بوجھ اُٹھانے لگا تھا۔ اس چکر سے چھوٹ کر اسد کے اندر ایک نیا جوش اور عزم پیدا ہوا۔ اب چاند اپنے عروج پر تھا۔ چنانچہ وہ دن یا رات کے کسی وقت کو بھی اُٹھ کر سفر کو جاری رکھ سکتا تھا۔ ایک مقام سے سڑک کو دیکھ کر اُس نے اندازہ کیا کہ اب وہ سرحد سے ایک آدھ روز کی دوری پر ہو گا۔ اُس نے کئی روز سے پیٹ بھر کر کھایا نہیں تھا، مگر منزل قریب دیکھ اُس کے بدن میں نئی قوت پیدا ہوئی۔

سرحد کا علاقہ خطرناک تھا۔ خاص طور پر سڑک سے دُور اندُور رہ کر اُسے سرحد پار کرنی تھی۔ اُس نے اپنا رُخ ذرا سا تبدیل کر لیا۔ یہ ایک ایسا زاویہ تھا جو اسد کے اندازے کے مطابق اُسے ایک دو روز میں بالآخر سڑک سے دُور لے جائے گا۔ تاہم یہ ایک فاش غلطی تھی۔ وہ راستے سے بھٹک گیا۔

دو روز سے وہ اپنے تازہ عزم کے ساتھ ایک سمت میں بڑھتا جا رہا تھا کہ آہستہ آہستہ اُس کی حِس نے اُسے خبردار کرنا شروع کیا۔ جنگل میں سفر کرتے کرتے اُس کی حِس اتنی تیز ہو چکی تھی کہ اب وہ اپنے اندازے کی نسبت حِس پہ زیادہ بھروسہ کرتا تھا۔ اُس کا اندازہ کئی بار غلط ہو چکا تھا، مگر اُس کی حِس سچی رہی تھی۔ وہ رک گیا۔ اُس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ کس مقام سے وہ بھٹکا تھا۔ آخری گاؤں جو اُس کے راستے میں آیا تھا کوئی ڈیڑھ رات کی مسافت پہ تھا۔ اب وہ کیا کرے؟ اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ یہ ایک قطعی غیر آباد، پتھریلی پہاڑیوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ تھا۔ یُوں دکھائی دیتا تھا کہ وہ ایک مہینے تک بھی چلتا گیا تو آبادی تک نہ پہنچ سکے گا۔ اُسے یاد آیا کہ تقریباً دو گھنٹے سے اُس نے کوئی درخت بھی نہ دیکھا تھا کسی نہ کسی مقام پر، اُس نے خیال کیا، درخت پتلے ہونے شروع ہو گئے ہوں گے۔ پھر، دیکھے بھالے بغیر، یہ پتھریلا علاقہ شروع ہو گیا اور جنگل ختم ہو گئے۔ مجھے یہ سب کچھ نظر کیوں نہیں آیا؟ میری آنکھوں کو کیا ہو گیا ہے؟ اسد نے دُور دُور تک نظر دوڑائی، آسمان کی طرف دیکھا۔ چاروں طرف چاندنی روشنی میں جہاں تک نظر جاتی تھی پتھروں کی سیاہ اور سفید چوٹیوں کے خیمے تھے اور وہ اکیلا ذی رُوح اُن کے درمیان گمشدہ کھڑا تھا۔ وہ کھڑا کھڑا لرزنے لگا۔ سمت کا اندازہ کھو گیا تھا۔ اُس نے ہاتھ بڑھا کر ایک پتھر کا سہارا لیا اور زمین پر بیٹھ گیا۔ اُس کے پیٹ میں بھوک کی ایک تیز لہر اُٹھی۔ اُس نے سوچے بغیر گٹھڑی میں ہاتھ ڈال کر چند پتے نکالے اور اُنہیں مُنہ میں بھر لیا۔ پتے نیم خشک ہو چکے تھے، مگر اُن کا مزا بُرا نہ تھا۔ اُن میں ہلکی کھٹائی اور ہلکی ہلکی تلخی تھی۔ اس مخصوص ذائقے نے اُس کے مُنہ میں اُبلتا ہوا لعاب پیدا کیا جس سے اُس کا حلق تر ہو گیا۔ اُن کو آہستہ آہستہ چبا کر نگلتے ہوئے اُس کے دل کو کچھ تسلی ہُوئی۔ دہشت کا لمحہ گزر گیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد اُس نے سیدھی طرح سوچنا شروع کیا۔ اُس نے فیصلہ کیا کہ بجائے اِدھر اُدھر کے اندازے لگانے کے اُسے سب سے پہلے پچھلے پاؤں درختوں تک پہنچنا چاہیے تاکہ کچھ خوراک کا آسرا ہو۔ یہاں تو ایک دانہ مُنہ میں ڈالنے کو دستیاب نہ ہو گا، اور پانی کا تو یہاں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اُس نے حیرانی سے اپنے اردگرد دیکھا اور اُٹھ کر اُلٹے پاؤں چل پڑا۔ پہلی سرسبز پہاڑی تک پہنچتے پہنچتے اُسے تین گھنٹے کے قریب لگے۔ صبح ہو رہی تھی۔ اسد نے درختوں کے پتے اور چند خودرو جھاڑیوں کے پھل، جو اُس کے علم میں تھے، کھا کر پیٹ بھرا۔ پانی کی تلاش میں وہ دوپہر تک چلتا رہا۔ آخر اُسے دُور سے ایک سیاہ عمودی لکیر پہاڑ میں کھنچی ہُوئی نظر آئی۔ یہ پانی کی نشانی تھی۔

وہاں پہ پہنچ کر وہ قطرہ قطرہ گرتے ہوئے پانی کے نیچے منہ رکھ کر دیر تک بیٹھا رہا۔ پھر وہ سوگیا۔ جب اُس کی آنکھ کھلی تو شام ہو رہی تھی۔ پہلے اُس نے خیال کیا کہ وہ اُلٹے پاؤں چلتا جائے اور واپس اُس مقام تک پہنچے جہاں سے اُسے آخری بار سڑک نظر آئی تھی۔ مگر یہ دو روز کا معاملہ تھا۔ پھر یہ بات بھی پکی نہیں تھی کہ وہ اس مقام تک پہنچتا ہے یا کہیں اور نکل جاتا ہے۔ چنانچہ اُس نے سوچا کہ یہ سفر کو ضایع کرنے والی بات ہے۔ اس کی بجائے اُسے کم و بیش اُسی سمت میں آگے بڑھنا چاہیے جس سمت میں وہ جا رہا تھا، صرف اتنی احتیاط رہے کہ اب وہ جنگل کے ساتھ ساتھ چلے اور اُس بے آب و گیاہ خطے میں نہ بھٹکنے پائے جہاں پہلے جا نکلا تھا۔ وہ اُٹھ کر چل پڑا۔ آدھی رات کے وقت وہ تھک کر ایک جگہ پر سو گیا۔ جب وہ جاگا تو پو پھٹنے میں ابھی کچھ وقت تھا۔ آبادی کا دُور دُور تک نام و نشان نہ تھا۔ اُس نے گٹھڑی میں سے مٹھی بھر پتے نکال کر منہ میں ڈالے اور انہیں چبانے لگا۔ اُس نے محسوس کیا کہ جنگل کی جھاڑیوں کی نسبت یہ پتے کہیں زیادہ قوت بخش تھے۔ یہ پتے سانس کو ٹھیک کرتے تھے یا نہیں، مگر بدن میں گرمی ضرور پیدا کرتے تھے۔ اُس نے تین چار مٹھی بھر پتے کھائے۔ ہر مٹھی کے بعد وہ گٹھڑی کو ٹٹول کر دیکھ لیتا جو تیزی سے گھٹتی جا رہی تھی، مگر مزید ایک مٹھی بھرنے سے باز نہ رہتا۔ جب وہ اُٹھا تو اپنے آپ کو پہلے سے کہیں زیادہ توانا محسوس کر رہا تھا۔ اُس کی بھوک اور پیاس بڑی حد تک ختم ہو چکی تھی۔ ان کی خاصیت اچھی ہے، اُس نے سوچا۔ مگر ساتھ ہی اُسے یہ بھی احساس تھا کہ وہ انہیں غلط مقصد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ اُس نے ارادہ کیا کہ وہ انہیں کم سے کم استعمال کرے گا اور کسی صورت بھی ایک وقت میں چند پتوں سے زیادہ نہیں کھائے گا۔ مگر اُس وقت تک وہ گٹھڑی جو پہلے ہی کاغذ کی سی ہلکی تھی، اور اب اپنی نمی ضایع کرنے کے باعث اور بھی مختصر ہو گئی تھی، تقریباً آدھی خالی ہو چکی تھی۔ اسد نے اُس پوٹلی کو کھول کر دوبارہ اُس کی گانٹھ لگائی تاکہ لاٹھی کے سرے پر کسی رہے۔ اُس نے دوپہر تک سفر جاری رکھا اور اس دوران تین چار پتے نکال کر کھائے۔ ان پتوں کے تسکین بخش اثرات کے علاوہ اُن کا ذائقہ اسد کے منہ کو لگ گیا تھا۔ ان کے ہلکے کھٹے اور ہلکے ہلکے 'تلخ' ذائقے کی لذت کو ایسی نہ تھی کہ ایک دم مزا دیتی، مگر اندر ہی اندر منہ کو لگ جانے والی تھی۔ بھوک اور پیاس کی تسکین کے لیے یہ بوٹی اکسیر تھی، چنانچہ کسی دوسرے جھاڑ جھنکاڑ کو چکھنے پر اُس کا دل نہ چاہتا۔ جب اُسے احساس ہوا کہ پتے تیزی سے کم ہو رہے ہیں تو اُس نے دیر تک انہیں منہ میں رکھنا شروع کر دیا تاکہ دیر تک چلتے رہیں۔ اگلے روز وہ محض انہیں چوسنے پر آ گیا۔ وہ ایک ایک پتے کو منہ میں ڈالتا اور اسے تالو اور زبان میں داب کر چوسنے لگتا۔ وہ زبان بھی ہلانے سے گریز کرتا تاکہ پتے کو زیادہ گزند نہ پہنچے، حتّٰی کہ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد پتا وہیں پڑا پڑا گھل کر ایک جھلّی کی شکل اختیار کر لیتا اور تالو سے چپک جاتا۔ اس وقت تک اُس کا تمام تر ذائقہ اُس میں سے خارج ہو چکا ہوتا، چنانچہ وہ زبان اُس پر سے ہٹا کر جلدی سے اُسے نگل لیتا۔ پھر دوسرا پتا منہ میں ڈال کر زبان اُس کے

اُوپر دبا دیتا۔ اِسی طرح خوشی اور غم، سُود و زیاں کے مِلے جُلے جذبات کے ساتھ، اُن پتوں سے خوراک حاصل کرتا ہوا وہ چلتا رہا، اور کوئی ڈیڑھ دن میں اُس نے کافی فاصلہ طے کر لیا۔ اب اِس علاقے کی صورت کچھ نکلتی آرہی تھی۔ جنگلوں کی شادابی بڑھ گئی تھی، اور اسد کے تجربے نے اُسے بتایا کہ جلد ہی اُس کا راستہ کسی وادی میں نکلنے والا ہے۔ آخر اگلے روز رات کے وقت وہ ڈھے پڑا۔

ظاہر ہے کہ پتوں کا اثر جھوٹا اور وقتی تھا۔ پتے کتنا ہی ظاہری اثر کیوں نہ رکھتے ہوں آخر پتے ہی ہوتے ہیں، خوراک نہیں ہوتے۔ عارضی طور پر اُن پتوں نے اسد کے بدن میں ایک طرح کی حدت پیدا کی تھی جس کے فریب میں آکر وہ چلتا گیا اور اِس طرح اپنی رہی سہی طاقت بھی صرف کر بیٹھا۔ چنانچہ کوئی تیس گھنٹے کے مسلسل بے خوراک سفر کے بعد اُس کی انتڑیوں کے عرق سُوکھ گئے اور اُس کی ٹانگیں اُس کے بوجھ کے نیچے جھول گئیں۔ وہ تیورا کر گر پڑا۔ اُس نے دو ایک بار اُٹھنے کی کوشش کی، پھر گدڑی لپیٹ کر ڈھلوان زمین پر نیم دراز ہو گیا۔ گھبراہٹ کے عالم میں اُس نے مٹھی بھر بھر کر پتے مُنہ میں ڈالنے شروع کر دیے۔ اس تازہ حادثے نے بُوٹی بچا کر لے جانے کی سکیم کو تباہ کر دیا تھا، مگر کافی تعداد میں پتے چبا کر نگلنے سے اُس کے بدن میں کچھ کچھ گرمی پیدا ہونے لگی۔ دھوپ بھی نکل آئی تھی۔ سُورج کی حدت سے کچھ دیر میں اُس کا لرزہ اُتر گیا اور وہ جلد ہی غنودگی کی حالت میں پہنچ گیا۔ نیم خواب کی حالت میں وہ گدڑی میں سر چھپائے، پہلو کے بل سکڑ کر ایک پہر تک پڑا رہا۔ کئی سوتے جاگتے ہوئے خواب اُس کی آنکھوں سے گزرے۔ ان خوابوں کی شکل بھی نئی تھی۔ ان میں جنگلی جانوروں کی بھرمار تھی۔ عجیب عجیب شکلوں کے درندے مختلف چٹانوں اور درختوں کے عقب سے نکل نکل کر اُسے ڈرا دھمکا رہے تھے۔ اِن میں سے کئی اِنسانوں کی آواز میں باتیں کرتے تھے اور بعض کے چہرے عجیب الخلقت تھے۔ وہ بار بار خواب میں چونک اُٹھتا۔ بیچ بیچ میں وہ جاگ کر آنکھیں کھولتا تو ایک لمحے میں منظر صاف ہو جاتا اور اُس کے ذہن کے پردے پر وہی دو مستقل صورتیں، مشعلوں کی مانند گڑی ہوئی، نظر آتیں جس سے سب بلائیں غائب ہو جاتیں۔ اُسے محسوس ہو رہا تھا کہ وقت پھر آزاد روی سے اُس کے اندر اور باہر جاری و ساری ہو گیا ہے جس پر سے اُس کا اختیار اُٹھتا جا رہا ہے۔ اُس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اپنی گدڑی کے گرم گھروندے میں اُسی طرح پڑا رہے اور کبھی وہاں سے نہ ہلے حتّٰی کہ وقت کا یہ لشکر ختم جائے۔ اُس کے جسم کو آرام مِل رہا تھا۔

اسی حالت میں لیٹے ہوئے اُسے خیال ہوا کہ ایک مانوس آواز اُس کے کان میں پڑی ہے۔ یہ میر حسن کی آواز تھی۔ پہلے اسد نے سوچا کہ وہ حسبِ معمول کوئی خواب دیکھ رہا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ خواب کی کیفیت سے نکل آیا۔ اُس نے حیرت زدہ ہو کر دیکھا کہ وہ خود، مُنہ گدڑی سے نکالے، آنکھیں کھولے بیٹھا ہے اور میر حسن اُس کے سامنے کھڑا اُس سے مخاطب ہو رہا ہے۔

"یہاں کیا کر رہے ہو؟" میر حسن اُس سے پوچھ رہا تھا۔ اُس کا لہجہ نرم مگر پختہ تھا۔

"کچھ نہیں۔" اسد نے جواب دیا۔

میر حسن کے ہمراہ دو اور کشمیری تھے جو ذرا دُور ایک درخت کے ساتھ بیٹھے روٹی کھا رہے تھے۔ میر حسن کو اپنے سامنے پاکر اسد کے دل میں خوشی کے غیر متوقع جذبات اُٹھ رہے تھے، جیسے اُس کو کوئی انجانا سہارا مل گیا ہو۔ میر حسن نے چند لمحے تک گہری نظروں سے اُسے دیکھنے کے بعد جُھک کر گدڑی کا پلّو اٹھایا اور اسد کے جسم پر ایک نظر ڈالی۔

"تمہارے پاؤں ناکارہ ہو گئے ہیں۔" وہ تشویش سے سر ہلا کر بولا۔

اسد نے گدڑی اُس کے ہاتھ سے کھینچ کر اپنے گرد لپیٹ لی۔ "پہلے بہت خراب ہو گئے تھے۔" اُس نے کہا، "اب ٹھیک ہیں۔"

"اِس دھوکے میں نہ آنا۔" میر حسن بولا، "پیر کا زخم بُرا ہوتا ہے۔ اندر ہی اندر پھیلتا جاتا ہے۔" اُس نے لاٹھی کے سرے پر بندھی ہوئی پوٹلی کو ٹٹول کر دیکھا۔ "تمہارے پاس کھانے کو کچھ ہے؟"

اسد نے نفی میں سر ہلا دیا۔

"کب سے بھوکے ہو؟"

"تین چار دن سے۔"

میر حسن نے اپنی جیب سے ایک پوٹلی نکال کر کھولی۔ اُس میں چار موٹی موٹی روٹیاں بندھی تھیں۔ اُس نے دو روٹیاں نکال کر اسد کے ہاتھ میں تھما دیں۔

"یہ لو۔" وہ بولا، "اُس ڈھیری کے پیچھے گاؤں ہے۔ اُدھر تمہیں کچھ نہ کچھ مل جائے گا۔ کوئی پیسا ہے؟"

اسد نے روٹی توڑ کر منہ میں بھر لی تھی اور نفی میں سر ہلا دیا۔ میر حسن نے جیب سے ایک ایک روپے کے تین چار نوٹ اور کچھ سکّے نکال کر اسد کو دیے۔ "جو بچ گئے اُدھر جا کر پھینک دینا۔" میر حسن نے کہا۔ اسد نے نوٹ اور سکّے لے کر جیب میں ڈال لیے۔ روٹی چبانے سے اُس کے جبڑوں میں درد شروع ہو گئی تھی۔ بہت آہستہ آہستہ اُس کا خشک حلق لعاب سے تر ہو رہا تھا اور اُس کی نوجوان رگوں میں خون کی حدت آنے لگی تھی۔ میر حسن اُس کے پاس زمین پر بیٹھ گیا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" اسد نے لقمہ نگل کر پوچھا۔

"اُدھر سے آ رہا ہوں۔"

"اِس راستے سے؟"

"میرا بھی رستہ ہے۔"

"کب گئے تھے؟"

"پرسوں۔"

"گُمشُد گئے تھے؟"

میر حسن نے نفی میں سر ہلایا، "وقت نہیں تھا۔"

"ذوالفقار سے مُلاقات ہُوئی؟"

"اونہوں۔" میر حسن نے دوبارہ سر ہلا کر کہا، "مگر سب تمہارے انتظار میں ہیں۔" اسد کو علم ہو گیا کہ میر حسن سب حالات سے باخبر ہے۔ وہ سر جھکائے بیٹھا روٹی توڑ توڑ کر کھاتا رہا۔ "بارڈر کدھر ہے؟" کچھ دیر کے بعد اُس نے پُوچھا۔ "وہ سُرخ ڈھیری بارڈر ہے۔" میر حسن نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پتلی سی شاخ کی چھڑی اُٹھا کر چوتھی پہاڑی کی جانب اشارہ کیا۔ "اِدھر کوئی خطرہ نہیں۔ اچھا کیا اِدھر آ گئے۔ آنکھیں بند کر کے بھی جاؤ تو نکل جاؤ گے۔ تین کوس پر سڑک مِل جائے گی۔ سیدھے ہاتھ پر ہو جانا۔ گُمشُد ——" وہ بازو لمبا کیے چھڑی کو نصف دائرے میں دُور تک گھماتا گیا، "وہاں پر ہے۔" اُس نے جنوب مغرب میں اُفق پر چھڑی کو ٹھہرا کر کہا، "تین دن کا سفر ہے۔ تمہاری حالت اچھی نہیں۔ چار یا پانچ دن لگ جائیں گے۔ سڑک پر کوئی سواری مِل گئی تو ایک ہی دن میں چلے جاؤ گے۔ مگر اچھا ہے سواری سے دُور ہی رہو۔"

"کیوں؟"

میر حسن جواب دینے کی بجائے گہری نظروں سے اُسے دیکھنے لگا۔ اسد نے پھر روٹی توڑ توڑ کر کھانی شروع کر دی۔ میر حسن کا چہرہ، اُس کا جسم، اُس کی شکل وُہی تھی، تیز اور نازک، مگر اُس کا انداز پختہ ہو گیا تھا، اُس کی آنکھوں میں لڑکپن کی چمک نہ رہی تھی، اُس کے لہجے میں مہلک تجربے کی جھلک تھی، جیسے اُس نے آدمیوں کو مرتے ہوئے دیکھا ہے، اور دُنیا اُس کے آگے کُھل بھی گئی ہے اور بند بھی ہو گئی ہے۔

"تم بتائے بغیر کیوں بھاگ آئے تھے؟" اُس نے پُوچھا۔

"میرا کام ختم ہو گیا تھا۔" اسد نے جواب دیا۔

"بتا کر آتے تو کیا حرج تھا۔ وہ تمہارا کچھ نہیں کر سکتے تھے۔"

اسد نے روٹی کا آخری نوالہ مُنہ میں ڈالا اور دُوسری روٹی کو تہہ کر کے جیب میں رکھ لیا۔ میر حسن کی آنکھیں

مسلسل اسد کے چہرے پہ لگی تھیں، جیسے وہ کچھ سوچ رہا ہو۔ پھر وہ تاسّف سے سر ہلا کر بولا، "تم بھی کس مصیبت میں پھنس گئے ہو۔ نہ اِدھر ٹھکانہ نہ اُدھر۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ "اب یہاں سے اُٹھ جاؤ۔ یہ جگہ ایسی غیر آباد نہیں جیسی نظر آتی ہے۔ آج رات کو نکل جانا۔" وہ چل پڑا۔

تھوڑی دُور جا کر میر حسن نے اچانک مُڑ کر اسد کی طرف دیکھا، "دیکھ بھال کر جانا۔" وہ فکر سے بولا۔

اسد نے میر حسن کو اُن دو آدمیوں کے درمیان متوازن چال سے دُور جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ اعتماد سے چل رہا تھا۔ اسد کو وہ میر حسن یاد آیا جو ابھی چند ماہ پہلے ایک نوعمر دیہاتی لڑکے کی صورت مطب کے صحن میں بیٹھا اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے اُس کی طرف ایسے دیکھا کرتا تھا جیسے اُس کی پرستش کر رہا ہو۔ اِن چند مہینوں میں کیا سے کیا ہو گیا تھا۔ اسد کے دل پر اچانک ایک گہرے افسوس کا سایہ اُتر آیا، جیسے پہلی بار اُس پہ اپنی اصل حیثیت کا انکشاف ہوا ہو۔ وہ ایک جانب سے دُوسری جانب کو جا رہا تھا، مگر یوں جیسے باہر سے باہر کو چلا جا رہا ہو۔ میں کسی ایک طرف سے بھی وابستہ نہیں ہوں، اُس نے سوچا۔ یہ کیسا کٹھن کام ہے۔

اُسی رات کو اُس نے سرحد پار کی۔ سڑک نظر آنے پر وہ دہنے ہاتھ کو مڑ گیا اور فاصلہ رکھ کر سڑک کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ کھانا حاصل کرنے کی دقت اب بڑی حد تک ختم ہو گئی تھی، مگر اُس کے پاؤں پھر اُسے تکلیف دینے لگے تھے۔ اُن میں سوجن پیدا ہو رہی تھی۔ اُس کے کپڑے پھٹ چکے تھے اور سر کے بال گندگی کے باعث چپک کر لٹوں کی صورت میں لٹک رہے تھے۔ تاہم منزلِ مقصود کی جھلک نے اُس کی کھوئی ہوئی طاقت گویا واپس لوٹا دی تھی۔ وہ اپنی لاٹھی، جس کے سرے پر بندھی ہوئی پوٹلی کا حجم اب مٹھی برابر رہ گیا تھا، کندھے پر رکھے، گدڑی سنبھالے، بچتا بچاتا ہوا اپنی منزل کی جانب بڑھتا رہا۔ جگہ جگہ پر وہ اپنے پیروں کو آرام دینے کی غرض سے بیٹھ جاتا، پھر اُٹھ کر چلنے لگتا۔ غرضیکہ اسی طرح، انتہائی افلاس کی حالت میں سفر کرتا ہوا وہ اپنے فرار کے اُنیسویں دن گُنبد پہنچا۔

(۱۲)

"اُس وقت بھی،" اسد نے یاسمین سے کہا، "جب میرے دل میں اندھیرا ہو چکا تھا، تمہاری شکل نے مجھے سہارا دیا۔"

یاسمین فرش پہ بیٹھی تھی۔ "کب؟" وہ بولی۔

"جب ایک ایک کر کے ساری اُمیدیں میرا ساتھ چھوڑ گئیں۔" کُرسی پہ بیٹھے بیٹھے اسد نے دھیمے لہجے میں بات کی، "جب مَیں اُدھر سے اِدھر آ گیا اور معلوم ہُوا کہ کوئی فرق نہیں پڑا، مَیں باہر کا باہر رہ گیا ہُوں۔" اُس نے گرم پانی کی چلمچی میں رکھے ہوئے اپنے پاؤں کو اور اُن کے ساتھ یاسمین کے اَدھ ڈوبے سفید ہاتھوں کو دیکھا۔ "اُس وقت میرے دل میں اندھیرا ہو گیا۔"

یاسمین نظر باندھے اُسے دیکھے جا رہی تھی، جیسے اُس کو صرف دیکھنے سے مطلب ہو۔

"اُس وقت ایک تمہاری شکل تھی جس نے میری جان کو سہارا دیے رکھا۔" اسد نے کہا۔

"تمہیں میری شکل یاد تھی؟"

"ہاں۔"

"مجھے تو تمہاری شکل یاد ہی نہیں آتی۔"

"تمہاری یادداشت خراب ہے۔" وہ ہنسا۔ "یا تم بے وفا ہو۔"

"نہیں، اسدی، یہ سچ ہے۔" وہ بولی۔ "تم جیسے ہی نظروں سے اوجھل ہوتے ہو، میں لاکھ کوشش کروں مگر تمہاری شکل یاد نہیں آتی۔ یہ کیا بات ہے؟"

"میرے اور تمہارے اندر یہی ایک فرق ہے۔"

"کیا فرق ہے؟"

"تم مجھے اپنے سامنے رکھنا چاہتی ہو۔ میں جہاں جاؤں تم میرے ساتھ رہتی ہو۔"

"پھر کس کی بات سچی ہے؟" یاسمین نے بچوں کی طرح سوال کیا۔

"دونوں کی۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"کیوں۔"

"ایک کی بات سچی ہوگی، ایک کی جھوٹی۔"

"اونہوں۔" اسد نے سر ہلا کر جواب دیا۔ "دونوں کی سچی ہے۔"

"کیسے؟"

"ہم دو ہیں، مگر ایک ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"پھر تمہیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔" یاسمین نے پوچھا۔ "چاہے میرے پاس رہو، چاہے چلے جاؤ؟"

اسد کی دلیل اُسے ایسے مقام پہ لے آئی تھی جہاں وہ یاسمین کو جواب دینے سے قاصر تھا۔ مگر اپنے دل کے اندر اُسے احساس تھا کہ اُن کا ایک ہونا جاو بے جا کا معاملہ نہیں، ایک خیال کی بات ہے۔ یا صرف دل کی زد میں ہونے کا سوال ہے۔ اسد نے محسوس کیا کہ یہ احساس نو پیدا بھی نہ تھا، بلکہ ایسا تھا کہ جیسے تادیر موجود رہا ہو۔

یاسمین کے گالوں پہ آنسوؤں کے دھبے ابھی موجود تھے۔ اُس کا بھرا بھرا بدن زمین پہ ایک ایسی چٹان کی مانند تھا جو اپنے تیز اور نازک کونوں پہ جم کر کھڑی ہو مگر دیکھنے میں بے توازن معلوم ہوتی ہو۔ اُس کے سفید کُرتے کے اندر بدن کی سلوٹیں دبیز ہو چلی تھیں۔ اسد نے جُھک کر ہاتھ سے اُس کے بدن کو چھوا۔ یاسمین

کے چہرے پہ رنگ گہرا ہو گیا۔

"تمہیں کب پتا چلا تھا؟" اسد نے پوچھا۔

"تمہارے جانے کے بیس دن کے بعد۔"

"تمہیں خوف نہیں آیا؟"

"کس بات کا خوف؟"

"اپنا" اسد نے کہا، "لوگوں کا۔"

"لوگوں کا مجھ سے کیا تعلق؟" وہ بولی، "مجھے صرف تمہارا خوف تھا۔"

"میرا خوف تھا؟"

"ہاں۔"

"کس بات کا؟"

یاسمین دیر تک نظر باندھے سوچتی رہی۔ "میں نے شام کے اندھیرے میں تمہیں دُور سے صرف چند لمحوں کے لیے دیکھا تھا۔" وہ بولی، "تم میری طرف پُشت کیے کھڑے تھے۔ بس۔ صرف یہی ایک واقعہ ہُوا تھا۔"

اسد حیرت سے اُسے دیکھتا رہا۔ "یہ تو پہلے پہل کی بات ہے۔"

"ہاں۔ مگر اتنی سی بات ہوئی تھی۔ مجھے اعتبار نہیں آتا۔ مجھے خوف رہتا ہے تم اوجھل ہو جاؤ گے۔ تمہاری شکل یاد نہیں آئی۔"

"تم تو بیوقوف ہو۔" اسد نے جُھک کر اُس کے پیٹ پہ آہستہ سے ہاتھ پھیلا کر رکھ دیا، "تمہیں اس پہ اعتبار ہے؟"

یاسمین نے اپنا ایک ہاتھ پانی سے نکالا اور اُسے اسد کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ "ہاں۔" وہ بولی۔

اسد نے محسوس کیا کہ اس رات کے عرصے میں پہلی بار یاسمین کے مُنہ سے ایک یقین کی بات نکلی تھی شام کے وقت جب یاسمین نے دروازہ کھول کر اُسے بازوؤں میں تھام لیا تھا، اُس تھکے ہارے ہوئے جسم کو کرسی پہ بٹھلا کر اُس کے بال دھوئے تھے اور اُن میں تیل ڈال کر کنگھی کی تھی، پھر گیلے تولیے سے اُس کے بدن کو مَل مَل کر صاف کیا تھا اور خشک ہونے پر ریشم کے کپڑوں کا سفید جوڑا پہنایا تھا، اُس کے بعد فرش پہ بیٹھ کر، چلمچی کے اندر نمک اور تیل ملے گرم پانی میں اُس کے پاؤں ڈبو کر اُنہیں ہولے ہولے ملنے لگی تھی تو اس دوران میں اُس نے رونے اور ہنسنے

ہوئے سینکڑوں باتیں کی تھیں، کچھ اپنے آپ سے، کچھ اس کے ساتھ، کچھ بات چیت کے انداز میں، مگر تمام تر بے خود بہاؤ کی حالت میں، جیسے ایک شوخ اور دھنٹ خراب میں مصروف ہو۔ اسی بہاؤ کے بیچ اس نے اپنے پیٹ کا ذکر بھی کیا تھا، مگر اس طرح کہ جیسے اس کی حقیقت غیر معروف ہو، یا کہ اتنی ہی اہم ہو جتنی دوسری باتوں کی حقیقت۔ مگر اب، جب کہ اسد یخنی کے دو پیالے پینے کے بعد اور نیم غنودگی کی حالت میں یاسمین کی باتیں سننے کے بعد بیدار ہو کر اپنی کہانی بیان کرنے لگا تھا تو یاسمین نے اس سوال پہ اس طرح ہاں کہا تھا کہ جیسے اس کے دل میں صرف اس ایک بات کا اعتبار ہو، اور کچھ بھی نہ ہو۔

"زمین کا سودا ہو گیا ہے۔" کچھ دیر کے بعد وہ بولی۔

"کس سے؟"

"انار گل سے۔" وہ بولی، "قیمت کچھ کم دے رہا ہے۔ مگر نقد دینے کا وعدہ کر رہا ہے۔ مکان اور مطلب والی زمین کا بھی سودا ہو جائے تو فیصلہ ہو۔"

باتیں کرتے کرتے یاسمین نے ہاتھوں سے ہولے ہولے رگڑ کر اس کے پیر صاف کر لیے تو گدلے پانی کی چلمچی اٹھا کر ایک طرف رکھ دی اور موٹی ململ کے ایک دوپٹے سے لمبی لمبی پٹیاں پھاڑ کر انہیں پیروں کے گرد لپیٹنے لگی۔

"جلدی کی کیا ضرورت ہے۔" اسد نے کہا، "بیچنا ہی ہے تو مناسب قیمت لے کر بیچو۔"

"اب میں یہاں رہنا نہیں چاہتی۔" یاسمین نے اٹھ کر اسد کی کرسی کا رخ موڑا اور اس کے پیر اٹھا کر آہستہ سے چارپائی پر رکھ دیے۔ پھر وہ ان کے پاس چارپائی پہ بیٹھ گئی اور پٹیوں کو دوبارہ کھول کر ٹھیک سے باندھنے لگی۔ اسد نے پڑھ اور سن رکھا تھا کہ اولاد کی محبت دل میں ایک عجیب سرمستی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ یاسمین کو انہماک سے پٹیاں کھولتے اور باندھتے ہوئے دیکھ کر اسد نے سوچا، وہ بات کیا غلط تھی؟ غلط نہیں تھی تو وہ جذبہ کہاں تھا؟ اپنے اندر جگہ جگہ پہ اس نے جھانک جھانک کر دیکھا، جیسے کسی ناقص مشین کے اندر نظر ڈال رہا ہو، مگر ولدیت کی سرخوشی کہیں دکھائی نہ دی۔ اس وسیع و عریض سرزمین پہ اب صرف ایک احساس چھایا ہوا تھا —— کہ بہت سی باتیں غلط نکل آئی ہیں، بہت سی دل کی زد سے باہر جا چکی ہیں۔ اب وقت نہیں۔

"یہ شور کیسا ہے؟" اسد نے پوچھا۔

"بتایا تو ہے۔ باغیچے کو جا رہے ہیں۔"

"اچھا؟"

اسد نے اُٹھنے کی کوشش کی تو یاسمین نے اُس کے پاؤں پہ ہاتھ رکھ کر روک دیا۔ "بیٹھے رہو۔ پیر پھٹ جائیں گے۔ باہر تُم نے دیکھا نہیں ؟"

"نہیں ایک طرف سے آوازیں آ رہی تھیں، مگر کوئی دکھائی نہیں دیا۔"

"چار پانچ دن سے تیاری ہو رہی ہے۔ پشاور کی طرف سے ایک شکاری آیا ہے۔ کہتے ہیں شیر کا پرانا شکاری ہے۔ جنگلات کے افسروں نے انتظام کیا ہے۔"

"شاہ رُخ بھی ساتھ ہے ؟"

"اسد، تم نے میری کوئی بات نہیں سُنی۔" یاسمین نے کہا، "شاہ رُخ کی تبدیلی ہو گئی ہے۔"

"کب ؟"

"ایک مہینہ ہو گیا ہے۔ تمہیں آتے ہوئے باہر کوئی نہیں ملا ؟"

"اونہوں۔ دو تین آدمی گزرے تھے، مگر کسی نے پہچانا نہیں۔"

"کون تھے ؟"

"پتا نہیں۔ اندھیرا تھا۔"

باہر اب آوازوں کا شور یوں سُنائی دے رہا تھا جیسے جلوس اُن کی دیوار کے پاس سے گزر رہا ہو۔ اسد نے اپنے پاؤں یاسمین کے ہاتھوں سے چھڑائے اور انہیں زمین پر رکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ بوجھ پڑنے پر پیروں میں پھر ایک لذیذ سا، گہرا سا درد اُٹھا جس کی تیز دھار عرصہ ہوا ختم ہو چکی تھی۔ یاسمین چارپائی پہ بیٹھی فکرمند نظروں سے اُسے فرش پر آہستہ آہستہ چل کر کھڑکی تک جاتے ہوئے دیکھتی رہی۔ اسد نے کھڑکی کھولی تو آوازیں کمرے میں آ داخل ہوئیں۔

"آدھے آدمی جا چکے ہیں۔ شکاری اُن کے ساتھ ہے۔" یاسمین بولی، "باقی کے اب جا رہے ہیں۔ رات کو ہانک لگائیں گے۔ پہلے دو دن تک اُدھر بکرا باندھ کر گھات میں بیٹھے رہے ہیں، مگر باگھ پھٹکا تک نہیں۔ شکاری کا کہنا ہے جانور چالاک ہے، مشکل سے قابو میں آئے گا۔ آج افسروں نے شکاری کو صرف ایک دن کی اور مہلت دی ہے۔"

"کیوں ؟"

"افواہ ہے جنگ شروع ہونے والی ہے۔"

اُن کے ہاتھوں میں چیڑ کی مشعلیں تھیں اور وہ ایک ایک کر کے نیچے بستی کو جانے والے رستے پر اُترتے جا رہے تھے۔ مشعلوں کی روشنی گاؤں کی دیواروں پر پڑ رہی تھی۔ جب وہ قافلہ اُترائی میں غائب ہو گیا تو فضا میں ایک

روشن غبار اُن کے سروں کے اُوپر اُوپر دُور تک چلتا رہا۔ اب اُن کی آوازیں دُور سے آ رہی تھیں۔ اسد کی ٹانگیں کپکپانے لگیں۔ اُس نے کہنیاں کھڑکی میں رکھیں اور اُن پہ بدن کو سہار کر کھڑا ہو گیا۔ پاؤں پہ بوجھ کم ہُوا تو پیروں کو کچھ آرام آیا۔

"جنگ شروع ہونے والی ہے؟" اُس نے بے خیالی میں دُہرایا۔

"ہاں۔ افواہ ہے ایک دو دن میں شروع ہونے والی ہے۔ ہر وقت جہاز پھرتے رہتے ہیں۔ تم نے بھی دیکھے ہوں گے۔"

"ہاں۔"

"کل دو جہاز ہمارے گھر کے اُوپر سے گزرے تھے۔ اتنے نیچے کہ آواز سے کان پھٹ گئے۔ سارا گاؤں نکل آیا تھا۔ فوج کی ناکہ بندی ہر طرف ہو رہی ہے۔ مُشکل سے سرکار نے ایک دن کی اور مہلت دی ہے۔ اسی لیے رات کو ہانکا لگوا رہے ہیں۔ اسدی، کھڑکی بند کر دو۔ سردی لگ جائے گی۔"

دفعتہً اسد کو احساس ہوا کہ وہ آنکھیں کہیں کھو گئی ہیں۔ اُس نے اندھیرے میں دُور دُور تک نظر دوڑائی۔ جنگل خالی تھا۔ پھر اُس نے اپنی آنکھیں میچ کر دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا، نہ شیشوں کا عکس نہ وہ شبیہہ۔ اُس کا دل خالی پڑا تھا۔ وہ انگلدہ سی جلتی ہُوئی آنکھیں ہوا ہو گئی تھیں۔ وہ حیران رہ گیا۔ اس کے دل میں یہ خدشہ ہمیشہ سے تھا کہ ایک نہ ایک دن اُس کی نظر رک جائے گی۔ اُس نے بار بار اپنی آنکھیں بند کر کے دیکھا، خیال کی قوت سے اسے برآمد کرنے کی کوشش کی، آخر پلکیں گرا کر دیر تک سُن کھڑا رہا۔ مگر وہ شبیہہ اب غائب ہو چکی تھی، جیسے ہوا میں تحلیل ہو گئی ہو، یا ایک حبت بھر کر کسی طرف کو نکل گئی ہو۔ اس پہ اُس کا ایمان رہا تھا، جیسے ہر ایک کا کسی نہ کسی پہ ایمان ہوتا ہے۔ اب وہ کسے ڈھونڈے گا؟ کس شے پہ اپنا یقین رکھے گا؟ وہ ایک لمبا چکر کاٹ کر گویا اُسی مقام پہ آ پہنچا تھا جہاں گھر کے اندر ایک ایک کر کے کواڑوں کے بند ہونے کی آوازیں آ رہی تھیں، اور وہ بچہ اپنی دو چار چیزیں تھیلے میں ڈال کر باہر گلی میں نکل آیا تھا۔ اُس کی نظر بے اختیار آسمان کی طرف اُٹھی۔ شروع ستمبر کی رات تھی اور خنک ہوا اُس کے چہرے سے ٹکرا رہی تھی۔ دُور نیچے اُس بل کھاتے ہوئے پہاڑی رستے پہ اب وہ جلتی ہُوئی لکیر پھر اُس کی نظروں کے سامنے آ گئی تھی جہاں وہ مشعلیں اُٹھائے جنگل کو جا رہے تھے۔ "حرامی!" اُس نے زیرِ لب کہا، "بزدل!"

وہ کھڑکی بند کر کے لوٹ آیا۔ چارپائی پر بیٹھ کر اُس نے پوچھا، "ذوالفقار کے آدمی کب آئے تھے؟"

"پچھلی اتوار کو۔" یاسمین نے کہا، "بعد میں بھی آئے ہیں، مگر باہر سے ہی پوچھ کر چلے جاتے رہے ہیں۔ اسدی؟"

"ہوں۔"

"تمہارے اُوپر کوئی پابندی تو نہیں تھی؟"

"اونہوں۔"

"پھر وہ آدمی کیوں آئے تھے؟"

"خیر خبر پُوچھنے آئے ہوں گے۔" اسد نے تھکے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ وہ تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔ "یاس!" وہ بولا، "تم تو کہتی تھیں تم اپنا گھر چھوڑ کر جانا نہیں چاہتیں۔"

"یہ مَیں اُس وقت سوچتی تھی جب تم میرے پاس تھے۔" وہ بولی، "جب تم چلے گئے تو مجھے معلوم ہوا کہ تمہارے اُوپر ہی میری جان کا انحصار ہے۔ اور کسی بات کی حقیقت نہیں۔ اسد؟"

"ہاں۔"

"تم کیا چاہتے ہو۔ مَیں یہاں رہوں یا چلی جاؤں؟"

"تم اپنی مرضی کی مالک ہو۔ مَیں تو چاہتا ہوں جہاں رہو میرے ساتھ رہو۔"

"تم بھی تو کہتے تھے۔" یاسمین نے اچانک پُوچھا، "کہ اپنے عمل سے ایک قدم اُٹھانا چاہتے ہو۔ اب مطمئن ہو گئے ہو؟"

اسد دیر تک اُس کے چہرے پر نظر جمائے دیکھتا رہا، جیسے کسی بات کا خیال کر رہا ہو۔ مَیں اِسے کیا بتاؤں، اُس نے سوچا، کہ بے عملی سے ہم شکار بنتے ہیں اور عمل سے قاتل؟

"ہاں۔" اُس نے آہستہ سے کہا۔

یاسمین اُس کے سینے پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔

جب دروازے پر دستک ہوئی تو اسد اُٹھ بیٹھا، جیسے وہ پہلے سے ان کا منتظر ہو۔ اُس کے بدن پہ گو تھکن کے آثار تھے، مگر اُس کے چہرے پہ اطمینان تھا۔ اُس نے پائنتی کی جانب سے حکیم کا جُوتا اُٹھا کر پہننے کی کوشش کی، مگر پٹیوں میں بندھے ہوئے پیر جُوتوں میں داخل نہ ہو سکے۔ چند سیکنڈ کے بعد وہ اِس کوشش کو ترک کر کے اُٹھ کھڑا ہُوا۔ بدن کے بوجھ کو پاؤں پر اُستوار کرنے کے بعد اُس نے اپنا لباس درُست کیا اور آہستہ سے فرش پر ایک قدم اُٹھایا۔ اسد کا قدم اُٹھتے ہی یاسمین، جو پاؤں کے پنجوں پہ اپنا جسم سنبھالے گُم سُم بیٹھی تھی، لپک کر اسد کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

"کہاں جا رہے ہو؟"

"ذوالفقار کے آدمی آئے ہوں گے۔" اسد نے اطمینان سے کہا۔

"تمہیں کیسے پتا ہے؟"

"میرا خیال ہے وہی ہوں گے۔ اِس وقت اور کون ہو سکتا ہے۔"

"کیوں؟ کیوں نہیں ہو سکتا؟" وہ بولی، "اِس وقت کیا کرنے آئے ہیں؟"

"کوئی پیغام وغیرہ لے کر آئے ہوں گے۔" اسد نے کہا، "فکر کی کیا بات ہے؟"

"مَیں جاتی ہوں۔" یاسمین اُس کے بازو پر ہاتھ رکھ کر بولی، "تم نہ جاؤ۔"

"تم اُن سے کیا کہو گی؟ یہی ناکہ مَیں اندر بیٹھا ہوں۔"

"مَیں اُن سے کہوں گی صبح کے وقت آئیں۔"

"کیا فائدہ؟ ایک بار تو مجھے ذوالفقار سے ملنا ہی ہے۔" اسد صبر سے بولا۔

دستک دوبارہ ہوئی۔ رات کے سناٹے میں لکڑی کے دروازے پر دستک والا ہاتھ بھاری پڑتا ہوا سنائی دیا۔ یاسمین کے چہرے پر ہراس پھیل گیا۔

"اسد،" وہ بولی، "میرا دل ڈر رہا ہے۔ مت جاؤ۔"

"بیوقوفی کی باتیں مت کرو۔" اسد نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دی، "ڈرنے کی کیا بات ہے۔ ابھی اُن سے بات کر کے آجاتا ہوں۔"

جب اسد نے تاریک صحن میں قدم رکھا تو وہ بولی: "جلدی آجانا، اسدی۔"

"ابھی آتا ہوں۔ تم یہیں ٹھہرو۔"

مگر وہ اُس کے پیچھے پیچھے دروازے تک چلی آئی۔ "اُن سے کہنا ابھی تمہارے پیر خراب ہیں۔" وہ چمٹی رہی؛ "ایک دو دن کے بعد آؤ گے۔"

"ہاں ہاں۔ ایک دو دن کے بعد۔" اسد نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔

"ابھی تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔"

"ہاں۔"

مگر وہ کنڈی اُتارنے لگا تو یاسمین پھر اُس کے سامنے آگئی۔ "تھوڑی دیر اور دیکھ لو، اسدی۔ شاید چلے جائیں۔"

"نہیں جائیں گے۔" اسد آہستہ سے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

"کیوں؟"

"اِس طرح نہیں جائیں گے۔" وہ بولا، "ابھی نہیں فارغ کرتا ہوں۔ تم اندر چلو۔"

"جلدی کرنا۔"

"ایک منٹ میں۔" وہ بولا، "تم اندر چلو۔ میں آتا ہوں۔"

جب اسد نے دروازہ کھولا تو باہر تاروں کی روشنی میں جس چیز پہ سب سے پہلے اُس کی نظر پڑی وہ دو خچر تھے۔ خچروں پر زین کسی تھی اور وہ سر جھکائے کھڑے تھے۔ پہلی نظر میں اسد کو کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ پھر یاسمین نے لالٹین اُٹھائی تو نیم تاریکی میں دو آدمیوں کی شکلیں نظر آئیں۔ صاف طور پہ دکھائی نہ دیتا تھا کہ اُن آدمیوں نے وردیاں پہن رکھی تھیں یا سادے لباس میں تھے، مگر اُن میں سے ایک دروازے کے ایک طرف اور دوسرا دوسری طرف دروازے سے لگ کر کھڑے تھے، جیسے پہرے دار ہوں۔ جب اسد نے دہلیز پر قدم رکھا تو وہ آدمی اپنی جگہ پر رُکے رہے، مگر اسد نے محسوس کیا اُن دونوں میں خفیف سی حرکت ہوئی ہے، جیسے آگے بڑھنے سے پہلے بدن کو سنبھال رہے ہوں۔ اسد دہلیز پر ایک پاؤں رکھے رُکا رہا۔ اچانک پیچھے سے یاسمین کی بے دم آواز آئی: "دروازہ بند کرلو، اسدی۔" ابھی الفاظ اُس کے مُنہ میں تھے کہ دو آدمیوں نے جھپٹ کر اسد کو ہوا میں اُٹھا لیا۔ وہ اپنے بازو اسد کی کمر اور ٹانگوں میں ڈالے، اُٹھائے اُٹھائے اُسے ایک خچر کے پاس لے گئے۔ وہاں پر انہوں نے اُسے اوپر اُٹھا کر آہستہ سے خچر کی پُشت پر بٹھا دیا۔ اسد کے بدن سے مزاحمت خارج ہو چکی تھی۔ وہ اپنا بوجھ اُن کے بازوؤں کی پالکی پہ ڈالے آرام سے خچر کے اوپر جا بیٹھا۔ کاٹھی پر بیٹھ چکنے کے بعد اُس نے نیچے کودنے کی کوشش نہ کی، بلکہ اپنے جسم کو دائیں اور بائیں کھسکا کر زین کی مضبوطی کو جانچا اور پھر ایک جگہ پر جم کر بیٹھ گیا۔ ایک آدمی چھلانگ لگا کر اُس کے پیچھے سوار ہوا۔ اُس آدمی نے اسد کی بغلوں کے بیچ سے ہاتھ آگے نکال کر باگ سنبھال لی۔ خچر نے سر اُٹھایا اور لمبے لمبے کان گول چکروں میں پھرانے لگا۔ اسد سیدھا بیٹھا خچر کے گھومتے ہوئے کانوں کو دیکھ رہا تھا کہ اُس کے کان میں ایک آواز آئی: "چھوڑ دو — مجھے چھوڑ دو۔"

اِس آواز کی یاسمین کی آواز سے، یا کسی انسان یا حیوان کی آواز سے مشابہت نہ تھی، بلکہ ایک بادل کے پھٹنے کی سی آواز تھی۔ صرف اسد کو علم تھا کہ یہ آواز یاسمین کی ہے، اور اپنے نیم خواب ذہن کے اندر وہ اس آواز کا منتظر تھا۔ مگر اس پھٹی ہوئی گرج دار آواز کا وہ متوقع نہ تھا۔ وہ چونک پڑا۔ اُس نے مُڑ کر دیکھا۔ بوڑھی حسینن بی بی عقب سے یاسمین کی کمر میں باہیں ڈالے پورے زور سے اُسے اندر کی طرف کھینچے ہوئے تھی۔ یاسمین آدھی دروازے کے اندر اور آدھی باہر، دونوں بازو اپنے آگے ہوا میں پھیلائے رات کی تاریکی

میں اُن فراری سایوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہی تھی جو غائب ہوتے جا رہے تھے۔

"مجھے جانے دو" وہ گرج رہی تھی، "مجھے جانے دو ——— اسدی، "اُس نے ایک لمبی کوک لگائی،

"اسدی ی ی ———"

پھر اُس کی آواز کا زور ٹوٹنے لگا۔ "مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ" وہ ایڑ لگاتے ہوئے خچروں کے پیچھے اُس ہیبت ناک آواز میں پکار کر بولی، "مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ ———"

دیکھتے دیکھتے خچر تاریکی میں غائب ہو گئے۔ گاؤں میں اُس وقت صرف اِکا دُکا مرد موجود تھے۔ اِس شور پر گھروں کے دروازے کھُلنے لگے۔ کہیں کہیں سے عورتیں اور مرد اور بچے نکل کر اکٹھے ہونے شروع ہوئے۔ جب یاسمین ہار کر دروازے کے اندر زمین پر ڈھیر ہو گئی تو حسین بی بی نے اُسے بازوؤں میں بھر کر اُٹھانے کی کوشش کی، پھر وہ بھی ہار کر اُس کے پاس بیٹھ رہی۔ یاسمین کی شلوار پر خون کا ایک دھبّا نمودار ہو کر پھیلتا جا رہا تھا۔ رات آدھی نکل چکی تھی۔

(٣)

Ah, but a man's reach should exceed his grasp or what's a heaven for.

R. Browning

اندھیری رات میں جیپ بتیاں بجھائے سڑک کے کنارے کھڑی تھی۔ پتھروں والے جب پکی سڑک پر آکر چڑھے تو جیپ میں سے تین آدمیوں نے نکل کر خاموشی سے قیدی کو وصول کیا۔ ڈرائیور اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا۔ جب وہ سب جیپ کے اندر اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ چکے تو جیپ وہاں سے روانہ ہوئی۔ بے در اندھیرے میں روشنی کی لکیریں اچھل کر پھیلیں اور انجن کی آواز نے فضا میں شور برپا کر دیا۔ اسد کو یوں محسوس ہوا جیسے سوئی ہوئی رات اٹھ کر چل پڑی ہو۔ سڑک، جو دن کی روشنی میں گہرے نیلے رنگ کی تھی، اب سیاہ نظر آرہی تھی۔ بتیوں کی روشنی ایک کٹے پھٹے ہوئے مہیب پنکھے کی شکل میں سڑک پر اور پہاڑوں کی دیواروں پر اڑتی چلی جا رہی تھی۔ مگر اندر اسد کی آنکھوں کے آگے اندھیرا تھا۔ یہ کیسی جیپ ہے، اس نے سوچا، جس کی اگلی اور پچھلی سیٹ کے بیچ پردہ پڑا ہے۔ ایسی جیپ میں نے پہلے نہیں دیکھی۔ وہ پچھلی سیٹ پر دو آدمیوں کے درمیان پھنس کر بیٹھا سامنے لٹکتے ہوئے سیاہ پردے کو دیکھے جا رہا تھا، جیسے وہاں کسی کھڑکی کے کھلنے کا منتظر ہو۔ یہ مجھے کہاں لے جا رہے ہیں، اس نے سوچا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ جان کر اسے حیرت بھی ہوئی کہ اس کے اس سوال میں نہ خوف تھا نہ ہراس، بس معمولی جستجو تھی، جیسے وہ کوئی عام سا سوال کسی سے پوچھ رہا ہو۔ اس کے بدن میں اس وقت ایک ساتھ کئی باتوں کے ہونے اور نہ ہونے کا تھما تھما ہوا علم موجود تھا۔ اس نے خیال کیا کہ وہ اپنے جسم سے نکل چکا ہے اور اب ہر اس کیفیت کی جانچ کر سکتا ہے جو اس پر گزر رہی ہے۔ ایک گڈمڈ کیفیت آرام کی تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ جیسے بال کی سی باریک بے شمار تاروں نے اس کے محور کو چاروں سمت سے اپنی اپنی طرف کھینچ رکھا ہے اور ان کی تان پر اس کا بدن مکمل توازن کی حالت میں ہلکا پھلکا اور آسان پڑا ہے۔ مگر ساتھ ہی اسے اس بات کا خدشہ تھا کہ اگر اس نے ذرہ بھر مزاحمت بھی کی تو تن آسانی کا یہ طلسم ٹوٹ پھوٹ جائے گا۔ اس کیفیت کی ایک شکل مدت ہوئی ایک بار پہلے لڑکپن کے زمانے میں اسد نے دیکھی تھی۔ اس وقت وہ باقاعدگی سے مسجد میں نماز پڑھنے جایا کرتا تھا اور یہ کیفیت وضو کرنے کے بعد اس پر طاری ہوتی تھی اور اس وقت تک رہتی تھی جب تک وضو قائم رہتا تھا۔ بہترین دروازہ مسجد کا تھا، اس نے اپنے آپ سے کہا۔ دونوں بازوؤں پہ بیٹھے ہوئے آدمیوں نے سختی سے سر موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ بے جنبش سامنے دیکھتا ہوا بیٹھا رہا۔ کسی وقت میں جا کر پھر یہ کیفیت اس کے ہاتھ سے نکل گئی تھی، اس نے سوچا۔ اب اتنی عمر کے بعد ایک بار پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کی جلد کے نیچے نیچے ایک انوکھی آشنائی کی لہر چل رہی ہے جس نے اس کے جسم کو بے وزن مگر دل کو توانا کر دیا ہے۔ اس کے دل میں ایک لمبی اور اونچی اڑان تھی، جیسے کوئی بلند پرواز پرندہ جس کے شہ پروں میں اتنی قوت ہو کہ فضا میں فراٹے بھرتا ہوا یکلخت کسی مقام پہ ٹھہر کر ہوا میں معلق ہو جائے، گویا آسمان کے بیچ کوئی دروازہ نکل آیا ہو اور وہ نادر

وہاں پہ رُک کر اُس کے اندر دیکھتا رہے۔ سب سے بہتر دروازہ مسجد کا تھا، اُس نے سوچا۔ گلی کے موڑ کی گولائی میں جڑا ہوا دروازہ ایسے دُہرے رُخ کا تھا کہ دونوں گلیوں میں جس مقام سے دیکھیں پُورے کا پُورا سامنے نظر آتا تھا۔ دروازے کے اردگرد سفید پتھر کی سلوں پہ رنگین پچی کاری کا کام تھا۔ رنگ کیسے تھے ہ ہرا اور نیلا اور قرمزی رنگ تھے جن کی شوخ بیلیں ہاروں کی مانند دروازے کے گرد لٹکی تھیں۔ مگر بات یہ نہ تھی کہ پتھر کے اندر شوخ بیلیں تھیں اس وجہ سے دروازہ بہترین تھا۔ بات یہ تھی کہ دروازہ کبھی بند نہ ہوتا تھا۔ رات کے وقت جب سارے گھروں اور دکانوں کے دروازے بند ہو جاتے تو اُس وقت بھی یہ دروازہ چوپٹ رہتا تھا۔ اندر بلب کی تیز روشنی مسجد کی سفید دیواروں پہ پڑتی تھی۔ اور رات چاہے کتنی ہو جائے کوئی نہ کوئی اندر چل پھر رہا ہوتا تھا۔ صبح دوپہر شام ہر وقت کوئی نہ کوئی ننگے پاؤں دھوتی اڑسے کنوئیں سے پانی کے بوکے نکال نکال کر ٹنکی میں ڈال رہا ہوتا تھا اور ہر کوئی اندر جا کر غسل خانے میں نہا سکتا تھا۔ نماز پڑھنے کی پابندی نہ تھی۔ زیادہ تر لوگ خاص طور پہ گرمیوں میں صرف نہانے کے لیے وہاں جاتے تھے اور نہا کر بھیگے بدن چپلی پہنے سیڑھیاں اُتر کر گھر چلے جاتے تھے۔ سوائے جمعے کے دن کے جب محلے کے چھوٹے بڑے اپنے اپنے گھروں سے صاف کپڑے پہن کر مسجد میں جاتے تھے اور کئی ایک وہاں پہ دوبارہ وضو کرتے تھے۔ پھر سردی ہو تو صحن کے بیچ دھوپ میں اور گرمیوں کے دنوں میں برآمدے کے تلے سائے میں گھس کر بیٹھنے کی کوشش کرتے اور منہ اُٹھا کر خطبہ سنتے تھے...... آشنائی کی لہر اب گہرے پانیوں کی جانب سفر کر رہی تھی اور اپنی رَو میں چھوٹی بڑی مدفون اشیا کو پلٹتی جاتی تھی، گویا کسی نادر اور قیمتی شے کی تلاش میں ہو۔ اسد اپنے آپ کو اِس لہر کی رَو پہ چھوڑے ہر چھوٹی چھوٹی شے کو اُٹھاتا، اُسے اُلٹتا پلٹتا اور دیکھتا بھالتا ہُوا چلا جا رہا تھا، جیسے کوئی خزانہ اس کے ہاتھ لگ گیا ہو۔ یہ لہر اب زندگی کی جڑوں کی جانب رواں تھی۔ اسد نے خیال کیا کہ جیسے ایک مہیب اور منہ زور مچھلی ہے جو غوطہ لگائے اپنے پَروں کے زور پہ اندر ہی اندر اُتری چلی جاتی ہے اور وہ اُس مچھلی کی پُشت پر جم کر بیٹھا اِس نئے راستے کے نشان اُٹھاتا چلا جا رہا ہے۔ جمعے والے دن، اُس نے خوشی سے سوچا، دروازے کے اندر چھوٹے بڑے بے شمار جوتوں کا جمگھٹ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی یہ پھیل کر دروازے سے باہر سیڑھیوں تک چلا آتا تھا۔ وہ جن کی ہلکی ہلکی سستی چپلیاں ہوتی تھیں اُن کو سیڑھیوں کے آس پاس لاپروائی سے اُتار کر اندر چلے جاتے تھے مگر جن کے پیروں میں مہنگے بوٹ ہوتے تھے وہ اُنہیں اُتار کر اُن کے تلے ایک دُوسرے سے ملا کر ہاتھ میں پکڑ لیتے تھے اور مسجد کے اندر لے جا کر ایک طرف دیوار کے پاس رکھ دیتے تھے تاکہ محفوظ رہیں۔ جمعے کو مسجد کی دیواروں کے ساتھ ساتھ ایسے بوٹوں کی قطار لگی

ہوتی تھی جو پہلو کے بل پڑے ہوتے تھے اور میرے دل میں ہر وقت خیال آتا تھا کہ نہ دھویا ہے نہ کلمہ پڑھ کر پاک کیا ہے بس تلے سے تلا جوڑ دینے سے یہ پاک کیسے ہو گئے۔ مولوی سردار شاہ کی ڈاڑھی کے بال سفید تھے اور سر پہ بڑی سی سفید بل دار پگڑی ہوتی تھی جس کو وہ کبھی کبھی اتار کر گود میں رکھتے تھے اور چھوٹے چھوٹے کھچڑی بالوں میں انگلیاں ڈال کر سر کھجاتے تھے۔ مگر پگڑی ڈھیلی ڈھالی ہونے کے باوجود خراب نہ ہوتی تھی بلکہ اسی طرح دوبارہ سر پہ جم جاتی تھی۔ اللہ میاں کی شکل اس وقت مولوی جی کی شکل کی سی تھی۔ بڑی سی ڈھیلے بلوں والی سفید پگڑی اور سفید ڈاڑھی اور پستہ قد، گندھا ہوا بھاری جثہ اور نیلا کرتہ نیلا تہمد اور اللہ میاں کا ایک ڈنڈا تھا۔ میں اور مانو اور ساود اور کریما اور بھی تندور والی کی لڑکی اور شجو ان دنوں ظہر کی نماز کے بعد مولوی جی سے قرآن شریف پڑھنے جایا کرتے تھے اور کئی اور بچے دوسری گلیوں سے بھی آتے تھے۔ پہلے کوئی درویش کچھ درس دیتا تھا جب تک کہ سارے بچے ایک ایک کرکے آ نہ جاتے تھے۔ پھر مولوی جی حجرے کے دروازے پہ آ کر اندر آنے کا اشارہ کرتے تو ہم سب اٹھ کر حجرے کے اندر چٹائی پر جا بیٹھتے تھے۔ چٹائی پر ایک چوکور گدا مولوی جی کے بیٹھنے کے لیے تھا اور پیچھے ایک گاؤ تکیہ تھا۔ تکیے کے اوپر دیوار میں ایک چھوٹی سی کھڑکی تھی جہاں سے بس اتنی روشنی پڑتی تھی کہ مشکل سے حروف نظر آتے تھے اور دروازہ اندر سے بند کر لینے پر حجرہ اور بھی تاریک ہو جاتا تھا۔ پھر پچھلے سبق میں یا اگلے میں جو کوئی اٹکنے لگتا تھا اس کو مولوی جی کی پیچی مگر رعب دار ڈانٹ کی آواز پڑتی تھی۔ "اللہ میاں کا ڈنڈا ا۔" اور زبان بندی کی اس آواز پر اٹکنے والا اپنی جگہ چھوڑ کر مولوی صاحب کے پاس جا بیٹھتا تھا۔ وہ اس وقت تک وہاں چپ چاپ بیٹھا رہتا تھا جب تک کہ کسی دوسرے اٹکنے والے کو آواز نہ پڑ جاتی تھی جب کہ اس دوران میں سب ڈر کے مارے ایک ساتھ اونچی آواز میں کوئی یہاں سے کوئی وہاں سے اپنا اپنا سبق وہراتے جاتے تھے گو اللہ میاں کے ڈنڈے کی شکل کسی نے نہ دیکھی تھی۔ تاہم سب نے کسی نہ کسی وقت میں ڈرے ڈرے ہاتھوں سے اسے پکڑ کر رکھا تھا جیسے کہ کوئی آگ کا کوڑا ہو جس پہ ہاتھ رکھ دینا ہی بڑی سزا ہو۔ حالانکہ یہ کوئی ایسی سزا نہ تھی کیونکہ اس سے کہیں درد نہ اٹھتا تھا اور اس سے بڑی سزا مولوی جی نے کبھی نہ دی تھی۔ سوائے اس وقت کے کہ جب بیٹھے بیٹھے کبھی کبھار وہ ہاتھ کو سختی سے جھٹک کر اٹھ کھڑے ہوتے تھے اور تیزی سے حجرے سے نکل کر غسل کے لیے چلے جاتے تھے اور پھر واپس آ کر درس دینے لگتے تھے۔ یا سوائے اس حکم کے کہ اس کا نام زبان تک آیا تو اس کی مار ایسی آنا فانا پڑے گی کہ ماں باپ اندھے ہو جائیں گے اور گھر مسمار ہو جائے گا اور تم گلیوں میں بھیک مانگتے پھرو گے۔ ہمارے دل میں اس کا ڈر بیٹھ گیا تھا۔ مگر دوسرے ڈروں کی مانند نہیں تھا جن سے دل میں بلبلے سے خوف پیدا ہو جاتے ہیں بلکہ چھوٹا سا ڈر تھا جیسے کوئی راز ہو اور دل میں تسلی تھی کہ جب تک اس کا ذکر زبان تک نہ آیا کچھ نہ ہوگا۔ وہ سبق

جو مولوی جی نے پڑھایا ایک ایک لفظ آج تک بھی دِل پر کندہ ہے۔ وہ گرمیوں کے دِن تھے اور دوپہر کے وقت گلی میں ٹھٹ کے ٹھٹ لگے تھے۔ مسجد کے دروازے پر چار پانچ سپاہی لاٹھیاں اُٹھائے کھڑے تھے اور دروازے میں مولوی سردار شاہ پہاڑ سا سینہ نکالے دونوں بازو پھیلائے اُن کا راستہ روکے کھڑے تھے۔ ہجوم سے گھبرا کر سپاہیوں نے اندر گھسنے کو ایک ہلا مارا تو مولوی جی سو سال بوڑھے درخت کی مانند دروازے میں جمے کھڑے رہے جیسے کہ ریل گاڑی کا انجن بھی انہیں اپنی جگہ سے ہلا نہیں سکتا۔ "مُرتد کو ختم کرنے والا۔" وہ گرجنے لگے، "دین کا سپاہی ہے اور اللہ کے گھر کا پناہ گیر ہے۔" اُن کے عقب میں صرف ایک دو درویش نظر آ رہے تھے مگر پتا چلتا تھا کہ مسجد کے اندر کوئی اور بھی ہے جو اُن کی حفاظت میں ہے۔ دُور دُور کی گلیوں کے آدمی آکر وہاں جمع ہو رہے تھے اور سب مولوی جی کے طرف دار تھے۔ "شاہ جی دروازہ بند کر لو۔" کسی نے آواز دے کر کہا۔ "یہ اللہ کی آنکھ ہے دروازہ نہیں۔" مولوی جی گرجے۔ "اللہ کی آنکھ بند نہیں ہوتی۔ دست انداز اس خادم کی لاش سے گزر کر جائے گا۔" اپنے کوٹھے پہ کھڑے یہ نظارہ دیکھتے ہوئے جب اس گرج کی آواز میرے کان میں پڑی تو آناً فاناً مجھے پتا چل گیا کہ دروازہ کیوں اتنا روشن اور پُرکشش تھا۔ یہ اللہ کی آنکھ تھی۔ پھر مجمع بیچ سے پھٹنے لگا اور پولیس کی ایک پوری گارد رائفلیں اُٹھائے مسجد کے دروازے پر آکر گلی کے دونوں جانب دُور دُور تک سیدھی قطاروں میں کھڑی ہو گئی اور اُن کا افسر گلے میں کالا پستول اور گولیاں لٹکائے اُن کے بیچوں بیچ چلنے لگا۔ اُس وقت بھی جب سینکڑوں کا مجمع چُپ سادھ گیا اور پستول والے افسر کی کڑک دار آواز گلی میں گونجنے لگی تو دروازے میں مولوی جی کی پھیلی ہوئی بانہوں اور چٹان کے سے سینے میں ذرہ برابر حرکت نہ ہوئی۔ اور اُس وقت بھی میرے لرزتے ہوئے دل میں ایک یقین تھا کہ ابھی اُن کے مُنہ سے ایک رُعب دار ڈانٹ کی آواز نکلے گی، "اللہ میاں کا ڈنڈا!!..." اور سب پولیس والے اُن کے پاؤں میں جا کر چُپ چاپ بیٹھ جائیں گے اور اپنے اپنے ہاتھ آگے بڑھا دیں گے، پھر کسی نے بول چال کی تو اُس پہ ایسی آفت آئے گی کہ اُس کا گھر مسمار ہو جائے گا اور وہ اندھا ہو کر گلیوں میں بھیک مانگتا پھرے گا۔ میرے دل میں اُس خطرے کے آخری وقت میں بھی ایک یہ بھروسا تھا۔ مگر دھکم پیل کے اندر پھر مَیں نے پستول والے افسر کا ڈنڈا ہوا میں اُٹھتا دیکھا اور مولوی جی اوندھے مُنہ مسجد کے دروازے میں گر پڑے اور لُڑھک کر تھڑے کی سیڑھیوں پہ آکر اُلٹے لیٹ گئے اور لوگوں کے مجمعے میں بھی دھکم پیل ہونے لگی۔ پولیس کے سپاہی مسجد میں داخل ہو گئے۔ پہلے کچھ جوتے اُتار کر اور باقی جوتوں سمیت بھاگتے ہوئے مسجد کے صحن پر چلے گئے جو ہمارے کوٹھے سے نظر آتا تھا۔ اُس وقت مَیں اپنی جگہ سے ہٹ کر آ گیا۔ مولوی جی اُس کے بعد نظر نہ آئے۔ اُن کی جگہ ایک درویش روز کی اذان دینے اور نماز پڑھانے لگا۔ کچھ دِنوں کے بعد ایک کالی ڈاڑھی والے پتلے سے مولوی صاحب، جن کا نام علی محمد بریلوی تھا، آ گئے۔ اُنہوں نے آتے ہی

بکّی گلی کے مولوی عنایت شاہ سے مناظرے شروع کر دیے۔ مناظرے شہر سے باہر ایک کھلے میدان میں ہوتے تھے جو پڑاؤ کہلاتا تھا۔ ہر جمعے کی نماز کے بعد دونوں اپنی اپنی کتابوں اور اپنے اپنے درویشوں کو لے کر وہاں پہنچ جایا کرتے تھے۔ پہلے کچھ دیر تک وہ ایک دوسرے سے بحث مباحثہ کرتے اور کتابیں کھول کھول کر حوالے دیتے۔ پھر دونوں غصّے میں آجاتے اور لعن طعن کرنے لگتے۔ دونوں طرف کے درویش ڈنڈے اور سونٹیاں نکال لیتے اور کبھی بیچ بچاؤ ہوجاتا مگر اکثر نوبت لڑائی پر جا پہنچتی تھی۔ پھر مناظرہ اگلے جمعے تک اُٹھا دیا جاتا۔ مولوی علی محمد بریلوی، سردی ہو یا گرمی، ہمیں مسجد کے صحن میں بٹھا کر اپنی تیز تیز آواز میں قرآن شریف کا درس دیتے تھے اور جو کوئی اونگھنے لگتا تھا اُس کی پیٹھ پر ایک پتلی سی قمچی تڑاخ سے لگاتے تھے۔ اِس سے سبق یاد ہوجاتا تھا مگر لفظ دِل پر کندہ نہ ہوتے تھے۔ وہ محنت وہ محبت اندر سے نکل گئی تھی......... اُس ٹمٹماتی ہوئی نیم روشن دُنیا میں دفعتہً اسد کو احساس ہُوا کہ وہ قیمتی اور نادر شئے محبت کے یہ نشان تھے۔ کچھ دیر پہلے ایک مشعلوں کی لکیر کو جنگل کی جانب بڑھتے ہُوئے دیکھ کر اُس نے سوچا تھا، اب میں کس بات پہ اپنا یقین رکھوں گا؟ اب سیپیوں کی طرح بکھری ہُوئی عمر کی ان گھڑیوں کو وہ ایک ایک کر کے چُنتا اور اُن کے مُنہ کھولتا ہُوا آزادی سے چلا جا رہا تھا، جیسے یہ سمت سب سے اصل اور آخری سمت ہو۔ یہ نشان جاندار تھے۔ سُوئی کے ناکے کو ایک بار میں نے، اُس نے سوچا، آنکھ کے آگے رکھ کر دیکھا تھا جس کے اندر سے اونٹوں کی قطاریں گزر رہی تھیں اور ایک قافلہ تھا عورتوں مردوں اور بچوں کا جن کے چہرے اُڑتی ہُوئی زرد آور خواہش میں ڈھلے تھے جیسے رہزنوں کے ہوتے ہیں یا چھوٹے بڑے مختاروں کے اور اُن کے سروں پہ بال آندھی کی طرح بکھرے تھے۔ یاسمین کی چھاتی پر بھی بال ہیں مگر ہلکے ہلکے سنہرے رنگ کے ریشم کے جالے کی مانند جو صرف روشنی کی آڑی شعاع میں چمکتے ہیں۔ یاسمین سیدھی پُشت پر لیٹی تھی اور کچّے پکتے نیم زرد رنگ آموں کی سی چھاتیاں جن کا گُندھا ہُوا حجم اتنا مختصر تھا کہ دونوں ایک مٹھی میں سما جائیں مگر دُور دُور تھیں اور ایک دُوسری سے پرے مُنہ کیے بغلوں کی جانب کو جھکی تھیں ایسے ہلکے سے خم پہ کہ گمان ہوتا تھا ابھی ڈھلکیں کہ ڈھلکیں گو سختی سے بندھی تھیں اور اپنی بادامی رنگ کی مہین لو بیاسی آنکھیں اُٹھائے تندہی سے باہر کو دیکھ رہی تھیں۔ اُن کی زرد مومی کاغذ کی سی جلد تھی جس کی سطح پر نیلی اور قرمزی شریانوں کا جال بچھا نظر آتا تھا اتنا صاف کہ جیسے ہونٹوں سے سمیٹا جائے گا۔ ایسی باریک اور بادامی آنکھیں میں نے نہیں دیکھیں۔ میں نے دیکھی کتنی ہیں۔ وہ چار یا پانچ ایک نیچے کو ڈھلکی ہوئی تھی اور خون میں ڈوب کر پھوٹ گئی تھی۔ وہ کی آنکھیں نہیں تھیں، صرف تانبے کے پیسے جتنے گول گول چٹاخ تھے اور چاند کی روشنی میں اُبھری ہُوئی گاڑھی دُودھیا جلد تھی جس کے اندر کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ دیکھی میں نے دراصل دو

ہیں، مگر شریانوں کے جال سے رِستی ہوئی روشنی ساری بہتی ہوئی آ کر اُن آنکھوں کی کنپٹیوں پر منجمد ہو گئی تھی اور میرے اندر یہ احساس ایک علم کے مطابق تھا کہ سارے جہان کی آنکھیں مَیں نے دیکھی ہیں۔ چہروں کی بات اور ہے۔ مجھے اُس بوڑھے شخص کے چہرے کی آنکھیں یاد ہیں جو خاکساروں کے کپڑے پہنے عینکیں بیچا کرتا تھا۔ وہ خاکساروں کے کپڑے پہنے روز شہر کے بازاروں میں ایک نعرہ لگاتا ہوا اپنے ٹوٹے ہوئے کیس میں لٹکی ہوئی عینکیں بیچا کرتا تھا۔ اُس کو عینکیں بیچتے ہوئے کسی نے نہ دیکھا تھا مگر اُس کے نعرے سے ہر کوئی واقف تھا جس کا عینکوں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہ ہمارے سکول کے سامنے ایک کمرے میں رہتا تھا اور ایک روز صبح سویرے سکول لگنے سے پہلے ہم وہاں کھیل رہے تھے کہ ایک پولیس کی گاڑی آئی اور اُسے پکڑ کر لے گئی۔ جب گاڑی چلی تو ایک مختصر سی کھڑکی کے شیشے سے منہ لگا کر اُس آدمی نے پوری آواز میں اور دھیمی لَے سے اپنا نعرہ لگایا: "چور اچکے چودھری تے لنڈی رن پردھان۔" بند گاڑی سے اُس کی گھٹی ہوئی آواز باہر نکلی تو وہاں کھڑے ہوئے لوگ ہنس پڑے۔ اُس وقت کی اُس کی آنکھیں مجھے یاد ہیں۔ اُس کے چہرے سے سارا جوش اور جذبہ دفعتہً ہوا ہو گیا اور ہنستے ہوئے لوگوں کو دیکھتے دیکھتے اُس کی آنکھوں میں ایک تحیر پھیل گیا، جیسے کسی اٹل قدرتی حادثے کو پہلی بار اُس نے دیکھ لیا ہو اور رُوح اُس کے جسم سے نکلتی جا رہی ہو۔ جس خون کو نہ عمر نے اور نہ تنہائی کی وحشت نے سست کیا تھا چند کھلنڈرے لوگوں کی بے اختیار ہنسی نے سرد کر دیا۔ اُس عمر میں مَیں نے اُن آنکھوں میں ایک آدمی کو زندگی کی حیرانی کا سامنا کرتے ہوئے دیکھا تھا، اور میرے دل میں سب آدمیوں کی زندگی کے بارے میں وسوسہ پیدا ہو گیا تھا۔ چہرے کی اور بدن کی آنکھوں میں اتنا فرق ہے۔ مَیں یا سمین کو کیسے یاد کروں؟ مجھے یہ بھی علم نہیں کہ ہم کہاں جا رہے ہیں۔ یہاں سے کچھ نظر نہیں آتا۔ صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ہم پہاڑوں سے اُتر رہے ہیں۔ اگلی سیٹ والے آدمیوں نے اب آہستہ آہستہ باتیں شروع کر دی ہیں۔ میرے ساتھ بیٹھے ہوئے آدمیوں نے بھی اگلے آدمیوں سے باتیں کی ہیں۔ میرے سامنے سے ہاتھ بڑھا کر ایک دوسرے کو سگریٹ دیے ہیں اور سلگائے ہیں۔ تیلی کی روشنی میں مَیں نے اُن کے چہرے دیکھے ہیں۔ معمولی چہرے ہیں۔ ان کے چہروں سے اور باتوں سے پتا نہیں چلتا کہ پولیس کے ہیں یا فوج کے۔ اتنا پتا چل رہا ہے کہ ہم چڑھائی سے اترائی کو جا رہے ہیں۔ جیپ کی آواز ایسے آ رہی ہے جیسے ٹرک چل رہا ہو۔ یہ کون لوگ ہیں؟ ...... اسد کے دل میں یہ شک تھا کہ ہو نہ ہو اِس معاملے کا تعلق ذوالفقار سے ہے۔ اِس خیال سے اُسے کچھ تسلی ہوئی، جیسے اُس کو یقین ہو کہ ذوالفقار اُسے زک نہیں پہنچنے دے گا۔ جیپ کا رُخ تو میدانوں کی طرف ہے، اُس نے سوچا۔ کیا یہ اب مجھے گھر چھوڑ کر آئیں گے؟ مگر اِس طرح قیدی بنا کر لے جانے کی کیا ضرورت ہے۔ یہ عجیب سفر ہے۔ شاید ان کا خیال ہو کہ قید میں ڈال کر یہ مجھ کو ایک بے خبر اور کند آدمی بنا ڈالیں گے۔ اِن کو خبر نہیں کہ میرے ذہن میں ایک بجلی

چمکتی ہے جس کے اندر مجھے چیزیں نظر آتی ہیں۔ یا سمین کی شکل اور دوسری شکلیں جو میلی نہیں ہوتیں۔ اس وقت میرا خیال اٹک رہا ہے۔ جب روشنی ہوگی تو اس میں ایک روانی آجائے گی جیسے دریا میں ہوتی ہے۔ پھر اس کے زور کے آگے کچھ نہیں ٹھہرے گا۔ اُس بجلی تک اِن کی رسائی کیسے ہوگی؟ اُس روشنی تک یہ کیسے پہنچیں گے جس میں جگمگاتی ہوئی لمبی گول رانیں قینچی کے پھلوں کی مانند کھلتی اور بند ہوتی ہیں۔ قینچی کے یہ پھل اندھیرے کمرے میں بھی جھلملاتے ہوئے میں نے دیکھے تھے جب گرمیوں کی سہ پہر میں نیند نہیں آرہی تھی۔ ابا ہر آدھ گھنٹے کے بعد جھانک کر دیکھا کرتے تھے اور ظہر اور عصر کی نماز کے بعد دعا پڑھ کر، چاہے میں سویا ہوا ہوں یا جاگتا، جھک کر پھونک مارنے آیا کرتے تھے۔ اُس ساری سہ پہر کو ابا نہیں آئے تھے اور میں نے اُن کی بیٹھک کا دروازہ جا کھولا تھا۔ کمرے میں پسینے کی اور کچے کاٹے ہوئے آلوؤں کی سی ہلکی ہلکی بو بھری تھی اور دیوان کے اوپر دو پھولی ہوئی گول گندمی رانیں کھلتی اور بند ہوتی تھیں اگرچہ کھڑکی کے شیشوں پر کپڑا ڈال کر روشنی کو بند کیا گیا تھا۔ ابا ایک سیکنڈ کے اندر آگے آگئے تھے۔ اُن کے چہرے پہ سراسیمگی تھی مگر آنکھوں میں پیار کی ٹھہری ہوئی سست نظر تھی جس سے میرے دل کو تسلی ہوئی تھی کہ کوئی بات نہیں، سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ اندر چہرہ اگرچہ نظر نہیں آتا تھا مگر مجھے علم تھا کہ یہ کون ہے۔ یہ چراغ تھی۔ چراغ کی بھاری بھاری چوڑی چھاتیاں تھیں جو کھلے سے کرتے کے اندر لٹکی رہا کرتی تھیں۔ وہ دن بھر گلی میں اپنے تھڑے پر بیٹھی رہتی تھی اور گزرتے ہوئے بچوں کو اور مجھے خاص طور پر اُچک کر اٹھا لیتی تھی اور بھینچ بھینچ کر پیار کرتی تھی۔ میں اُس کی گود سے نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارا کرتا تھا اور جیسے ہی میرا پاؤں زمین پہ ٹکتا میں چھلانگ مار کر بھاگ آتا تھا۔ کیونکہ چراغ کی چھاتیاں اگرچہ موٹے نرم گدوں کی سی تھیں مگر مجھے علم تھا کہ وہ اپنی بیٹی کے بچوں کو مارا کرتی ہے اور اپنی بیٹی سے ہر وقت لڑتی رہتی ہے۔ اُس کی بیٹی کا خاوند پٹواری تھا اور اپنی بیوی کے ساتھ چراغ کے دو کمروں اور چوبارے والے گھر میں رہتا تھا اور ہر چوتھے پانچویں روز اپنی بیوی اور ساس کو پیٹا کرتا تھا۔ وہ انہیں شور مچا مچا کر گالیاں دیتا تھا مگر گلی کا کوئی آدمی چھڑانے کو اُن کے گھر کے پاس نہیں پھٹکتا تھا۔ اِسی طرح گلی کے سب لوگوں کو چراغ کی اِس بات کا بھی علم تھا مگر مجھے نہیں تھا۔ مجھے اُس دن ہوا جب ابا، جو پانچ وقت کے نمازی تھے، بازاری لوگوں کی طرح غضب کی حالت میں گالیاں دیتے ہوئے بندوق اٹھا کر باہر نکل گئے۔ جاتے اُن کے پیچھے پیچھے بھاگا اور جاتے جاتے گھر کے دروازے کو باہر سے کنڈی لگاتا گیا۔ مگر میں نے اور پھوپھی اماں نے روتے روتے گلی والی کھڑکی کی سلاخوں میں سے دیکھا کہ ڈپو والے صوفی فضل کریم، جن کی خشخشی سفید داڑھی تھی اور لوگ کہتے تھے کہ بلیک کرتے ہیں، اسی طرح غیظ و غضب کی حالت میں دوسری طرف کھڑے تھے۔ وہ اپنی قمیض کے بٹن

کھول کھول کر اور سینہ ننگا کر کے چیخ رہے تھے، مار، گولی مار، دیکھوں تیری بہادری، اور بہت سے لوگ بیچ بچاؤ کر رہے تھے اور ابا کی بندوق سیدھی نہ ہونے دیتے تھے۔ تماشائیوں میں ایک آدمی ہماری کھڑکی کے آگے کھڑا کہہ رہا تھا، خدا کسی کو توفیق نہیں دیتا اس چڑیل کو نکاح کر کے گھر میں ڈال لے، عزت دار لوگوں کی عاقبت خراب کرتی ہے۔ اس شخص نے کسی کا نام نہ لیا تھا مگر مجھے اسی وقت پتا چل گیا تھا کہ اس کا مطلب چراغ سے ہے۔ میں نے منہ اٹھا کر پھوپھی ارما کے چہرے کی طرف دیکھا تھا اور ان کی بہتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ کر میرے دل کو حیرانی ہوئی تھی کہ پھوپھی ارما کو بھی اس بات کا علم تھا۔ اس گلی میں، جہاں دوسری گلی کا کوئی آدمی آنکھ اونچی کر کے نہیں گزر سکتا تھا، سب لوگوں کو ابا کی اور صوفی فضل کریم کی اور چراغ کی اس بات کا علم تھا اور کوئی کچھ نہیں کہتا تھا، بلکہ بیچ بچاؤ کرانے آجاتے تھے۔ یہ سوچ کر میرے دل کو بڑی بھاری تسلی ہوئی تھی، جیسے میں کسی قلعے کے اندر محفوظ بیٹھا ہوں۔ اس روز اچانک دروازہ کھلنے پر اندھیرے کمرے میں اگرچہ شکل مجھے نظر نہیں آئی تھی اور رانیں میں نے ننگی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھیں مگر مجھے علم تھا کہ کس کی ہیں۔ عرق بوٹی تھی۔ پسینے کی بو سے میں واقف تھا مگر کاٹے ہوئے کچے آلوؤں کی طرح کی یہ باس نئی تھی۔ میرا جی تھوڑی دیر کے لیے متلانے لگا تھا۔ مجھے اچانک خیال آیا تھا کہ میں دوزخ میں جاؤں گا۔ اس عمر میں جب مجھے کسی کسی بات کی خبر ہو رہی تھی مجھے ایک اشارہ ملا تھا کہ کچھ لوگ ہیں جو دوزخ میں جائیں گے۔ مگر اس اشارے پر میرے دل کو کوئی پریشانی نہ ہوئی تھی، جیسے کوئی معمولی بات ہو، یا کوئی ایسی بات ہو جس کا کوئی علاج نہ ہو۔ جیپ کھڑی کیوں ہو رہی ہے؟ کوئی مقام آگیا ہے؟ کوئی مقام نہیں آیا۔ جیپ سڑک کے کنارے پر آرکی ہے اور تین آدمیوں نے اتر کر ڈھلان پر پیشاب کیا ہے۔ یہ پیشاب کا مقام ہے۔ اب تینوں آدمی جیپ کے باہر کھڑے آہستہ آہستہ باتیں کر رہے ہیں۔ چوتھا آدمی میرے پاس بیٹھا ہے۔ اس کو پیشاب نہیں آیا۔ اگر آیا ہے تو کرنے نہیں گیا، میری حفاظت پر مامور ہے۔ اب میں بھاگ کر کہاں جاؤں گا؟ میرے پاؤں میں درد اگرچہ رک گیا ہے مگر مجھے معلوم ہے کہ گیا نہیں، بے حس ہو گئے ہیں۔ اب ان لوگوں کو کس بات کی فکر ہے۔ میرا خیال پھر اٹک رہا ہے، جیسے نیم جان ہو گیا ہو۔

بشیر کا بدن بڑا جاندار بدن تھا۔ بشیر چھریرے کا تھا، مگر جب کالج میں گیا تو دو اور لڑکوں کے ساتھ شہر میں ایک چوبارہ کرائے پر لے کر رہتا تھا۔ میں بشیر سے ملنے وہاں جایا کرتا تھا۔ تین دیواروں کے ساتھ تین چارپائیاں بچھی تھیں جن پر سفید چادروں اور بادامی کھیسوں کے بستر تھے۔ ہر ایک چارپائی کے پاس ایک ایک میز پڑی تھی جو آتشی اور گلابی رنگ کے کڑھے ہوئے پھولوں والے میز پوشوں سے ڈھکی تھی۔ میزوں کے اوپر کاپیاں، کتابیں، سگریٹ، فاؤنٹین پین، گلاس، لفافے اور پیڈ رکھے تھے۔ کمرے کے بیچ میں ایک اور میز تھی جسے اونچی نیچی اینٹوں والے فرش پر جما کر دو کرسیاں

سامنے سامنے رکھ کر اور چارپائی گھسیٹ کر ہم چاروں اُس کے گرد بیٹھ کر تاش کھیلا کرتے تھے۔ سامنے والے مکان کے چوبارے میں ایک شام کو ہم نے دو ننگے بدن چلتے پھرتے ہوئے دیکھے تھے۔ ساری دنیا سے بے خبر وہ آدمی پُشت کھڑکی کی جانب کیے ہاتھ کولہوں پہ رکھے تن کر کھڑا تھا۔ عورت اس کی ٹانگوں کے بیچ اپنے گھٹنوں پہ کھڑی اپنے سفید بازو اُس کی کمر کے گرد ڈالے، مہندی لگے ہاتھوں کی اُنگلیاں اس کی پیٹھ کے گوشت میں گاڑے غصیلے بلّے کی طرح غرّا رہی تھی۔ اُس کا چہرہ آدمی کے دھڑ کی اوٹ میں نظر نہیں آتا تھا، مگر اُس کے سر کا لرزتا غرّاتا ہوا سایہ بغل کی دیوار پر ناچ رہا تھا جب کہ گلی کی اس جانب اپنے چوبارے کی کھڑکی میں بتی بجھائے چار نوجوان بدن، بشیر، رؤف، رشید اور میں ہاتھ رانوں میں دبائے یہ تماشا دیکھتے تھے۔ بشیر کے چوبارے کی ایک ایک چیز مجھے یاد ہے، مگر اس طرح سے کہ جیسے ہمیشہ کے لیے اُس سامنے والے چوبارے کا شوخ پس منظر بن گئی ہو۔ اُس ایک شام کے چند لمحوں میں اتنی جان تھی۔ بشیر جھبریے کا تھا جو ہمارے گاؤں سے چار کوس کے فاصلے پر تھا۔ ہم دونوں ابھی دسویں میں پڑھتے تھے کہ ہمارے گاؤں کی جھبریے سے کبڈی پڑی تھی۔ اُن دنوں میں بشیر کی قینچی دُور دُور تک مشہور تھی۔ مگر اُس دن میری قینچی اِس ڈھب سے اُس کو لگی کہ وہ جنبش نہ کر سکا۔ اُن دنوں نہر کے اندر تیر تیر کر اور کھیتوں کی مشکل مٹی میں دوڑ دوڑ کر ہماری رانوں میں ایسا زور پیدا ہونے لگا تھا کہ یوں محسوس ہوتا تھا کوئی چھوٹا موٹا پیڑ قینچی میں آ جائے تو چرمر ہو جائے گا۔ کبڈی کھیلنے کے بعد جب کنوئیں پر مل مل کر نہاتے اور پھر دہی کی گاڑھی لسّی کے کٹورے چڑھا کر کسی درخت کی چھاؤں میں جا بیٹھتے اور باتیں کرتے کرتے نیند کے زور میں آ کر تھوڑی دیر کے لیے وہیں لیٹ کر سو جاتے تو بدن میں وہ اکڑاؤ اُٹھتا کہ جیسے زمین کا سینہ چیر کر نکل جائے گا۔ مجھے کبڈی کھیلتے دیکھ کر پیر بخش نمبردار نے چچا سے کہا تھا، لڑکے کے جسم پر ماس کی بوٹی تک نہیں، تار ہی کے بٹے ہوئے رسّے ہیں رسّے۔ تمہارے جسم کو کسی کی نظر لگ گئی ہے، یاسمین نے کہا تھا۔ بڑی لمبی نظر لگی ہے۔ میرے پاؤں سُن ہو گئے ہیں۔ کالج کے دوسرے سال میں بشیر کو شہر کے رستے میں اُس کے چچا کے بیٹوں نے کلہاڑیوں سے کاٹ کر کھیتوں میں پھینک دیا تھا۔ میں اسے دیکھنے گیا تھا مگر سوگز سے اُس کے کپڑوں کے نشان دیکھ کر چلا آیا تھا۔ اور کوٹھوں پہ پھرتی، سرسراتے ہوئے بالوں والی لڑکیوں کے نیم رُخ اشارے اور لڑکوں کی ہلکی ہلکی آہیں، ہر وقت کی باتیں اور نیلے ملائم کاغذ پہ محنت سے لکھے اور پھاڑے ہوئے اَن گنت خط ختم گئے تھے مگر اِن باتوں کی کوئی حقیقت نہیں۔ صرف کٹے ہوئے بدن یا محبت کرتے ہوئے سدا بہار ہیں۔ ان چیزوں کا رنگ کبھی میلا نہیں ہوتا۔ جیپ اب دوبارہ چل پڑی ہے۔ آگے پردہ پھر گر گیا ہے۔ میں تو قیدی ہوں، مگر ان دو آدمیوں کو بھی اچھی سزا ملی ہے۔ باہر نہیں دیکھ سکتے۔ چُپ بیٹھے سگریٹ پی رہے ہیں۔ میں ان سے کوئی بات کروں؟ اب رات ختم ہونے والی ہوگی۔ کچھ دیر میں دن نکل آئے گا۔ پھر کوئی نہ کوئی منزل آئے گی۔ یاسمین نے میری شکل بھی نہیں دیکھی تھی، نہ آواز سُنی تھی۔ میں وہاں پہ

کھڑا تھا، اور شام کے اندھیرے میں دُور سے چند لمحوں کے لیے اُس کی نظر مجھ پہ پڑی تھی۔ بس اتنی بات ہوئی تھی۔ میں یاسمین کو کیسے یاد کروں۔ ایک خوشنما اور دیرپا جذبہ کہاں سے لاؤں، جو اُس کا اہل ہو۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اسد کے دل میں ایک ہُوک اُٹھی۔ اِس ہُوک سے گویا اچانک ایک طلسم ٹوٹ گیا۔ اسد پر اب یہ حقیقت کھلی کہ وہ کون سی ایسی منزل تھی جس کی سیڑھیوں کے طویل سلسلے کو طے کرتا ہوا وہ یہاں تک پہنچا تھا۔ ایک ایک سیڑھی پہ جما جما کر قدم رکھتا ہوا، زندگی کی چھپی اور چھپائی ہوئی چیزوں کو اُٹھاتا، اُن کے اُوپر سے تبرک کے پردے اُتارتا ہُوا وہ اِس ایک منزل کی تلاش میں چلا جا رہا تھا کہ یاسمین کو کیسے یاد کرے۔ سب سُنی سُنائی باتیں نیم جان تھیں۔ اصل جان تو اُس اندر والی ٹھوس گٹھلی میں بند تھی جو بجلی کے چھپاکے میں تیز دھار پھل کی طرح چمکتی ہے۔ صرف محبت کرتے ہُوئے بدن، اسد نے اُڑان تیز کرتے ہُوئے خوشی سے سوچا، سدا بہار ہیں۔ اُس وقت جب میں چارپائی پہ لیٹا لالٹین کی روشنی میں کمرے کی چھت پہ ایک ایک سایے کو دیکھ رہا تھا تو میرے اُوپر جھکی وہ کہہ رہی تھی، ہائے اسدی، تمہاری جلد پہ نشان پڑ گئے ہیں، ظالموں نے کیا کیا ہے۔ اُس کے ہونٹ میری گردن اور سینے اور پیٹ کی ہڈیوں کے نشیب تلاش کر رہے تھے۔ اُس وقت میں اچانک اپنے آپ سے نکل کر چارپائی سے پرے جا کھڑا ہوا تھا اور اُوپر سے جیسے اُن دو گوشت پوست کی شبیہوں کو ایک دُوسرے سے لپٹتے اور جدا ہوتے ہُوئے دیکھنے لگا تھا جیسے تیز ہوا کے اندر دو بے دم لچکتی بیلیں ہوں اور ہونٹ میری جلد کے نشانوں کے اُوپر اُوپر سرکتے جاتے تھے، پسلیوں کے پنجر کے آس پاس اور ناف کی سلوٹ کے اندر زبان کی نم نوک لمحہ بھر کو کوندتی ہوتی، کولھے کی اُبھری ہوئی ہڈی کو ہاتھ دلاسے کی طرح ڈھانپتے ہُوئے اور دو مہین اور گول بادامی آنکھیں نیزے کی کنی کی مانند میری رانوں کی جلد کے اُوپر اُوپر تیز سیدھی لکیریں کھینچے جاتی تھیں۔ ان لکیروں کی سنسناہٹ سے روئیں کانٹوں کی طرح کھڑے تھے جن کی جڑوں میں سرپٹ دوڑتی ہوئی جان کی جلد بہترین ریشم کی سی ہلکی اور نازک اور مضبوط بُنتر کی تھی، اور سرکشی سے سر اُٹھائے اس کے ہونٹوں کے ریشم سے آنکھ ملائے کھڑی تھی جیسے کہتی ہو کہ دُنیا کی کسی اور شے پہ، پھول پہ یا ترشے ہوئے پھل پہ اپنا ہاتھ رکھ کر یا ہونٹ لگا کر دیکھ لو ایسا بیش بہا نہ ہوگا، ان لمبی لمبی سرکتی ہوئی انگلیوں کے پوروں سے اپنی جان میری آنکھ میں ٹپکا دو میں تمہارا بدل ہوں میں تم ہوں تم جیسا ہوں، کہ یک بارگی میرے بدن سے ایک چیخ برآمد ہوئی اور اچھال مار کے انگلیوں کے پوروں کو منتشر کرتی ہوئی اُس کی آنکھوں کو ڈھکتی چلی گئی، اور اِس تیر کی سی چیخ کے مقابل وہ ایک لمحہ برابر سرکی نہ اپنی جگہ سے ہلی بلکہ آنکھوں پہ اور رُخسار پہ اور کندھے کی گولائی پہ اِس پگھلے ہُوئے موتیوں کی لکیر کو اٹھائے بے حرکت و حرمت بیٹھی رہی اور پیار

کا ایک سُست نظر خمار اُس کے جوڑوں سے پھوٹ پھوٹ کر بہنے لگا تھا۔ صبح سویرے دو آنکھیں میرے دیکھتے ہی دیکھتے ٹھہر گئی تھیں اور میں نے نظر کی شعاع کو تنکے میں بدلتے ہوئے دیکھا تھا جب منہ اندھیرے گرم سوتے سوتے ابا نے آ کر مجھے جگایا تھا۔ آنکھیں کھول کر میں نے دیکھا تھا کہ پتا نہیں میں کہاں پر ہوں اور ابا ایک چمکتا ہوا چھرا ہاتھ میں لیے میرے اُوپر کھڑے ہیں۔ پھر میں نے دیکھا کہ میں بستر میں لیٹا ہوں اور ابا نے ہاتھ بڑھا کر میرے سر پہ پھیرا ہے اور بال درست کیے ہیں اور جھک کر گال کو چوما ہے اور چھرے والا ہاتھ میرے آگے بڑھا دیا ہے۔ اِس کو ہاتھ لگا دو، ابا نے کہا اور میں اسے چھونے کی بجائے کھیس کے کچھ اور اندر سرک گیا تو ابا میرے سر پر ہاتھ رکھ کر پیار سے بولے، بس دستے کو ہاتھ لگا دو بیٹے، اور سو جاؤ۔ اُنہوں نے چھرے کا پھل موڑ کر اپنی طرف کر لیا اور لکڑی کا دستہ میری جانب بڑھا کر دوسرے ہاتھ سے میرا ہاتھ پکڑا اور دستے سے چھو کر چھوڑ دیا۔ پھر وہ باہر نکل گئے۔ اب سو جاؤ، وہ جاتے جاتے کہہ گئے، مگر اُن کے باہر جاتے ہی میں بستر سے نکل کر اُن کے پیچھے پیچھے چلا آیا اور آسمان پر بادل تھے یا صبح سویرے کا وقت، ٹھیک یاد نہیں، مگر دن کا اُجالا ابھی کم تھا۔ ہمارے پکے صحن میں نالی کے اُوپر موتی کو پچھاڑے ایک آدمی اُس کے اُوپر بیٹھا تھا اور ابا وہ چھرا اُسے دے رہے تھے۔ یہ بڑی عید کا دن تھا۔ موتی ہمارا بکرا تھا جس کے گلے میں بڑے بڑے سفید موتیوں کا پٹا تھا۔ میں روز شام کو رسی پکڑ کر اُسے صحن میں پھراتا تھا اور ابا کہتے تھے یہ تمہارا قربانی کا بکرا ہے۔ مجھے علم تھا کہ یہ میرا قربانی کا بکرا ہے مگر مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ کیا ہوتا ہے۔ ہر روز شام کو میں رسی پکڑ کر اُسے صحن میں گھمایا کرتا تھا اور اب میں جا کر اُس کے منہ کو ہاتھ بھی لگا لیتا تھا اور وہ مجھے کچھ نہیں کہتا تھا۔ جب اُس روز صبح سویرے قصائی نے موتی کو پچھاڑ کر اُسے ذبح کیا تو میں ڈر کر پیچھے ہٹنے کی بجائے آگے نکل کر ابا کے پاس جا کھڑا ہوا اور کانپتے ہوئے نرخرے کو اور نالی میں بہتے ہوئے خون کو دیکھنے لگا۔ وہ شاید پہلا موقع تھا جب میں اپنے آپ میں سے نکل کر الگ کھڑا ہو گیا تھا اور غور سے اُن آنکھوں کو دیکھ رہا تھا جو میرے دیکھتے دیکھتے بٹے بن گئی تھیں۔ اُنکی چمک برابر قائم رہی تھی اور اُن کی شکل میں کوئی تبدیلی نہ آئی تھی، مگر صاف دکھائی دیتا تھا کہ نظر کہیں ٹھہر گئی ہے۔ یہ میری پہلی قربانی تھی۔ وہ آنکھیں پہلے بھی ہوا میں دیکھ رہی تھیں اور اب بھی دیکھے جا رہی تھیں مگر دیکھتے دیکھتے خالی ہو گئی تھیں۔ اِس سے مجھے پتا چلا کہ ہوا کیا ہوتی ہے۔ یاسمین نے کہا تھا، اسدی، تم نے بڑے دُکھ اُٹھائے ہیں، مگر یہ تو کوئی بات نہیں۔ میں اپنی سانس کے عارضے کی خاطر اِدھر اُدھر پھرتا رہا ہوں مگر ایسے ایسے عارضے کس کو نہیں ہوتے۔ صرف اِتنی بات ہے کہ اِس بجلی کی چمک کو میں قائم رکھنے کی کوشش کر رہا ہوں اور اُس وقت تک کرتا رہوں گا جب تک میرے دل میں زور ہے۔ بس اِتنی بات ہے۔ کتنے ایسے لوگ ہیں جن کو اشارہ ملتا ہے کہ وہ دوزخ میں جائیں گے اور وہ اُسے تسلیم کر لیتے ہیں، مگر ثابت قدم رہتے ہیں۔

اس لیے کہ دوزخ اور جنت کی کون سی بات ہے۔ ایک کیفیت ہے جو عمر کے کسی مقام پر ہر ایک کے ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور پھر اُس کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے باقی رستہ طے ہوتا ہے۔ محبت کے یہ نام اور نشان میں نے پیدا کیے ہیں جو میرے رستے میں دکھائی دیتے ہیں اور کبھی ماند نہیں پڑتے۔ میں ان کو کیسے چھوڑوں۔ بس اتنی بات ہے۔ باقی یہ لوگ مجھے کہاں لے کر جا رہے ہیں، اِس کا مجھے علم نہیں۔ اگر قید میں ڈالنا تھا تو اِس علاقے سے باہر کیوں لے جا رہے ہیں؟ اگر دیس نکالا دینا ہے تو اس طرح قیدی بنا کر لے جانے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ عجیب سفر ہے——

لندن۔ فیصل آباد۔ طرابلس
جون ۱۹۷۶ء تا جون ۱۹۷۸ء

1491

عبداللہ حسین

اُداس نسلیں

"اُداس نسلیں" کو بجا طور پر ان معدودے چند ناولوں میں شمار کیا جاتا ہے جو اُردو ادب کی آبرو ہیں۔ عبداللہ حسین کے تخلیقی کمال نے اس ناول کو ایسا آئینہ خانہ بنا دیا ہے جس میں بیسویں صدی کے برصغیر پاک و ہند کا ایک تاریخ آفریں، ہنگامہ خیز اور تغیر پذیر دور اپنی پوری شدت کے ساتھ منعکس ہے۔ رنگارنگ کرداروں اور پُر اثر واقعوں کا یہ مُرقّع چونکا دینے والی حد تک متنوع اور وسیع ہے۔ عبداللہ حسین نے اِس ناول میں زندگی کو اپنی تمام تر شیرینی اور سفّاکی کے ساتھ سمو دیا ہے۔

"اُداس نسلیں"، جسے پاکستان کے سب سے وقیع ادبی انعام آدم جی پرائز کا مستحق گردانا گیا تھا، ہندی اور بنگلہ کے علاوہ بھارت کی کئی دُوسری زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔

نشیب

اُردو ادب میں عبداللہ حسین کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اس کا ناول "اُداس نسلیں" برصغیر پاک و ہند کے طول و عرض میں قارئین سے خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ لیکن عبداللہ حسین نے صرف ناول ہی کے میدان میں جھنڈا نہیں گاڑا، وہ بڑا باکمال افسانہ نگار بھی ہے۔

"نشیب" اس کے ناولٹوں اور افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے۔ اس مجموعے کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شامل چار افسانے تو مطبوعہ ہیں لیکن دو ناولٹ اور ایک افسانہ ایسے ہیں جو اس سے پہلے کہیں نہیں چھپے۔ "نشیب" نامی ناولٹ کو اس مجموعے کا دل سمجھنا چاہیے۔

یہ دو ناولٹ اور پانچ افسانے گویا ایک چوڑے زاویے والا عدسہ ہیں جس میں زندگی غیر معمولی گہرائی اور وسعت سے ہم کنار ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے۔ ان کہانیوں کے کردار محبت اور ہمدردی کے بھوکے ہیں۔ انھیں کسی ایسی آسودگی کی طلب بے کل رکھتی ہے جو آسودہ حال کے دنیوی تصور سے ماورا کوئی چیز ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کسی طرح اپنی تنہائیوں اور محرومیوں کے گرداب سے نکل کر ساحل سے جا لگیں۔ ان سب نے کبھی نہ کبھی ایک بہتر زندگی، مختلف زندگی کی جھلک دیکھی ہے اور اپنے دل میں کہیں نہ کہیں یہ محسوس کرتے ہیں کہ وہ راہ سے پہلے گروہ غلط سمت میں مڑ گئے تھے اور غلط سمت ہی میں چلتے جا رہے ہیں۔ ناولٹ "نشیب" ایک ایسے ہی المیے کی تفسیر ہے۔ اس میں دو کہانیاں ایک دوسرے کے اندر گھومتی ہیں اور باہمی معنویت کو اُجالتی ہیں۔ "نشیب" اور اس مجموعے کے باقی افسانے اور ناولٹ اُردو فکشن میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھیں گے۔ عبداللہ حسین کی ...نے کی تول جیسی نثر موضوعات کے ساتھ پورا پورا انصاف [کر]تی ہے۔

قوسین